اخبارِ ملت

چیچن جانباز

چیچنیا: روس ایکبار پھر اپنے تمام تر ظلم و وحشت کے ساتھ چیچنیا پر چڑھ دوڑا ہے۔ صرف تین سال پہلے ۹۸-۱۹۹۴ء کی جنگ میں وہ چیچن جانبازوں سے سخت ہزیمت اٹھا چکا ہے۔ مجبور ہو کر اس نے چیچنیا کے ساتھ جنگ بندی کے معاہدے پر دستخط کئے جس کے تحت یہ طے پایا کہ چیچنیا کی حتمی حیثیت کا تعین پانچ سال بعد چیچن عوام کی مرضی سے ہوگا۔ لیکن تین سال بعد ماسکو میں بم دھماکوں کا بہانہ بنا کر روس نے چیچنیا کے لوگوں پر قیامت صغریٰ برپا کر رکھی ہے۔ شہریوں، بستیوں اور آبادیوں پر اس کی وحشیانہ بمباری جاری ہے جس سے ہزاروں مسلمان شہید اور لاکھوں بے گھر ہو چکے ہیں۔ بے گھر چیچن انتہائی سرد موسم میں خیموں میں رہنے پر مجبور ہیں۔ ان ظالمانہ کارروائیوں میں اسے امریکہ، چین اور یورپ کی مکمل حمایت حاصل ہے۔ انسانی حقوق کی تنظیمیں بھی خاموش ہیں۔

اقوام متحدہ کہتی ہے کہ یہ روس کا اندرونی معاملہ ہے جس میں وہ کوئی مداخلت نہیں کر سکتی۔ حالانکہ روس نے چیچنیا کے ساتھ ایک معاہدہ پر دستخط کر کے اسے متنازع علاقہ تسلیم کیا ہوا ہے۔

اس معاملے میں اسلامی ممالک کی خاموشی انتہائی تکلیف دہ ہے۔ ہادیٔ اعظم ﷺ نے فرمایا تھا کہ اس امت کی مثال ایک جسم کی ہے جس کا ایک حصہ تکلیف میں ہو تو سارا جسم تکلیف میں اس کے ساتھ جاگتا ہے۔ آج اس جسم کے کئی حصے کراہ رہے ہیں۔ لیکن عالم اسلام کا سکوت ہے کہ ٹوٹنے میں نہیں آتا۔

اقلیتی طبقہ کے جذبات مجروح

بنگلور: (پی ٹی آئی) ایک اخبار میں شائع شدہ متنازعہ مضمون جس کے نتیجہ میں اقلیتی طبقہ کے مذہبی جذبات مجروح ہوئے ہیں، ۳۰۰۰ سے زائد افراد نے احتجاجی مظاہرہ کیا۔ اس دوران برہم ہجوم پر قابو پانے کے لیے پولیس نے اشک آور گیس کا استعمال کیا اور لاٹھی چارج بھی کیا۔ ہجوم نے "دی نیو انڈین ایکسپریس" اخبار کے دفتر پر سنگ باری کی۔ اخبار مذکور میں کل ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ برہم ہجوم کا کہنا ہے کہ یہ مضمون اشتعال انگیز ہے اور اس کے نتیجہ میں اقلیتی طبقہ کے مذہبی جذبات مجروح ہوئے ہیں۔ سٹی پولیس کمشنر ٹی ڈیال نے پی ٹی آئی کو بتایا کہ سات تا آٹھ

طرف توجہ کرائی ہے اس لئے آپ کے حکم پر بندۂ ناچیز حاضر ہے۔ مارچ کے شمارے سے وی پی سے ارسال فرمائیں۔ میں چھڑالوں گا۔ یا کہیں تو رقم ارسال کر دی جائے۔ آپ کے حکم کا منتظر ہوں اور حلقۂ احباب میں سے بھی گزارش کروں گا کہ کارِ ثواب بھی ہے اور راہِ نجات بھی ہے۔ کیونکہ ھدیٰ ہادیٔ اعظم ﷺ کا آئینہ ہے اس کا ہر گھر میں ہونا لازمی ہے۔

حقیر فقیر محتاجِ دعا
ثمر ماچوی۔ جمشید پور

مکرمی!
مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی کی وفات ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ ان کی ذات والا صفات کا ثانی ملنا اس دور میں بہت مشکل ہے۔ ان کے چلے جانے سے ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جسے پر کرنا ناممکن ہے۔ مولانا کے انتقال سے ملک ممتاز دانش ور، ماہر اسلامیات و ادب عربی اور ہماری مشترکہ تہذیب کے ایک علمبردار سے محروم ہو گیا ہے۔ ان کی رحلت اسلامی دنیا اور پوری انسانیت کے لئے ایک بڑا سانحہ ہے۔ ان کی تالیفات اور خطبات نے پوری دنیا کے لوگوں پر اثر ڈالا انہوں نے اسلام اور اسلامی تاریخ کو جس انداز میں اس دور میں متعارف کرایا وہ ہماری علمی تاریخ کا ایک انتہائی درخشاں باب ہے۔ مولانا کی ذات سے عالم اسلام میں ہندوستان کا وقار قائم تھا۔ مولانا مرحوم ہندوستان اور عرب ممالک کے درمیان ایک پل کا کام کرتے تھے وہ ایک سچے محب وطن تھے۔ اور ہماری مشترکہ تہذیب میں یقین رکھتے تھے۔ انہوں نے ہندوستانی طیارہ کے اغوا کو ایک غیر اسلامی فعل قرار دیا تھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ انسانی قدروں کے علم بردار تھے۔ علامہ اقبال کے کلام کے ترجمے غیر ملکی زبانوں میں ان کے انتقال کے بعد ہوئے جب کہ مولانا کے سیکڑوں مضامین ان کی زندگی میں ہی دوسری زبانوں میں ترجمہ ہو کر شائع ہوئے۔ حضرت مولانا جہاں ایک منفرد اسلوب نگارش کے حامل، عربی ادب کے انشا پرداز، تاریخ و سیرت کا وسیع و ہمہ گیر مطالعہ رکھنے والے ایک متدین عالم دین اور صاحب نسبت بزرگ تھے وہیں وہ ایک جہاں دیدہ متحمل اور بردبار رہنما بھی تھے۔ مولانا نے اپنی پوری زندگی اسلام کی ترویج واشاعت، آپسی بھائی چارہ اور قومی یکجہتی کے لیے وقف کر دی تھی۔ مولانا مرحوم کے علمی و ادبی کارناموں کا ایک طویل سلسلہ ہے جس کا اعتراف مختلف موقع پر عظیم ترین علمی وادبی اعزازات کی شکل میں کیا گیا۔ مولانا کی تصانیف بالخصوص "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" "سیرت سید احمد شہید" نیز اسلامی تاریخ پر ان کی مشہور کتاب "تاریخ دعوت و عزیمت" نے غیر معمولی شہرت و مقبولیت حاصل کی۔

سید راحت حسین
انصاری روڈ دریا گنج دہلی

میں پریشانی دور ہونے کا عمل حضرت خواجہ غریب نوازؒ فرماتے ہیں۔ قرآن شریف کی آیات جو کہ سورہ فتح کی آیت ۴ هوالذی انزل السکینة فی قلوب المومنین ...... وکان الله عزیزاً حکیما۔ آپ نے اس میں عزیزاً کی جگہ الیما لکھا ہے۔ یہ غلط ہے اسے درست کر لیجئے۔

۲۔ ماہ جنوری ۲۰۰۰ء کے ھدیٰ میں صفحہ ۵۳۰ تحریر مولانا نذیر احمد کی "حضرت علی کرم اللہ وجہہ" شروع دعوت پر لبیک کہا اور ایمان قبول کر لیا۔ مردوں میں سب سے پہلے حضرت ابو بکر صدیقؓ نے خواتین میں سب سے پہلے حدیجۃ الکبریٰؓ نے غلاموں میں سب سے پہلے حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ نے۔ اس جگہ بچوں میں یا کم عمر میں لکھنا موزوں تھا۔ آپؐ کے ہم سب غلام ہی ہیں مگر حضرت علیؓ بچے تھے جبکہ اسلام لانے میں آپ کا پہلا درجہ تھا۔ میرا آگاہ کرنا صحیح ہے یا غلط معافی چاہتا ہوں مجھے زیادہ علم نہیں آپ سے کم ہے جو لکھا ہے اسے صحیح کیجئے معلوم کریں۔

حاجی احمد کے قاضی
علی خانہ، گنور (مہاراشٹر)

دعائے مغفرت کی درخواست

محترمی ایڈیٹر صاحب۔ السلام علیکم

عرض تحریر ہے کہ ہمارے والد محترم جناب حاجی حافظ عبد القیوم صاحب ۱۳ رمضان المبارک مطابق ۲۲ دسمبر ۱۹۹۹ء بروز بدھ قضائے الٰہی سے اس دار فانی سے دار البقا کو رحلت کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب پاکؐ کے صدقے میں ان کی مغفرت فرمائے، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔ آمین اور ہم سب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ پسماندگان

عبد الباری، عبد الغفار و جملہ برادران
حافظ عبد القیوم بک سیلر
گلی لنگر خانہ، درگاہ اجمیر شریف۔

کارِ ثواب اور راہِ نجات

قابل صد احترام صدیقی صاحب۔ سلام محبت مزاج گرامی!

امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔

تازہ شمارہ میں اہلِ سنت کے لیے "امام اعظم نمبر" کا اعلان سن کر روحانی مسرت ہوئی وقت اہم مسئلہ ہے حال ہی میں احمد آباد میں اہلِ سنت ایک جلسہ تھا جس میں کانپور سے پوری ٹرین بک ہو کر گئی تھی۔ "دعوت اسلامی" عروج پر ہے علماء نے مجھے خاص ہدایت فرمائی ہے کہ دعوت اسلامی پر آپ نظم لکھیں اس کی کیسٹ قوال حضرات سے کرائیں اس کی تبلیغ بہت ضروری ہے اس لئے ایک نظم حاضر ہے امید ہے کہ اس نظم سے ھدیٰ کے نمبر میں چار چاند لگ جائیں گے۔ اور عوام الناس میں مقبولیت حاصل کرے گا۔ حالانکہ آپ حضرات نے برابر خاص نمبروں میں جگہ عنایت فرمائی ہے۔ قبلہ والد محترم کے زمانے ہی سے ذرہ نوازی کا ثبوت آپ لوگ دیتے رہے۔ یہ محبت ہے ذرہ نوازی ہے۔

آپ نے تازہ شمارے میں خریداری کی

آتے رہے۔ بختیار کاکیؒ کے استاد جن کا مزار ان کے درگاہ کے دروازے کے پاس ہی ہے۔ درگاہ کلیم اللہؒ میں بھی ایک خاندان بزرگ کا مدفن ہے جو حضرت کلیم اللہؒ کے استاد تھے۔ اس کے علاوہ شاہجہاں بادشاہ نے عرب سے تین سید خاندان کے بزرگ بلوائے تھے جن میں سے ایک ہمارے جد امجد تھے جن کو قاضی القضاۃ کا عہدہ یعنی چیف جسٹس آف انڈیا بنایا گیا تھا۔ میرے والد سید محمد جعفری اور آپ کے والد کے اچھے مراسم تھے۔ میں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ اوکھلا سے B.A کیا اس کے بعد منسٹری آف ہوم آفیسرز میں ملازم ہو گیا پھر میں نے اپنی پوسٹنگ DESU میں کرالی تھی اور یکم اکتوبر ۱۹۹۸ء کو I.P.STATION سے ریٹائرمنٹ لے لی۔

کل میں آپ کا مارچ ۹۹ کا شمارہ دیکھ رہا تھا اس میں ''اپنی باتیں'' میں آپ نے مشائخ، پیرزادگان اور مولوی صاحبان کے سیاست میں شرکت پر اعتراض کیا ہے اور سیاست چھوڑ کر حصارِ دین میں داخل ہونے کا مشورہ دیا ہے۔

اس سلسلے میں میری ایک عرض ہے کہ اس میں آپ کو مغالطہ ہوا ہے۔ اگر آپ قرآن و حدیث پر غور کریں تو آپ کو بالکل واضح ہو جائے گا کہ اللہ اور رسول ﷺ نے دین اور دنیا کو الگ الگ خانوں میں تقسیم نہیں کیا ہے۔ انگلینڈ امریکہ دین اور دنیا کو الگ الگ کرنا چاہتے ہیں تو یہ اسلامی احکام کی کھلی خلاف ورزی ہے۔ اسلام مسلمانوں کو تارک دنیا نہیں بناتا۔ بلکہ رسولؐ کی زندگی سے صاف ظاہر ہے کہ تمام دنیاوی کام اسلام کے اصولوں کے مطابق انجام دیئے جائیں۔ یہ نظریہ کہ دین صرف روزہ نماز حج زکوٰۃ ہی ہے غلط ہے بلکہ سونا جاگنا شادی بیاہ وغیرہ تمام دنیاوی کام اگر اللہ اور رسولؐ کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق انجام دیئے جائیں تو یہ تمام کام عبادت ہی میں شمار ہوں گے۔ ہمارے علماء کی اس غفلت کے نتیجہ میں ہم آج کا معاشرہ تباہی کی طرف جاتا صاف طور پر دیکھ رہے ہیں۔ ہمیں اس نظریے کو درست کرنا ہوگا اور امریکہ کے حکم کی پرواہ کئے بغیر صحیح اسلامی اصولوں پر گامزن ہونا ہوگا۔

اسی طرح امریکہ کے حکم کے مطابق تمام دنیا کے علماء کرام نے بے چون وچرا فیملی پلاننگ کو جائز بنا دیا۔ حالانکہ اس سلسلے میں بھی اللہ اور رسول نے صاف طور پر بتا دیا ہے۔ میرے والد نے شاہی امام عبد اللہ بخاری صاحب سے فیملی پلاننگ جائز کا فتویٰ واپس کرا کے خود بھی مسز اندرا گاندھی کو اس بارے میں واضح کرا دیا تھا کہ آپ سے ان معاملات میں بہت ہی احتیاط کی ضرورت ہے۔ گستاخی کی معافی چاہتا ہوں۔ زیادہ طوالت کے ڈر سے مختصر کر دیا ہے۔

آپ کا خیر اندیش

عزیز جعفری۔ کوچہ چیلان دریا گنج۔ دہلی

محترم جناب احمد صدیقی راہی صاحب

السلام علیکم

۱۔ آپ کی خدمت میں میں عرض ہے کہ ماہ نومبر ۱۹۹۹ء کے ھدیٰ میں صفحہ ۷ ۱۴ کے کالم

میں نے ایک آدمی کے پاس دیکھا تھا جس نے مجھے دینے سے انکار کر دیا۔ میں چاہتا ہوں کہ مجھے اس کی ایک کاپی دستیاب کر دیں ممنون ہوں گا۔

فقط دعاگو

ثاقب کریمی (بہار)

(نوٹ: اب یہ نمبر نایاب ہے)

امام اعظمؒ کا یوم ولادت

محترم ومکرم مدیر اعلیٰ احمد مصطفیٰ صدیقی راہیؔ مد ظلہ............ سلام مسنون

امید کہ آپ کارکنان اسلامی ڈائجسٹ ھدیٰ بفضل ربی بخیر و عافیت ہوں گے۔ گزارش ہے کہ بتاریخ ۲۹ جنوری سرور یہ ایکسپریس سے جب بڑودہ جنکشن پہنچا تو بک اسٹال سے ماہنامہ ھدیٰ فروری ۲۰۰۰ء کا حاصل کیا اور رتلام جنکشن تک اس کا مطالعہ بڑی محویت اور انہماک سے کرتا رہا۔ اسی میں صفحہ ۱۴۔۱۵ پر امام اعظم نمبر کا اشتہار نظر آیا۔ چونکہ مارچ کے پہلے ہفتے میں یہ نمبر شائع ہو ہی جائے گا۔ اس حقیر نے ان کے متعلق ان کی حیات پر کتابیں دیکھیں تو صحیح تاریخ ولادت معلوم نہیں ہو سکی۔ عرض ہے کہ کیا اس نمبر میں امام صاحبؒ کی ولادت باسعادت کی تاریخ ہو گی کہ کس ماہ میں آپ جلوہ افروز ہوئے۔ چونکہ آپ کی ولادت کا سن ۸۰ ہجری تو ملتا ہے مگر کس ماہ میں کون سی تاریخ میں آپ کی ولادت ہوئی یہ میرے مطالعے میں دیکھنے میں نہیں آئی۔ کلینڈر میں آپ کی وفات ۲ شعبان ملتی ہے مگر ولادت کی تاریخ کسی کلینڈر میں نہیں ملتی۔ بعض علماء اہل سنت یہی وعدہ کرتے ہیں مگر آج تک منتظر ہوں۔ کسی تاریخ سے آگاہ نہیں کرتے۔ اگر آپ کے اس نمبر میں مستند حوالے سے تاریخ ولادت کہ کس تاریخ میں آپ اس دنیا میں تشریف لائے وہ صحیح تاریخ اور کس ماہ میں آپ کی ولادت ہوئی اس کا نام اور وہ ساعت اگر اس نمبر میں مستند ہو تو مجھے جواب سے محروم نہ رکھیں۔ اور جلد سے جلد آگاہ فرمائیں تاکہ میں بذریعہ منی آرڈر اس کا خریدار بن سکوں۔ اور ھدیٰ جیسے ماہنامہ کا سالانہ خریدار بھی۔ اس ماہنامہ میں ”حمد باری“...... ضیاء صاحب، ”نعت شریف“...... مرزا حدید صاحب، ”ہم کون تھے اور کیا ہو گئے“...... صدرالدین صدر صاحب کے تمام اشعار بہت ہی پسند آئے۔ علاوہ اس کے سائنس سے معلوماتی مضامین بھی باعث تسکین قلب و روح ہوئے۔ بے عمل مسلمانوں کو باعمل بنانے کا بہترین اصلاحی پیغام ہے کاش آج کا کلمہ پڑھنے والا اس پر عمل کرنے کی سعادت حاصل کر لے۔ کیونکہ عمل ہی سے بنتی ہے، یہ خاکی ان کی فطرت میں۔ فقط

نیاز مند ڈاکٹر محب...... رتلام

حصارِ دین میں داخلے کا مشورہ

جناب احمد مصطفیٰ صدیقی صاحب،
مدیر اعلیٰ ھدیٰ اسلامی ڈائجسٹ
السلام علیکم

پہلے میں اپنا تعارف کرا دوں۔ ہمارے خاندانی بزرگ وقتاً فوقتاً مختلف ادوار میں ہندوستان

اپنی لمبی عمر صرف کر کے حاصل نہ کر سکتا تھا وہ مجھے چند گھنٹوں میں حاصل ہو گئی۔ اللہ آپ کو مزید ترقیات سے نوازے اور آپ کی مساعی جمیلہ کو قبول فرمائے۔ آمین

اب میں نے بھی ارادہ کر لیا ہے کہ میں بھی ھدیٰ کو ہر ماہ آپ کے پاس سے منگا کر پڑھوں۔ اس لیے رسالے کا سالانہ خریدار بننا چاہتا ہوں اس کے بعد یہاں کا ماحول دیکھ کر آپ کو مطلع کروں گا اگر آپ اس بندے کو یہاں کا ایجنٹ مقرر فرمادیں تو نوازش ہو گی۔

محمد غفران قاسمی

امام مسجد گورور، ضلع ہاسن (کرناٹک) ۵۷۳۱۲۰

ہر تشنہ لب کی تشنگی

قارئین ھدیٰ !السلام علیکم

ھدیٰ ڈائجسٹ ایک ایسا جریدہ ہے جس کی ہر سطر نوری کرن اور جس کا ہر لفظ روشن ستارہ ہے اور کیوں نہ ہو یہ سید کونین ﷺ کے مشن کو عوام تک پہنچانے کا ذریعہ ہے۔ یہ ہم سب کا پسندیدہ شمارہ ہے اور ہم سب قارئین اس کی بہتری، ترقی اور روشن مستقبل کے لیے دعا گو ہیں۔ اس کی تحریریں کبھی بھی اپنی افادیت نہیں کھوتیں۔ شمارہ نیا ہو یا پرانا اس کی تازگی برقرار اور اس کی فیض جاری ہے۔ قارئین کرام ھدیٰ ڈائجسٹ کو دعوتِ فکر دی جاتی ہے کہ آیئے اس جریدے کی جو ہمارا اپنا محبوب ہے خدمت کے لیے عملی کوشش کریں۔

صرف ستر پیسے روزانہ کی بچت سے بھی بہترین خدمت کی جا سکتی ہے۔ مہینے کے بیس روپے بچا کر ہم ایک شمارہ خرید کر کسی مستحق کو عطیہ کر سکتے ہیں۔ طلبہ و طالبات اس ضمن میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ سگریٹ نوش حضرات سگریٹ کا پیکٹ خریدتے وقت ایک سگریٹ کے پیسے بچا کر اس عظیم صدقۂ جاریہ میں شرکت کر سکتے ہیں۔ آپ ذرا غور کریں آپ کے سگریٹ کے دھوئیں کا کش آپ کے جسم کو بھی نقصان پہنچاتا ہے، آپ کے مال کے زیاں کا سبب بھی ہے اور دوسرے لوگوں میں بیماریاں بھی پھیلاتا ہے۔ ہو سکتا ہے آپ کے ایک سگریٹ کی قربانی سے ھدیٰ ڈائجسٹ کا پاکیزہ پیغام دوسروں تک بھی پہنچ جائے۔

نثار احمد چشتی

ذاکر نگر، نئی دہلی

فہم قرآن اور فہم حدیث

مکرمی...... سلام مسنون

ھدیٰ کا فہم قرآن نمبر کے بعد فہم حدیث نمبر بھی بہت عمدہ ہے۔ ایسی کتابیں بہت کم ہی ملتی ہیں۔ یقیناً آپ بہت محنت کے بعد یہ سب کر پائے ہیں۔ اس کے لیے آپ کو بہت لوگوں کی دعائیں ملتی ہیں۔ میں بھی دعا گو ہوں کہ خدا آپ کی عمر دراز کرے۔ تقریباً بیس یا پچیس سال قبل مجھے ٹھیک سے یاد نہیں آپ کی طرف سے قریب ۵۰۰ صفحات پر مشتمل "اقبال نمبر" شائع ہوا تھا
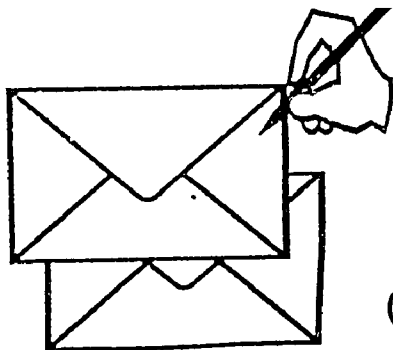
سبق آموز تحریریں

جناب مینیجر صاحب!......سلام مسنون
ھدیٰ ڈائجسٹ کا پہلا تعارف ماہ اکتوبر ۱۹۹۹ء میں ہوا۔ یہ شمارہ پڑھ کر میں یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہو گیا کہ یہ رسالہ شروع سے لے کر آخر تک قابلِ تحسین ہے۔ کیونکہ اس کے تمام مضامین اور تحریریں سبق آموز ہیں۔ میں محترم راہی صاحب کو داد دیتا ہوں اور میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ راہی صاحب کی عمر دراز کرے اور ھدیٰ ڈائجسٹ مزید ترقی کرے۔ آمین

مظہر حسین.........نگینہ

ھدیٰ کے قارئین سے

ھدیٰ ڈائجسٹ کے قارئین سے میری گزارش ہے کہ وہ اس پرچہ کو پڑھے لکھے اور باشعور لوگوں میں متعارف کرائیں۔ یہ بندہ ناچیز ان قارئین کرام کو دل سے دعائیں دے گا کیونکہ یہ ایسا رسالہ ہے جس کے ذریعے نوجوانوں میں علمی، تخلیقی اور تعمیری شعور بیدار کیا جا سکتا ہے۔ مسلمان بھائیوں کو دین و دنیا میں کامیابیاں حاصل ہو سکتی ہیں اور لوگ مثبت طرزِ فکر پر گامزن ہو سکتے ہیں۔

محمد قاسم رضا.........سنبھل

ھدیٰ پڑھ کر تشنگی دور ہو گئی

مکرم المقام قابل صد احترام حضرت مولانا حاجی احمد مصطفیٰ صدیقی راہی......دامت فیوضہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعدہ امید ہے کہ مزاج گرامی بعافیت ہونگے۔

میں دارالعلوم کا ایک معمولی فاضل ہوں اور کرناٹک صوبہ کے ہاسن ضلع میں ایک مسجد میں دین کی خدمت انجام دے رہا ہوں۔

تقریباً دس سال قبل آپ کے ماہنامہ ھدیٰ کو دیکھنے اور پڑھنے کا اتفاق ہوا تھا اس کے بعد یہاں آکر اپنے ایک عزیز کے پاس سے لے کر پڑھا تو مجھے ایسا لگا کہ مجھے ایک عرصے سے جس چیز کی تلاش تھی وہ مجھے مل گئی۔ ھدیٰ کو پڑھ کر میری علمی تشنگی دور ہو گئی۔ خصوصاً فہم حدیث نمبر، فہم دین نمبر پڑھ کر آپ کی علمی ذکاوت اور محنت و کاوش کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکا۔ میں جس چیز کو

حضرت علیؓ نے فرمایا

☆خدا تعالیٰ کی اطاعت اپنی جان پر جبر کرنے کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔

☆آدمی کے چہرے کا حسن اللہ تعالیٰ کی عمدہ عنایت ہے۔

☆انسان جو حالت اپنے لیے پسند کرتا ہے اسی حالت میں رہتا ہے۔

بڑے آدمی۔ طلسمی صاحب! آواز کی طلسم سے باہر نکلئے۔ عملی زندگی میں قدم رکھنے کے لئے بڑی جد و جہد کی ضرورت ہے۔ مقابلہ سخت ہے اور وقت کم۔ شادی کے بارے میں آپ نے بالکل صحیح سوچا ہے کہ شادی اسی وقت کرنا چاہیے جب انسان خود کسی قابل ہو جائے۔ آپ کی یہ مثبت سوچ اچھی ہے جہاں تک لڑکی کا تعلق ہے تو وہ بھی آپ کے معاملے میں سنجیدہ نہیں ہے اس نے بھی محض وقت گزاری کے لئے ٹیلی فون پر بات کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے اظہار عشق پر وہ خوب ہنسی گویا آپ کا تمسخر اڑایا اور دل میں یہ سمجھ کر خوش ہوئی کہ دیکھا کیسا بے وقوف بنایا۔

سات سال سے

سوال: میری بڑی بیٹی بیمار ہے۔ سر سے لے کر پیروں تک پورے جسم میں درد ہوتا ہے جب وہ گیارہ سال کی تھی تو ایک بار سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دائیں ٹانگ کی پنڈلی میں کھنچاؤ پیدا ہوا۔ کچھ عرصہ آرام رہا لیکن پھر وہی تکلیف شروع ہوئی۔ کئی معالجین کو دکھایا، بہت سے طبی امتحانات ہوئے لیکن کوئی مرض سامنے نہ آیا۔ پھر تمام جسم کے ساتھ سر میں بھی درد شروع ہو گیا۔ طرح طرح کے معالجین سے رجوع کیا لیکن تکلیف ختم نہ ہوئی۔ کسی عامل نے بتایا کہ بچی پر سخت قسم کا عمل کرایا گیا ہے۔ رات کو سوتے میں بچی کو دباؤ محسوس ہوتا ہے اور لگتا ہے کوئی شخص ہے لیکن چہرہ نظر نہیں آتا۔ ہم نے صدقہ و خیرات بھی دیا لیکن سات سال سے بچی کا وہی حال ہے۔ وہ پیر کی ایڑی پوری طرح زمین پر رکھ نہیں سکتی۔ کمر، پسلیوں، معدہ، سر، بازو اور ہاتھ کی انگلیوں میں درد رہتا ہے؟

جواب: اس بات کے امکانات قوی ہیں کہ مرض کی تشخیص نہیں ہو سکی ہے۔ اعصاب سے متعلق یا مختلف غدود اور ان کے کیمیاوی نظام میں عدم توازن سے بھی اس طرح کی علامات ظاہر ہو سکتی ہیں۔ کسی ماہر طبیب و معالج سے رجوع کریں اور تشخیص کا درست راستہ اختیار کیا جائے تو وجہ متعین ہو جائے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ روزانہ صبح سورج نکلنے سے پہلے کوئی شخص وضو کرنے کے بعد ایک مرتبہ یا ودود پڑھ کر سیدھے ہاتھ پر دم کر کے بچی کے سر پر پھیر دے۔ اس طرح سات بار کیا جائے۔ رات کے وقت اسم ذات اللہ پڑھ کر انگشت شہادت سے بچی کے سر پر لکھ کر دم کر دیا جائے۔ یہ عمل بھی سات بار کیا جائے۔ کئی ماہ ان وظائف پر کاربند رہیں۔

☆☆☆☆

اختلافات بڑھتے جا رہے ہیں۔ بھائیوں کا رویہ ہم بہنوں کے ساتھ بھی اچھا نہیں ہے۔ شادیوں کی جب بھی بات چلتی ہے تو کوئی نہ کوئی مخالف بن کر رخنہ ڈال دیتا ہے۔ میں نے میٹرک کے بعد ایف اے کا امتحان نہیں دیا۔ گھر میں اکثر خون کے چھینٹے اور نشانات پڑے دکھائی دیتے ہیں؟

جواب: لوبان کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر ایک سو ایک بار سورۂ فلق دم کر کے رکھ لیں۔ روزانہ عصر مغرب کے درمیان جلتے کوئلوں پر چند ٹکڑے ڈال کر پورے گھر کو دھونی دیں۔ یہ عمل چالیس دن کیا جائے۔ والد صاحب کو روزانہ پانی پر سو بار یا سلام دم کر کے پلائیں۔ سورۂ کوثر روزانہ رات کو سات بار پڑھ کر گھر کے چاروں کونوں کی طرف منہ کر کے دم کر دیا کریں۔

ناکامی ہی ناکامی

سوال: میرے بھائی کا مسئلہ یہ ہے کہ کام یا کاروبار شروع کرتا ہے اس میں ناکامی ہوتی ہے۔ کئی بار سرمایہ لگا کر کام شروع کیا لیکن نقصان ہی ہوا۔ کئی بار بیرون ملک جانے کی کوششیں کیں لیکن اس میں بھی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ اب یہ ہونے لگا ہے کہ جب بھی کوئی کام شروع کرنے کی تیاری کرتا ہے تو دو راستے سامنے آجاتے ہیں اور باہر جانے کے اسباب پیدا ہونے لگتے ہیں لیکن پھر معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔ بھائی اور ہم گھر والے فیصلہ کرنے سے عاجز ہو جاتے ہیں کہ کون سا راستہ اختیار کیا جائے۔ بھائی کی اپنی قوت فیصلہ بھی کمزور ہے؟

جواب: بھائی سے کہیں کہ وہ نماز عشا کے بعد یا نصف رات کے فوراً بعد چھیاسی مرتبہ بسم اللہ الواسع الودود پڑھ کر دونوں ہاتھوں پر دم کر کے ہاتھ چہرے پر پھیر لے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنے لئے فضل و کرم کی درخواست کیا کرے۔ اس وظیفے کو کم از کم دو ماہ تک پڑھا جائے۔

آوازوں کا طلسم

سوال: دو ماہ پہلے کی بات ہے کہ ایک سہ پہر لڑکی کا ٹیلی فون آیا۔ میری اس سے دوستی ہو گئی میں نے اس سے فون نمبر مانگا تو وہ ٹال گئی۔ ہم نے اب تک ایک دوسرے کو نہیں دیکھا ہے یکم دسمبر کو اس لڑکی نے پھر ٹیلی فون کیا تو میں نے ڈرتے ڈرتے اظہار محبت کر دیا جس پر وہ خوب ہنسی۔ اس دن کے بعد سے اس نے مجھے فون نہیں کیا۔ میں بہت پریشان ہوں مجھے اس کی آواز سن کر بڑا سکون ملتا تھا میں کامرس کا طالب علم ہوں اور میری خواہش ہے کہ میں اس وقت شادی کروں جب معاشرے میں کوئی بلند مقام حاصل کر لوں۔ آپ یقین کریں کہ میرے دل میں اس لڑکی سے شادی کرنے کی کوئی خواہش نہیں ہے بس اس کی آواز سننا چاہتا ہوں؟

جواب: آپ لڑکی سے کبھی ملے نہیں اسے دیکھا نہیں صرف چند بار ٹیلی فون پر آواز سنی اور ہوش و حواس کھو بیٹھے۔ بھئی یہ تو کوئی اچھی علامت نہیں۔ اگر یہی حال رہا تو پھر آپ بن چکے

قسم کا کفارہ

سوال : کئی مرتبہ قسم توڑی جائے تو ایک کفارہ دینا ہوگا یا کئی ؟

جواب : جتنی مرتبہ توڑی جائے اتنے ہی کفارے ادا کرنے ہوں گے۔

سوال : قسم کا کفارہ کس کو دیا جائے، کیا مسجد میں یہ رقم دی جاسکتی ہے ؟

جواب : کفارے کی رقم مسجد میں نہیں دی جا سکتی۔ کسی غریب مسکین کو یا کسی دینی مدرسے میں یہ رقم دے دی جائے۔

سوال : ایک کفارے کی کتنی رقم بنتی ہے ؟

جواب : ایک کفارے کی رقم پانچ سو روپے بنتی ہے۔

عاشقِ رسول

سوال : عاشقِ رسول کی کیا پہچان ہے ؟

جواب : حضور اکرم ﷺ کی تعلیمات پر پورے طریقے سے عمل پیرا ہو اس کا کوئی کام بھی سنت کے خلاف نہ ہو ہر کام میں وہ حضور ﷺ کی خوشنودی کو ملحوظ رکھتا ہو اور جن کاموں سے حضور ﷺ نے منع فرمایا ہے ان سے وہ بچتا ہو اپنی مرضی پر چلنے کے بجائے حضور ﷺ کی ہدایات کے مطابق زندگی بسر کرتا ہو ایسا شخص ہی عاشقِ رسول کہلا سکتا ہے۔

نماز پڑھتے وقت

سوال : ہمارے محلے کی مسجد میں آرائش کے لئے شیشے کا استعمال بہ زیادہ کیا گیا ہے۔ جماعت سے نماز پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے نمازی ایک دوسرے کو سجدہ کر رہے ہوں۔ کیا ایسی صورت میں نماز ہو جاتی ہے ؟

جواب : جی ہاں! نماز ہو جاتی ہے۔

حاملہ کو طلاق

سوال : ہم میاں بیوی میں جھگڑا ہو گیا اور اس نے شدت اختیار کر لی۔ اسی دوران میں نے اس کے سامنے تین مرتبہ طلاق کے الفاظ استعمال کئے۔ بیوی نے بتایا کہ وہ حمل سے ہے کیا ایسی صورت میں طلاق ہو گئی ؟

جواب : حاملہ عورت کو طلاق دی جائے تو طلاق ہو جاتی ہے اور تین طلاق کے بعد مصالحت کی بھی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔

پہلی کتابیں

سوال : قرآن شریف سے پہلے کی آسمانی کتابوں پر کیا اب بھی عمل کیا جاسکتا ہے ؟

جواب : قرآن شریف کے نزول کے بعد پچھلی تمام کتابیں منسوخ ہو چکی ہیں۔ اب ان پر عمل کرنا جائز نہیں۔ اب صرف قرآن شریف پر عمل کرنا ہوگا۔

خون کے قطرے

سوال : ہمارے گھر کے حالات کچھ ایسے ہیں کہ ہمیں جادو یا سحر کا شک قوی ہو گیا ہے۔ والد مستقل بیمار رہتے ہیں اور گھر کے لوگوں میں

کی روشنی میں آپ بتائیں کہ کیا اس نے دوسری شادی کر کے غلطی کی ہے یا اس کے بہن بھائیوں کی غلطی ہے کہ انہوں نے اس کی دوسری شادی کیوں نہ کی؟

جواب: بیوہ کو دوسری شادی کرنے کی اسلام نے اجازت دی ہے بلکہ تلقین کی ہے کہ بیوہ کو گھر میں نہ بٹھا کر رکھا جائے بلکہ جیسے ہی کوئی رشتہ آئے اس کی جلد سے جلد شادی کر دی جائے۔ مذکورہ صورت میں غلطی بیوہ بہن کی نہیں ہے بلکہ اس کے بھائی بہنوں کی ہے جنہوں نے آٹھ سال تک اس کو گھر بٹھائے رکھا اور اس کی دوسری شادی نہیں کی اب اگر اس نے اپنی دوسری شادی کہیں باہر کر لی ہے تو اس میں اس کی کوئی غلطی نہیں اس نے صحیح قدم اٹھایا ہے۔

سر ہلکا ہو گیا

سوال: میری عمر ۱۸ سال ہے۔ سات ماہ سے میرا وجود ہلکا ہو چکا ہے سر بھی ہلکا ہو جاتا ہے۔ پہلے میرے سر اور بدن کا وزن تھا۔ پھر میں نے ایک وظیفہ کیا اس میں گوشت کھا لیا اس میں حیواناتی پرہیز تھا۔ مرشد عامل نے اس کا توڑ تو کر دیا مگر اثر الٹا ہو گیا؟

جواب: بھائی! آپ کس چکر میں پڑ گئے ہیں۔ کسی اچھے اسکول میں داخلہ لے کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی کوشش کیجئے اور قرآن کریم کو ترجمہ کے ساتھ پڑھیں۔ پانچوں وقت کی صلوٰۃ کا باجماعت مسجد میں جا کر اہتمام کریں۔ صبح خالص عمدہ مکھن بادام کھائیں۔

کامیابی کی منزل

سوال: میں بہت کچھ کرنا چاہتا ہوں اور اپنا ایک مقام بنانے کا خواہش مند ہوں لیکن سوچنے اور منصوبہ بنانے کے باوجود عمل کے میدان میں نتائج اچھے نہیں۔ ذہن کسی ایک کام کو لگ کر کرنے میں حائل ہو جاتا ہے اور بے دلی سی طاری ہو جاتی ہے۔ میں جلد کامیابی کی منزلیں طے کرنا چاہتا ہوں لیکن کامیابی مجھ سے دور ہے۔ امید ہے کہ کوئی ایسی دعا یا اسم بتائیں گے جس کی برکت سے میرا کام آسان ہو جائے؟

جواب: آپ اپنی زندگی میں خیال و عمل میں توازن پیدا کریں۔ بہت زیادہ سوچنے اور توقعات قائم کرنے سے گریز کریں اور حقیقت پسندی کو ملحوظ رکھیں۔ کثرت سے یاحی یاقیوم کا ورد کیا کریں۔ بفضل خدا کثیر فوائد حاصل ہوں گے۔

نماز میں کوتاہی

سوال: لڑکپن میں نماز کا بیحد شوق تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ نماز کی ادائیگی میں کمزوری آگئی اور نماز ترک ہونے لگی۔ آئے دن عزم مصمم کرتا ہوں کہ کل سے نماز شروع کروں گا لیکن کل کبھی نہیں آتی۔ ذہن و دماغ پر ایک پریشانی سی طاری رہتی ہے اور کسی کام میں دل نہیں لگتا اکثر بنے بنائے کام بگڑ جاتے ہیں؟

جواب: نماز عشا کے بعد اکتالیس بار اول و آخر درود شریف کے ساتھ آیت کریمہ کا ورد کریں۔ وظیفے کی مدت نوے دن ہے۔

میں کوئی فرق نہیں آتا۔

سوال : کچھ لوگ ہاتھوں میں رسیدی کتابیں لیے لوگوں سے پیسے مانگتے پھرتے ہیں اور غیر مسلموں کے پاس بھی چلے جاتے ہیں۔ کیا یہ طریقہ ٹھیک ہے؟

جواب : یہ طریقہ اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔

زوال کا وقت

سوال : کیا رمضان شریف میں بھی جبکہ شیطان کو قید کر دیا جاتا ہے زوال کا وقت ہوتا ہے؟

جواب : جی ہاں! زوال کا وقت رمضان میں بھی ہوتا ہے اس کا تعلق شیطان سے نہیں ہے۔

سوال : نماز جمعہ کے دو فرضوں کے بعد بھی کیا چار فرض پڑھنے ہوتے ہیں؟

جواب : جمعہ کے دن نماز جمعہ کے صرف دو فرض ہیں اس کے بعد چار فرض پڑھنے کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

شریعت کیا کہتی ہے

سوال : رشتہ دار لڑکی کے ساتھ شادی کرنا زیادہ بہتر ہے یا غیروں میں شادی کرنا زیادہ بہتر ہے؟ شریعت کیا کہتی ہے؟

جواب : دونوں میں سے جو لڑکی زیادہ دیندار ہو اس کے ساتھ شادی کرنا زیادہ بہتر ہے۔

معاف شدہ مہر

سوال : شادی کے بعد عورت اپنا مہر معاف کر دے تو کیا طلاق کی صورت میں مہر اس کو ملے گا؟

جواب : مہر معاف کر دینے کی صورت میں طلاق ہونے پر مہر ادا نہیں کیا جائے گا۔

سوال : کیا نجومی کو ہاتھ دکھانا صحیح ہے؟

جواب : اسلام نے اس سے روکا ہے۔

قضا نمازیں اور توہمات

سوال : جان بوجھ کر نماز قضا کرنا کیسا ہے؟

جواب : صحیح نہیں، نماز کو اس کے وقت پر پڑھنا چاہیے۔

سوال : مختلف رسوم مثلاً شام کے وقت جھاڑو دینے سے منع کیا جاتا ہے اس کی کیا حقیقت ہے؟

جواب : یہ محض توہمات ہیں۔ اسلام نے اس طرح کی کوئی پابندی نہیں لگائی ہے۔

سود کی رقم کا استعمال

سوال : کسی شخص کو اس کی جمع شدہ رقم پر بینک کی طرف سے سود ملتا ہے تو وہ اس رقم کا کیا کرے؟

جواب : وہ رقم بینک سے لے لے اور بغیر ثواب کی نیت کے کسی غریب محتاج کو دے دے۔

بیوہ بہن

سوال : ہماری بہن بیوہ ہونے کے بعد آٹھ سال تک بیٹھی رہی تو گھر والوں نے اس کی دوسری شادی کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا، بالآخر اس نے خود ہی باہر والوں سے شادی کر لی کتاب و سنت

آپ پوچھیے ہم جواب دیں گے، کسی بھی سوال پوچھنے والے کا نام و مقام شائع نہیں کیا جائے گا

تعلیمی ترقی

سوال : تعلیمی ترقی کے لیے وظیفہ اور دعا بتا دیجیے؟

جواب : قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کی محنت کو ضائع نہیں کرتا اس لیے خوب محنت توجہ اور لگن کے ساتھ اپنی تعلیم کی طرف توجہ دیجیے اور اپنا وقت دوسرے کاموں میں ضائع نہ کیجیے، نماز پابندی سے ادا کی جائے اور ہر نماز کے بعد اللہ تعالیٰ سے اپنی کامیابی کے لیے دعا کیا کیجیے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اعلیٰ درجے کی کامیابی سے نوازے گا۔ ہماری دعائیں بھی آپ کے ساتھ ہیں۔

عورت کا ذبیحہ

سوال : کیا عورت جانور ذبح کر سکتی ہے اور کیا اسلامی تاریخ میں اس کی کوئی مثال موجود ہے؟

جواب : جی ہاں! عورت جانور ذبح کر سکتی ہے۔ حضور اکرم ﷺ کے زمانہ اطہر میں خود امہات المومنینؓ میں سے بعض نے قربانی کے جانور ذبح کیے۔

نکاح خواں

سوال : کیا کوئی عورت کسی جوڑے کا نکاح پڑھا سکتی ہے؟

جواب : کتاب و سنت کی روشنی میں اس میں کوئی ممانعت نہیں بلکہ اگر نکاح پڑھانے والا مرد یا عورت کوئی بھی نہ ہو اور چند لوگوں (گواہوں) کی موجودگی میں لڑکا اور لڑکی آپس میں ایجاب و قبول کر لیں تو نکاح ہو جاتا ہے۔ خطبہ نکاح سنت ہے۔

لوگوں سے مانگنے والے

سوال : ایک شخص دوسرے لوگوں سے کہتا ہے کہ یہ میری بیوی ہے۔ میری ماں ہے میری بہن ہے۔ سب کچھ یہی ہے تو ایسی صورت میں شرعی مسئلہ کیا ہے؟

جواب : یہ سب لغو کلام ہے۔ ایسی باتوں سے آدمی کو بچنا چاہیے مگر بہر حال اس سے نکاح

اگر اس کے آدمی مزاحمت کریں تو جنگی کارروائی کرنا اور مدد کی ضرورت ہو تو مجھے اطلاع دینا۔ دراصل مہدی علوی کا حکم یہ تھا کہ حسن بن صباح کو گرفتار کر کے لے آنا۔

عابد جبیبی نے پہلے دوستانہ انداز اختیار کیا تھا۔ اس نے حسن بن صباح کو ایسے انداز سے امام کہا تھا جیسے اس نے دل کی گہرائیوں سے اسے امام تسلیم کر لیا ہو لیکن حسن بن صباح نے اس کے ساتھ جانے کی بجائے یہ کہہ دیا کہ پہلے امیر شہر اس کے پاس آئے تو عابد جبیبی نے یوں محسوس کیا جیسے امام نے اس کی اور اس کے امیر شہر کی عزت افزائی کی ہو۔

عابد جبیبی کا ارادہ تو یہ تھا کہ حسن بن صباح نے اس کے ساتھ جانے سے انکار کیا تو وہ اسے گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے جائے گا لیکن وہ جان نہیں سکا تھا کہ حسن بن صباح نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالی تھیں اور اسی میں سارا راز تھا۔ عابد جبیبی اپنی آنکھوں کو حسن بن صباح کے زیرِ اثر تھا۔ یہ تو ہر مؤرخ نے لکھا ہے کہ حسن بن صباح کے بولنے کا انداز ایسا تھا کہ سننے والے پر سحر کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی اور اس کا استدلال خالصتاً فریب کاری پر مبنی ہوتا تھا لیکن اچھے خاصے دانشور بھی اس کے فریب میں آجاتے تھے۔

عابد جبیبی سدھائے ہوئے جانور کی طرح اٹھا اور رخصت ہو گیا۔

(جاری ہے اگلے ماہ)

☆☆☆☆☆

کچھ بحثیں ہوئیں آخر مہدی علوی نے اپنا حکم سنایا۔
"پچاس سواروں کا ایک دستہ لے جاؤ"...... اس نے کہا...... "وہاں حسن بن صباح کے مرید اور معتقد بھی ہوں گے۔ تم ساتھ جاؤ۔ حسن بن صباح سے کہنا کہ وہ تمہارے ساتھ آجائے۔ نہ آئے تو اسے میرا حکم سنانا کہ تم زیر حراست ہو۔ ہو سکتا ہے اس کے مرید اور معتقد مزاحمت کریں۔ کوشش کرنا کہ خون خرابہ نہ ہو۔ ہونے کو وہاں بہت کچھ ہو سکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کچھ بھی نہ ہو۔ اگر معاملہ بگڑتا نظر آئے تو ایک سوار کو دوڑا دینا۔ میں اپنا تمام دستہ بھیج دوں گا۔ میں حسن بن صباح کو اپنے سامنے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

مہدی علوی کے حکم کی تعمیل فوری طور پر ہوئی مشیر پچاس سواروں کو ساتھ لے کر چلا گیا۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ یہ دستہ دن کے پچھلے پہر چلا تھا، رات کو حسن بن صباح کی خیمہ گاہ میں پہنچ گیا۔ وہاں اب لوگوں کا اتنا ہجوم نہیں تھا۔ انہوں نے حسن بن صباح کی زیارت کرلی تھی اور وہ چلے گئے تھے۔ پیچھے حسن بن صباح کے اپنے آدمی رہ گئے تھے۔

سواروں نے خیمے کو گھیرے میں لے لیا۔ حسن بن صباح اپنے مصاحبوں میں بیٹھا تھا۔ اس نے گھوڑوں کے ٹاپ سنے اور چونکا۔ اس کے مصاحبوں کے چہروں پر گھبراہٹ آگئی۔ پیشتر اس کے کہ حسن بن صباح کوئی حرکت کرتا یا کوئی حکم دیتا، مہدی علوی کا مشیر خیمے میں داخل ہوا اور جھک کر سلام کیا۔

"یا امام!"...... مشیر عابد حبیبی نے حسن بن صباح سے مصافحہ کر کے اور اس کے سامنے دوزانو بیٹھ کر کہا...... "امیر الموت مہدی علوی نے امام کے حضور سلام بھیجا ہے اور یہ عرض بھی کہ امام جنگل میں پڑے اچھے نہیں لگتے۔ اگر امام قلعے میں آجائیں اور کچھ دن یہاں رہ کر دیکھیں۔ اگر یہ جگہ پسند آجائے تو قلعے میں ہی رہیں۔
"کیا دعوت نامہ رات میں دیا جاتا ہے؟"...... حسن بن صباح نے عابد حبیبی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتے ہوئے کہا...... "اور کیا تمہارے ہاں مہمان کو محاصرہ میں لے کر اسے دعوت دی جاتی ہے؟"
"امیر شہر نے حکم دیا کہ ابھی روانہ ہو جاؤ"...... عابد حبیبی نے کہا...... ہم ایسے وقت روانہ ہوئے کہ یہاں بے وقت پہنچے۔ اگر آپ کے خیمے میں روشنی نہ ہوتی تو میں کل صبح آپ کے حضور حاضر ہوتا...... اور یہ سوار؟...... یہ ہمارے ہاں رواج ہے کہ مہمان کے لیے ہم گھوڑ سوار بھیجا کرتے ہیں۔ آپ کے لیے پچاس گھوڑ سوار لایا ہوں۔"

امیر شہر کو میرا سلام کہنا"...... حسن بن صباح نے کہا...... "اور ان کا شکریہ ادا کرنا پھر کہنا میں آؤں گا لیکن میں اپنے رواج کے مطابق آؤں گا۔ رواج یہ ہے کہ پہلے امیر شہر کم از کم ایک رات کے لیے مجھے میزبانی کا شرف عطا کریں گے پھر میں ان کے ساتھ ہی الموت چل پڑوں گا۔"
عابد حبیبی کو مہدی علوی نے حکم دیا تھا کہ حسن بن صباح کو اپنے ساتھ لے آئے اگر وہ نہ آئے تو اسے میرا حکم سنانا کہ تم حراست میں ہو۔

سفید بادل کی شکل کا دھواں بن کر اوپر اٹھا۔ تاریخ میں یہ سراغ نہیں ملتا کہ یہ بارود تھا یا سفوف یا سیال مادہ تھا۔ یہ تحریر ملتی ہے کہ اس وقت تک مسلمانوں نے بارود سازی اور کیمیاگری میں یورپ والوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ترقی کر لی تھی۔

چونکہ وہ علاقہ جنگلاتی تھا، سبزہ زار تھا اور رات تھی اس لیے فضا میں نمی زیادہ تھی۔ نمی کی وجہ سے دھواں فوراً اوپر نہیں اٹھا اور نہ جلدی بکھرا۔ اس میں جو رنگ تیر رہے تھے آئینوں یا دھات کی چمک دار چادروں سے اس طرح دھوئیں میں شامل کیے گئے تھے کہ ٹیکری کے پیچھے آگ جلا کر اس کی چمک منعکس کی گئی اور آئینوں وغیرہ کے آگے باریک رنگ دار کپڑے رکھے گئے تھے۔ تاریخ میں اس سے زیادہ تشریح اور وضاحت نہیں ملتی، ٹیکری کے پیچھے کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔

☆☆☆

قلعہ الموت وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس بلندی پر جہاں قلعہ تھا، ایک شہر آباد ہو گیا تھا۔ امیر الموت مہدی علوی کو اطلاعیں مل رہی تھیں کہ فلاں جگہ ایک قافلہ پڑاؤ کیے ہوئے ہے جس کا امیر کارواں ایک برگزیدہ شخصیت ہے۔ مہدی علوی کو اس بزرگ کے معجزے بھی سنائے گئے لیکن اس نے دھیان سے نہ سنے اور کوئی اہمیت نہ دی۔

مہدی علوی کو یہ تو پتہ ہی نہ چل سکا کہ حسن بن صباح کی تشہیر اور تبلیغ کی تیز و تند ہوا چلی ہے جس کا گزر الموت سے بھی ہوا ہے اور اس سے اس کا محافظ دستہ بھی متاثر ہوا ہے۔ یہ انتظام احمد بن عطاش کا تھا۔ مہدی علوی کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ حسن بن صباح نے بادل کے ٹکڑے میں سے اپنے ظہور کا جو ڈھونگ رچایا ہے، یہ الموت کے کچھ لوگوں نے بھی دیکھا ہے اور انہوں نے اسے برحق مانا ہے۔

"امیر عالی مقام!"...... مہدی علوی کو اس کے ایک مشیر نے پریشانی کے سے عالم میں کہا...... "ہم نے تو ادھر توجہ ہی نہیں دی تھی لیکن اپنے تمام لوگوں میں اور آپ کے محافظ دستے میں یہ عجیب و غریب خبر پھیل گئی ہے کہ امام حسن بن صباح بادل کے ایک ٹکڑے میں آسمان سے اترا ہے اور لوگ دھڑا دھڑ اس کی بیعت کر رہے ہیں۔"

"ہم یہی کر سکتے ہیں کہ اسے اپنے علاقے سے نکال دیں"...... مہدی علوی نے کہا...... "کسی مسلمان کو یقین نہیں کرنا چاہیے کہ کوئی امام یا کوئی نبی یا کوئی بزرگ آسمان سے اترا ہے۔ ہم نبوت پر یقین رکھنے والے مسلمان ہیں اور نبوت کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔"

"آپ نہ مانیں"...... مشیر نے کہا...... "میں بھی نہیں مانتا ہوں لیکن یہ صورت حال بڑی ہی خطرناک ہے کہ لوگوں نے بھی اسے سچ مان لیا ہے اور ہمارے سپاہیوں اور سواروں نے بھی...... امیر محترم! میں نے جو معلومات فراہم کی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کوئی نیا فرقہ بن رہا ہے، اسے یہیں پر ختم کر دیا جائے تو اچھا ہے۔"

ان دونوں میں کچھ دیر تبادلہ خیالات ہوا،

"میں تم میں سے ہوں" ...... حسن بن صباح نے کہا...... "مجھے جو کہنا چاہتے ہو کہہ لو، یہ سوچ لو کہ میرے راستے پر چلوگے تو رنج و آلام سے، مشکلات سے، مصائب سے، تنگ دستی اور بیماری سے محفوظ رہو گے۔ شیطان سے اور جنات سے محفوظ رہو گے۔"

"ہم نے تجھے مان لیا" ...... ایک آدمی بولا...... "امام بھی نبی بھی، کوئی معجزہ دکھا۔"

لوگوں کے ہجوم میں ایسا سناٹا طاری تھا جیسے وہاں کوئی ایک بھی انسان نہ ہو۔ یہ تقدس اور عقیدت مندی کی انتہا تھی کہ لوگ جیسے اپنی سانسوں کو بھی روکنے کی کوشش کر رہے ہوں کہ امام ناراض ہو جائے گا۔ ان کے کانوں میں جب کسی کی آواز پڑی کہ کوئی معجزہ دکھا تو سناٹا اور گہرا ہو گیا۔

"کیا یہ معجزہ نہیں جو تم نے دیکھا ہے؟" ...... حسن بن صباح نے کہا...... "اللہ مجھے جنت کے بادلوں کے ایک ٹکڑے پر سوار کر کے زمین پر اتارا ہے۔ کیا تم نے دیکھا نہیں کہ یہ بادل قوس و قزح کے رنگوں سے سجا ہوا تھا؟...... مجھے زمین پر اتار کر جنت کا بادل واپس چلا گیا ہے۔"

"ہم نے دیکھا ہے۔"...... بہت سی آوازیں اٹھیں۔

"بے شک ہم نے دیکھا ہے یا امام" اور بھی آوازیں اٹھیں۔

حسن بن صباح کو مشعل بردار ٹیکری سے اتار کر اس خیمے میں لے گئے جو کپڑے کی دیواروں اور کپڑے کی چھت کا خوشنما کمرہ تھا۔

اسی خیمے میں احمد بن عطاش سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ اور شاید احمد بن عطاش ابھی وہیں تھا۔

زیارت کے لیے آئے ہوئے ہجوم میں مختلف قبیلوں کے سردار اور دیگر سرکردہ افراد بھی تھے۔ اگلی صبح ان لوگوں نے حسن بن صباح کی بیعت کا سلسلہ شروع کر دیا۔

☆☆☆

کیا حسن بن صباح واقعی بادل کے ٹکڑے پر سوار ہو کر آسمان سے زمین پر آیا تھا؟ اس سوال کا جواب پہلے ایک باب میں دیا جا چکا ہے۔ حسن بن صباح کا پہلے بھی ایک پہاڑی پر "ظہور" ہوا تھا۔ پہاڑی کے پیچھے ایک غار میں آگ جلا کر اس کی چمک آئینوں پر ڈالی جاتی تھی۔ ان میں آئینے بھی تھے اور چمکتی ہوئی دھات کی چادریں اور ایسی چادریں بھی جن پر ابرق چپکایا گیا تھا۔ ایک آئینہ شاہ بلوط والے آئینے پر منعکس کی جاتی تو رات کو یوں لگتا تھا جیسے شاہ بلوط میں آسمان کے ستارے کی چمک رہے ہوں۔ سیدھے سادے پسماندہ لوگ اسے آسمان کے ستارے کی چمک سمجھتے رہے اور ایک روز اس شاہ بلوط کے ستارے کی چمک میں سے حسن بن صباح کا ظہور ہوا۔

اب ایک ٹیکری سے بادل اٹھا اور ٹیکری پر آیا۔ اس میں رنگ تیر رہے تھے اور اس میں سے حسن بن صباح نکلا۔ یہ بھی آگ، چمک دار دھات یا ابرق کی چادروں اور آئینوں کا کرشمہ تھا۔ ٹیکری کے پیچھے دامن میں پندرہ بیس گز لمبائی میں دہکتے انگارے پھیلائے گئے تھے اور ان پر دھواں پیدا کرنے والا بارود یا کوئی اور کیمیائی مادہ پھینکا گیا تھا جو

ہوئی ایک ٹیکری تھی او زیادہ اونچی نہیں تھی۔ پندرہ نہیں تو سترہ ہاتھ اونچی ہو گی۔ اس کی لمبائی ڈھائی تین فرلانگ تھی۔ اس کی ڈھلان پر اور اوپر بھی ایک دوسرے سے کچھ دور دور چھاتوں کی طرح پھیلے ہوئے اور لمبوترے بھی، درخت تھے۔

اس ٹیکری کے پیچھے ایک اور ٹیکری تھی جو اگلی ٹیکری سے زیادہ بلند تھی۔ ان کے دامن آپس میں ملے ہوئے تھے۔

لوگوں نے زمین سے اٹھتا ہوا جو بادل دیکھا تھا بلکہ دیکھ رہے تھے، وہ آگے والی کم بلند ٹیکری کے عقب سے اٹھ رہا تھا۔ یہ آگ کے دھوئیں کا بادل نہیں تھا۔ یہ بادل بادلوں کے ان ٹکڑوں جیسا تھا جو برسات کے بعد سر سبز پہاڑیوں سے نیچے آجاتے اور وادیوں میں منڈلاتے رہتے ہیں۔

وہ رات تھی اور رات کی تاریکی تھی لیکن بادل کا یہ دودھ جیسا سفید اور بہت بڑا ٹکڑا روشن تھا اور صاف نظر آرہا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس میں سرخ، سبز، نیلی اور پیلی روشنیاں تیر رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے قوسِ قزح کے رنگ بکھر کر اٹھکیلیاں کرتے پھر رہے ہوں۔

بادل ٹیکری پر آگیا اور آہستہ آہستہ فضا میں تحلیل ہونے لگا اور اس میں ایک آدمی کا ہیولہ نظر آنے لگا۔ اسکے بازو دائیں بائیں پھیلے ہوئے تھے۔

"لوگو!"...... بڑی ہی بلند آواز میں کسی نے اعلان کیا...... "بسم اللہ پڑھو۔ کلمہ طیبہ پڑھو اور سجدے میں چلے جاؤ۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے امام حسن بن صباح کو زمین پر اتار دیا ہے۔"

"جسے دشمن کے لشکر دیکھتے ہیں وہ واپس چلے جاتے ہیں اس کا ظہور ہو گیا ہے"...... کسی اور نے اعلان کیا۔

لوگ سجدے میں چلے گئے تھے۔

حسن بن صباح کے تین سو آدمیوں کے جہاں خیمے لگے ہوئے تھے وہاں سے جلتی ہوئی دس بارہ مشعلیں نکلیں جو ٹیکری پر چڑھ گئیں۔ ہوا ذرا تیز چل رہی تھی اس لیے بادل کا یہ ٹکڑا ایک طرف ہٹتا گیا اور فضا میں تحلیل ہوتے ہوتے غائب ہو گیا اور اس جگہ ٹیکری پر حسن بن صباح رہ گیا۔ جو بازو پھیلائے کھڑا تھا۔ وہ سبز رنگ کے چمکدار چغے میں ملبوس تھا۔ سر پر پگڑی اور اس پر اتنا بڑا سبز رومال پڑا ہوا تھا جس نے کندھے بھی ڈھانپ رکھے تھے۔

"سجدے سے اٹھو لوگو!"...... ایک اعلان ہوا...... "اور ٹیکری کے قریب آجاؤ۔"

لوگ اٹھ دوڑے۔ انہیں تلواروں اور برچھیوں سے مسلح کچھ آدمیوں نے ٹیکری کے قریب روک کر بیٹھ جانے کو کہا۔ دس بارہ مشعلوں کی روشنی میں لوگوں کو حسن بن صباح کا چہرہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔

"میں آگیا ہوں۔"...... حسن بن صباح نے بلند آواز سے کہا...... "اللہ سے یہ وعدہ لے کر آیا ہوں کہ ان مسلمانوں کو جو میرے دائرے میں آجائیں گے انہیں دنیا میں ہی جنت دکھا دی جائیگی۔ میں تم سب کے گناہ بخشوا آیا ہوں۔"

" اے اللہ کی طرف سے آنے والے!"...... لوگوں میں سے ایک نے پوچھا...... "ہم تجھے امام کہیں، نبی کہیں......"

اس پر چلو، دوسری راہوں پر نہ چلنا ورنہ وہ (شیطان) تمہیں میری راہ سے ہٹا کر تم میں تفرقہ ڈال دے گا۔"

ابو داؤد میں معاویہؓ بن ابی سفیانؓ کے حوالے سے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے کھڑے ہو کر فرمایا، خبردار ہو جاؤ، اہل کتاب جو تم سے پہلے تھے وہ بہتر فرقوں میں بانٹے گئے تھے، اور میری امت عنقریب ۷۳ فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ ان میں سے ۷۲ جہنم میں جائیں گے اور صرف ایک جنت میں جائے گا۔

داستان گو نے فرقوں کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ جب مسلمان اللہ کی اس سیدھی رات پر چلتے رہے جو اللہ کے رسول ﷺ نے دکھائی تھی تو وہ روحانی طور پر مطمئن اور مسرور رہے اور اللہ کی حکمرانی کرۂ ارض پر پھیلتی چلی گئی مگر جب فرقوں میں بٹ گئے تو وہ اپنی فطرت میں بے اطمینانی، تشنگی اور خلا سا محسوس کرنے لگے۔ وہ صاف محسوس کرنے لگے کہ وہ بھٹک گئے ہیں۔ ان کی ذہنی کیفیت یہ تھی جیسے ...... "یہ دور اپنے ابراہیم کی تلاش میں ہے" ...... ان کے کانوں میں آواز پڑتی کہ فلاں جگہ ایک بزرگ آیا ہے جو غیب کی باتیں سناتا ہے، یا یہ کہ فلاں جگہ ایک بزرگ کا ظہور ہوا ہے اور یہ اس کی کرامات ہیں تو لوگ کوسوں کی مسافت طے کر کے وہاں پہنچتے اور اس بزرگ کے آگے سجدے کرتے تھے۔

☆☆☆

یہ کیفیت مسلمان معاشرے میں شدت اختیار کرتی گئی جس نے آگے چل کر پیر پرستی، مزار پرستی اور خانقاہی نظام کی صورت اختیار کر لی۔ یہی رواج آج بھی مذہبی راہ اختیار کیے ہوئے ہے کہ کوئی مشکل یا مصیبت آپڑے تو لوگ خدا سے مدد مانگنے کی بجائے اپنے اپنے پیر کے آستانوں کی دہلیزوں پر اور ان کے مرے ہوئے باپوں کے مزاروں پر جا سجدے کرتے ہیں۔ ان کی زبان پر یا اللہ کی بجائے یادستگیر کا ورد ہوتا ہے۔

☆☆☆

داستان گو کہہ رہا تھا کہ لوگوں نے حسن بن صباح کی زیارت کے لیے وہیں ڈیرے ڈال دیئے تھے۔ احمد بن عطاش حسن بن صباح سے مل کر اور کوئی نیا منصوبہ تیار کر کے چلا گیا۔ تاریخ میں ایک شہادت یہ بھی ملتی ہے کہ احمد بن عطاش گیا نہیں تھا وہیں روپوش ہو گیا تھا۔ اس منصوبے میں اسے پس منظر میں رکھنا تھا۔

ایک رات آدھی رات گزر گئی تھی۔ رات کے سناٹے کو تین چار دھماکہ نما آوازوں نے تہہ و بالا کر ڈالا۔

"وہ دیکھو...... لوگو...... ادھر دیکھو۔"

"زمین سے بادل اٹھ رہے ہیں۔"

"لوگو، جاگو...... بادلوں کے رنگ دیکھو۔"

"یہ ضرور امام کا ظہور ہو رہا ہے۔"

پھر ایک ہڑبونگ تھی، ایک شور تھی، بھاگ دوڑ تھی، نفسا نفسی جیسی حالت تھی، لوگ دھکے دے رہے تھے، دھکے کھا رہے تھے اور اس طرف دوڑے جا رہے تھے جدھر زمین سے بادل اٹھ رہا تھا۔

وہ ہری سر سبز گھاس اور جھاڑیوں سے ڈھکی

"پھر تو اس قلعے پر قبضہ کر لینا کوئی مشکل نہیں۔"...... حسن بن صباح نے کہا...... "میرے پاس تین سو سے کچھ زائد تجربہ کار لڑنے والے آدمی ہیں...... اور یہ جو میری زیارت کے لیے ہجوم آگیا ہے، کئی سو اس میں لڑنے والے مل جائیں گے۔"

"نہیں حسن!"...... احمد بن عطاش نے کہا ...... "میں حیران ہوں کہ یہ بات تم کہہ رہے ہو۔ کیا ہم نے پہلے جو قلعے لیے ہیں وہ لڑ کر لیے ہیں؟ ...... خون کا ایک قطرہ نہیں بہے گا اور الموت ہمارا ہوگا...... سنو، ہم کیا کریں گے۔"

احمد بن عطاش اور حسن بن صباح کی باتیں سرگوشیوں میں بدل گئیں۔ سرگوشیاں بھی ایسی جو خیمے کی کپڑے کی دیواریں بھی نہیں سن سکیں۔ احمد بن عطاش سحری کے وقت خیمے سے نکلا اور خلجان کو چلا گیا۔

تین چار راتیں گزر گئیں "اللہ کے امام" اور ان کے "معجزوں" کے چرچے اتنے زیادہ اور ایسے انداز سے کیے جا رہے تھے کہ تجسس اور پسماندگی کے ہاتھوں مجبور ہو کر لوگ حسن بن صباح کی زیارت کے لیے چلے آرہے تھے۔ داستان گو سنا چکا ہے کہ پہلے بھی لوگوں نے سنا تھا کہ خدا کا ایلچی آسمان سے اترنے والا ہے تو لوگ اسی طرح اکٹھے ہو گئے تھے اور انہوں نے وہیں ڈیرے ڈال دیئے تھے۔ لوگوں کی فطرت میں کوئی انقلاب تو نہیں آگیا تھا۔ ان میں فطری کمزوریاں جوں کی توں موجود تھیں۔ اب وہ اس جگہ ہجوم کر کے آگئے تھے۔

یہاں اس حقیقت کا بیان بے محل نہ ہوگا کہ امت کے ہاتھوں سے اسلام کا دامن چھوٹ گیا تھا اور اسلامی عقائد کی شکست و ریخت ہو رہی تھی۔ خلفائے راشدین کے دور میں امتِ رسول اللہ ﷺ نے اللہ کی رسی مضبوطی سے پکڑے رکھی اور فاتح اور کامران رہے۔ پھر قرآن کی نافرمانی کرتے ہوئے قیادت، اقتدار اور دوسروں پر برتری حاصل کرنے والے ہوس کار سرداروں اور دین کے نام نہاد عالموں نے اپنے اپنے نظریات اور اپنے اپنے عقیدے وضع کرنے شروع کر دیئے، آیات قرآنی کی تفسیریں بدل ڈالیں اور امت کو فرقوں میں بانٹ دیا۔

حسن بن صباح کے ابتدائی دور تک مسلمان چھ بڑے فرقوں میں بٹ چکے تھے اور ہر فرقے بارہ بارہ شاخیں بن چکی تھیں یعنی ہر فرقہ فرقوں میں بٹ گیا تھا اور یوں رسول کریم ﷺ کی پیش گوئی کے مطابق امت ۷۲ فرقوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔

عبداللہ بن مسعودؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے دست مبارک سے ایک سیدھی لکیر کھینچی اور فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی راہِ مستقیم ہے پھر آنحضور ﷺ نے اس لکیر کے دائیں بائیں اس طرح لکیریں کھینچیں جیسے درخت سے شاخیں نکلتی ہیں اور فرمایا کہ یہ سب راہیں ٹیڑھی ہیں اور ان میں کوئی ایک بھی راہ ایسی نہیں جس پر ایک شیطان موجود نہ ہو۔ یہ شیطان اپنی اپنی طرف بلاتے ہیں پھر آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی "بیشک یہی میری (اللہ کی) راہ سیدھی ہے۔

اپنے تین سو میں سے دو سو سے زائد آدمیوں کو خود اپنی زبان سے نہیں بلکہ اپنے خاص مصاحبوں کی زبان سے کہلوایا کہ وہ آبادیوں میں امام کے معجزے سناتے جائیں۔

"یہ حکم امام نہیں"...... مصاحبوں نے ان تین سو افراد سے کہا...... "یہ ہمارا فرض ہے کہ ہر کسی کو معلوم ہو جائے کہ وہ امام جسے خدا نے ملت رسول ﷺ کو صحیح راستہ دکھانے کے لیے آسمان سے اتارا ہے۔ اس نے کیا معجزے دکھائے ہیں لوگوں سے کہو کہ وہ امام کو خدا کا بھیجا ہوا امام مان لیں۔

حسن بن صباح جب الموت سے تھوڑی دور رکا، اس وقت اس کے ساتھ تین سو کی بجائے تین ہزار سے زائد لوگ تھے۔ تاریخ میں یہ پتہ نہیں چلتا کہ پہاڑیوں کے اندر قدیم قلعے سے الموت تک کتنا فاصلہ تھا، البتہ یہ بات صاف ہے کہ حسن بن صباح کے آدمیوں نے اس علاقے کی آبادیوں میں "خدا کے بھیجے ہوئے امام" کے "معجزے" ایسے انداز سے سنائے کہ لوگ حسن بن صباح کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ حسن بن صباح نے ایک جگہ رک کر ڈیرے ڈال دیئے۔ اس کے لیے بڑے سائز کا شاہانہ خیمہ لگا دیا گیا تھا۔

تشہیر اور پروپیگنڈے کا کام صرف حسن بن صباح نے ہی نہیں کیا تھا، احمد بن عطاش اس کام میں ہمہ تن مصروف رہتا تھا۔ اس نے مبلغوں کی جماعتیں بنادی تھیں۔ جس کے ارکان اسلام کے حوالے سے باطنی نظریئے کی تبلیغ کرتے تھے۔ بڑے مؤرخوں خصوصاً ابن خلدون، ابو القاسم، رفیق دلاوری، ابن اثیر، نے تو یوں لکھا ہے کہ وہ باطنی نظریئے کی تبلیغ کرتے تھے۔ تفصیلات لکھنے والے وقائع نگاروں اور مبصروں نے لکھا ہے کہ یہ تبلیغ دراصل تشہیر تھی حسن بن صباح کی اور لوگ جوق در جوق حسن بن صباح کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے اکٹھے ہوتے جا رہے تھے۔ لیکن حسن بن صباح کی جھلک انہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔

حسن بن صباح کا جہاں خیمہ تھا وہاں تک کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اس سے ذرا پرے ہٹ کر ان کے اپنے آدمیوں کے خیمے تھے۔ لوگوں کو حسن بن صباح کے خیمے سے دور روک لیا جاتا تھا۔

☆☆☆

حسن بن صباح یہاں پہنچا تھا تو تیسری رات خلجان سے اس کا پیرو مرشد احمد بن عطاش اس کے پاس آگیا تھا۔ ان کی ملاقات دو ڈھائی سال بعد ہو رہی تھی۔ احمد بن عطاش نے حسن بن صباح کو مصر بھیجا تھا۔ اس کے بعد یہ دونوں پہلی بار مل رہے تھے۔ حسن بن صباح نے اپنے استاد کو اپنی کارگزاری سنائی اور استاد نے جب حسن بن صباح کو بتایا کہ اس نے قلعہ خلجان میں کیسے کیسے خفیہ انتظام کئے ہیں حسن بن صباح حیران رہ گیا۔

"اب قلعہ الموت پر قبضہ کرنا ہے۔" احمد عطاش نے کہا...... "جو بظاہر ناممکن نظر آتا ہے۔ امیر مہدی علوی کے پاس تین سو سواروں کا صرف ایک دستہ ہے۔ یہ اس کا محافظ دستہ ہے۔ اس کی فوج ہے ہی نہیں۔"

بائیں گلیاں تھیں جو بھول بھلیاں تھیں۔ ان میں چھوٹے کمرے تھے، بڑے بڑے بھی اور بہت بڑے بھی اور تہہ خانے سے ایک سرنگ بھی نکالنی تھی۔ اسے اتنا کھلا اور اونچا رکھنا تھا کہ تین آدمی پہلو بہ پہلو اس میں سے گزر سکیں۔ سرنگ بھی بھول بھلیوں جیسی بنائی تھی۔

قلعے کی تعمیر شروع ہو گئی۔ ملک کے معماروں کو اس کام پر لگادیا گیا۔ ملک کی آدھی آبادی مزدوری کے لیے پہنچ گئی۔ اتنی زیادہ مخلوق چیونٹیوں کی طرح کام کرنے لگی۔

اس قلعے کا نام آلہ موت رکھا گیا۔ دیلمی زبان میں موت عقاب کو کہتے تھے اور آلہ کے معنی تربیت گاہ ہوتے تھے۔ سلطان عقاب کے پیچھے اس جگہ گیا تھا۔ اگر اس کے عقاب کا شکار اس ٹیکری پر نہ گرتا تو سلطان کبھی اس حسین ٹیکری کو نہ دیکھ سکتا نہ اسے ایسا قلعہ بنانے کا خیال آتا جو اس دور کا ایک عجوبہ تھا اور جو بعد میں حسن بن صباح کی جنت بنا۔

☆☆☆

حسن بن صباح کے زمانے میں یہ قلعہ اپنی اصل حالت میں تھا۔ اس علاقے کا حکمران امیر جعفری تھا۔ کسی بھی مؤرخ نے اس کا پورا نام نہیں لکھا۔ امیر جعفری نے اپنی حیثیت کے ایک سرکردہ فرد مہدی علوی کو قلعہ الموت کا حاکم مقرر کر رکھا تھا۔

حسن بن صباح الموت سے تھوڑی دور ہی رک گیا۔ اس کے ساتھ قدیم قلعے میں تین سو کے لگ بھگ آدمی تھے ان سب کے ساتھ جانا تھا لیکن ان میں سے بہت سے آدمیوں کو پہلے ہی روانہ کر دیا گیا تھا۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ وہ الموت کے راستے میں آنے والی آبادیوں میں جاکر لوگوں کو حسن بن صباح کے یہ معجزے سناتے جائیں کہ تبریز میں صرف ستر آدمی تھے جن پر سلجوقیوں کے پانچ سو سے زائد سواروں نے حملہ کر دیا۔ حسن بن صباح نے قلعے کی دیوار پر کھڑے ہو کر اس گھوڑ سوار لشکر کے سالار کی طرف دیکھا پھر کہا، واپس چلے جاؤ۔ لشکر نے محاصرہ اٹھا لیا اور واپس چلا گیا۔

ان تین سو آدمیوں میں صرف تین آدمی تھے جو حقیقت سے آگاہ تھے اور ایک عورت تھی جو حسن بن صباح کی رازدار تھی۔ باقی سب نے ان "معجزوں" کو حقیقت تسلیم کر لیا تھا۔ انہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ ان "معجزوں" کی تشہیر کریں۔ وہ تو انہیں کہے بغیر بھی کرنی تھی۔ یہ انسانی فطرت کا خاصا ہے اور یہ انسان کی کمزوری ہے کہ وہ کوئی عجوبہ دیکھتا ہے یا کوئی پر اسرار واقعہ اس کے سامنے رونما ہوتا ہے تو وہ اس کی تہہ تک نہیں پہنچتا۔ اس کا تجزیہ نہیں کرتا بلکہ اپنے آپ پر ہیجانی کیفیت طاری کر کے یہ واقعہ ہر کسی کو سنسنی خیز لہجے میں سناتا ہے اور اس وہم میں مبتلا ہو کر کہ اس کی بات کو کچھ لوگ سچ نہیں مانیں گے، سنانے والا زیبِ داستان کا سہارا لیتا اور مبالغہ آرائی کرتا ہے۔

حسن بن صباح کو خدا نے ایسا دماغ دیا تھا کہ وہ انسان کی کمزوریوں کو سمجھتا اور انہیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا جانتا تھا۔ اس نے

دوڑاتا ٹیکری پر چڑھ گیا۔ اس کے ساتھ اس کے محافظ اور کچھ مصاحب تھے۔ سلطان نے پرندہ عقاب سے لے لیے اور جب ٹیکری کی اس بلندی سے چار سو نظر دوڑائی تو اس کی تو جیسے روح بھی مخمور ہو گئی ہو۔ یہ خطہ ہریالی کی بدولت بہت ہی خوبصورت تھا۔ ایک طرف دریا تھا جس کا اپنا ہی حسن تھا۔

ٹیکری دامن سے اوپر تک گھنے درختوں اور مخمل جیسی گھاس سے ڈھکی ہوئی تھی۔ بعض درخت پھولدار تھے جن کی بھینی بھینی خوشبو خمار ساطاری کرتی تھی۔ ٹیکری کے چاروں طرف دور دور تک ایسا سبزہ زار تھا کہ اسے جنت نظیر ہی کہا جا سکتا تھا۔ دو جگہوں سے چشمے پھوٹتے تھے۔ دونوں جگہوں پر پچیس تیس گز چوڑی جھیلیں بنی ہوئی تھیں۔ ان کے شفاف پانی چھوٹی چھوٹی ندیوں کی شکل میں بہتا، پتھروں اور کنکریوں پر جل ترنگ بجاتا دریا میں جا گرتا تھا۔ بعض جگہوں پر قریب قریب کھڑے تین تین چار چار درختوں کے تنوں کو پھولدار بیلوں نے کچھ اس طرح اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا کہ گھپیں سی بن گئی تھیں۔ دائیں، بائیں اور پیچھے ہرے پتوں اور پھولوں کی دیواریں اور اوپر چھتیں بنی ہوئی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ گھپیں انسانوں نے بیلوں کو تراش کر بنائی ہوں لیکن یہ قدرت کی صناعی کا شاہکار تھا۔ ایک یورپی مؤرخ نے لکھا ہے کہ کوئی کہے کہ یہ خطہ بہشت کا حصہ تھا اور کسی وجہ سے زمین پر رکھا تھا تو میں اسے سچ مان لوں گا۔

سلطان کو اس خطہ کے حسن نے مسحور تو کر ہی لیا تھا، اس نے دیکھا کہ دفاعی لحاظ سے بھی یہ جگہ موزوں ہے۔ یہ ٹیکری اوپر سے نوکیلی یا گول نہیں بلکہ چپٹی تھی اور اس کا طول ایک میل سے ذرا ہی کم اور عرض بھی کچھ اتنا ہی تھا۔

"بلا شبہ میں نے اتنی دلفریب زمین آج ہی دیکھی ہے"...... سلطان نے کہا...... "کیا تم میں کوئی ہے جو مجھے یہ مشورہ نہ دینا چاہے کہ میں یہاں ایک ایسا قلعہ تعمیر کروں جو اس خطے جیسا دلنشین اور چٹانوں جیسا مضبوط ہو؟"

"کوئی نہیں عالی جاہ!"...... مصاحبوں کی ملی جلی آوازیں اٹھیں...... "اس سے زیادہ دلفریب جگہ اور کہیں نہیں...... قلعہ جو یہاں بنے گا اس کی دیواروں اور اس کے دروازوں تک کوئی دشمن نہیں پہنچ سکے گا...... دشمن کا لشکر کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو۔ ٹیکری پر چڑھتے ہمارے تیروں کی بوچھاڑوں سے لڑھکتا نیچے جائے گا۔"

سلطان نے شکار سے واپس آکر پہلا کام یہ کیا کہ اس ٹیکری پر قلعے کی تعمیر کا حکم دیا۔ دور دور سے ماہر معمار بلوائے گئے۔ ان سے نقشے بنوائے گئے۔ ان میں رد و بدل کیا گیا۔ نقشے کو بڑی محنت سے آخری شکل دی۔ اس دیلمی سلطان نے نقشے میں جو نئی چیزیں شامل کیں، انہوں نے تعمیرات کے ماہرین کو حیران کر دیا۔ قلعے کی تعمیر کوئی پیچیدہ کام نہیں ہوا کرتا تھا لیکن اس سلطان نے (جس کا تاریخ میں نام نہیں ملتا) جو نقشہ معماروں کو دیا وہ قلعہ بھی تھا، محل بھی اور باقی جو کچھ تھا وہ پر اسرار تھا۔ اس میں تہہ خانہ بھی تھا جس میں بے شمار کمرے تھے۔ ان کے آگے، پیچھے اور دائیں

اب نظام الملک نے ایسے جاسوسوں کی تلاش شروع کر دی جو حسن بن صباح کے اتنی قریب پہنچ جائیں کہ اس کے خاص مصاحبوں میں شامل ہو جائیں اور اندر کی خبریں لائیں۔

داستان گو موزوں سمجھا ہے کہ اس داستان کو واپس قدیم قلعے کے ان کھنڈرات میں واپس لے جائے جہاں سے حسن بن صباح نے سلجوقی سالار قزل ساروق اور اس کے سواروں کے لشکر کو کچھ پلا کر واپس بھیج دیا تھا۔ پھر کیا حسن بن صباح انہی کھنڈرات میں بیٹھا رہا تھا؟

نہیں...... رات اس کے پیروکاروں نے فتح کا جشن منایا اور اگلی صبح وہاں سے اس سمت کوچ کر گیا تھا جس طرف مشہور تاریخی قلعہ الموت تھا۔ اس کی اور اس کے پیر و مرشد کی نظریں اس قلعے پر لگی ہوئی تھیں۔ حسن بن صباح کی منزل یہی قلعہ تھا۔ اسے اس نے اپنا مستقل اڈہ بنانا تھا اور اسی قلعے کے اندر اور اس کے ارد گرد اسے اپنی جنت بنانی تھی...... وہ جنت جس نے تاریخ کو انگشت بدنداں کر دیا تھا۔ یہ جنت ایسی حیران کن حقیقت تھی کہ آج کے دور کے کچھ لوگ اسے محض ایک افسانہ اور مبالغہ کہتے ہیں۔

قلعہ الموت کے کھنڈرات آج بھی ایک وسیع و عریض ٹیکری کی بلندی پر موجود ہیں۔ ایران کے اس علاقے کو طالقان کہتے ہیں۔ یہ بلند ٹیکری شہر قزوین اور دریائے خزز کے درمیان ہے۔ یہ قلعہ یوں تعمیر ہوا تھا کہ کسی زمانے میں اس خوبصورت خطے میں ویلمی سلاطین کی حکمرانی تھی ایک روز ایک سلطان اپنا عقاب ساتھ لے کر شکار کو گیا۔ اس نے اڑتے ہوئے ایک پرندے کے پیچھے عقاب چھوڑا۔ عقاب نے پرندے کو کچھ دور جا کر پکڑ لیا لیکن پرندہ اسکے پنجوں سے نکل گیا۔ یہ اتنا زخمی تھا کہ زیادہ دور تک اڑ نہیں سکتا تھا گرتے گرتے ٹیکری کی چوٹی پر جا گرا۔ یہ کوئی چھوٹا سا پرندہ نہیں ایک بڑا اور کمیاب نسل کا پرندہ تھا۔ عقاب نے اس پر ایک بار پھر جھپٹا مارا اور اسے وہیں دبوچ لیا۔ سلطان جو گھوڑے پر سوار تھا گھوڑا

کر دوں۔ شیخ کا فرستادہ دو تین منزل تک ان کے ساتھ گیا اور بغیر جواب لیے واپس آگیا۔

بہر حال شیخ منور لاہوری بہت بڑے عالم اور فقیہ تھے۔ اکبر نے ۹۹۵ھ میں ان کو سارنگ پور کی صدارت سے معزول کر کے قلعہ گوالیار میں محبوس کر دیا۔ پانچ سال قید و بند میں مبتلا رہے۔ اس اثنا میں انہوں نے بڑا تصنیفی کام کیا۔ چنانچہ الدرر النظیم فی ترتیب الآیۃ و سور القرآن الکریم کے نام سے قرآن کی تفسیر لکھی، قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی تفسیر قرآن حکیم البحر المواج کو جو فارسی زبان میں ہے، عربی میں منتقل کیا، ایک کتاب "حدائق البیان شرح علی بدیع البیان" سپرد قلم کی، شرح طوالع لکھی، بوصیری کے قصیدہ بردہ کی شرح قلم بند کی، ایک رسالہ الحق الصریح فی اثبات عدم قبول التوبۃ لساب النبی صلی اللہ علیہ و سلم" تحریر کیا۔ یہ رسالہ انہوں نے مخدوم الملک شیخ عبد اللہ سلطان پوری کے جواب میں لکھا تھا، عبد اللہ سلطان پوری نے ایک رسالے میں رسول اللہ پر سب و شتم کرنے والوں کی قبولیت توبہ کا اثبات کیا ہے، قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی "الارشاد" کی شرح بھی لکھی، نیز شیخ حسن صنعانی لاہوری (متوفی ۶۲۰ھ) کی حدیث کی مشہور کتاب "مشارق الانوار" کی شرح سپرد قلم فرمائی۔

شیخ منور پانچ برس قلعہ گوالیار میں قید رہے، اس مدت میں انہوں نے اپنی تفسیر "النظیم فی ترتیب الآیۃ و سور القرآن الکریم" اور قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی تفسیر "البحر المواج" کی عربی کے قالب میں ڈھال لیا تھا اور دونوں تفسیروں کا مسودہ مکمل کر لیا تھا۔ اب وہ نظر ثانی اور تصحیح کرنا چاہتے تھے کہ فرماں روائے ہند جلال الدین اکبر کے غیظ و غضب کا پارہ اور چڑھ گیا اور وہ تمام کتابیں جو جیل میں لکھی تھیں اور کم و بیش ڈیڑھ ہزار اجزا پر مشتمل تھیں ایک ایک ورق کر کے چھین لی گئیں اور کتب خانہ شاہی میں جمع کر دی گئیں۔ افسوس ہے وہ سب کتابیں ضائع ہو گئیں۔ صرف ایک کتاب تفسیر قرآن الدرر النظیم فی ترتیب الآیۃ و سور القرآن الکریم محفوظ رہ سکی جو کسی طرح قید خانہ میں مصنف کے پاس رہ گئی تھی۔

اسی اثناء میں بادشاہ کا غصہ اور بڑھا تو حکم صادر ہوا کہ شیخ منور کو قلعہ گوالیار سے دار الخلافہ آگرہ میں لایا جائے، اس حکم کی تعمیل کی گئی اور زندگی کے چند روز باقی رہ گئے تھے، نہایت تنگی اور تاریکی میں بسر کیے۔ بالآخر ۱۲ ذی القعدہ ۱۰۱۱ھ کو اس عالم کون و فساد سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔ موت کے بعد مرکزِ علم و تحقیق لاہور کے اس جلیل القدر عالم و فقیہ اور مفسر و محدث کو غربا اور فقرا کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ بعد ازاں ماہِ محرم ۱۰۱۵ھ میں ان کے فرزندانِ گرامی کسی مناسب تدبیر سے رفیع المرتبت باپ کی میت کو خاکِ آگرہ سے نکال کر لاہور لے آئے اور اپنے آبائی قبرستان میں دفن کیا۔

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ بادشاہ کی ناراضی کی اصل وجہ کیا تھی۔ دس سال مالوہ کی صدارت پر مامور رہے اس عرصے میں بادشاہ ان سے خوش رہا۔ (اگلے ماہ دیگر)

متبحر عالم تھے، بیجاپور کے بادشاہ علی عادل شاہ کی دعوت پر ہندوستان آئے اور اس کے پاس بیجاپور میں قیام پذیر ہوئے۔ اس کے قتل کے بعد ۹۹۱ھ میں آگرہ گئے اور جلال الدین اکبر بادشاہ سے ملاقات ہوئی، اکبر نے ان کی بڑی پذیرائی کی۔ ۹۹۳ھ میں منصبِ صدارت عطا کیا اور امین الملک کے خطاب سے سرفراز کیا۔ پھر عضد الدولہ کا خطاب دیا، بعد ازاں عضد الملک کے لقب سے نوازا اور دیوانِ وزارت میں داخل کیا، اپنے فحول علما اور مشاہیر حکما میں سے تھے۔ جب یہ اکبر کے فرمان کے مطابق آگرہ گئے تو شیخ منور لاہوری بھی وہیں سکونت فرماتے تھے۔ ایک روز منطق و حکمت کے موضوع پر شیخ منور سے گفتگو ہوئی تو بہت سے فکری عقدے حل ہوئے اور متعدد علمی گوشوں سے پردے اٹھے، خوش ہو کر شیراز کے اس عظیم عالم نے فرمایا سیر ہند کرتے ہوئے مدت گزر گئی، اس طویل عرصے میں آج پہلا موقعہ ہے کہ شیراز کی مہک علمی دماغِ آرزومند میں پہنچی ہے۔

حکیم شمس الدین علی گیلانی، اکبر کی عنایاتِ شاہی سے حکیم الملک کے خطاب سے سرفراز تھے اور مولانا شاہ محمد شاہ آبادی سے نسبتِ تلمذ کرتے تھے، ان کے بارے میں شیخ منور لاہوری کے بیٹے شیخ کبیر کا بیان ہے کہ ایک روز بادشاہ کے حضور عرض گزار ہوئے کہ تفسیر بیضاوی اور دیگر منتہی کتابوں پر ان کے استاد مولانا شاہ محمد شاہ آبادی نے ایسے اعتراضات کئے ہیں کہ علمائے وقت ان کا جواب دینے سے قاصر ہیں اور شاہ آبادی عالم اس باب میں سب پر غالب ہیں۔ حکیم گیلانی نے شاہنشاہ کو اس بات پر آمادہ کیا کہ علما کی مجلس منعقد کر کے ان کے اعتراضات و ایرادات سے متعلق گفتگو کی جائے چنانچہ قرآن کی آیت و اذابتلیٰ ابراھیم ربہ بکلمٰتٍ فاتمھن کی تفسیر پر حکیم موصوف نے مولانا شاہ آبادی کا اعتراض پیش کیا۔ قاضی صدر الدین لاہوری ثالث مقرر ہوئے۔ شیخ منور نے اس انداز سے اس آیتِ کریمہ کی وضاحت کی اور اس اسلوب سے اعتراض کا جواب دیا کہ حاضرینِ مجلس حیران رہ گئے۔ قاضی صدر الدین نے شیخ کو داد دیتے ہوئے کہا کہ شیخ منور نے قاضی ناصر الدین بیضاوی کی عبارت کی اس حسن و خوبی سے وضاحت کی ہے اور اس عمدگی سے اعتراض کا جواب دیا ہے کہ اگر خود بیضاوی موجود ہوتے تو شیخ کی نگاہ دوربین کی تحسین فرماتے۔

دس سال کے بعد ۹۹۵ھ میں اکبر نے شیخ منور کو سارنگ پور (مالوہ) کے عہدۂ صدارت سے معزول کیا اور ان کی جگہ عضد الدولہ میر فتح اللہ شیرازی کو صدر مقرر کر کے بھیجا۔ میر شیرازی وہاں پہنچے تو شیخ منور سے بعض علمی نکات پر بحث شروع ہوئی۔ شیخ منور نے مقدمہ طوالع کی شرح ان کو دکھائی جس کی عبارت بڑی مشکل اور الجھی ہوئی تھی۔ میر فتح اللہ نے جواب کے لیے ایک دن کی مہلت مانگی، دوسرے دن پھر گفتگو شروع ہوئی تو فرمایا میں نے اس پر کچھ مسودہ تیار کیا ہے جس سے مسئلہ زیرِ بحث کی عقدہ کشائی ہوتی ہے۔ کسی شخص کو میرے ساتھ بھیجئے تاکہ میں اسے صاف کر کے آپ کی خدمت میں پیش

مفتی شیخ احمد وغیرہ شامل ہیں۔ یہ وہ حضراتِ علمائے عظام تھے جو علوم شریعت کے ماہر اور مبلغ تھے اور احکامِ شرعیہ میں خواجہ معین الدین کشمیری سے طالبِ فتویٰ ہوتے تھے۔ یعنی وہ وضاحتِ مسائل شرعیہ اور افتا میں خواجہ ممدوح علمائے کشمیر کے مرکز و مرجع تھے، خطۂ کشمیر کے ارکانِ دولت، اربابِ حکومت اور خواص و عوام سب اس سلسلے میں ان سے رجوع کرتے تھے۔

خواجہ معین الدین کشمیری نے کشمیری مسلمانوں میں اتباعِ شریعت اور ترویجِ سنت کا جذبہ پیدا کیا، بدعات کو ختم کرنے اور خلافِ شرع رسوم کو مٹانے میں بےحد کوششیں کیں۔ وہ زاہد و عابد اور متقی و متورع عالم و فقیہ تھے۔ مصنف بھی تھے، فتاویٰ نقشبندیہ اور کنز السعادات، مسائل فقہ میں ان کی تصنیفات ہیں۔ ان کے علاوہ فارسی زبان میں سیر و سلوک سے متعلق ایک رسالہ "رضوانی" لکھا۔ مرآت القلوب، سید خیر البشر اور مرآۃِ طیبہ بھی ان کی تصانیف میں شامل ہیں۔ سعیدیہ لائبریری ٹونک میں ان کی دو ضخیم تفسیریں بھی ہیں۔ ایک زبدۃ التفاسیر عربی میں اور دوسری شرح القرآن فارسی میں۔

خواجہ ممدوح نے ماہِ محرم ۱۰۸۵ھ میں کشمیر میں وفات پائی۔

شیخ منور لاہوری

شیخ منور بن عبد الحمید بن عبد الشکور بن سلیمان بن اسرائیل لاہوری علومِ عقلیہ ونقلیہ کے ماہر تھے۔ شیخ سعد اللہ بن ابراہیم لاہوری ان کے خالو تھے، جو اپنے وقت کے جید عالم اور متقی بزرگ تھے، انہی سے اخذِ علم کیا اور مرتبۂ عالی کو پہنچے، قوتِ حفظ وادراک نہایت تیز تھی۔ تقریباً بیس سال کی عمر میں علومِ متداولہ کی تحصیل سے فارغ ہو گئے تھے۔ قرأت و تجوید پر عبور رکھتے تھے اور قرأت سبعہ کے عالم تھے، حسن صورت اور حسن سیرت کے زیور سے آراستہ تھے، مغل بادشاہ جلال الدین محمد اکبر ان کی فراوانیٔ علم و فضل سے بہت متاثر تھا، ۹۸۵ھ میں اس نے ان کو مالوہ کے منصبِ صدارت پر مامور کیا۔ جب وہ مالوہ کے شہر سارنگ پور پہنچے تو وہاں علما و فضلا اور اصحابِ طریقت و سلوک کی ایک جماعت موجود تھی، انہوں نے جوش اور مسرت سے انہیں خوش آمدید کہا اور بڑی تکریم سے پیش آئے۔ دس سال سارنگ پور میں قیام رہا، منصب صدارت کے ساتھ ساتھ وہاں غلغلۂ تدریس بلند کئے رکھا۔ اس اثنا میں بے شمار شائقینِ علم و عرفان نے ان سے استفادہ کیا اور شہرتِ علمی پورے ملک میں پھیل گئی۔

شیخ منور ارضِ لاہور کے وہ عالم کبیر ہیں جن کا ذہن رسا، تفسیر، حدیث، فقہ منطق و حکمت اور تمام علوم مروجہ کا احاطہ کیے ہوئے تھا۔ اکبر کے سلسلۂ ملازمت میں منسلک ہونے سے پہلے چوالیس سال اقلیمِ علم میں سیاحت کناں رہے اور درس وتدریس کو بنیادی مشغلہ قرار دیے رکھا۔

امیر فتح اللہ شیرازی (متوفی ۹۹۷ھ) ان کے علم و فضل کے بہت مداح تھے۔ یہ شیراز میں پیدا ہوئے تھے، مسلکاً شیعہ تھے اور علومِ حکمیہ کے

سے موضع برونہ منتقل ہو گئے جو اس زمانے میں اعمالِ جون پور میں ایک گاؤں تھا۔ برونہ کے نامور بزرگ شیخ نور الدین بن عبد القادر صدیقی برنوی کی صاحب زادی سے شادی کی اور اللہ نے اس سے اولاد عطا کی۔ پھر ایک وقت آیا کہ اہل و عیال کو برونہ میں چھوڑا اور اور خود علاقہ بنگال کے ایک شہر "پرینہ" چلے گئے، وہاں اقامت اختیار کر لی، مدفن بھی وہیں ہے۔ ان کے بیٹے شیخ محمد رشید جون پوری نے جو سر زمین بر صغیر کے بہت بڑے عالم و فاضل اور صاحبِ تصنیفاتِ مشہورہ تھے، اپنے نانا شیخ نور الدین برونوی کے ہاں تربیت حاصل کی اور ابتدائی کتابیں (بعض انتہائی بھی، جیسا کہ شیخ محمد رشید جون پوری کے حالات میں بیان کیا جا چکا ہے) انہی سے پڑھیں۔ شیخ مصطفیٰ عثمانی برونوی، فقیہ، زاہد، متورع اور متوکل علی اللہ تھے۔ مشتبہات سے دامن کشاں رہتے تھے۔ انہوں نے ۲۰ ذی الحجہ ۱۰۷۶ھ میں پرینہ میں وفات پائی۔

خواجہ معین الدین کشمیری

خواجہ معین الدین کشمیری کا سلسلۂ نسب یہ ہے۔ معین الدین بن خاوند محمود بن ضیاء الدین بن میر محمد بن تاج الدین بن علاء الدین عطار بخاری نقشبندی کشمیری۔ خواجہ معین الدین کشمیری خطۂ کشمیر کے ممتاز بزرگ حضرت خواجہ خاوند محمود (متوفی ۱۲ شعبان ۱۰۵۲) کے فرزند تھے۔ خواجہ خاوند محمود کبار مشائخ نقشبندیہ میں سے تھے، ماوراء النہر اور اس کے گرد و نواح میں بڑے اثر و رسوخ کے مالک تھے اور ان کے ارادت مند دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ شاہ جہان بادشاہ کے عہد میں کابل سے ہندوستان آئے اور کشمیر میں سکونت اختیار کی، کئی مرتبہ لاہور، دہلی اور آگرہ گئے، ملوک و امرائے سلطنت سے ملے اور اپنی نیکی کی وجہ سے ان کے نزدیک انتہائی عزت و اکرام کے مستحق قرار پائے۔ کشمیر میں بڑی ترویج اسلام کی اور ہزاروں لوگ ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے۔

خواجہ معین الدین کشمیری، انہی خواجہ خاوند محمود کے بیٹے تھے جن کا شمار مشائخ نقشبندیہ اور کشمیر کے فقہائے حنفیہ میں ہوتا تھا۔ ان کا مولد و منشا کشمیر ہے۔ گھر میں علم کے چشمے بہہ رہے تھے۔ اپنے والدِ گرامی خواجہ خاوند محمود سے ابتدائی درسی کتابیں پڑھیں اور فقہ کی کچھ تعلیم حاصل کی۔ مزید حصولِ علم کی غرض سے دہلی گئے، وہاں شیخ عبد الحق محدث دہلوی کی تدریسی سرگرمیاں جاری تھیں، ان کے حلقۂ درس میں داخل ہوئے اور کافی عرصہ وہاں رہ کر حدیث و فقہ کی کتابیں پڑھیں، یہاں تک کہ اپنے عہد کے جید عالم اور نامور فقیہ گردانے گئے۔ بعد ازاں کشمیر واپس آئے اور مسندِ مشیخت کو زینت بخشی۔ علم و فضل کی فراوانی کا یہ عالم تھا کہ اس عہد کے بڑے بڑے کشمیری اصحابِ علم اور اربابِ طریقت ان کی خدمت میں آتے اور استفادہ کرتے تھے۔ ان علمائے کرام میں ملا محمد طاہر کشمیری خلف مولانا حیدر کشمیری، علامہ ابو الفتح کلو، ملا یوسف مدرس، مفتی محمد طاہر، مولانا عبد الغنی اور مولانا

جائے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت صاحب رشیدیہ شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری طلباء کی جماعت میں شیخ محمد افضل سے درس لے رہے تھے اور مولانا محی الدین بہاری شیخ محمد رشید کی استعدادِ علمی سے واقف ہونا چاہتے تھے۔ غالباً یہ اس بناء پر تھا کہ شیخ محمد رشید کی شہرت زمانۂ طالب علمی ہی میں اہل علم میں پہنچ گئی تھی۔ مولانا محی الدین بہاری نے دورانِ درس میں کسی مسئلے پر محمد رشید سے مذاکرہ و مباحثہ شروع کر دیا۔ شیخ نے ان کو اس انداز سے جواب دیا اور اس نہج سے بحث میں حصہ لیا کہ قریب تھا کہ مولانا کو خاموش کرادیں، مگر شیخ محمد افضل نے اپنے شاگرد کو خاموش رہنے کا حکم دیا اور وہ خاموش ہو گئے۔

مولانا محی الدین بہاری نے ۱۰۶۸ھ کو وفات پائی۔

قاضی مرتضیٰ بیجاپوری

قاضی مرتضیٰ بیجاپوری کا لقب رضی الدین تھا۔ اپنے عصر کے نامور عالم و فقیہ اور شیخ تھے۔ ان کے والد محمود نائطی بندرگاہ گوا کے قاضی تھے۔ والد کی وفات کے بعد ۹۹۳ھ میں یہ منصب لائق بیٹے کو ملا۔ قاضی ممدوح مصنف بھی تھے، فن صنائع وبدائع سے متعلق سلطان ابراہیم عادل شاہ کے عہد میں "تحفۃ الفقیر" کے نام سے ایک مفید کتاب تصنیف کی۔ یہ کتاب لکھ کر بیجاپور کے بادشاہ ابراہیم عادل شاہ کو بطور تحفہ پیش کی۔ بادشاہ نے اسے بہت پسند کیا۔

شیخ مصطفیٰ عثمانی برونوی

شیخ مصطفیٰ عثمانی برونوی کا نسب نامہ یہ ہے: مصطفیٰ بن عبدالحمید بن راجو بن سعدی بن عارف بن عبدالواسع بن تجھلی بن ہدی بن عبدالملک بن متھن بن نصیر الدین بخشی...... شیخ مصطفیٰ عثمانی برونوی کو لوگ شیخ رومی عثمانی برونوی کے لقب سے ملقب کرتے تھے۔ شیخ سری بن مفلس سقطی عثمانی کی اولاد سے تھے جو مشہور ولی اور متقی بزرگ تھے۔ شیخ مصطفیٰ عثمانی برونوی اپنے دور کے عالم فقیہ اور پرہیزگار بزرگ تھے اور صاحبِ رشیدیہ شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری (متوفی ۹ رمضان ۱۰۸۳ھ) کے والد تھے۔ یہ دراصل "سکلائی" کے باشندے تھے جو علاقہ اودھ میں اعمالِ امیٹھی میں ایک قریہ تھا۔ شیخ مصطفیٰ نے موضع سکلائی میں نشو و نما پائی اور شیخ محمد بن نظام الدین عثمانی امیٹھوی (متوفی ۲۶ ذی القعدہ ۱۰۱۱ھ) سے بیعت ہوئے۔ پھر حصولِ علم کا شوق پیدا ہوا اور اپنے علاقے کے علما سے تحصیل کی۔ بعد ازاں ان کے مرشد شیخ محمد بن نظام الدین عثمانی امیٹھوی نے جون پور جانے کی اجازت مرحمت فرمائی اور وہ جون پور چلے گئے۔ جون پور علمائے عظام کا مرکز تھا اور مختلف علما و مشائخ کے درس و تدریس اور تصوف و طریقت کے سلسلے جاری تھے، شیخ مصطفیٰ بھی ان سے منسلک ہو گئے، وہاں کے اساتذہ سے علم حاصل کیا اور شیخ قیام الدین بن قطب الدین جون پوری سے خرقۂ طریقت عطا ہوا۔ پھر امیٹھی کا قصد کیا اور کافی عرصہ وہاں مقیم رہے۔ امیٹھی

اسحاق بھٹی

مولانا محی الدین بہاری

مولانا محی الدین بن عبداللہ بہاری، ملا موہن بہاری کے عرف سے معروف تھے۔ ہندوستان کے صوبہ بہار کے شہر 'بہار' کے نواح میں متولد ہوئے، نشو نما بھی اسی گاؤں میں پائی۔ حصولِ علم کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ نو سال کی عمر کے تھے کہ قرآن مجید حفظ کر لیا۔ ان کے والد مولانا عبداللہ بہاری بھی صاحب علم بزرگ تھے، حفظِ قرآن کے بعد ان سے درسی کتابیں پڑھنا شروع کیں اور سترہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہوگئے۔ پھر اپنے شہر ہی میں درس و افادے کا سلسلہ شروع کر دیا اور اس دور کے مشاہیر فقہاء گردانے گئے۔ کچھ عرصہ شائقین علم کو پڑھاتے اور مستفید کرتے رہے۔ بعد ازاں دہلی گئے اور شاہجہاں بادشاہ سے ملاقات ہوئی۔ اس نے ان کی علمی قابلیت سے متأثر ہو کر اپنے بیٹے اورنگ زیب کا معلم مقرر کر دیا۔ بارہ سال اس خدمت علمی پر مامور رہے۔ پھر تصوف و طریقت کا جذبہ دل میں موجزن ہوا اور شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی کے پوتے شیخ حیدر کی خدمت میں حاضری دی، ان سے اخذ طریقت کیا۔ اس کے بعد اپنے شہر بہار واپس چلے گئے اور سب اطراف سے منقطع ہو کر زہد و عبادت کی زندگی اختیار کر لی۔ اس اثناء میں علم نحو کی انتہائی کتاب 'کافیہ' کی مبحث غیر منصرف تک فارسی زبان میں حقائق و معارف کے اسلوب پر شرح سپردِ قلم کی۔ حقائق و معارف کے انداز ہی میں مبحث غیر منصرف تک عربی زبان میں 'کافیہ' کی ایک شرح شیخ ابو البقا نے لکھی ہے۔

'گنج ارشدی' میں شیخ غلام ارشد جون پوری لکھتے ہیں کہ مولانا محی الدین بہاری شیخ محمد افضل جون پوری کے شیوخ میں سے تھے۔ وہ ایک مرتبہ جون پور تشریف لائے اور شیخ محمد افضل کے ہاں گئے۔ شیخ اس وقت درس دے رہے تھے اور طلباء کی جماعت ان کے سامنے تھی۔ انھوں نے مولانا محی الدین کے اعزاز میں درس بند کرنے کا ارادہ کیا لیکن مولانا نے روک دیا اور فرمایا کہ ان کی موجودگی میں سلسلہ درس جاری رکھا

کمزور ہے تو قوی ہو جائے گا۔ نوکری سے معزول ہے بحال ہو جائے گا اور اگر لاولد ہے تو اولاد پائے گا علامہ ابن عربیؒ فرماتے ہیں کہ مغرب کے فرض و سنت کے بعد اسی جگہ چالیس مرتبہ پڑھے اور اس جگہ سے اٹھے نہیں تو اللہ تعالیٰ سے جو حاجت مانگے گا پائے گا۔ اور اگر قیدی ایک سو اکیس بار پڑھ کر بیڑی پر دس بار دم کرے تو وہ اللہ کے حکم سے رہا ہو جائے گا۔ علامہ ابن القیمؒ فرماتے ہیں کل داء له دواء وانا احسنت المداوة بالفاتحة وجدت لها تاثيراً عجيباً فى الشفاء۔

سورۂ بقر کی فضیلت

اس مبارک سورۃ کی بڑی فضیلت ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں اقرئو ا سور البقرة فان اخذ ها بركة و تركها حسرة و لا يستطيعها البطنة سورۂ بقرہ پڑھا کرو اس کو لینا برکت ہے اور چھوڑنا حسرت ہے۔ جادوگر اس کی طاقت نہیں رکھتے۔ قیامت کے روز پڑھنے والے کی شفاعت کرے گی۔ فرمایا جس گھر میں سورہ بقرہ پڑھی جاتی ہے اس گھر سے شیطان بھاگ جاتا ہے اور فرمایا۔ لكل شئى سنام وسنام القران البقره وفيها آية هى سيدة آية القران ط ہر چیز کے لئے کوہان و رفعت ہے قرآن مجید کی رفعت سورۂ بقرہ ہے اس میں ایسی آیت ہے جو قرآن مجید کی تمام آیتوں کی سردار ہے۔ فرمایا اس سورت کے پڑھنے کی وجہ سے رحمت کے فرشتے اترتے ہیں اور فرمایا اس سورت کی آخری دو آیتیں ایسی ہیں کہ پڑھنے والے کو کفایت کریں گی الآيتان من آخر سورة البقرة من قرأ بهما فى ليلة كفتاه (مسلم)

آیت الکرسی کی فضیلت

اس مقدس آیت کی بڑی بزرگی ہے۔ قرآن مجید کی آیتوں میں سب سے بڑی عظمت کی آیت ہے۔ سوتے وقت اس کو پڑھنے سے رات بھر شیطان قریب نہیں آسکتا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نگہبانی ہوتی ہے۔ ہر نماز کے بعد پڑھنے والا جنت میں داخل ہوگا۔ اس آیت میں اسم اعظم (الحی القیوم) ہے اور پچاس کلمے ہیں اور ہر کلمے میں پچاس برکتیں ہیں اس کے پڑھنے سے رنج و غم دور ہو جاتا ہے۔ روزی میں کشائش ہوتی ہے۔ شیطان ہٹ جاتے ہیں اور ہر آفت و بلا سے محفوظ رہتا ہے۔ جہات ستہ اور داخل جوف میں پڑھنے سے ایک مضبوط قلعہ حفاظت کے لیے ہو جاتا ہے کوئی چور ڈاکو داخل نہیں ہو سکتا۔

آمن الرسول الخ

یہ سورۂ کریمہ کی حدیثوں میں بہت فضیلت بیان کی گئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں جو اس کو جمعہ کے دن پڑھے گا تو اس جمعہ سے دوسرے جمعہ تک اس کے لیے روشنی ہوگی اور جو اس کے شروع کی دس آیتوں کو ضبط کر لے گا وہ دجال کے فتنے سے محفوظ رہے گا۔ غرض اس کے پڑھنے سے دجال کے فتنے اور دیگر بڑی آفتوں سے محفوظ رہے گا۔

(اگلے ماہ سورہ یٰسین کی فضیلت)

چاروں آسمانی کتابوں (توراۃ ، انجیل ، زبور اور قرآن) میں اس سورت جیسی کوئی سورت نہیں نازل ہوئی (ترمذی) اور حدیث میں فرمایا کہ بغیر سورہ فاتحہ کے کوئی نماز ہی نہیں ہوتی (بخاری) اور فرمایا اخیر سورة فی القرآن الحمد لله رب العالمین قرآن مجید میں سب سورتوں سے بہتر الحمد للہ رب العالمین ہے۔ حضرت سائب بن یزیدؓ روایت کرتے ہیں عوذنی رسو ل الله ﷺ بفاتحة الکتاب تفلاً رسول اللہ ﷺ نے مجھے سورہ فاتحہ پڑھ کر دم کیا۔ آنحضرت ﷺ نے اس سورت کو رقیہ (منتر) فرمایا (بخاری) ایک صحابیؓ نے سانپ کے کاٹے ہوئے پر دم کیا۔ خدا کے حکم سے وہ اچھا ہو گیا۔ اور فرمایا فاتحة الکتاب شفاء من کل داء۔ سورۂ فاتحہ ہر بیماری کے لیے شفا ہے ایک روایت میں فرمایا خیر الدواء القرآن قرآن مجید سب دواؤں سے بہتر دوا ہے اور فرمایا اذا قرأت الفاتحة و قل هوالله احد فقد آمنت من کل شیئ الا الموت جب تم سورۂ فاتحہ اور قل ہو اللہ احد پڑھ لو تو سوائے موت کے ہر آفت سے مامون ہو جاؤ گے۔

خاصیت : سورۂ فاتحہ کی خاصیت یہ ہے کہ ہر بیماری کے لیے باعث شفا ہے وبا، طاعون زدہ بسم اللہ اور الحمد للہ دو دو مرتبہ پڑھ کر دم کرنے سے اللہ تعالیٰ کے حکم سے بہت جلد شفا ہو گی۔ جو شخص بسم اللہ اور الحمد للہ کو فجر کی سنت اور فرض کے درمیان ہمیشہ ۴۱ بار پڑھتا رہے گا تو اگر وہ محتاج ہے تو غنی ہو جائے گا قرض دار ہے تو اس کا قرض ادا ہو جائے گا بیمار ہے تو اچھا ہو جائے گا

جودھا فغفر له (الداء والدواء) اس کو اچھا کر کے لکھو کیونکہ ایک شخص نے بسم اللہ کو بہت خوش خط واچھا لکھا تھا اس کو بخش دیا گیا۔ حضرت مجدد الدین مجاہد ملت والا جاہ نواب سید صدیق حسن خان صاحبؒ (جو ان دعاؤں کی برکت سے نوابی کے تخت پر متمکن ہوئے) بسم اللہ کے خصائص کے متعلق فرماتے ہیں کہ جو شخص بسم اللہ کو زیادہ پڑھا کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو روزی زیادہ عطا فرمائے گا۔ لوگوں کے دلوں میں اس کی عزت ہوگی سوتے وقت ۲۱ بار پڑھنے سے اس رات جن وانسان وشیطان کے شر وفساد اور چوری ڈاکہ اور آگ لگنے اور اچانک موت کے آجانے اور تمام بلاؤں و آفتوں سے محفوظ رہے گا۔ دیوانے کے کان میں ۴۱ بار پڑھنے سے جلد صحت یابی ہوتی ہے، مرگی والے پر دم کرنے سے جلد افاقہ ہوتا ہے۔ ظالم و جابر حاکم کے سامنے پچاس بار پڑھنے سے اس کے دل میں رعب و خوف آجاتا ہے۔ تکلیف زدہ اور جادو کئے ہوئے آدمی پر متواتر سات دن تک سو سو بار پڑھنے سے خدا حکم سے جادو اور تکلیف کی شکایت دور ہو جائے گی۔ اور اسے بحساب ابجد یعنی سات سو چھیاسی (۷۸۶) بار خالص نیت کے ساتھ پڑھنے سے ہر مشکل کام آسان اور حاجت روائی ہو جاتی ہے۔ اگر اکیس (۲۱) بار لکھ کر بچے کے گلے میں لٹکا دیا جائے تو اس گھر میں جن، شیطان نہ آئے اور مال و کمائی میں برکت ہوگی۔ دوکان پر لٹکا دی جائے تو تجارت میں فائدہ ہوگا۔ ایکسو ایک (۱۰۱) مرتبہ لکھ کر باغ اور کھیت میں لکھ کر دفن کر دیا جائے تو کھیتی اور فصل اچھی ہوگی۔ اس کے علاوہ بے شمار فائدے ہیں جن کا اہل علم و عمل نے تجربہ کیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سچ فرماتے ہیں کہ لوگ اللہ تعالیٰ کی ایک آیت سے غافل ہیں۔ حالانکہ وہ آیت رسول اللہ ﷺ اور حضرت سلیمانؑ کے علاوہ کسی پر نہیں اتری۔ حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں جو دوزخ کے فرشتے زبانیہ سے نجات چاہے وہ بسم اللہ پڑھے کیونکہ دونوں ۱۹۔ ۱۹ ہیں حضرت عمرؓ کے پاس روم کے بادشاہ نے خط لکھا کہ میرے سر میں ہمیشہ درد رہتا ہے کبھی بند نہیں ہوتا۔ آپ کوئی دوا روانہ فرمائیں تو حضرت عمرؓ نے ایک ٹوپی ارسال کی جب بادشاہ اس ٹوپی کو سر پر رکھتا تو سر کا درد موقوف ہو جاتا جب اس کو اتار دیتا تو پھر درد ہونے لگتا۔ اس کو بہت تعجب ہوا ٹوپی میں دیکھا تو صرف بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے سوا کچھ نہ لکھا ہوا تھا۔ اس نے کہا اس بسم اللہ کی برکت سے ہی درد سر موقوف ہو جاتا ہے۔ اس نے کہا ما اکرم هذاالذی و عزه شفانی واحدة منه۔ پھر وہ مسلمان ہو گیا (کتاب الداء والدواء)

سورہ فاتحہ کی فضیلت

اس سورہ فاتحہ (الحمد للہ) کی بہت فضیلت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ولقد آتینا ك سبعا من المثانی والقرآن العظیم "(اے نبی) ہم نے تم کو سبع مثانی اور قرآن مجید دیا ہے۔" اس سبع مثانی سے مراد سورہ فاتحہ ہے یہ سورت تمام سورتوں سے مرتبہ میں بڑی ہے۔ حدیث میں فرمایا کہ

کی بہترین عبادت قرآن مجید کی تلاوت ہے۔(بیہقی)

قرآن مجید کی ظاہری تعظیم بھی کرنی چاہیے اس سے بہت ثواب ملتا ہے زمین پر قرآن مجید کے گرے ہوئے ورقوں کا اٹھانے والا اللہ تعالیٰ کا ولی ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے نام کے لکھے ہوئے کاغذات کو زمین سے اٹھانے والے علیین میں بلند مرتبہ پائیں گے۔ حضرت علیؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ زمین پر جب کوئی کتاب اللہ گر پڑتی ہے تو اس کی حفاظت کے لیے اللہ تعالیٰ فرشتوں کو بھیج دیتا ہے۔ وہ فرشتے اپنے پروں سے اس کی نگرانی کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنے ولیوں میں سے کسی ولی کو بھیج دیتا ہے وہ اس کو زمین سے اٹھالیتا ہے اور جو زمین سے کسی ایسی تحریر کو اٹھالے جس میں اللہ کے ناموں میں سے کوئی نام ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے نام کو علیین میں بلند کرے گا۔ اور اس کے ماں باپ کے عذاب میں کمی کردے گا اگر چہ اس ماں باپ کافر ہوں (رواہ الصغیر۔ طبرانی)

استعاذہ وبسملہ

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے "جب تم قرآن مجید پڑھو تو اللہ کی پناہ مانگ لیا کرو مردود شیطان سے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ استعاذہ قرآن مجید کے شروع کرنے سے پہلے پڑھنا چاہیے تاکہ زبان فضول باتوں سے پاک و صاف ہوجائے۔ اس کے بعد بسم اللہ پڑھنی چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جس اچھے کام کے شروع میں بسم اللہ نہ پڑھی جائے وہ کام ادھورا و ناقص رہ جاتا ہے۔ لہٰذا ہر کام کے شروع میں اس کو ضرور پڑھنا چاہیے (ابو داؤد۔ ابن ماجہ) حضرت وہب بن منبہ مشہور تابعی محدث فرماتے ہیں کہ بسم اللہ کو ایسی شرافت و سلطنت حاصل ہے جو اور کلموں کو حاصل نہیں۔ ذبیحہ اسی سے حلال ہوتا ہے تمام عبادتوں اور طہارتوں میں اس کا ہونا ضروری ہے۔ سچے دل سے کہنے والا نہ دریا میں غرق ہوگا، نہ آگ میں جلے گا، نہ سانپ بچھو اس کو ڈسیگا، اور دوزخ کے زبانیہ (فرشتوں) سے محفوظ رہے گا کیونکہ وہ انیس ہیں اور بسم اللہ کے حروف بھی انیس ہیں (فصل الخطاب فی فضل الکتاب) حضرت جعفر بن محمدؒ فرماتے ہیں کہ اگر جماع کے وقت بسم اللہ نہ پڑھے تو اس آدمی کے ذکر (عضو تناسل) پر شیطان مسلط ہو جاتا ہے۔ جماع کے وقت جب کہ بسم اللہ نہیں کہتا تو شیطان بھی اس کے ساتھ جماع کرتا ہے اور مرد کی طرح اسی (فرج) میں انزال کرتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے ایک شخص نے پوچھا کہ میری بیوی جو سو کر بیدار ہوئی تو اس کی شرم گاہ میں آگ کا ایک شعلہ تھا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا یہ شیطان کی وطی ہے تو جماع کے وقت بسم اللہ ضرور کہہ لیا کر۔ حدیث شریف میں رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ جماع کے وقت اگر بسم الله جنبنا الشيطان وجنب الشيطان و رزقتنا (بخاری) پڑھے تو شیطان کچھ نقصان نہیں کرے گا۔ حضرت علیؓ نے ایک بسم اللہ لکھنے والے کو دیکھ کر فرمایا جودھا فان رجلا

بارگاہ ہوئیں اور آپ سید الاولین والآخرین کے لقب سے پکارے گئے۔

سچ تو یہ ہے کہ ہمارے نبی ﷺ نے موت و حیات، دنیاو آخرت کے کسی گوشہ کو نہیں چھوڑا جس کے لئے کم از کم دوچار دعائیں نہ ارشاد فرمائی ہوں۔

قرآن مجید کی بزرگی

قرآن مجید سارا ہی دعا و شفا ہے۔ اگر کوئی شخص صرف قرآن مجید ہی پڑھتا رہے اور کوئی کوئی دعا نہ مانگے تو اللہ تعالیٰ اس کو دعا کرنے والے سے بھی زیادہ مرحمت فرمائے گا چنانچہ رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں من شغله القرآن ذکری و مسئلتی اعطیته افضل ما اعطی السائلین (ترمذی) جو قرآن پڑھنے کی وجہ سے میری یاد اور سوال سے باز رہے، میں اس کو مانگنے والوں سے بھی زیادہ دوں گا۔ کیونکہ قرآن مجید کا پڑھنے والا اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہوتا ہے اور اللہ اپنے کلام کو زیادہ توجہ سے سنتا ہے ۔اس مضمون کے ضمن میں ہم چاہتے ہیں کہ قرآن مجید اور اس کی سورتوں اور بعض آیتوں کی فضیلت بیان کر دیں تاکہ دعا کرنے والا اس ثواب سے محروم نہ رہے۔

قرآن مجید کی تعریف انسانی طاقت سے باہر ہے۔ صرف چند حدیثوں کا ترجمہ ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں من قرء حرفاً من کتاب الله فله حسنة (الحدیث دارمی) جو شخص قرآن مجید کا ایک حرف پڑھے اس کو ایک نیکی ملے گی اور ایک نیکی کا ثواب دس نیکی کے برابر ہے۔ الٓم ایک حرف نہیں ہے بلکہ "الف" ایک حرف ہے "لام" ایک حرف ہے "میم" ایک حرف ہے، تو ان تین حرفوں کے بدلے تیس نیکیاں ملیں گی اور پورے قرآن مجید میں تین لاکھ بائیس ہزار چھ سو ستر (۳۲۲۶۷۰) حروف ہیں۔ ان کو دس گنا کر کے جوڑ یئے تو بتیس لاکھ چھبیس ہزار سات سو (۳۲۲۶۷۰۰) ہوئے تو پورے قرآن مجید پڑھنے کا ثواب بتیس لاکھ چھبیس ہزار سات سو درجے ہوئے۔ اور فرمایا جو شخص قرآن مجید پڑھ کر اس پر عمل کرے اس کے ماں باپ کو قیامت کے روز ایسا تاج پہنایا جائیگا جس کی روشنی آفتاب کی چمک سے زیادہ ہوگی اگر وہ آفتاب تمہارے گھروں میں ہو، جو شخص پڑھ کر عمل کرے تو اس کا کیا حال ہوگا یعنی پڑھنے والے کو اس سے زیادہ بہت کچھ ملے گا (احمد ابو داؤد) اور فرمایا کہ قرآن پڑھنے والے سے کہا جائے گا کہ پڑھتا جا اور جنت کے درجوں پر چڑھتا جا تیرا آخر درجہ وہی ہوگا جو آخر آیت پڑھے گا اور قرآن مجید میں چھ ہزار چھ سو چھیاسی (۶۶۸۶) آیتیں ہیں تو ان کی اسی قدر درجے ملیں گے۔ ہر دو درجوں کے درمیان زمین و آسمان کے برابر فاصلہ ہے (ترمذی) اور فرمایا جو شخص قرآن مجید پڑھے اور اس کے حلال کو حلال اور حرام کو حرام جانے۔ اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل کرے گا اور اس کے گھرانے کے دس دوزخی آدمیوں کے بارے میں اس کی شفاعت قبول فرمائے گا۔ جس گھر میں قرآن مجید پڑھا جاتا ہے اس میں برکت زیادہ ہوتی ہے جس میں نہیں پڑھا جاتا ہے اس میں نہیں ہوتی۔ (بزار) اور فرمایا کہ میری امت

ہے، کوئی فرشتے اور پیر و مرشد کو پکارتا ہے کوئی یا شیخ عبد القادر شیئاً للہ کی مالا جپتا ہے کوئی خواجہ غریب نواز کی دہائی دیتا ہے کوئی پیروں، مرشدوں کی من گھڑت دعاؤں کی تسبیح پڑھتا ہے اور قرآن مجید و حدیث کی دعاؤں سے کوسوں دور بھاگتا ہے حالانکہ قرآن مجید و حدیث کی دعائیں اصل ہیں اور جو ان میں تاثیر ہے وہ اور دعاؤں میں ہو ہی نہیں سکتی۔ اور ان میں عقائد کی اصلاح بھی ہے اگر آپ گہری نظر سے دیکھیں تو ہر دعا میں عقیدے کی درستی موجود ہے کیونکہ بغیر اس کے کوئی عمل مقبول نہیں۔

قرآنی دعائیں جو اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو تعلیم فرمائیں جن کی برکت سے ان کی ضرورتیں و حاجتیں پوری ہوئیں کیونکہ دوسرے انسانوں کی طرح وہ بھی انسان ہی تھے۔ جو دوسرے انسانوں کی ضرورتیں پیش آتی ہیں ان کو بھی پیش آیا کرتی تھیں۔ وہ بیمار بھی ہوتے تو صحت اللہ تعالیٰ ہی سے چاہتے۔ واذا مرضت فھو یشفین (یہ حضرت ابراہیمؑ کا مقولہ ہے "جب میں بیمار ہوتا تو اللہ مجھے اچھا کرتا ہے")۔ بے اولاد ہوتے تو اولاد کے لیے دعا فرماتے رب ھب لی من الصالحین (اے پروردگار تو مجھے نیک اولاد دے)۔ لوگ ستاتے تو ان سے نجات کے لیے دربار خداوندی میں دست بدعا ہوتے رب نجنی من القوم الظالمین (اے اللہ مجھے ظالم قوم سے نجات دے) لغزشیں ہو جاتیں تو اس سے معافی چاہتے۔ حضرت ابوالبشر آدم علیٰ نبینا و علیہ السلام سے لغزش ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں القا کیا کہ تم یہ دعا پڑھو۔ ہم تمہاری لغزش معاف کر دیں گے۔ حضرت آدم علیہ السلام ربنا ظلمنا انفسنا و ان لم تغفر لنا و ترحمنا لنکونن من الخاسرین پڑھنے لگے اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرما کر عفو و کرم سے مشرف فرمایا۔

حضرت یونس علیہ السلام سے بھی غلطی ہو گئی تو لا الہ الا انت سبحانك انی کنت من الظالمین کی التجا سے دریا اور شکم ماہی سے نجات حاصل کی۔ حضرت نوح علیہ السلام نے دشمنوں سے خلاصی کے لیے دعا کی جو قبول ہوئی۔ حضرت زکریا علیہ السلام نے طلب اولاد کے لیے دعا کی دربار الٰہی میں قبول ہو کر ایسا فرزند عطا ہوا کہ لم نجعل له من قبل سمیا اور سلام علیه یوم ولد ویوم یموت ویوم تبعث حیا سے سرفراز ہوا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی یہ دعا کی رب ھب لی من الصالحین جو قبول ہو کر اسماعیل صادق الوعد وکان رسولا نبیا جیسا یادگار عالم عطا ہوا اور ووھبنا له اسحق و یعقوب وکلا جعلنا صلحین کی بشارت عظمیٰ سے مسرور ہو کر الحمد للہ الذی وھب لی علی الکبر اسماعیل و اسحق ان ربی لسمیع الدعا سے شکریہ ادا فرمایا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون جیسے جابر، ظالم بادشاہ سے آزاد ہونے کی درخواست کی جو قبول بارگاہ ہوئی اور ان کو قلنا لا تخف انك انت الاعلیٰ سے تسلی دی گئی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے نزول مائدہ کی دعا فرمائی جو قبول ہوئی۔ ہمارے نبی ﷺ نے رب زدنی علما وغیرہ کی دعائیں فرمائی جو مقبول

کی فریاد کو سنتا اور عموماً اس کی مصیبتوں کو دور کرتا ہے۔ انسان ہر مصیبت کو دور کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی سہارا ضرور تلاش کرتا ہے حتیٰ کہ دہریئے (خدا کے منکر) ملحد اور بڑے بڑے مغرور بھی اپنی سمجھ اور عقیدے کے مطابق اپنے سے بڑی ذات کا وسیلہ وذریعہ بناتے ہیں اور اس کے دامن کو پکڑ کر نجات حاصل کرنے کے خواہاں رہتے ہیں۔ بعضوں نے مورتوں کو پکارا کسی نے چاند سورج، مریخ وغیرہ ستاروں کی منت و سماجت و خوشامد کی۔ اور دہائی دی کہ اس آڑے وقت میں کام آئیں۔ مگر جب ان سے حاجت روائی نہیں ہوتی تو تمام مادی وصوری اور ظاہری ذریعوں سے منہ پھیر کر صرف ایک ذات (اللہ تعالیٰ) کی طرف متوجہ ہو کر نہایت عاجزی وانکساری، آہ وزاری سے پکارتے اور دعائیں کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان پریشان حال لوگوں کی پکار کو قبول فرما کر انہیں دامنِ رحمت میں چھپا لیتا ہے۔ جب خدا ہی اس آڑے وقت و مصیبت میں کام آنے والا ہے تو ہر حالت میں اسی کو پکارنا چاہیے۔ دوسرے عاجز و محتاجوں کو پکارنے سے کیا فائدہ کیونکہ وہ تو اس پکار کو سنتے ہی نہیں، فائدہ پہنچانا تو در کنار ومن اضل ممن یدعون من دون اللہ من لایستجیب لہ الیٰ یوم القیامۃ وھم عن دعائھم غافلون (سورہ احقاف) ان سے زیادہ گمراہ کون ہوگا جو اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہیں جو قیامت تک ان کی بات کو نہیں سن سکتے۔ حالانکہ وہ ان کی پکار سے بھی بے خبر ہیں (کیونکہ وہ ان ہی جیسے مجبور، عاجز بندے ہیں) ان الـذین تدعون من دون اللہ عباد امثالکم (اعراف)

بیشک اللہ کے سوا جن کو تم اپنی مدد کے لیے پکارتے ہو وہ تمہارے ہی جیسے عاجز بندے ہیں بلکہ وہ تم سے بھی زیادہ عاجز ہیں کیونکہ زندہ انسان اپنی بعض مصیبتوں کو دور کر سکتا ہے اور وہ بے جان تو اپنی مصیبت کو دور کر ہی نہیں سکتے۔ دوسروں کی مصیبت کیا دور کریں گے۔ والذین تدعون من دونہ لا یستطیعون نصرکم ولا انفسھم ینصرون (اعراف) وہ لوگ جنہیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو نہ وہ تمہاری مدد کر سکتے ہیں اور نہ وہ اپنی ہی مدد کر سکتے ہیں۔ آیات مذکورہ سے یہ ثابت ہوا کہ سب ہیچ اور بے بس ہیں کوئی کسی کی مدد اور تکلیف کو دور نہیں کر سکتا۔ مددگار صرف اور صرف اللہ ہی کی ذات ہے ہر حالت میں اللہ ہی کو پکاریں اور اسی سے دعائیں کریں۔ پکار میں دوسرے کو شریک نہ کریں فلا تدعوا مع اللہ احداً اللہ کے ساتھ کسی کو بھی مت پکارو (ورنہ تمہارے سب کام خراب ہو جائیں گے) ولا تدع من دون اللہ مالا ینفعك فان فعلت فانك اذا من الظٰلمین اللہ تعالیٰ کے سوا ان چیزوں کو مت پکارو جو (پکارنے سے) فائدہ اور چھوڑنے سے کچھ تکلیف نہ پہنچا سکیں۔ پھر اگر تم ایسا کرو گے تو اس وقت یقیناً ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔

قرآن مجید میں اس قسم کی بے شمار آیتیں ہیں کہ ہر حالت میں اللہ تعالیٰ ہی کو پکارنا چاہیے اور ہر چیز کو اسی سے مانگنا چاہیے۔ پھر بھی بہت سے ناواقف مسلمان مصیبت میں خدا کو چھوڑ کر دوسروں کو پکارتے ہیں کوئی کسی نبی، ولی کو پکارتا

بسم الله الرحمن الرحیم

الحمد لله الذی یجیب المضطر اذا دعاه و یکشف السوء ویجعلکم خلفاء والصلوٰة والسلام علیٰ سید الرسل والانبیاء و آله النجباء و النخباء و اتباعه الکرماء۔ امابعد

پروردگار عالم نے اس کارگاہ عالم فانی میں آرام و تکلیف، رنج و غم، دوست دشمن، بیماری، تندرستی اور طرح طرح کی صدہا راحتوں اور مصیبتوں کو پیدا فرما کر سب مخلوق اور خاص کر انسانوں کو اس میں مبتلا کی لقد خلقنا الانسان فی کبد ہم نے انسان کو مشقت اور تکلیف میں پیدا کیا ہے۔ ابتداء آفرینش سے لے کر قیامت تک گوناگوں پریشانیوں میں گھرا رہتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی اس کی نجات کے لیے مختلف احتیاطی تدبیریں بھی مقرر فرما دی ہیں کہ جن پر گامزن رہنے سے پریشانیاں دور ہو سکتی ہیں۔ جیسے سردی سے بچاؤ کے لیے گرم سامان اور گرمی سے بچاؤ کے لیے ٹھنڈ پہنچانے والی چیزیں اور دشمن سے بچاؤ کے لیے سامانِ جنگ، رنج و غم دور کرنے کے لیے آرام و راحت کے اسباب، بیماری کو دور کرنے کے لیے دعائیں اور دوائیں پیدا کیں۔ حدیث میں آیا ہے ما انزل الله داء الا انزل له شفاء (بخاری) ہر بیماری کے لیے شفا اور دوا اللہ تعالیٰ نے پیدا کر دی ہے۔ در حقیقت اللہ تعالیٰ ہی رنج و غم، تکلیف و مصیبت وغیرہ پیدا کرنے والا اور وہی ان مصیبتوں کو دور فرما کر راحت و آرام صحت و تندرستی عطا فرمانے والا ہے۔ ہر چیز پر قادر و مختار کل ہے۔ وہ بڑا داتا ہے۔ وہ اس بات کو بہت محبوب رکھتا اور پسند کرتا ہے کہ اسے کوئی پکارے اور مانگے۔ اسی پکارنے اور مانگنے کو دعا کہتے ہیں امن یجیب المضطر اذا دعاه و یکشف السوء "بھلا ہے کوئی جو بے قرار و پریشان حال کی فریاد کو سنے جب کہ وہ اسے پکارے اور وہ تکلیف کو دور کر دے۔" یعنی اللہ تعالیٰ ہی بے چین و بیقرار

جاتے ہیں ان سے نجات رہے۔

اور بعض صوفیا نے ملنے جلنے کو روا رکھا ہے جیسا کہ ظاہر احادیث میں صالحین کی صحبت میں بیٹھنے کی ترغیب ہے اور نیک لوگوں سے ملنے جلنے کو آخرت کے لیے سود مند بتایا گیا ہے۔ خود فرمانِ الٰہی ہے: الاخلاء یومئذ بعضهم لبعض عدو الا المتقین (الزخرف ۴۳۔۶۷) "اس روز دوست باہم دشمن ہوں گے مگر متقی حضرات کہ وہ دوست ہی رہیں گے۔"

حضرت احمد بن حواریؒ سے دریافت کیا گیا کہ نجات کا راستہ کیا ہے؟ تو فرمایا حیف! ہمارے اور اس راستے کے درمیان بے شمار گھاٹیاں ہیں جو محض اس طرح سر ہو سکتی ہیں کہ بڑی سرعت سے سفر ہو۔ اللہ تعالیٰ سے اپنا معاملہ درست کیا جائے۔ اور مشغول کرنے والے تعلقات کو ختم کیا جائے۔

شیر نے بات مان لی

حضرت ابراہیم ادہمؒ اپنے مصاحبین کے ساتھ تشریف فرما تھے کچھ لوگ پریشان حال مجلس میں آئے اور کہنے لگے حضور والا! ایک شیر ہمارے راستے میں آگیا ہے۔ حضرت وہاں تشریف لے گئے اور شیر سے فرمایا:

"ابوالحارث! اگر تجھے ہمارے بارے میں کوئی حکم ہوا ہے تو تو اس پر عمل کر اور اگر ایسا نہیں ہے تو راستے سے ہٹ جا۔"

حضرت کی بات سن کر شیر وہاں سے چلا گیا۔ جاتے ہوئے دل گرفتہ چلا تا جا رہا تھا۔ پھر آپ نے لوگوں کو یہ تلقین کی کہ نیند سے اٹھنے کے بعد اسے پڑھ لیا کرو

"اے اللہ! تو اپنی چشم عنایت سے جسے کبھی نیند نہیں ہماری نگہبانی فرما۔ اور اپنی اس پناہ سے جس کا قصد کوئی کر سکتا ہے ہماری حفاظت فرما اور اپنی قدرت سے ہم پر رحم فرما کیونکہ تجھ پر بھروسہ اور امید کرنے کے بعد ہم ہلاک نہیں ہوں گے۔"

شیر کی گوشمالی

حضرت سفیان ثوریؒ اور شیبان راعیؒ حج کے لیے تشریف لے جا رہے تھے۔ حضرت سفیان فرماتے ہیں اچانک ہمارے راستے میں ایک شیر آگیا:

حضرت سفیانؒ: (شیبان راعیؒ سے مخاطب ہو کر) اس کتے کو آپ دیکھ رہے ہیں جو سامنے آرہا ہے؟

حضرت شیبانؒ: ڈرو نہیں۔

اور حضرت شیبان کی آواز سن کر کتے کی طرح دم ہلانے لگا اور ان کو خوش کرنے لگا اور شیبان نے اس کا کان گرم کیا۔

حضرت سفیان: آخر یہ سب کیا ہے؟

حضرت شیبان: کچھ بھی نہیں سفیان! اگر مجھے شہرت کا اندیشہ نہ ہوتا تو اپنا سفر اس کی پشت پر لاد کر مکہ معظمہ تک لے جاتا۔

ایک بزرگ کے بارے میں روایت ہے کہ وہ پہاڑ پر رہتے تھے جب بارش ہوتی یا انہیں سردی لگتی تو کئی شیر جمع ہو کر انہیں لپٹا لیتے اور ان کے جسم کو گرمی فراہم کرتے۔

☆☆☆

ہوئی۔ خیر اب تو بتا تو یہاں سے جاتا ہے یا میں خود چلا جاؤں، وہ چلا گیا۔

حضرت ابراہیم بن ادہمؒ فرماتے ہیں "تو اگر خود کو ہمہ وقت توبہ کے آئینے میں دیکھتا ہے تو معصیت کی قباحت تجھ پر عیاں ہو جائے گی۔"

انہی کا ارشاد ہے:

"لوگوں سے پہچان کم کرو، جن لوگوں سے جان پہچان نہیں ہے ان سے پہچان نہ پیدا کرو اور جن سے ہے ان سے بھی کنارہ کشی کرو اور جس طرح خونخوار درندے سے دور رہتے ہو اسی طرح لوگوں سے بھاگو۔ جمعہ اور جماعت سے کبھی پیچھے نہ رہو۔

ایک بزرگ نے فرمایا:

"تم انجان لوگوں سے پہچان پیدا کرنا چاہتے ہو، اور ہم پہچان والوں سے انجان بنتے ہیں۔"

میں نے سوچا مجھے اچھا سا کوئی دوست ملے مخلص و معتقد اور راز چھپانے والا
ولوی سنگ نظر آئی مجھے ہر بستی جو ملا دل کو نیا زخم لگانے والا

حضرت علامہ یافعی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

حضرت امام ابراہیم بن ادہم وغیرہ نے فرمایا، یہ سلف صالحین کے دو مذہب فکر میں سے ایک ہے۔ وہ حضرات تنہائی کو سلامتی کا ذریعہ خیال فرماتے ہیں تاکہ عبادت کے لیے فراغت رہے اور میل جول کے بعد جو لوگوں کے حقوق ہو

سے میری بھوک بھی مٹ جاتی ہے پیاس بھی رفع ہو جاتی ہے ...... اس کے علاوہ گرمی سردی، نیند سستی غنودگی اور نامانوسی اور وحشت یہ تمام چیزیں مجھ سے دور رہتی ہیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا "اب تم ہمارے ساتھ بیٹھنا چاہتے ہو یا تمہیں تمہاری جگہ پہنچادیا جائے؟"

نوجوان نے کہا "حضور مجھے میری ہی جگہ بھجوادی جائے۔"

حضرت سلیمان علیہ السلام نے حضرت آصف رضی اللہ عنہ کو حکم دیا اور انہوں نے قبہ اٹھاکر پھر سمندر کی تہہ میں پہنچادیا۔

اس کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا "اللہ تم پر رحم کرے دیکھو والدین کی دعا کتنا مقبول ہے ان کی نافرمانی سے بچو۔"

جن کو حق سے قرار ملتا ہے

شیخ ذوالنون مصریؒ راوی ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی آئی:

"اے موسیٰ! اس پرندہ کی طرح زندگی گزار و جو اکیلے رہتا ہے۔ درختوں سے اپنی روزی لیتا ہے۔ خالص پانی یا یہ کہ نہر کا پانی پیتا ہے۔ رات کے وقت کسی غار میں پناہ لیتا ہے اس لیے کہ اسے مجھ سے محبت اور میرے نافرمانوں سے نفرت ہے۔ اے موسیٰ! یہ میری قسم ہے کہ کسی عمل کے دعویدار کا عمل پورا نہیں ہونے دوں گا اور جو میرے علاوہ کسی سے امید رکھتا ہے اس کی امید کاٹ ڈالوں گا اور جو غیر اللہ پر اعتماد کرے گا اس کی پشت توڑ دوں گا اور جو غیر اللہ سے انس رکھے گا اسے طویل وحشت میں گرفتار کر دوں گا۔ اور جو غیر سے محبت کرے گا اس سے کنارہ کش ہو جاؤں گا۔ اے موسیٰ! میرے کچھ بندے ایسے ہیں کہ وہ اگر مجھے پکارتے ہیں تو میں ان کی طرف توجہ فرماتا ہوں میری جانب چلتے ہیں تو انہیں اپنے نزدیک کرتا ہوں۔ میرا تقرب تلاش کرتے ہیں تو جام وصال پلاتا ہوں اور کفایت کرتا ہوں۔ مجھے سرپرست بناتے ہیں تو سرپرستی قبول کرتا ہوں۔ اگر مجھ سے مخلصانہ محبت کرتے ہیں تو میں بھی اسی طرح پیار کرتا ہوں۔ ان کے دلوں کی نگہداشت کرتا ہوں۔ ان کے حالات کی سرپرستی کرتا ہوں۔ میں نے ان کے قلوب کی تسلی صرف اپنے ذکر سے فرمادی ہے۔ ذکر ہی ان کے امراض کا علاج ہے۔ ذکر ہی سے ان کے قلوب کی منزل میرے پاس بناتے ہیں اور انہیں میرے سوا قرار بھی نہیں آتا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ان بندگان خاص سے ملحق فرمائے۔ آمین

انقطاع و یکسوئی

حضرت فضیل بن عیاضؒ مسجد میں تشریف فرماتھے ایک شخص آپ کے پاس آیا، سلام کر کے بیٹھا، آپ نے دریافت فرمایا کیوں آئے ہو؟ اس نے کہا اے ابو علی! آپ سے انس کے لیے آیا ہوں۔

فرمایا، یہ انس تو نہیں، یہ تو نری وحشت

کر حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں حاضر کیا، جس میں چار دروازے تھے۔ ایک دروازہ موتی کا، دوسرا یاقوت کا، تیسرا ہیرے کا اور چوتھا زمرد کا، چاروں دروازے کھلے ہونے کے باوجود اندر سمندر کے پانی کا ایک قطرہ بھی داخل نہیں ہوتا تھا۔ حالانکہ قبہ سمندر کی تہہ میں تھا ...... حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملاحظہ فرمایا کہ اس کے اندر ایک خوبصورت جوان صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے نماز میں مشغول ہے۔ آپ قبہ کے اندر تشریف لے گئے اور اسے سلام کر کے دریافت فرمایا اس سمندر کی تہہ میں تم کیسے پہنچ گئے؟ اس نے جواب دیا "اے اللہ کے نبی! میرے ماں باپ معذور تھے اور میری ماں نابینا تھیں میں نے ان دونوں کی ستر سال تک خدمت کی۔ میری ماں کا جب انتقال ہونے لگا تو اس نے دعا کی کہ خداوندا! اپنی طاعت میں میرے فرزند کو عمر دراز عطا فرما۔ اسی طرح جب میرے باپ کا وصال ہونے لگا تو انہوں نے دعا کی۔ پروردگار میرے بیٹے کو ایسی جگہ عبادت میں لگا جہاں شیطان کا دخل نہ ہو سکے۔ میں اپنے والد کو دفن کر کے جب اس ساحل پر آیا تو مجھے یہ قبہ نظر آیا۔ اس کی خوبصورتی کا مشاہدہ کرنے کے لیے میں اس کے اندر چلا گیا۔ اتنے میں ایک فرشتہ وارد ہوا اور اس نے قبہ کو سمندر کی تہہ میں اتار دیا۔"

حضرت سلیمانؑ نے اس سے دریافت کیا تم کس زمانے میں یہاں آئے۔ نوجوان نے جواب دیا۔ سیدنا ابراہیمؑ کے زمانے میں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے جان لیا کہ اسے دو ہزار سال ہو گئے ہیں۔ مگر وہ اب تک بالکل جوان ہے اور اس کا بال بھی سفید نہیں ہوا ہے۔

حضرت سلیمانؑ نے اس سے دریافت کیا "تم وہاں کھاتے کیا ہو؟"

نوجوان نے جواب دیا "اے اللہ کے نبی! ایک سبز پرندہ روزانہ اپنی چونچ میں سر برابر کی ایک زرد چیز لے کر آتا ہے میں اسے کھا لیتا ہوں اور اس میں دنیا کی تمام نعمتوں کا لطف ہوتا ہے اس

رحمۃ للعالمین

اللہ تعالیٰ نے تمام کائنات کے لیے حضور کو رحمت بنا کر بھیجا۔ آپ کا یہ وصف قرآن حکیم نے خصوصیت سے بیان کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلاَّ رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ ۝

"ہم نے آپؐ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ حضورؐ نے دنیا پر یہ احسان کیا کہ تمام انسانوں کو ان کے حقوق دلائے۔ ماں، باپ، بہن، بھائی سب کے فرائض کی پوری پوری تشریح کی۔

عدل و انصاف کو عام کیا۔ سچائی کا درس دیا، لڑکیوں کی تعلیم پر زور دیا، غلاموں کو یہاں تک عزت بخشی کہ وہ مخدوم اور آقا بن گئے۔

حیوانات تک کے بارے میں فرمایا کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ ہمیں ہر جاندار کی خدمت کرنی چاہیے کیونکہ ان کی خدمت کرنے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجر ملتا ہے۔

صلح کرلی ہے ساتھیوں نے بھی اپنے سردار کا اتباع کیا اور راپنی اپنی تلواریں توڑ کر رہزنی کے کپڑے اتار پھینکے اور مکہ معظمہ کا قصد کر کے سب نے احرام باندھا...... تین شبانہ روز چلنے کے بعد جب وہ لوگ ایک گاؤں پہنچے تو وہاں انہوں نے ایک نابینا ضعیفہ کو پایا۔ اس نے پوچھا تم لوگوں میں فلاں نام کردی ہے؟ (اور اس نے ان کے سردار کا نام لیا) سردار نے کہا ہاں! وہ میں ہوں۔

ضعیفہ نے کہا کہ میرے بیٹے کا انتقال ہو چکا ہے، یہ سب اس کے کپڑے رکھے ہیں، میں تین روز سے متواتر حضور سرور عالم ﷺ کو خواب میں دیکھتی ہوں۔ سرکار ﷺ کا حکم ہے کہ یہ تمام کپڑے میں تمہیں دے دوں۔

اس طرح ڈاکوؤں نے سچی توبہ کر کے حضور ﷺ کی بشارت کے ذریعہ صالحیت کے لباس پائے اور انہیں پہن کر حرمین طیبین کی جانب روانہ ہوئے۔

دیناروں کی بارش

حضرت عبد الواحد بن زید ؒ کی مجلس میں قریش کے کچھ شرفاء بیٹھا کرتے تھے۔ ایک روز ان میں سے کسی نے کہا ہم لوگوں کو تنگ دستی کی وجہ سے تباہی اور موت کا اندیشہ ہے۔ حضرت نے آسمان کی جانب نگاہ اٹھا کر دعا کی۔

"اے اللہ میں تجھ سے سوال کرتا ہو کہ تیرے اس اسم رفیع کے وسیلے سے جس سے تو مخصوص اولیاء میں سے جسے چاہتا ہے نواز تا ہے اور وہ نام اپنے برگزیدہ بندے کے دل میں الہام فرماتا ہے۔ تو اسی وقت ہمیں ایسا رزق عطا فرما جس سے شیطانی خیالات میرے اور میرے دوستوں سے دور ہو جائیں۔ بیشک تو احسان فرمانے والا، قدیم الاحسان ہے۔ اے اللہ! ابھی ......ابھی......ابھی"۔

اسی وقت حاضرین نے چھت شق ہونے کی آواز سنی اور دیناروں کی بارش ہونے لگی۔ پھر حضرت نے فرمایا اللہ تعالیٰ پر توکل کر کے غیر خدا سے بے نیاز ہو جاؤ...... پھر آپ نے حکم دیا کہ سب دینار اٹھا لو۔ ان لوگوں نے لے لیے اور حضرت نے خود کچھ نہیں لیا۔

دعائے والدین کی کرامت

اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو وحی فرمائی کہ سمندر کے کنارے جائیں اور قدرت الٰہیہ کا تماشہ دیکھیں۔ حضرت اپنے مصاحبین کے ساتھ تشریف لے گئے مگر انہیں کوئی ایسی شے نظر نہیں آئی۔ آپ نے ایک جن کو حکم دیا کہ سمندر میں غوطہ لگا کر اندر کی خبر لاؤ...... عفریت نے غوطہ لگایا مگر کچھ نہ پایا اور واپس آکر عرض کیا اے اللہ کے نبی! میں نے غوطہ لگایا مگر سمندر کی تہہ تک نہیں پہنچ سکا اور نہ کوئی شے دیکھی ...... حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس سے قوی جن کو غوطہ خوری کا حکم دیا مگر وہ بھی نامراد واپس آیا۔ فرق یہ ہے کہ اس سے دوگنی مسافت تک اندر گیا۔ اب آپ نے اپنے وزیر آصف بن برخیا کو سمندر میں اترنے کا حکم دیا...... انہوں نے تھوڑی دیر میں ایک سفید کافوری قبہ لا

ادارہ

درسِ توکل

فصلوں کی کٹائی کا زمانہ تھا، کسان کھیتوں میں مشغول تھے۔ ایک نیک بخت شخص اس زمانے میں رزق کی تلاش میں اپنے گوشہ سے نکلا۔ راستہ میں بارش ہونے لگی تو وہ ایک جگہ رک گیا۔ جہاں سے ایک غار نظر آیا۔ اس نے دیکھا کہ اس کے اندر ایک اندھا عقاب پڑا ہوا ہے۔ نیک مرد نے سوچا یہ عقاب کہاں سے کھاتا پیتا ہوگا۔ اتنے میں اس نے دیکھا کہ ایک کبوتری بارش سے بھاگ کر اس غار میں چھپنے کے لیے داخل ہوئی اور اتفاقاً عقاب پر گر پڑی۔ عقاب نے اسے اپنے پنجہ میں لے لیا اور کھا گیا نیک مرد یہ واقعہ دیکھ کر وہیں سے توکل کے ساتھ اپنے گوشہ میں لوٹ آیا۔

ڈاکو نیک بن گئے

کردستان میں ڈاکوؤں کا ایک سردار تھا اس نے بیان کیا کہ ایک روز ہم لوگ لوٹ مار کی نیت سے ایک جگہ بیٹھے ہوئے تھے۔ اس جگہ تین کھجور کے درخت تھے مگر صرف ایک پر پھل لگے ہوئے تھے میں نے دیکھا ایک چڑیا پھل دار پیڑ پر سے کھجور منہ میں لے کر دوسرے پیڑ پر جاتی ہے۔ اس چڑیا نے اس طرح دس بار چکر لگایا۔ میرے دل میں جستجو ہوئی کہ دیکھوں یہ چڑیا کھجوریں جاکر کسے کھلاتی ہے...... درخت پر چڑھ کر جب دیکھا تو ایک اندھا سانپ منہ کھولے بیٹھا تھا۔ اور چڑیا کھجور لالا کر اسی کے منہ میں ڈالتی تھی۔ یہ دیکھ کر مجھے رونا آگیا اور میں نے کہا:

"یارب العالمین! یہ وہ موذی جانور ہے جس کے قتل کا حکم تیرے محبوب رسول سیدنا محمد ﷺ نے دیا ہے۔ اور میں تیرا بندہ تیری وحدانیت کا معترف ہو کر لوٹ مار میں پھنسا ہوں۔ اسی لمحہ دل میں یہ بات اتری کہ اے شخص توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ میں نے اپنی تلوار توڑ ڈالی اور توبہ توبہ چلاتے ہوئے وہاں سے بھاگا...... اس وقت غیب سے آواز سنائی دی۔ اے بندے میں نے تیری توبہ قبول کی۔ ڈاکوؤں کا سردار اپنے ساتھیوں کے پاس آیا اور انہیں سارا واقعہ کہہ سنایا اور کہا میں راندۂ درگاہ تھا مگر اب رحمتِ خداوندی نے مجھے پناہ دے دی ہے اور میں نے اطاعت پر

تھے۔ عیاب نے آکر سلام کیا اور خلیفہ کا فرمان ایک طرف رکھ کر انتظار کرنے لگا۔ موسیٰ بدستور لکھنے میں مصروف رہا اور اس کی طرف زیادہ توجہ نہ کی۔ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ خس خانے کی خنکی اور ہوا کی تیزی کے اثر سے عیاب کی آنکھ لگ گئی۔

موسیٰ نے اسے سوتا پایا تو آہستہ سے اٹھا۔ دبے پاؤں جاکر خلیفہ کا فرمان اٹھایا اور اسے کاغذوں میں چھپا کر پہلے کی طرح اپنی جگہ آبیٹھا۔ اتنے میں عیاب کی آنکھ کھل گئی اور یہ دیکھ کر بدستور لکھنے میں مصروف ہے، وہ پھر سو گیا۔ اسی طرح کئی مرتبہ اس کی آنکھ کھل گئی اور کئی مرتبہ نیند آئی۔ آخر وہ اٹھ بیٹھا اور موسیٰ کو مخاطب کر کے کہنے لگا "آپ اب تک لکھنے میں مصروف ہیں اور میرے مطالبے کی طرف توجہ نہیں فرماتے۔"

موسیٰ نے پوچھا "تمہارا کیا مطالبہ ہے، تم نے تو مجھ سے کچھ بیان نہیں کیا؟"

عیاب نے جواب دیا "امیر المومنین کا فرمان لے کر آیا ہوں۔"

موسیٰ بولا "امیر المومنین کا فرمان سر آنکھوں پر۔ لاؤ کدھر ہے؟"

عیاب نے ادھر ادھر تلاش کی مگر بے سود۔ فرمان غائب تھا۔ پریشان ہو کر بولا "یہاں رکھا تھا۔"

موسیٰ نے کہا "یہاں کوئی فرمان نظر نہیں آتا۔ معلوم ہوتا ہے تم نے خواب دیکھا ہے۔ اسی لیے ایسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو۔"

عیاب نے اپنا سر پیٹ لیا اور چلا کر بولا کہ "فرمان کی چوری ہوئی ہے۔ میں قسمیہ کہتا ہوں کہ میں نے اپنے ہاتھ سے یہاں رکھا تھا۔"

موسیٰ نے حاضرین کو مخاطب کر کے کہا "لکھ لو کہ یہ جھوٹ بولتے ہیں۔ اگر ان کے پاس واقعی کوئی فرمان تھا تو یہ اسے یہاں لے کر نہیں آئے، بلکہ راستے ہی میں کہیں گرا آئے ہیں۔"

اب عیاب کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا کہ وہ عبداللہ بن خاقان کے پاس جائے اور سارا واقعہ سنا کر امداد کی درخواست کرے۔ چنانچہ وہ عبداللہ کی خدمت میں پہنچا اور اسے صورت حال سے آگاہ کیا۔ عبداللہ اسے متوکل کے پاس لے گیا اور تمام واقعہ دہرایا۔

متوکل بہت ہنسا اور بولا "عیاب کو خوب دھوکہ دیا۔"

یہ کہہ کر حکم دیا کہ "موسیٰ کو بلاؤ" جب وہ حاضر ہوا تو متوکل نے سوال کیا "یا موسیٰ! تم نے فرمان چرایا ہے؟"

موسیٰ نے جواب میں عرض کی "یا امیر المومنین! نصف رقم نقد جمع کر چکا ہوں اور اسی وقت خزانے میں بھجوا رہا ہوں۔ باقی نصف رقم پانچ روز تک پہنچا دوں گا۔"

یہ کہہ کر امیر المومنین کا حکم نامہ نکالا اور سامنے رکھ دیا۔

متوکل نے اس دلچسپ حرکت کی بنا پر اس کا قصور معاف کر دیا اور موسیٰ کی طرف سے اس کا دل صاف ہو گیا۔ (اگلے ماہ دیگر)

غریب ہاشمی کو چھوڑ دو۔ اس پر بڑا احسان ہو گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ تمہارے پیچھے کوئی جاسوس نہیں لگایا جائے گا۔"

وزیر نے زمین کا بوسہ دیا اور دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے غصے کی حالت میں اس جاسوس کو قتل نہیں کرایا تھا نہ مار پیٹ کی تھی۔ چنانچہ گھر آکر اس نے جاسوس کو بلوایا اور بڑا قیمتی خلعت اور انعام واکرام دے کر رخصت کیا۔ اس دن کے بعد امیر المومنین تک وزیر کی روزانہ زندگی کے حالات وواقعات پہنچنے کا سلسلہ بند ہو گیا۔

خلیفہ کے فرمان کی چوری

امیر المومنین متوکل کے وزیر موسیٰ بن عبد الملک نے ایک مرتبہ بیت المال سے ایک بہت بڑی رقم قرض لی تھی۔ اتفاق ایسا ہوا کہ قرض کی میعاد گزر گئی اور موسیٰ وہ رقم ادا نہ کر سکا۔ اس پر متوکل نے حکم لکھوایا کہ "فوراً قرضے کی رقم ادا کر دو ورنہ وقت آگیا ہے کہ تم کو سزا دی جائے اور بے عزت کیا جائے۔"

اس حکم پر دستخط کر کے خلیفہ نے اپنے ایک مصاحب عیاب کے حوالے کیا اور کہا کہ "موسیٰ کو یہ حکم نامہ پہنچاؤ اور رقم کا مطالبہ کرو۔"

ابھی عیاب راستے ہی میں تھا کہ موسیٰ کو خلیفہ کا فرمان نافذ ہونے کی اطلاع پہنچائی چنانچہ وہ ادھر ادھر آدمی دوڑا کر قرض کے طور پر رقمیں منگوانے لگا۔

ابھی وہ اس طریقے سے رقمیں جمع کر رہا تھا کہ عیاب آپہنچا۔ موسیٰ اس وقت خس خانے میں بیٹھا ہوا خطوط لکھ رہا تھا اور دو غلام پنکھے جھل رہے

باہر چلا۔

قاسم کا مختار کچھ فاصلے سے اس کے پیچھے ہو لیا۔ وزیر کے احاطے سے باہر نکل کر یہ اپاہج شخص سیدھا کھڑا ہو گیا اور بھلے چنگے کی طرح چلنے لگا۔

چند قدم چلا ہوگا کہ ایک خادم ملا۔ اس نے کاغذ قلم اور دوات پیش کی۔ اپاہج تھوڑی دیر تک کچھ لکھتا رہا۔ مختار سمجھ گیا کہ وزیر کی نقل و حرکت کی روداد لکھی جا رہی ہے۔ انہی قدموں لوٹ کر وزیر کے پاس پہنچا اور اسے جاسوس کے متعلق اطلاع پہنچائی۔

دوسرے دن مختار پچھلی رات ہی کو وزیر کے ہاں جا پہنچا اور دو چار غلاموں کے ساتھ جاسوس کا انتظار کرنے لگا۔ ادھر جاسوس پہنچا ادھر مختار نے غلاموں کو اشارہ کیا اور جاسوس صاحب پکڑے گئے۔

جب اسے وزیر کی خدمت میں پیش کیا گیا تو اس نے پوچھا "تو کون ہے؟"

جاسوس نے جواب دیا "جان کی امان پاؤں تو عرض کروں۔"

قاسم نے کہا "امان دی مگر سچ بولنا اور کوئی بات نہ چھپانا۔"

جاسوس نے کہا "میں فلاں ہاشمی ہوں اور میرا گھر فلاں محلے میں ہے دربارِ خلافت سے پچاس اشرفی ماہانہ وظیفہ مقرر ہے کام صرف یہ ہے کہ روزانہ بھیس بدل کر نکلوں اور لوگوں کی روزانہ زندگی کے حالات و واقعات معلوم کر کے لکھ لوں۔ چنانچہ مدت سے یہ فرض انجام دے رہا ہوں جو روداد تیار کرتا ہوں اس کے امیر المومنین تک پہنچانے کی صورت یہ ہے کہ روزانہ مغرب کی نماز کے وقت قصرِ خلافت سے ایک خادم آتا ہے اور میری روداد لے جاتا ہے اسی طرح ہر مہینے کی ۲۹ کو یہی خادم میری تنخواہ مجھے پہنچا جاتا ہے۔"

شام ہوئی تو مختار اس جاسوس کے محلے میں گیا اور اس کے گھر کے پاس جا کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ ٹھیک مغرب کی نماز کے بعد امیر المومنین کا خادم آیا اور جاسوس کو آواز دی ایک کنیز نے جواب دیا کہ آج میرا آقا ابھی تک شہر سے نہیں لوٹے ہیں اور ہم سب پریشان ہیں کیونکہ آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ اس وقت تک گھر نہ پہنچا ہو۔ اللہ جانتا ہے کیا قصہ ہے؟"

مختار بیان کرتا ہے کہ "یہ سن کر خادم لوٹ گیا میں بھی وزیر کی خدمت میں پہنچا اور ساری کیفیت کہہ سنائی۔

دوسرے دن میں پھر اسی محلے میں گیا اور جاسوس کے مکان کے قریب سے گزرا تو اندر سے رونے پیٹنے کی آوازیں آئیں اس کے اعزا و اقربا جمع تھے اور زور شور سے ماتم ہو رہا تھا۔ میں تھوڑے سے فاصلے پر ایک طرف کھڑا ہو گیا اور مغرب کی نماز کا انتظار کرنے لگا ادھر لوگ نماز سے فارغ ہوئے ادھر خلیفہ کا خادم وہاں پہنچا اور جاسوس کا حال معلوم کر کے چلا گیا۔ میں نے لوٹ کر وزیر کو اطلاع پہنچائی اور اپنے گھر چلا آیا۔"

دوسرے دن جب وزیر امیر المومنین کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان کی نظر اس پر پڑی تو قریب بلا کر کہا "تمہیں ہماری جان کی قسم ہے اس

نے جواب دیا" امیر المومنین نے ان
میری عزت افزائی کی ہے لیکن
یا مجال کہ ایسی گستاخی کا خیال بھی دل
"

نے خادم کو تو ٹال دیا مگر اس کے دماغ
ا ہو گئی کہ امیر المومنین کو رات کی
ع کیوں کر ہوئی؟ پریشانی کے عالم
زیر اپنے منصبی فرائض انجام دیتا رہا
آیا۔ راستے بھر سوچتا رہا کہ میں نے
آخری گوشے میں مجلس منعقد کی تھی
کوئی دوست شریک تھا نہ کوئی رشتے
یا ماجرا ہے کہ خلیفہ کو ساری روداد کی

نچ کر اس نے اپنے مختار کو بلوایا اور اسے
نا کر حکم دیا کہ "جس طرح ہو سکے
ہمارا یہ راز کس نے ظاہر کیا؟"
دوسرے دن منہ اندھیرے قاسم کے
نچا اور بیرونی خصے کے ایک کونے میں
، جانے والوں کی نگرانی کرنے لگا۔
اسے وہاں بیٹھے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی جب
خص گھٹنوں کے بل چلتا ہوا وہاں پہنچا اور
، گارپانی چھڑک رہے تھے ان کے پاس
دھر کی باتیں کرنے لگا" وزیر صاحب کا
ہے؟ رات کو ان کے پاس کون آیا تھا؟ کل
یادہ دیر کیوں نہیں ٹھہرے؟" اس قسم
ت کرتا رہا۔ پھر باورچی خانے کی طرف
ڑی دیر تک باورچیوں کو مذاق کی باتوں
رہا۔ ساتھ ساتھ اپنے مطلب کی باتیں

اقوال زریں

☆ علم سے آدمی کی وحشت اور دیوانگی دور ہو جاتی ہے۔ (بیکن)

☆ عورت کا بناؤ سنگھار اس کے دل کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ (گرے)

☆ کسی کے غصے میں کہے ہوئے کلام کو کبھی مت بھولو۔ (بیکن)

☆ جب ہم کسی سے مشورہ یا نصیحت طلب کرتے ہیں تو ہمارے تحت الشعور میں یہ بات چھپی ہوتی ہے کہ یہ مشورہ یا نصیحت ہماری مرضی کے ہرگز خلاف نہ ہو۔
(سی کولٹن)

☆ اچھے لوگ وہ ہیں جو قرض کو خوش دلی سے ادا کرتے ہیں۔ (نبی کریم ﷺ)

☆ جس پر نصیحت عمل نہ کرے وہ جان لے کہ اس کا دل ایمان سے خالی ہے۔
(حضرت ابو بکرؓ)

سب سے زیادہ عقل مند شخص وہ ہے جو اپنی بات کو اچھی طرح ثابت کر دے۔
(حضرت عمر فاروقؓ)

بھی پوچھتا جاتا تھا۔ رات کو وزیر صاحب نے کیا
کھایا؟ کوئی مہمان آیا تھا یا نہیں؟ کس قسم کی بحثیں
رہیں؟ فلاں معاملے میں کیا حکم دیا جائے گا؟"
اس قسم کے سوالوں کے جواب حاصل کر
کے اس نے کچھ کھانے کو مانگا اور وہیں بیٹھے بیٹھے کھا
پی کر اپنے جسم کو گھسیٹتا اور زمین پر گھٹنے رگڑتا ہوا

کو گرفتار کر کے لوٹی۔

قیصر کو ملک شاہ کے سامنے لایا گیا تو حاجبوں نے اس سے کہا کہ "سلطان کو کورنش بجالاؤ۔"

قیصر نے سر نہیں جھکایا اور نہ کورنش بجالایا صرف اتنا کہا کہ "یہ بادشاہ ہے تو میں بھی بادشاہ ہوں۔ یہ جوان ہے تو میں بھی جوان ہوں۔"

پھر بولا "ایک بات کہوں؟"

ملک شاہ نے جواب دیا "کہو۔"

قیصر بولا "کیا کہوں اگر بادشاہ ہو تو بخش دو۔ اگر قصائی ہو تو قتل کر دو۔ اور اگر تاجر ہو تو فروخت کر دو۔ ان تینوں میں سے ایک کام کرو۔ اور بس۔"

ملک شاہ نے جواب دیا "میں بادشاہ ہوں تمہاری جان بخشی کرتا ہوں۔"

چنانچہ قیصر کو بیش بہا خلعت پہنایا اور سلطان نے اسے اپنے پاس بٹھا کر نظام الملک کے مشورے سے نئی شرطیں طے کیں اور نیا خراج مقرر کیا۔

آخر میں قیصر نے نظام الملک سے مخاطب ہو کر کہا کہ "آپ کی کوئی خواہش ہو تو بیان کیجیے۔ میں اسے پورا کروں گا۔"

"نظام الملک نے جواب دیا" صرف ایک معمولی درخواست ہے جس کی تعمیل آپ کے لیے بہت آسان اور میرے لیے صدہا خزانوں کے برابر ہے وہ یہ کہ میری ہمیشہ سے یہ آرزو رہی ہے کہ قسطنطنیہ میں میری تھوڑی سی ملکیت ہو اسلیے آپ مجھے وہاں تھوڑی سی زمین عنایت فرمادیں۔"

قیصر نے پوچھا "کتنی زمین درکار ہے؟"

نظام الملک نے جواب دیا "ایک بیل کی کھال کے برابر!"

قیصر بولا "بہتر ہے۔"

چنانچہ اس نے وعدہ کر لیا اور قسم کھائی کہ خواجہ کی خواہش پوری کر دی جائے گی۔

نظام الملک نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ ایک بیل کی کھال اتار کر اس کا تسمہ بنایا جائے۔ چنانچہ خواجہ نے اسی تسمے کے برابر لمبی اور اس کی لمبائی کے برابر چوڑی زمین قسطنطنیہ میں حاصل کر لی۔ اور وہاں ایک سرائے، ایک خانقاہ اور ایک مسجد تعمیر کرائی چونکہ ان عمارتوں پر پانی کی طرح روپیہ بہایا گیا تھا اس لیے تینوں عمارتیں بہت خوبصورت تیار ہوئیں اور آج تک موجود ہیں۔

خلیفہ کا جاسوس

امیر المومنین معتضد کا وزیر قاسم بن عبداللہ جوان آدمی تھا مگر اپنی لیاقت اور استعداد کے سبب اس عہدے کا اہل سمجھا جاتا تھا۔ ایک دن قاسم نے اپنی حرم سرا میں مجلسِ نشاط آراستہ کی اور اس عہد کے قاعدے کے مطابق حریر کے کپڑے پہن کر گانے والی کنیزوں کے جھرمٹ میں بیٹھ کر خوب گانے سنے اور خوب شراب لنڈھائی۔ دن چڑھے جب وہ دربارِ خلافت میں پہنچا تو اسے دیکھتے ہی ایک خادم نے آکر کہا کہ امیر المومنین فرماتے ہیں "رات تو بہت رنگ رلیاں منائیں۔ اگر ہمیں بھی یاد کر لیتے تو کیا بگڑ جاتا۔ ہم بھی حریری لباس پہنتے اور تمہارا ساتھ دیتے۔

نظام الملک نے ان کو اسی وقت اپنے خیمے میں قید کر دیا تاکہ یہ بری خبر لشکر میں نہ پھیل سکے اور شام کے وقت سواروں کے ایک دستے کو شکار گاہ میں بھجوا دیا۔ تھوڑی دیر بعد اس دستے کے سوار لوٹ کر شاہی خیموں کی طرف آئے اور نعرہ لگاتے آئے کہ "سلطان کی سواری آتی ہے۔" اس طرح لشکر پر ظاہر کیا گیا کہ سلطان شکار کھیل کر واپس آگیا ہے۔

دوسرے دن نظام الملک نے لشکر کے چاروں طرف پہرے بٹھا دیے اور خود ایلچی بن کر رومی لشکر کی طرف روانہ ہوا۔ جب قیصر کو اطلاع ملی کہ نظام الملک ایلچی کی حیثیت سے آیا ہے تو قیصر نے اس کی بہت تعظیم کی اور عزت کی جگہ بٹھایا پھر خواجہ کو مخاطب کر کے کہنے لگا "ملک شاہ ابھی نوجوان ہے بلکہ بعض باتوں کے لحاظ سے بالکل بچہ ہے چنانچہ اس کی یہ فوج کشی بچوں کا کھیل معلوم ہوتی ہے آپ اسے اس طفلانہ حرکتوں سے منع کریں۔"

نظام الملک نے مصلحتاً اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ پھر ادھر ادھر کی چند باتوں کے بعد صلح کی شرطیں طے کیں اور فریقین میں معاہدہ ہو گیا۔ اس سے فراغت پا کر وہ قیصر سے رخصت ہونے لگا تو قیصر نے پوچھا "آپ کے لشکر کے چند سوار تو گم نہیں ہوئے؟"

نظام الملک نے بے پروائی سے جواب دیا "ہوئے ہونگے مجھے علم نہیں۔ اتنے بڑے لشکر میں ہر ایک سوار کو یاد رکھنا آسان نہیں۔"

قیصر نے کہا "ہم نے چند سواروں کو گرفتار کیا ہے۔"

نظام الملک نے جاتے جاتے جواب "چھوڑ دیجیے تو بہتر ہے۔"

قیصر نے اپنے وزیر کو اشارہ کیا۔ وہ ا الملک کے ساتھ ہو لیا اور اسے سواروں کے لے گیا۔ نظام الملک نے ان کو دیکھا تو غصہ لال پیلا ہو کر بولا "کیوں بے نالائقو! نابکارو دن شکار کھیلنے کے ہیں، لشکر میں چلو تمہاری خبر لیتا ہوں۔ غضب خدا کا، ٹکے ٹکے کے اور دماغ بادشاہوں کے سے۔ شکار کا شوق چڑ آپ کو۔ ایک دفعہ آجاؤ لشکر میں، ایسی خبر لو چھٹی کی دودھ یاد آجائے اور شکار وکار سب جائے۔"

اس طرح برا بھلا کہتا ہوا نظام الملک ا ساتھ لے کر اپنے لشکر کی طرف روانہ ہوا۔ رومی لشکر کی حدود سے باہر نکل آیا تو گھوڑے سے اتر پڑا اور ملک شاہ کی رکاب چوم رومی سفیر نے (جو ساتھ آیا تھا) یہ دیکھا تو سمجھ گیا کہ ان قیدیوں میں مسلمانو بادشاہ ہمارے ساتھ آگیا تھا مگر اب اس چارے کے پچھتانے سے کیا ہو سکتا تھا۔

ملک شاہ نے لشکر گاہ میں پہنچ کر سپاہیوں تیاری کا حکم دیا اور اسی وقت قیصر کی فوجوں پر بول دیا۔ قیصر صلح کی وجہ سے جنگ کے لیے تیا تھا۔ یہ خبر سن کر حیران رہ گیا۔ مگر پھرتی فوجوں کو آراستہ کر کے میدان میں آیا۔ آخر قی کی فوجوں کے قدم اکھڑ گئے اور وہ میدان بھاگیں۔ ملک شاہ کی فوج نے تعاقب کیا اور قیصر

لڑکوں کا کیا حال ہے ؟"

مصاحب نے جواب دیا "بہت آسودہ حال ہیں اور عیش و آرام سے بسر کر رہے ہیں۔"

خلیفہ بولا "انہوں نے عرضی دی تھی کہ ہم فاقوں مر رہے ہیں۔"

اس گفتگو کا نتیجہ یہ نکلا کہ خلیفہ کے حکم سے سپاہی زادوں کو بلا کر حال پوچھا گیا۔ انھوں نے جواب دیا "بیشک جس وقت ہم نے عرضی لکھی تھی، ہم فاقوں مر رہے تھے لیکن ہمارا باپ فلاں سوداگر کے بیٹے کے پاس دس ہزار دینار امانت رکھ گیا تھا جس کا حال ہمیں معلوم نہ تھا۔ جب اس سوداگر کے لڑکے کو ہماری حالت کا علم ہوا تو اس نے امانت کی رقم ہمارے حوالے کر دی اور ہم فاقوں کی مصیبت سے چھوٹ گئے۔"

خلیفہ نے کہا "جس شخص کی امانت و دیانت کا یہ عالم ہو کہ اس کے پاس ایک شخص امانت رکھ جائے خود جنگ میں مارا جائے اور امانت رکھنے کا کوئی گواہ اور کاغذ پتر موجود نہ ہو پھر بھی وہ شخص امانت کو حق دار کے حوالے کر دے وہ شخص تعریف کے قابل ہے۔"

خلیفہ نے اسی وقت سوداگر کے لڑکے کو بلایا۔ خلعتِ فاخرہ عنایت فرمایا اور اسے اپنا خزانچی بنالیا۔

سوداگر کے لڑکے نے اتنی ترقی کی کہ بغداد میں اس کے مقابلے کا کوئی امیر نہ تھا۔

نظام الملک کی تدبیر

جس زمانے میں سلطان ملک شاہ اور قیصرِ روم میں جنگ چھڑی ہوئی تھی ایک دن کا ذکر ہے کہ ملک شاہ کو شکار کی سوجھی۔ اس کی عادت تھی کہ ایسے موقع پر چتر و نشان، دورباش رکھنے والوں اور دوسرے غیر ضروری سامان کو ساتھ نہ لیتا تھا۔ اس موقع پر بھی چند سواروں کو ساتھ لے کر لشکر گاہ سے نکل کھڑا ہوا۔ تھوڑی دور گیا تھا کہ دفعتہً رومیوں کے مقدمۃ الجیش سے مڈ بھیڑ ہو گئی۔ رومیوں نے دشمن کے چند سواروں کو غیر مسلح پایا تو ان پر ہلہ بول دیا اور گھیر کر ایک دو کے سوا سب کو گرفتار کر لیا۔ ملک شاہ بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ پکڑا گیا۔

جب رومی سپاہی ان کو لیے ہوئے اپنی لشکر گاہ کی طرف جانے لگے تو سلطان نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ "خبر دار کوئی شخص میری تعظیم نہ کرے اور نہ میرا نام بتائے بلکہ مجھ سے ایک عام سپاہی کی طرح پیش آئے۔"

اس کے ساتھیوں نے ایسا ہی کیا۔ چنانچہ جب ان کو قیصر کی خدمت میں پیش کیا گیا اور قیصر نے پوچھا کہ "تمہارا سردار کون ہے ؟" تو سب نے یک زبان ہو کر جواب دیا "ہمارا سردار لشکر میں ہے ہم سب عام سپاہی ہیں۔ شکار کی غرض سے آئے تھے کہ آپ کے آدمیوں نے گرفتار کر لیا۔"

قیصر نے حکم دیا کہ ان سب کو قید کر دیا جائے۔

جب ملک شاہ کے وہ ساتھی جو رومیوں کے ہاتھ سے بچ نکلے تھے اپنی لشکر گاہ میں پہنچے تو سیدھے نظام الملک کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس کو سلطان کی گرفتاری کی اطلاع دی۔

افسر رہتا تھا۔ یہ عبدالملک بن مروان کی فوج میں ملازم تھا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ اسے انہی دنوں میں اپنی فوج کے ساتھ روم کی جنگی مہم پر جانا پڑا۔

چلتے وقت وہ سوداگر کے لڑکے کے پاس آیا اور بولا "میرے بچے ابھی کم عمر ہیں اور مجھے ایک جنگی مہم پر جانا ہے زندگی کا بھروسہ نہیں اگر زندہ رہا تو خیر ورنہ میں نے اپنا پیٹ کاٹ کر ان معصوموں کے لیے کچھ رقم جمع کی ہے میں اسے امانت کے طور پر تمہارے حوالے کر جاتا ہوں۔ اگر میں لڑائی میں کام آؤں اور ان کو ضرورت پڑے تو ان کے سپرد کر دینا۔" یہ کہہ کر سپاہی نے دس ہزار دینار سوداگر کے لڑکے کے حوالے کیے اور خود سفر پر چل دیا۔

سپاہی بدقسمتی سے لڑائی میں مارا گیا اور اس کے دس ہزار دینار سوداگر زادے کے پاس امانت ہے۔

اس کے باپ کو علم ہوا تو اس نے اپنے بیٹے سے کہا "میرے حالات بہت خراب ہیں اور تمہارے پاس سپاہی کی رقم بے کار پڑی ہے۔ اگر اس میں سے تھوڑی سی مجھے قرض دے دو تو میرا کاروبار سنبھل سکتا ہے۔"

بیٹے نے جواب دیا "ابا تمہارا کاروبار خیانت کی وجہ سے پٹ ہوا ہے۔ میری جان بھی چلی جائے تو میں اس رقم میں خیانت نہ کروں گا۔"

ان باتوں کو عرصہ گزر گیا۔ فوجی افسر کے گھر میں روپے کی ضرورت ہوئی۔ بے چارے حیران و پریشان ہوئے کہ کہاں جائیں کس کے آگے ہاتھ پھیلائیں۔ سوداگر کے لڑکے کے پاس روپے امانت رکھنے کا حال کسی کو معلوم نہ تھا۔ اس لیے جب حالات بہت خراب ہو گئے تو ناچار عبد الملک کو عرضی لکھنے کی ٹھانی۔ اتفاق سے عرضی لکھوانے اسی سوداگر کے لڑکے کے پاس آئے۔ اس نے سارا حال لکھ کر عرضی ان کے حوالے کی۔

عبدالملک نے عرضی پڑھ کر جواب دیا "جو سپاہی جنگ میں شہید ہو جاتے ہیں ان کا نام بیت المال کی فہرست سے کاٹ دیا جاتا ہے۔ میں اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکتا۔"

بے چارے مایوس اور پریشان خالی ہاتھ لوٹ آئے۔ سوداگر کا لڑکا ابھی تک خاموش تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ خلیفہ نے سپاہی کے لڑکوں کو ٹکا سا جواب دے دیا ہے تو اس نے ان کو بلایا اور کہا "تمہارے باپ نے جنگ میں جاتے وقت دس ہزار دینار میرے پاس امانت کے طور پر رکھوائے تھے اور کہا تھا کہ آڑے وقت میں تمہارے حوالے کر دوں۔ یہ رقم جوں کی توں میرے پاس محفوظ ہے۔ اب جب کہ تمہارے حالات خراب ہو چکے ہیں میں تمہارے باپ کی امانت تمہارے حوالے کرتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ گھر کے اندر گیا اور دس ہزار دینار کی تھیلیاں لا کر ان کے حوالے کر دیں۔ وصیت کے مطابق اس میں سے ایک ہزار دینار سوداگر کے لڑکے کے حوالے کیے اور خوشی خوشی گھر لوٹے۔

تھوڑے دنوں بعد عبدالملک کو فوجی افسر کا خیال آیا۔ ایک مصاحب سے پوچھا "اس کے

سی ولایتوں پر قبضہ کر لیا اور اس کی سلطنت میں ترقی ہونے لگی تو اس نے چاہا کہ ہرات کی بھی اپنی قلمرو میں شامل کرے۔ چنانچہ اس نے ہرات پر چڑھائی کا ارادہ کیا اور فوجی تیاریوں کا حکم دے دیا۔

کوچ کرنے کے دن صبح منہ اندھیرے نقارے بجنے لگے اور سپاہی ہتھیاروں سے لیس ہو کر یعقوب کی محل سرا کے باہر جمع ہونے لگے۔

دن چڑھے یعقوب مسلح ہو کر کوٹھے پر آکھڑا ہوا تو منجموں نے حساب لگا کر ستاروں کا اثر معلوم کیا اور حکم لگایا کہ "اسوقت کی روانگی منحوس ہے۔ ہر جگہ شکست کا سامنا ہوگا۔" یعقوب خاموش رہا اور بدستور بام پر کھڑا رہا۔

گرمی کا موسم، سیستان کی سرزمین، تھوڑی ہی دیر میں دھوپ کی تیزی بڑھنے لگی اور دیوار سے آگ کے شعلے نکلنے لگے۔ دوپہر کے وقت تک زمین کا چپہ چپہ آگ کی بھٹی بن گیا۔ فولادی ہتھیاروں پر گرمی اور دھوپ کا اثر ظاہر ہے۔ یہ محسوس ہوتا تھا کہ زرہ بکتر کی جگہ انگاروں کا لباس پہن رکھا ہے مگر یعقوب اس چلچلاتی دھوپ میں مع ہتھیاوروں کے کوٹھے پر کھڑا رہا۔

دھوپ کی تیزی کم ہونے پر ادھر وہ کوٹھے سے اترا ادھر منجموں کے ستاروں کا غصہ کم ہوا۔ منجموں نے کہا "وقت کی نحوست، برکت سے بدل گئی ہے۔ قسمت اتنی طاقتور ہو گئی ہے کہ اب امیر جہاں جائے گا فتح پر فتح پائے گا۔"

بعض مصاحبوں نے یعقوب سے سوال کیا کہ "امیر کوٹھے پر کیوں چڑھے اور اتنی دیر تک کیوں کھڑے رہے؟"

جواب ملا "گرمی کا موسم ہے اور میں ایک ایسی مہم پر جارہا ہوں جس میں سستی اور آرام طلبی کی بجائے حوصلے اور برداشت کی ضرورت ہے۔ بنابریں میں اپنے نفس کا امتحان لے رہا تھا کہ یہ گرمی اور دھوپ برداشت ہو سکے گی یا نہیں۔ چنانچہ میں دھوپ کی انتہائی تیزی کے وقت یعنی دوپہر تک ہتھیار باندھے کوٹھے پر کھڑا رہا۔ جب میں نے اندازہ کر لیا کہ میں یہ تکلیف برداشت کر سکتا ہوں تب نیچے اترا۔

اس محنت کشی اور تحمل کا یہ نتیجہ نکلا کہ اس نے اس سفر میں نہ صرف ہرات فتح کیا بلکہ بعض اور ملک بھی اس کے قبضے میں آگئے۔

ایمانداری کا پھل

دمشق میں ایک سوداگر رہتا تھا۔ اس کی ایمانداری کی وجہ سے سیکڑوں لوگ اس کے پاس اپنا مال و دولت امانت کے طور پر رکھواتے تھے۔ ایک مرتبہ اس سوداگر سے امانت میں خیانت ہو گئی اور وہ دوسرے سوداگروں اور امیروں کی نظر سے گر گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سب نے اس سے لین دین بند کر دیا اور اس کی ساکھ گرتے گرتے آخر کار اسے لے ڈوبی۔ مفلسی نے آگھیرا اور ہزاروں روپے کا مقروض ہو گیا۔

اس سوداگر کا بیٹا بہت عقل مند اور سمجھ دار تھا جب اس نے اپنے باپ کا حال سنا تو زاہدوں کی طرح گوشہ نشین ہو گیا اور صبر و شکر کے ساتھ مفلسی پر قناعت کر کے گزارا کرنے لگا۔

سوداگر کے بیٹے کے پڑوس میں ایک فوجی

ایک دن امیر المومنین خیمے سے نکلا تو کیا دیکھتا ہے کہ تمام لشکر والے اپنی اپنی جگہ کھڑے ہیں کوئی تیر اندازی میں مصروف نہیں۔ پوچھا: "اس طرح کیوں کھڑے ہو، تیر کیوں نہیں چلاتے؟"

سپاہیوں نے جواب دیا "سردی کے مارے کمانیں اکڑ گئی ہیں، کھنچتی نہیں۔"

معتصم خیمے کے دروازے پر بیٹھ گیا اور کمانیں لانے کا حکم دیا۔ سپاہیوں نے بہت سی کمانیں لا کر پیش کیں۔ معتصم ایک ایک کمان کو اٹھا کر کھینچنے لگا اور وہاں بیٹھے بیٹھے اس نے دو سو کمانیں کھینچ کر سپاہیوں کو دکھائیں۔ معتصم کی اس حرکت نے سپاہیوں پر جادو کا اثر کیا اور وہ پورے جوش و خروش سے لڑائی میں مصروف ہو گئے۔ یا تو کمانیں کھنچتی نہ تھیں یا اب کمانوں سے تیر نہیں بجلیاں برسنے لگیں۔ تھوڑی ہی دیر میں عموریہ کا مطلع صاف تھا اور جس مضبوط قلعے کو نجومیوں کے ستارے فتح نہ کر سکتے تھے، اسے معتصم کے سپاہیوں نے پامال کر کے دکھا دیا۔

فتح حاصل ہوتے ہی معتصم نے اس کنوئیں کا پتہ پوچھا جس میں وہ سیدانی قید تھی۔ ابلق گھوڑے پر سوار وہاں پہنچا اور جس طرح رستم نے بیژن کو کنوئیں سے نکالا تھا اس طرح اس نے اس عورت کو باہر نکالا اور اس سے خطاب کر کے کہا "تو نے خدا کے حضور میں فریاد کی اور مجھے آواز دی تھی میں حاضر ہو گیا۔"

اس روز اس نے حکم دیا کہ دشمن کے نوے ہزار آدمیوں کو قتل کی سزا دی جائے۔ اس واقعے پر ابو تمام نے ایک زبردست قصیدہ کہا جس کا مطلع یہ ہے:

السیف اصدق انبا من الکتب فی حدہ الحد بین الجد واللعب

اس قصیدے میں نجومیوں کی خوب خبر لی گئی اور ان کے جھوٹے حکم کی قلعی کھولی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ فتح خدا کی طرف سے ہوتی ہے ستاروں کی طرف سے نہیں۔

والعلم فی شہب الارماح لامعۃ بین الخمیسین لا فی السبعۃ الشہب

اس روز سزا کے متعلق کہا ہے۔

تسعون الفا کآساد الشریٰ نضجت جلودہم قبل نضج التین والعنب

مال غنیمت کے متعلق ان الفاظ میں ذکر کرتا ہے۔

لم تطلع الشمس یوم فیہ ذلک علی بان ولم تغرب علی عزب

ابو تمام ابھی قصیدہ سنا ہی رہا تھا کہ معتصم نے حکم دیا اسے فی بیت ایک ہزار درہم انعام دیا جائے۔ جب وہ اس بیت پر پہنچا۔

رمی بک اللہ وجہا فہدمہا ولو رمی بک غیر اللہ لم تصب

یعنی تو نے جو کچھ کیا اپنے زور و قوت سے نہیں کیا بلکہ خدائے تعالیٰ کی مدد اور قوت سے کیا۔ یہ اشارہ ہے قرآن مجید کی اس آیت کی طرف کہ خدا فرماتا ہے "وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمیٰ" معتصم نے کہا کہ میں نے درہموں کو دیناروں میں بدل دیا۔

چونکہ اس قصیدے کے ستر اشعار تھے اس لئے اسے ستر ہزار دینار انعام میں ملے۔

یعقوب بن لیث اور اپنی قوت برداشت کا امتحان

جب یعقوب بن لیث نے خراسان کی بہت

جگہوں پر بھی بغاوت کا فتنہ اٹھ کھڑا ہوگا اور ہر ایک کو ملک دابنے کا حوصلہ ہونے لگے گا۔ اس لیے میں اس مرتبہ ایسا جرار لشکر بھیجوں گا کہ سنجاب جیسی دس ولایتیں مغلوب ہو جائیں۔ اگر خدانہ خواستہ یہ لشکر بھی نامراد لوٹا تو میں خود لشکر لے کر جاؤں گا اور اس نمک حرام کو پکڑ لاؤں گا۔ ورنہ اپنی جان گنوادوں گا تاکہ اس جھنجٹ سے پیچھا چھوٹے۔

وزیر نے جب بادشاہ کو اپنے ارادے میں اس قدر مستقل پایا تو اپنی غلطی کا اقرار کیا اور معافی مانگی۔

معتصم اور ایک مظلوم عورت کی امداد

ایک مرتبہ دربند اور روم کے وقائع نگار نے امیر المومنین معتصم کو اطلاع دی کہ عموریہ کے بادشاہ نے ایک سیدانی کو جو اس کے قبضے میں آگئی تھی طرح طرح کی اذیتیں اور تکلیفیں پہنچائیں۔ اور جب اس مظلوم اور بیکس عورت نے چلا چلا کر کہا کہ "وا محمداہ ، وامعتصماہ" تو اس ظالم نے طعنہ دیا کہ "ہاں اسی وقت معتصم ابلق گھوڑے پر سوار ہو کر آئے گا اور تجھے میرے پنجے سے چھڑا لے جائے گا۔" یہ کہہ کر اس نے اسے پہلے تو پیٹا پھر ایک کنویں میں قید کر دیا۔

راوی بیان کرتے ہیں جس وقت معتصم کو یہ اطلاع ملی اسوقت شراب دار اس کو شراب پیش کر رہا تھا۔ جب اس نے یہ پڑھی تو غم و غصہ کے مارے بری حالت ہو گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ بھرائی ہوئی آواز سے بولا "اے بڑھیا! خدا کی قسم معتصم جب تک تیرا انصاف نہ کر لے گا کسی آرام و لذت کی طرف توجہ نہ دے گا۔"

یہ کہہ کر اس نے شراب دار کو حکم دیا کہ "اس شراب کے پیالے پر اسی حالت میں مہر لگادو کیوں کہ میرے اوپر حرام ہے کہ میں شربتِ آرزو سے شیریں کام ہوں اور ایک مظلوم عورت قید کی حالت میں مایوسی کے کڑوے گھونٹ پی رہی ہو اور مجھے مدد کے لیے پکار رہی ہو۔"

یہ کہہ کر اس نے لشکر کی تیاری کا حکم دیا۔ جب لشکر تیار ہو گیا تو اس نے نہ صرف اپنے لیے ابلق گھوڑا منگوایا بلکہ سپاہیوں کو بھی حکم دیا کہ جس جس کے پاس ابلق گھوڑا ہو وہ اس پر سوار ہو۔ کہتے ہیں کہ چار ہزار ابلق گھوڑے اس لشکر میں تھے۔ نجومیوں نے بالاتفاق حکم لگایا کہ "امیر المومنین ناکام و نامراد لوٹیں گے کیوں کہ عموریہ کے متعلق ستاروں کا حکم ہے کہ اس پر جنگ کے ذریعے قبضہ نہیں ہو سکتا۔"

اس کے جواب میں معتصم نے کہا "حضرت مصطفیٰ ﷺ نے فرمایا ہے کہ " من صدق منجماً فقد کذب بما انزل الله علی محمد" نجومیوں کی ذرا پروانہ کی اور عموریہ کی طرف روانہ ہوا۔ آندھی پانی کی سی تیزی کے ساتھ عموریہ کے دروازے پر آپہنچا اور اس کا محاصرہ کر کے جنگ شروع کر دی۔

جاڑوں کا موسم تھا کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ زمین لوہے کی طرح سخت ہو رہی تھی اور ہوا بدن کے پار ہوئی جاتی تھی۔

انتخاب

ارادے کی مضبوطی

امیر اسماعیل سامانی کے عہد حکومت میں سنجاف کا والی بہت طاقت ور ہو گیا تھا اور اس نے بہت سا سامانِ حرب جمع کر لیا تھا۔ جب دیکھا کہ ملک میں کافی اقتدار حاصل ہو چکا ہے اور سامان جنگ کے ذخیرے جمع ہو چکے ہیں تو اس نے سرکشی کی ٹھہرائی اور امیر اسماعیل کے تمام حقوق واحسانات بھلا کر اس کے خلاف بغاوت کا علم بلند کر دیا۔

امیر اسماعیل نے کئی ترکیبوں سے اسے سیدھے راستے پر لانے کی کوشش کی مگر کوئی اثر نہ ہوا۔ ناچار ایک حاجب کو فوج دے کر اس کی سرکوبی کے لیے بھیجا۔ والی سنجاف نے مقابلہ کیا۔ حاجب مارا گیا اور اس کی فوج شکست کھا کر لوٹ آئی۔ امیر نے دوبارہ فوج بھیجی۔ اس نے بھی شکست کھائی۔ امیر بہت رنجیدہ ہوا اور سوچنے لگا کہ اب کے خود لشکر لے کر جائے۔

ایک دن اسی مہم کے بارے میں اپنے وزیر ابوالفضل بلعمی سے مشورہ کر رہا تھا وزیر نے کہا" سنجاب کی مہم اتنی اہمیت نہیں رکھتی کہ امیر بذاتِ خود زحمت فرمائیں۔ اس کا کسی اور طرح سے انتظام ہو سکتا ہے۔"

امیر اسماعیل بہت خفا ہوا اور بولا "کسی عقلمند وزیر کی زبان سے یہ بات اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ کیا تم نے اردشیر کی وصیتوں میں نہیں پڑھا کہ "بادشاہ کو چاہیے کہ پہلے اپنے تخت کا فکر کرے۔ پھر اس کمرے کا جس میں وہ تخت بچھا ہو۔ پھر اس عمارت کا جس میں وہ کمرہ ہے۔ پھر اس شہر کا جس میں وہ عمارت ہو، پھر اس رعایا اور ولایت کا جن سے وہ شہر آباد ہو۔ الغرض جو چیزیں زیادہ قریب ہو اتنا ہی اس کا فکر کرنا چاہیے۔ سنجاب ہمارے پڑوس میں ہے اگر ہم اس کی مہم کو حقیر سمجھیں گے تو کرمان، غزنین اور دوسرے دور دست مقامات سے کیا امید کی جا سکتی ہے۔ ان

ممکن ہے خدا تعالیٰ کی رحمت جوش میں آجائے اور اپنے بندہ کو نوازدے۔ بقول اپیٹیشن "اے خدا تو جانتا ہے کہ بہترین بات کیا ہے جو کچھ تیری مرضی ہے اس کے مطابق کر جو کچھ چاہے دے اور جب چاہے دے میری بابت جو تیرا جی چاہتا ہے کر اور وہی کر جو بڑی عظمت اور شان کے مطابق ہے جہاں تیرا قرب ہو وہاں خرابی کہاں ہو سکتی ہے تیرے لیے اگر میں مفلس ہو جاؤں تو یہ اس سے بہت ہے کہ میں تیرے بغیر دولت مند ہوں۔ میں تیرے ساتھ اس زمین پر پھرنے کو تیرے بغیر جنت میں رہنے پر ترجیح دیتا ہوں جہاں تو ہے وہیں اصل جنت ہے اور جہاں تو نہیں ہے وہیں موت اور جہنم ہے۔"

ایک جرمن عورت کے احساسات

ایک جرمن عورت اپنی سوانح میں لکھتی ہے "میں سمندر کے کنارے تنہا بیٹھی تھی کہ نفس کو وسیع کرنے والے اور زندگی میں موافقت اور ہم آہنگی پیدا کرنے والے خیالات دل میں موجزن ہونے لگے۔ میں نے بے بس ہو کر بحرِ بے پایاں کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے جو ہستی لامحدود کا مظہر ہے۔ میری روح دعا میں مشغول ہوئی اور زندگی میں پہلی مرتبہ دعا کی ماہیت مجھ پر منکشف ہوئی اور میں نے محسوس کیا کہ دعا انفرادیت کی تنہائی سے ہستی کل کی وحدت کے شعور کی طرف عود کر آنے کا نام ہے۔"

لیڈ بیٹر کے خیالات

عام طور پر دعا سے مراد وہ کلمات لیے جاتے ہیں جو ایک فرد اپنے سماجی، معاشی، طبی اور روحانی مسائل کے حل میں مدد مانگتے ہوئے اپنے رب کے حضور ادا کرتا ہے۔ لیڈ بیٹر رقم طراز ہے "دعا کیا ہے؟ کاسمک ورلڈ میں قوت کے خزانوں کا منہ کھول دینا۔ یہ ایک زبردست ذہنی و جذباتی جدوجہد ہے اور اس دنیا میں جو ایک نظام کے تحت چل رہی ہے ہر کوشش کا کوئی نہ کوئی صلہ ہوتا ہے یہاں نتائج اعمال سے یوں بندھے ہوئے ہیں کہ انہیں جدا کرنا ممکن نہیں۔ یہی یورپی صوفی ایک اور مقام پر کہتا ہے "گداز میں ڈوبی ہوئی ہر آواز کا جواب فوراً آتا ہے اگر ایسا نہ ہو تو لوگ کائنات کو مردہ سمجھنے لگیں۔ دعا اور قبولیت ایک سکے کے دو رخ ہیں۔ قبولیت اسی طرح دعا کا دوسرا رخ ہے جس طرح نتیجہ سبب کا۔

آر ڈبلیو ٹرائن کے بقول ہر خیال ایک لہر ہے جو دماغ سے نکلنے کے بعد موزوں صلہ لے کر واپس آتی ہے۔ قبولیت دعا کے لیے ضروری ہے کہ اول اپنی غلطی کا اعتراف کیا جائے دوئم تہہ دل سے اضطراب کے ساتھ توبہ کی جائے یعنی کہ اس غلطی کو آئندہ نہ دہرانے کا مصمم ارادہ کیا جائے اور اپنے کردار میں اخلاقی و سماجی لحاظ سے مثبت تبدیلی لائی جائے نیز توحید و رسالت پر ایمان کو پختہ کیا جائے۔

(اگلے ماہ قرآن حکیم اور اللہ کی مدد)
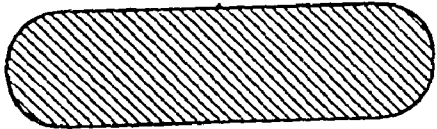
اس طرح یقین کی قوت ہمیں حاصل ہوتی ہے جس سے ہم میں مسائل کا مقابلہ کرنے کی ہمت پیدا ہو جاتی ہے۔ ہدایت الٰہی کے شعور کے ساتھ ہر چیز کی نسبت انسان کا زاویہ نگاہ بدل جاتا ہے۔ مسائل کے حل کرنے کے متعلق کامیاب طریقہ کار اس کے ذہن میں نقش ہو جاتا ہے جسے بروئے کار لا کر اپنے مقاصد حاصل کر لیتا ہے مگر سائنس جس طرح یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ گائے کے تھنوں میں دودھ کیسے پیدا ہوتا ہے اسی طرح وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ دعا سے خیالات اور کیفیات کس طرح بدل جاتی ہیں۔

جب ہم سب چیزوں کو نور الٰہی سے وابستہ کر کے سوچتے ہیں تو ہر بات ہمارے لیے بلند معنی کی حامل ہو جاتی ہے۔ جس طرح ایک پھول کو دیکھ کر عام شخص ایک شاعر کے احساس جیسا احساس پیدا نہیں کر سکتا۔ اسی طرح ہر شخص چیزوں کی ماہیت کو اس نظر سے محسوس نہیں کر سکتا جس طرح اہلِ ایمان، حامل تقویٰ محسوس کر سکتا ہے۔ ایک ہی کتاب پڑھنے والا ہر شخص اس کتاب سے مختلف بصیرت حاصل کرتا ہے بقول ایک دانشور کتاب کو بھی علم ہے کہ اسے کون پڑھ رہا ہے اور اسے کیا فیض عنایت کرنا ہے۔ ہر شخص کو اس کے ظرف کے مطابق فیض ملتا ہے۔

عقائد کی اہمیت

ایک نامور شاعر منیر نیازی کے بقول "میں سندربن کے جنگلوں میں گیا تو وہاں درختوں سے ہم کلام ہونے سے میرے باطن میں عجیب خوشگوار احساس پیدا ہوا جو کہ میرے دیگر ساتھیوں کو محسوس نہیں ہوا" یہ حقیقت واضح ہے کہ ایک ہی ماحول میں ہر فرد کے تجربات و احساس مختلف ہو سکتے ہیں۔ ذہن کی یہ کیفیت فرد کے عقائد کے تابع ہوتی ہے۔ عقائد فرد کے وقوف، احساسات اور فکر کو اس طرح متأثر کرتے ہیں کہ فرد کے جذبات بھی مختلف باطنی کیفیات کو پیدا کرتے ہیں جو کہ خارجی ماحول اور مادی اجسام میں تبدیلی لانے کا موجب بنتی ہیں جو عقیدہ دعا کے نتیجہ میں مادی جسم یا خارجی ماحول میں مطلوبہ تبدیلی کا سبب بنتا ہے اس کے مطابق خدا تعالیٰ کو واحد، لا شریک، بے نیاز اور مسبب الاسباب تسلیم کرنا ہے۔ اس عقیدہ کے عملی اظہار کے لیے ضروری ہے کہ فرد صبر اور تقویٰ اختیار کرے۔ پرہیز گار اور مومن بنے کیونکہ روحانی زندگی محض فکر و مطالعہ نہیں بلکہ ایک عملی تجربۂ حیات ہے۔ روحانی زندگی کا مقصود خدا تعالیٰ کی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنا اور اس راہ سے انسانی فلاح میں کوشاں ہونا ہے۔ یہ محض طرزِ فکر نہیں بلکہ انداز عمل ہے۔

جب فرد کو خیر ازلی کے سوا اور کسی چیز کی خواہش نہ رہے جو کچھ چاہے خدا کے لیے چاہے تو اس کو اعلیٰ ترین مسرت، راحت، سلامتی اور اطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔

امیٹیشن کے الفاظ

اگر فرد "امیٹیشن آف کرائسٹ" کے الفاظ کی عملی تصویر بن کر خدا تعالیٰ کے حضور دعا گو ہو تو

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا" جب تک بندہ گناہ اور قطع رحمی کی دعا نہ چھوڑے گا اس کی دعا قبول نہ ہوگی۔

☆ چھٹی شرط جلدی نہ کرنا ہے۔ بہت سے لوگ دعا کرتے ہیں اور اس کا فوری اثر چاہتے ہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔

☆ ساتویں شرط ممکنات کی دعا کرنا ہے یعنی دعا تو وہی قبول کی جائے گی جو ممکن ہوگی اگرچہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے لیکن وہ اپنے قانون کے خلاف نہیں کرتا۔

دعا کے آداب

دعا کے آداب یہ ہیں:

☆ انسان باوضو ہو۔ طبرانی کی ایک روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا جس نے صحیح صحیح وضو کیا پھر دو رکعتیں نماز پڑھیں پھر اپنے رب سے دعا کی تو اس کی دعا قبول کی جائے گی خواہ جلدی اثر ہو یا دیر میں۔

☆ دعا کرتے وقت رخ قبلہ کی طرف ہو۔

☆ جب آپ قبلہ کی طرف رخ کر کے بیٹھ جائیں تو اپنی تمام تر توجہ اپنی دعا پر جمائیے۔ اس بات کا دھیان رکھیے کہ توجہ ہٹنے نہ پائے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ" یاد رکھو اللہ پاک غافل اور لہو و لعب والے دل کی دعا قبول نہیں فرماتا۔

☆ دعا مسلسل کرتے رہو۔ اللہ تعالیٰ کو یہ بات اچھی معلوم ہوتی ہے کہ انسان اس سے مانگے جائے۔

☆ دعا مانگتے وقت خوب روؤ۔ جتنا رویا جا سکے گڑگڑا کر مانگو کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی کمی نہیں ارشاد ہوتا ہے "لوگو! مردو اور عورتو! اپنے پروردگار سے گڑگڑا کر اور چپکے چپکے دعا کرو۔"

☆ دعا کرتے وقت پہلے اپنے پروردگار کی خوب تعریف کرو۔ جس قدر ہو سکے اس کی پا[کی] اور عظمت کے پیارے بول بولو اور دعا [کے] آخر میں بھی تعریف کرو۔

☆ دعا کے اول و آخر درود شریف پڑھنا بھی ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر دعا [قبول] نہیں ہوتی اور آسمانوں میں معلق رہتی [ہے]۔

☆ دعا مانگتے وقت ہتھیلیوں کا رخ منہ کی طرف کر لو اور دونوں ہاتھوں کو ملا لو حدیث [میں] بھی ہے کہ اللہ پاک کو خالی ہاتھ [لوٹاتے] ہوئے شرم آتی ہے۔

☆ دعا کے الفاظ بار بار پڑھنے چاہئیں سرکار رسالت ﷺ جب دعا فرما[تے] تین مرتبہ دعا کے الفاظ دہراتے۔

☆ جس چیز کی ضرورت ہو صرف [اللہ] سے ہی مانگے۔ ترمذی شریف [میں] ہے کہ حضورؐ نے فرمایا" ہر شخص [اپنی] ضرورت صرف رب سے مانگے کہ اگر اس کے جوتے کا تسمہ بھی [ٹوٹ جائے] تو وہ بھی اپنے رب سے مانگے۔"

☆ دعا ختم ہو جانے کے بعد آمین [کہو یعنی] اے اللہ میری دعا قبول فرما[ئے]۔ ابو ہریرہؓ کا قول ہے کہ آمین [...]

گناہوں کو مٹانا چاہتا ہے یہی چیز اس کے حق میں اچھی ہے کیونکہ اس کی دعا قبول کر کے اس کی مصیبتوں کو دور کرنا اس کے حق میں نامناسب ہے ایسے وقت کچے ایمان والے ڈانواڈول ہو جاتے ہیں کہ خدا نے ہماری فریاد نہیں سنی۔ اسی طرح ایسا بھی ہوتا ہے کہ ظاہر میں کافروں کی دعائیں قبول ہو جاتی ہیں۔ یہ اس لیے نہیں کہ معاذاللہ ان کے جھوٹے معبود ان کی حاجتیں پوری کرتے ہیں بلکہ اس بے ایمان کے لیے اللہ کی طرف سے ایک ڈھیل دی گئی جیسا کہ قرآن حکیم فرماتا ہے: "میں انہیں ڈھیل دیتا ہوں اور میری تدبیر سے کوئی بچ کر نکلنے والا نہیں۔"

مومن کی دانائی

پس مومن کو بڑی دانائی اور ہوشیاری سے کام لینا چاہئے اور اس بات کو یاد رکھنا چاہئے کہ دنیا کے کارخانے میں اس کے لیے طرح طرح کے دکھ، قسم قسم کی پریشانیاں اور وضع وضع کی تکلیفیں ڈھالی جا رہی ہیں تاکہ وہ گناہوں سے پاک ہو جائے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جسے اللہ تعالیٰ بہت بھلائیاں دینا چاہتا ہے اس پر مصیبتیں بھیجتا ہے۔" قرآن میں ہے: "تمہارے رب نے فرمایا مجھ سے دعا کرو میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔" یعنی مسلمان کو حکم کیا گیا ہے کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ سے ہی دعا کرے اور اللہ نے وعدہ فرمایا ہے کہ میں اس کا ثواب دوں گا۔

ترمذی میں ہے "دعا عبادت کا جوہر ہے۔" ایک اور جگہ ترمذی میں ہے اللہ کے نزدیک دعا کی بڑی قدر قیمت ہے کیونکہ دعا عبادت کا جوہر اور اس کا خاصہ اور فرمانبردار بندہ اللہ کا محبوب ہوتا ہے اور محبوب کی قدر ہر جگہ ہوتی ہے۔ ایک اور جگہ ترمذی میں ہے "جو آدمی الله سے سوال نہیں کرتا اللہ پاک اس پر غضب ناک ہو جاتا ہے کیونکہ دعا نہ کرنا تکبر اور غرور کی علامت ہے۔"

ترمذی میں ہے "تمہارا پروردگار بڑا غیرت والا اور بڑی عزت والا ہے جب بندہ اس کے سامنے ہاتھ اٹھاتا ہے تو اسے خالی ہاتھ لوٹاتے ہوئے شرم آتی ہے۔"

دعا کی شرائط

دعا کی چند شرائط ہیں:

☆ پہلی شرط توحید و اتباع سنت۔ انسان جس قدر بھی سنت کا اتباع کرے گا اسی قدر اس کی دعا مستجاب ہو گی۔

☆ دوسری شرط اخلاص ہے۔ یعنی سچے اور صاف دل سے دعا کی جائے محض دکھاوا نہ کیا جائے۔

☆ دعا کی تیسری شرط حلال مال ہے۔ جب آدمی کا کھانا پینا اور لباس حلال مال کا ہو اس کی دعا ضرور اثر کرے گی۔

☆ چوتھی شرط کبھی جھوٹ نہ بولنا ہے۔ کیونکہ جھوٹ بولنے والا منافق ہے اور منافق، ریاکار اور مشرک کی دعا قبول نہیں ہوتی (لیکن اگر اللہ چاہے)

☆ پانچویں شرط ہے کہ وہ دعا جس میں گناہ اور قطع رحمی کا شائبہ ہو قبول نہیں ہوتا۔

حکیم محمد طارق محمود چغتائی

قسط ۸

دعا عبادت کا جوہر

دنیا سکھ و چین کی جگہ نہیں بلکہ تکلیف اور مشقت کی جگہ ہے۔ ہمیں اس دنیا میں کوئی ایسا شخص نہیں ملے گا جس کی زندگی آرام و سکون سے پر ہو۔ انسان کی زندگی میں ایسے نازک دور بھی آتے ہیں جب اسے کسی کی امداد و اعانت کی ضرورت پیش آتی ہے اور اسے اس بھری دنیا میں کوئی ایسی طاقت نظر نہیں آتی جو اس مشکلات کو حل کر سکے۔ اسی حالت میں انسان کا دل دماغ ہاتھ پاؤں غرض جسم کا رواں رواں اس پروردگار عالم کو پکارتا ہے جس کی بادشاہت کائنات اور عالم کے گوشے گوشے پر ہے اور جس نے اپنے انبیاء کے ذریعے ہمیں ایک ایسا انمول ہیرا دیا ہے کہ جس کی قدر و منزلت کا ٹھکانا ہی نہیں اور وہ ہیرا "دعا" ہے۔

دعا مومن کا ہتھیار ہے

طبرانی کی حدیث میں حضور ﷺ نے فرمایا ہے "دعا مومن کا ہتھیار ہے۔" کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مومن کی مراد ظاہر میں پوری نہیں ہوتی کیونکہ مومن کو اس آزمائش سے اس کے

حضرت یوسفؑ کا اپنے دوست سے تحفہ طلب کرنا

ایک دفعہ حضرت یوسفؑ کا ایک دوست بڑی دور سے ان سے ملنے کے لیے آیا۔ دونوں بچپن کے یار تھے۔ اثنائے گفتگو میں اس نے حضرت یوسفؑ کو ان کے بھائیوں کے ظلم اور حسد کا واقعہ یاد دلایا۔ آپ نے فرمایا کہ وہ مصیبت ایک زنجیر تھی اور میں ایک شیر۔ جس طرح شیر کی زنجیر میں جکڑے جانے سے کوئی اہانت نہیں ہوتی اسی طرح میں نے قید میں پڑ کر کوئی بے عزتی محسوس نہیں کی اور اللہ سے شکوہ نہیں کیا۔

شیر را بر گردن ار زنجیر بود
بر ہمہ زنجیر ساراں میر بود

اگر شیر کی گردن میں زنجیر پڑی ہوئی ہو تو بھی وہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے تمام جانوروں کا سردار ہوتا ہے۔

دوست نے پوچھا "قید خانے اور کنوئیں میں آپ پر کیا گزری؟"

فرمایا "جیسے چاند کا حال زوال (گھٹنے) کی راتوں میں ہوتا ہے۔"

اس گفتگو کے بعد حضرت یوسفؑ نے اس سے کہا کہ ارے میاں تو میرے لیے کیا سوغات لایا ہے۔ ذرا وہ تو دکھا۔ دوستوں کے پاس خالی ہاتھ جانا ایسا ہے جیسے آٹے کی چکی پر بغیر گیہوں کے جانا۔

مہمان دوست حضرت یوسفؑ کے مطالبے پر بہت شرمندہ ہوا اور کہا کہ میں نے آپ کے شایانِ شان تحفہ ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوا۔ بھلا میں ایک رتی سونے (یا دانہ جواہر) کو کانِ زر اور ایک قطرہ آب کو دریا کے پاس کس منہ سے لاتا۔ آپ کے خزانے میں کون سی چیز نہیں ہے جو موجود نہیں ہے۔ البتہ ایک چیز آپ کے پاس ایسی ہے کہ اس کی کہیں نظیر نہیں ملتی۔ اور وہ آپ کا حسن و جمال ہے چنانچہ میں نے یہی مناسب سمجھا کہ آئینہ بطور سوغات آپ کی خدمت میں پیش کروں جو عاشقانِ الٰہی کے سینۂ پرنور کی طرح صاف اور روشن ہو اور آپ اس میں اپنا روئے زیبا دیکھ کر مجھے یاد کر لیا کریں۔

یہ کہہ کر اس نے بغل سے آئینہ نکالا اور حضرت یوسفؑ کے سامنے رکھ دیا کیوں کہ حسین آدمی کے سامنے آئینہ آتا ہے تو وہ اسی کے دیکھنے میں مشغول ہو جاتا ہے (جن کو اللہ تعالیٰ نے نورِ باطن عطا کیا ہوا ہے وہ اپنے حسن و جمال میں اللہ تعالیٰ کے حسن و جمال اور کاریگری کا تماشا دیکھتے ہیں اور ان کی زبان پر بے اختیار حق تعالیٰ کے حمد و ثنا جاری ہو جاتی ہے)۔

(جاری ہے اگلے ماہ)

کو میرا مخلصانہ سلام پہنچا دینا اور ساتھ ہی میری طرف سے کہنا کہ تمہاری ملاقات کو جی ترس گیا ہے۔ تم تو آزادی کے ساتھ باغوں اور سبزہ زاروں میں مزے کر رہے ہو اور میں یہاں قید میں گرفتار تم کو یاد کرتا رہتا ہوں ؎

این چنیں باشد وفائے دوستاں
من دریں حبس و شما در بوستاں

(کیا اسی کا نام دوستوں کی وفا ہے کہ میں پنجرے میں پڑا رہوں اور تم باغوں میں عیش کر رہے ہو)

سوداگر نے وعدہ کیا کہ وہ طوطی کا پیغام اس کی قوم تک پہنچا دے گا۔ جب وہ ہندوستان پہنچا تو ایک جنگل میں اس کو چند طوطی نظر پڑے۔ اس نے گھوڑا روک کر ان کو طوطی کا سلام و پیغام پہنچایا۔ اس کو سنتے ہی ان طوطیوں میں سے ایک تھر تھر کانپنے لگا اور پھر بیدم ہو کر زمین پر گر پڑا۔ سوداگر کو بہت افسوس ہوا کہ میں نے یہ پیغام پہنچا کر ناحق اس غریب کی جان لے لی۔ شاید یہ میرے طوطی کا کوئی قریبی عزیز تھا جو اس کی حالت زار کی خبر برداشت نہ کر سکا۔

کچھ مدت کے بعد وہ سوداگر اپنا کاروبار ختم کر کے اپنے وطن واپس آیا اور تمام اہل خانہ کو ان کے حسب فرمائش تحائف دیئے۔ طوطی نے پوچھا کہ کیا تم نے میری فرمائش پوری کی۔ سوداگر نے ایک آہ سرد بھر کر اثبات میں جواب دیا اور پھر جو واقعہ گزرا تھا من و عن بیان کر دیا۔ جونہی طوطی نے یہ قصہ سنا وہ بھی تھر تھر کانپنے لگا اور پھر گر کر ٹھنڈا ہو گیا۔ سوداگر یہ دیکھ کر فرطِ غم سے رنجور ہو گیا۔ اس نے اپنی ٹوپی زمین پر پھینک دی۔ گریبان چاک کر لیا اور بین کرنے لگا۔ جب رونے دھونے سے دل کا غبار ہلکا ہوا تو بادیدۂ گریاں پنجرہ کھول کر طوطی کو باہر پھینک دیا۔ لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ (بظاہر) مردہ طوطی نے پر پھڑپھڑائے اور پرواز کر کے ایک درخت کی اونچی ڈالی پر جا بیٹھا۔ اب سوداگر نے بڑی لجاجت سے طوطی سے پوچھا کہ اے میرے بلبل ذرا یہ تو بتا کہ ہندوستان کہ طوطی نے تجھ کو کیا خفیہ پیغام دیا جس سے کام لے کر تو نے میری عقل پر پردہ ڈال دیا۔

طوطی نے کہا کہ اس نے اپنے عمل سے مجھ کو یہ نصیحت کی تھی کہ تو بولنا چالنا ترک کر دے کیوں کہ اپنی خوش نوائی ہی کی بدولت قید کی سختیاں جھیل رہا ہے تو جو ہر خاص و عام کا دل اپنے نغموں سے خوش کرتا ہے میری طرح مردہ بن جا۔ اسی ترکیب سے تو بند قفس سے رہا ہو گا ورنہ یاد رکھ ؎

ہر کہ داد او حسن خود را بر مراد
صد قضائے بد سوئے او را نہاد

جس کو عالم آشکارا حسن عطا ہوا ہے وہ سو بلاؤں کا ہدف بھی بنتا ہے۔

یہ کہہ کر طوطی سوداگر کو خدا حافظ کہہ کر اپنے وطن کی جانب پرواز کر گیا۔

طوطی کے مرنے سے مراد نفس امارہ کو مارنا ہے۔ موسم بہار آتا ہے تو خاک سے سبزہ اور پھل پھول پھوٹ پڑتے ہیں لیکن پتھر اس وقت بھی سرسبز نہیں ہوتا۔ اگر سربلندی چاہتا ہے تو خاک بن پتھر نہ بن۔

ہے تو پہلے دل و دماغ کو ہر قسم کے وسوسوں اور جذبات سے پاک کر لے۔

سفیر نے جب اہلِ مدینہ سے اس قسم کی باتیں سنیں تو اس کے دل میں خلیفہ سے ملنے کا اشتیاق اور بھی بڑھ گیا۔ چنانچہ اس نے گھوڑا اور اسباب وہیں چھوڑا اور خود حضرت عمر فاروقؓ کی تلاش میں سرگرداں ہو گیا۔ پھرتے پھراتے اس کا گزر ایک اعرابی خاتون کے پاس سے ہوا۔ اس سے خلیفہ کا پتہ پوچھا تو اس نے کہا کہ عمرؓ کھجور کے اس درخت کے نیچے یک و تنہا سو رہے ہیں۔ سفیر ادھر بڑھا جب اس کی نظر حضرت عمرؓ پر پڑی تو ان کی ہیبت سے اس کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ اگرچہ محبت اور ہیبت ایک دوسرے کی ضد ہے لیکن اس نے محسوس کیا کہ میں نے بہتیرے بادشاہ دیکھے ہیں اور ان کی صحبتوں میں رہا ہوں لیکن آجتک مجھے کسی بادشاہ سے خوف محسوس نہیں ہوا۔ معلوم نہیں اس شخص (حضرت عمرؓ) کی ہیبت سے میرے اوسان کیوں خطا ہو گئے ہیں۔ میں شیروں اور چیتوں سے بھرے ہوئے جنگلوں میں بھی پھرتا رہا ہوں لیکن میرے چہرے پر خوف کی زردی کبھی نہیں چھائی۔ میں نے بارہا جنگوں میں حصہ لیا ہے اور شیروں کی طرح لڑ کر دنیا پر اپنی شجاعت کا سکہ بٹھایا ہے۔ حریف کو زخم لگائے بھی ہیں اور اس سے زخم کھائے بھی ہیں لیکن میرے دل نے کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی کمزوری نہیں دکھائی۔ لیکن آج معلوم نہیں کیا بات ہے کہ اس سوئے ہوئے نہتے آدمی کو دیکھ کر میرے جسم کی بوٹی بوٹی کپکپا رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ حق کی ہیبت ہے۔ اس گدڑی پوش آدمی کی نہیں ؎

ہر کہ ترسید از حق و تقویٰ گزید
ترسد از وے جن و انس و ہر کہ دید

یعنی حق سے ڈر کر جس نے تقویٰ (پرہیزگاری) کی راہ اختیار کی، اس سے جن وانس اور ہر شے ڈرتی ہے۔

وہ دل ہی دل میں ایسی باتیں کر رہا تھا کہ حضرت عمرؓ فاروق کی آنکھ کھل گئی۔ سفیر نے آگے بڑھ کر بڑے ادب سے آپکو سلام کیا۔ آپ نے نہایت شفقت سے سلام کا جواب دیا۔ سفیر کو اپنے پاس بٹھا کر تسلی دی اور دیر تک اس کے ساتھ معرفت کی باتیں کرتے رہے۔ سفیر آپ کے اخلاق حسنہ اور سادگی سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس کے دل میں کفر و شرک کا زنگ یکسر دور ہو گیا اور وہ مشرف بہ اسلام ہو گیا۔

ایک سوداگر اور اس کی طوطی

ایک سوداگر کے پاس ایک خوبصورت طوطی تھا۔ ایک مرتبہ سوداگر نے ہندوستان کے سفر کا عزم کیا۔ چلتے وقت اس نے گھر کے ہر فرد سے پوچھا کہ وہ اس کے لیے ہندوستان سے کیا تحفہ لائے۔ ہر ایک نے اپنی اپنی پسندیاں کی اور سوداگر نے اس کے لانے کا وعدہ کیا۔ پھر اس نے طوطی سے پوچھا کہ تو بھی تو بول تیرے لیے کیا تحفہ لاؤں؟

طوطی نے کہا میری صرف یہ درخواست ہے کہ جب تو ہندوستان پہنچے تو وہاں کے طوطیوں

حوصلہ عطا کیا اور جس نے مجھ کو اس ظالم سے اپنی قوم کو نجات دلانے کی ترکیب بجھائی۔ اے بھائیو! ہم نے ظاہری دشمن کو تو مار لیا لیکن اس سے بدتر دشمن ہمارے اندر چھپا بیٹھا ہے اور وہ ہے نفس امارہ۔ اس دشمن کو مارنا عقل و ہوش کے بس کی بات نہیں ہے۔ بھلا نفس امارہ کا شیر عقل و ہوش کے خرگوش سے کیا دبے گا۔ ظاہر کے شیر سے تو جنگ ختم ہو چکی ہے اب ہم کو باطن کے شیر سے نبرد آزما ہونے کی فکر کرنی چاہیے۔

سہل شیرے داں کہ صفہا بشکند
شیر آن است آنکہ خود را بشکند

"شیر کے لیے یہ آسان ہے کہ وہ صفوں کو توڑ ڈالے (درہم برہم کر دے) لیکن حقیقی شیر تو وہ ہے جو اپنے آپ کو توڑ ڈالے (فنا کر دے)"

موت کا مقام اور وقت معین ہے

ایک دن ایک سادہ دل آدمی حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں حاضر تھا۔ اس کا چہرہ زرد تھا اور جسم پر کپکپی طاری تھی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے پوچھا اے بھائی! تجھے کیا ہوا؟ اس نے عرض کی کہ یا حضرت آج مجھ کو عزرائیل نظر آیا۔ اس نے مجھ پر ایسی غضب آلود نظر ڈالی کہ میرے ہوش و حواس گم ہو گئے۔ اب مجھے کسی کل چین نہیں پڑتا اور میرے غم واندوہ کا یہی سبب ہے۔ حضرت سلیمانؑ نے پوچھا کہ اچھا اب تو کیا چاہتا ہے؟

اس نے عرض کی کہ عالی جاہ میری بس یہی التجا ہے کہ آپ ہوا کو حکم دیں کہ وہ مجھے فوراً ہندوستان میں چھوڑ آئے۔ شاید اسی طرح میری جان میں جان آئے۔

حضرت سلیمانؑ نے اسی وقت ہوا کو حکم دیا کہ اس شخص کو فی الفور ہندوستان پہنچا دو۔

ہوا نے آپ کے حکم کی تعمیل کی۔ جونہی اس شخص نے سرزمین ہند پر قدم رکھا اس کی جان قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

دوسرے دن عزرائیلؑ حضرت سلیمانؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ان سے پوچھا کہ تو نے اس مسلمان پر کل نگاہِ غضب کیوں ڈالی تھی؟

عزرائیل نے عرض کی کہ اے شاہِ جہاں مجھ کو حکم ہوا تھا کہ اس شخص کی جان ہندوستان میں فلاں وقت قبض کر لوں لیکن میں اس کو یہاں دیکھ کر حیران ہو گیا۔ جب وہ آپ کی وساطت سے ہندوستان پہنچ گیا تو میں نے حکم الٰہی کے مطابق اس کی جان قبض کر لی۔

حضرت عمر فاروق اور قیصر کا سفیر

حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں ایک دفعہ قیصر روم نے اپنا سفیر آپ کی خدمت میں بھیجا۔ جب وہ مدینہ منورہ پہنچا تو اس نے لوگوں سے پوچھا کہ خلیفہ کا محل کہاں ہے تاکہ میں وہاں اپنا گھوڑا اور اسباب پہنچاؤں۔ لوگوں نے کہا کہ ہمارے خلیفہ کا کوئی محل نہیں ہے۔ گو ان کی حکومت کا ڈنکا ساری دنیا میں بج رہا ہے لیکن وہ خود درویشوں کی طرح معمولی جھونپڑی میں رہتے ہیں۔ اگر تجھے ان کا مقام دیکھنے کی آرزو

ان کمینوں کی چکنی چپڑی باتوں میں آگیا۔ بھلا یہ رزیل اپنا عہد کیوں پورا کریں گے۔ وہ اسی طرح غصہ میں دھاڑ رہا تھا کہ دور سے خرگوش کر تیزی سے اپنی طرف آتے دیکھا۔ جب وہ قریب آیا تو شیر نے غرا کر کہا کیوں بے نابکار! تو نے اتنی دیر کیوں لگادی۔

خرگوش نے دست بستہ عرض کی کہ اے بادشاہ اگر تھوڑی دیر کے لیے جان کی امان پاؤں تو اپنی دیر سے آنے کی وجہ بیان کروں۔ شیر نے کہا "بک تو کیا کہتا ہے ؟"

خرگوش نے کہا میں تو صبح سویرے حضور کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے چلا تھا اور میرے ساتھ ایک اور خرگوش بھی حضور کے دستر خوان کی زینت بننے کے لیے روانہ ہوا تھا لیکن بدقسمتی سے راستے میں ایک اور شیر نے ہم کو روک لیا۔ میں نے اس سے کہا کہ ہم اپنے شہنشاہ کے غلام ہیں اور اسی کی درگاہ کے خادم ہیں تو ہمارے راستے میں حائل نہ ہو۔ اس ظالم نے کہا کہ میں کسی شہنشاہ وغیرہ کو نہیں جانتا اگر تم نے بھاگنے کی کوشش کی تو میں تم کو بھی اور تمہارے نام نہاد شہنشاہ کو بھی پھاڑ ڈالوں گا۔ یہ کہہ کر اس نے میرے ساتھی کو پکڑ لیا اور میں بصد مشکل جان بچا کر حضور کی خدمت میں پہنچا۔ اے بادشاہ میرا ساتھی جسامت میں مجھ سے ہٹا تھا اگر اس ظالم شیر کے یہی لچھن رہے تو حضور کے پاس بلاناغہ راتب پہنچنا ممکن نہ رہے گا۔

خرگوش کی باتیں سن کر شیر کا خون کھول اٹھا اور اس نے بپھر کر کہا کہ چل تو سہی میں دیکھوں وہ موذی کہاں ہے میں اس کو ابھی مزہ چکھاتا ہوں۔ خرگوش بڑے حوصلے اور خود اعتمادی کے ساتھ شیر کے آگے آگے چل پڑا یہاں تک کہ ایک شکستہ کنوئیں کے قریب ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ شیر نے للکار کر کہا کہ آگے بڑھ پیچھے قدم کیوں ہٹاتا ہے۔

خرگوش نے کانپتے ہوئے کہا کہ وہ شیر اسی کنویں میں رہتا ہے اور میرے ساتھی کو پکڑ کر اسی کنوئیں میں لے گیا ہے۔ اس کے خوف سے مجھے آگے بڑھنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ اگر حضور مجھے اپنی بغل میں اٹھا کر اس کنوئیں کے اندر جھانکیں تو میری باتوں کی تصدیق ہو جائے گی۔

شیر نے خرگوش کو بغل میں لے کر کنوئیں میں جھانکا تو دیکھا کہ ایک اور شیر خرگوش کو بغل میں دبائے کھڑا ہے۔ قضا آتی ہے تو عقل پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ شیر کو یہ نہ سوجھا کہ پانی میں یہ اس کا اپنا ہی عکس ہے۔ اس نے غصے میں بے تاب ہو کر خرگوش کو پرے پھینکا اور خود کنوئیں میں چھلانگ لگادی۔ خرگوش نے جب دیکھا کہ ظالم کی جان نکل گئی ہے تو فرطِ مسرت سے قلابازیاں کھاتا ہوا جنگل کو بھاگا اور اپنی قوم کو اس ظالم کی ہلاکت کی خوشخبری سنائی۔ سب جانوروں نے خرگوش کو شاباش دی اور ایک عظیم الشان جشن مسرت منعقد کر کے اس کا شکریہ ادا کیا۔ خرگوش نے کہا کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کی بدولت ہوا ہے۔ اے دوستو میری کیا بساط تھی کہ اس ظالم سے عہدہ بر آ ہوتا۔ تعریف اور شکر کے لائق وہی ذاتِ پاک ہے جس نے مجھ کو عقل اور

اشرفیاں بھر کر اعرابی کو دو۔ اس کے علاوہ اس نے اعرابی کو ایسے انعام واکرام اور خلعتوں سے نوازا کہ وہ اپنے دکھ درد کو بھول گیا۔ جب وہ رخصت ہونے لگا تو خلیفہ نے حکم دیا کہ خشکی کا راستہ بڑا طویل اور کٹھن ہے اس لیے اس کو کشتی پر بٹھا کر دریائی راستے سے اپنے وطن بھیجو۔ نقیبوں نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور اعرابی اللہ کا شکر ادا کرتا اور خلیفہ کو دعائیں دیتا اپنے وطن واپس گیا۔

دانا خرگوش

ایک جنگل میں ایک خونخوار شیر نے تمام صحرائی جانوروں کا ناک میں دم کر رکھا تھا ہر وقت ان کی گھات میں رہتا تھا اور کوئی دن نہ جاتا تھا جب وہ کسی نہ کسی جانور کو اپنا لقمہ نہ بنا لے۔ غرض کوئی جانور اس جنگل میں اپنی جان کو محفوظ نہیں سمجھتا تھا۔ آخر سب جانوروں نے مل کر ایک تجویز سوچی اور شیر کے پاس جا کر کہا کہ اے جنگل کے بادشاہ ہم روزانہ تیرے پیٹ بھر کھانے کے لیے راتب مقرر کر دیتے ہیں۔ یہ مقررہ خوراک تجھے گھر بیٹھے بلاناغہ پہنچ جایا کرے گی۔ ہماری صرف اتنی التجا ہے کہ تو ہمارا شکار نہ کیا کرتا کہ ہم جنگل میں بے کھٹکے گھوم پھر سکیں۔ شیر نے پہلے تو ان کی پیش کش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا لیکن کافی بحث و تکرار کے بعد مان گیا۔

اس معاہدے کے قرار پا جانے کے بعد تمام جانور روزانہ ایک جگہ جمع ہوتے اور قرعہ ڈالتے جس کا نام قرعہ میں آجاتا وہ بلا حیل و حجت شیر کی خوراک بننے کے لیے روانہ ہو جاتا۔ اسی طرح ہوتے ہوتے ایک دن قرعہ خرگوش پر جا پڑا۔ اس نے کہا کہ اے دوستو! یہ جور و ستم کب تک جاری رہے گا؟ اسطرح ہماری قربانیوں کا سلسلہ کبھی ختم بھی ہوگا یا نہیں؟

دوسرے جانوروں نے خرگوش کے تیور دیکھے تو انہوں نے یک زبان ہو کر اس سے کہا کہ ہم نے اتنے دن تک اپنا وعدہ پورا کیا ہے اب تم ہم کو رسوا نہ کر اور جلد شیر کے پاس جا ایسا نہ ہو کہ وہ ہم سے ناراض ہو جائے۔

خرگوش نے کہا کہ دوستو خدا نے شیر کے پنجۂ ستم سے تم کو چھڑانے کے لیے مجھے ایک چال سجھادی ہے۔ مجھے اتنی مہلت دو کہ میں اس پر عمل کر سکوں۔

جانوروں نے اس سے پوچھا کہ ذرا ہم کو بھی بتاؤ کہ تم کو کون سی تجویز سوجھی ہے۔

خرگوش نے کہا کہ راز کا برسرِ عام کھولنا دانائی سے بعید ہے۔ کیا تم نے داناؤں کا قول نہیں سنا کہ بات ہونٹوں سے نکلی اور کوٹھوں پر چڑھی۔ ذرا صبر سے کام لو اور دیکھو کہ پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے؟ جانور اب خاموش ہو گئے اور دم بخود ہو کر انتظار کرنے لگے کہ دیکھیں خرگوش کیا قدم اٹھاتا ہے۔

اب خرگوش کی سنیے۔ وہ مزے سے اپنے گھر بیٹھا رہا۔ جب شیر کو مقررہ وقت پر خوراک نہ پہنچی تو اس کے غیظ و غضب کی انتہا نہ رہی۔ بار بار زمین پر پنجے مارتا تھا اور کہتا تھا کہ ہائے افسوس میں

میں رہ رہا تھا۔ اس خلیفہ کے عہد میں ایک اعرابی بڑی تنگی ترشی سے اپنی زندگی کے دن گزار رہا تھا۔ ایک رات اس اعرابی کی بیوی نے شکایت کی کہ ساری دنیا میں ہم جیسا بد قسمت اور غریب کوئی نہ ہوگا۔ نہ ہمارے پاس کھانے کو روٹی ہے اور نہ پہننے کے لیے ڈھنگ کا کپڑا۔ ہماری غریبی کو دیکھ کر اپنے بیگانے سب حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ آخر یہ صورتِ حال کب تک جاری رہے گی۔

اعرابی نے کہا کہ اری نیک بخت زیادہ گزر گئی ہے اور تھوڑی باقی رہ گئی ہے۔ قناعت سے بڑھ کو کوئی دولت نہیں تو حرص و ہوس میں پھنس کر کیوں اپنا جی میلا کرتی ہے۔

بیوی نے جھلا کر کہا تو اپنی قناعت کو اپنے پاس ہی رکھ۔ معلوم نہیں تیری غیرت کو کیا ہوا۔ بے عزتی اور مفلسی کی زندگی کو قناعت کا نام دینا قناعت کے لفظ کا منہ چڑانا ہے۔ اعرابی بیوی کے طعنوں پر بڑا سیخ پا ہوا اور اس نے چیخ کر کہا کہ اے بس کی گانٹھ اپنی بکواس بند کر ورنہ میں گھر بار چھوڑ کر بھاگ جاؤں گا۔

عورت اب رونے لگی اور اس کی منت سماجت اور تعریفیں کرنے لگی۔ یہاں تک کہ خاوند کا دل پسیج گیا اور وہ کہنے لگا کہ تو ہی بتا کہ اس مفلسی سے نجات پانے کی کیا تدبیر کروں۔

بیوی نے کہا آجکل بغداد کے خلیفہ کی سخاوت کی ساری دنیا میں چرچا ہو رہا ہے اگر تو اس سے مل سکے تو ساری مصیبتوں کے دن کٹ جائیں۔

اعرابی نے کہا کہ مجھ جیسا مسکین بارگاہِ شاہی میں باریابی کیسے پا سکتا ہے؟ بیوی نے کہا کہ ہمارے مشکیزے میں برساتی پانی بھرا رکھا ہے تو یہی مشکیزہ لے جا اور خلیفہ کی نذر کر۔ اس کی خدمت میں اس کے سوا اور کچھ عرض نہ کرنا کہ جس بیابان سے میں آرہا ہوں وہاں اس پانی سے بہتر حضور کی نذر کرنے کی قابل کوئی چیز نہ تھی۔

اعرابی نے عورت کی بات مان لی اور پانی کے مشکیزے کو اٹھا کر عازم بغداد ہو گیا۔ ادھر عورت نے مصلیٰ بچھالیا اور رات دن اپنے شوہر کی سلامتی کی دعائیں مانگنے لگی۔ اللہ تعالیٰ نے اعرابی کی دستگیری کی اور وہ مشکیزے کو سینے سے لگائے کئی دن کے پر صعوبت سفر کے بعد صحیح سلامت بغداد پہنچ گیا۔ وہاں اس نے دیکھا کہ ہر طرف حاجت مندوں کی بھیڑ لگی ہے اور وہ جھولیاں بھر بھر کر بارگاہِ شاہی سے نکل رہے ہیں۔ وہ بیچارہ بھی شاہی محل کے دروازے پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ شاہی نقیبوں نے اس سے پوچھا کہ اے عرب کے شریف تو کس جگہ سے آیا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ اے سردارو اگر تم مجھے عزت دو تو میں شریف ہوں اور اگر میری طرف پیٹھ پھیر لو تو بے عزت ہوں۔ میں مسافر ہوں، ایک دور افتادہ بیابان سے آرہا ہوں اور یہ مشکیزہ خلیفہ کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے لایا ہوں۔ اس میں میٹھا برساتی پانی ہے۔

شاہی نقیبوں نے ہنستے ہوئے یہ مشکیزہ اس سے لے لیا اور خلیفہ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ خلیفہ نے نہایت خوش دلی سے یہ تحفہ قبول کر لیا اور حکم دیا کہ اس مشکیزے کو خالی کر کے اس میں

ماخوذ از مثنوی مولائے روم

خدا کے پاک بندوں پر اپنا قیاس نہ کرو

ایک بنیے کے پاس طرح طرح کی بولیاں بولنے والا سبز رنگ کا خوبصورت طوطا تھا۔ وہ طوطا مالک کی غیر حاضری میں دکان کی نگہبانی کرتا اور گاہکوں سے مزے مزے کی باتیں کیا کرتا تھا۔ ایک دن بنیا اپنے گھر گیا ہوا تھا اور طوطا دکان کی نگہبانی کر رہا تھا کہ یکایک ایک بلی چوہے کے پیچھے دوڑی۔ طوطا خوفزدہ ہو کر ایک طرف بھاگا۔ وہاں روغنِ بادام کی چند بوتلیں پڑی ہوئی تھیں وہ سب لڑھک گئیں اور روغنِ بادام زمین پر بہہ گیا۔ بنیا گھر سے لوٹا اور روغن کو زمین پر بہتے دیکھا تو اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور غصے سے طوطے کے سر پر اس زور سے ہاتھ مارا کہ وہ بیچارا گنجا ہو گیا۔ چونکہ طوطے کو بے قصور سزا ملی تھی وہ برا مان گیا اور بول چال ترک کر دی۔ اس کی خاموشی سے بنیا بہت پشیمان ہوا۔ بہتیرے کوشش کی لیکن طوطے کی مہر سکوت نہ ٹوٹی۔ اس طرح کافی مدت گزر گئی۔ ایک دن وہ دکان میں طوطے کی خاموشی کے غم میں غلطاں بیٹھا تھا کہ ایک منڈے ہوئے سر والا درویش دکان کے سامنے سے گزرا۔ طوطے نے جونہی اس کو دیکھا زور سے پکار اٹھا "ارے گنجے شاید تو نے بھی تیل کی بوتل لنڈھائی جو تجھے بھی گنجا ہونا پڑا۔" جو لوگ وہاں موجود تھے وہ طوطے کی بات سن کر بے اختیار ہنس دیے کہ اس طوطے نے درویش کو بھی اپنے جیسا سمجھا۔

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر
گر چہ باشد در نوشتن شیر شیر

(اللہ کے پاک بندوں کو اپنے جیسا مت سمجھو۔ اگرچہ لکھنے میں شیر اور شِیر کو ایک ہی طرح لکھا جاتا ہے لیکن ان میں فرق ہے وہ ظاہر ہے)

سخی خلیفہ کی خدمت میں پانی کا تحفہ

اگلے وقتوں میں ایک خلیفہ تھا۔ جس کی سخاوت اور داد و دہش کے سامنے حاتم کا نام بھی ماند پڑ گیا تھا۔ اطراف و اکناف عالم سے لوگ جوق در جوق اس کی خدمت میں آتے اور اس کے بحرِ سخاوت سے خوب خوب سیراب ہو کر واپس جاتے۔ غرض اس کی جود و سخا کا ڈنکا چار دانگ عالم

اور صائب الرائے اور ہوشیار ہوگا وہ کہے گا کہ دس دن بھی کہاں ؟ صرف ایک ہی دن سمجھو اس بات کے کہنے والے کو عقلمند اور اچھی روش والا اس لئے فرمایا کہ دنیا کا زوال و فنا اور آخرت کی بقا اور دوام اور سختی کو اس نے دوسروں سے زیادہ سمجھا۔

سورۂ نازعات میں فرمایا:' کانهم یوم یرونها لم یلبثوا لا عشیة او ضحٰها یعنی جب وہ قیامت کو دیکھیں گے تو ایسا معلوم ہوگا کہ دنیا میں بس ایک شام یا اس کی صبح ٹھہرے ہیں۔

اب تو جلدی کرتے ہیں اور کہتے ہیں متی هذاالوعد ان کنتم صدقین یہ وعدہ کب پورا ہوگا اگر تم سچے ہو۔

سورۂ روم میں فرمایا ویوم تقوم الساعة یقسم المجرمون ما لبثوا غیر ساعة لذالك کانوا یوفکون اور جس دن قائم ہوگی قیامت قسم کھا کر کہیں گے مجرمین کہ ہم دنیا میں ایک گھڑی سے زیادہ نہیں رہے اسی طرح الٹے چلتے تھے۔

قبر میں یا دنیا میں رہنا تھوڑا سا معلوم ہوگا جب قیامت کی مصیبت سر پر آکھڑی ہوگی تو افسوس کریں گے اور کہیں گے کہ دنیا کی اور برزخ کی زندگی بڑی جلدی ختم ہوگئی، کچھ زیادہ مدت ٹھہرنے کا موقعہ ملتا تو اس دن کے لیے تیاری کرتے یہ تو ایک دم مصیبت کی گھڑی سامنے آگئی دنیا کے مزے اور لمبی چوڑی امیدیں سب بھول جائیں گے بے ہودہ عمر ضائع کرنے اور دنیا کے ساز و سامان اور عہدوں اور بڑائیوں میں جو برسہا برس گزارے تھے اتنی لمبی عمر کو گھڑی بھر کی زندگی بتائیں گے اللہ جل شانہ نے فرمایا کذالك کانوا یؤفکون یعنی اسی طرح دنیا میں الٹی باتیں کرتے تھے اور بے ہودہ خیالات جماتے تھے نہ دنیا میں حق کو مانا اور دل میں اتارا نہ یہاں سچ بول رہے ہیں۔

(اگلے ماہ قیامت کے دن کی پریشانی اور حیرانی)

☆☆☆☆☆

دن اندھے، گونگے اور بہرے کر کے چہروں کے بل چلائیں گے۔)

سورۂ طٰہٰ میں ارشاد فرمایا:

ومن اعــرض عن ذکری فان له معیشة ضنکا و نحشــرهم یوم القیٰمة اعمیٰ قال ربّ لم حشــرتنی اعمیٰ وقــد کنت بصیراً . قال کذالك اتتك آیاتنا فنسیتها و کــذالك الیوم تنسیٰ . وکـــذالك نجــزی من اسرف ولم یومن بآیات ربه ولعــذاب الآخرة اشد وابقی	اور جس نے منہ پھیرا میری یاد سے تو اس کے لیے ہے تنگی کی زندگی اور قیامت کے روز ہم اس کا حشر اس طرح کریں گے کہ وہ اندھا ہوگا اور وہ کہے گا کہ اے میرے رب کیوں تو نے مجھے اندھا اٹھایا حالانکہ میں دیکھتا تھا جواب میں ارشاد باری ہوگا اسی طرح آئی تجھیں تیرے پاس میری آیتیں پس تو نے ان کو بھلا دیا اور اسی طرح تو آج بھلایا جائے گا اور اسی طرح ہم بدلہ دیں گے اس کو جو حد سے بڑھا اور اپنے رب کی آیتوں پر ایمان نہ لایا اور البتہ آخرت کا عذاب سخت ہے اور باقی رہنے والا ہے۔

خداوند عالم کے دین سے دنیا میں جن لوگوں نے آنکھیں پھیریں اور مالک حقیقی کی آیات کو سن کر قبول کرنے اور اقرار کرنے کے بجائے سب سنی ان سنی کر دی ان کی آنکھوں اور کانوں اور زبانوں کی طاقتیں سلب کر لی جائیں گی اور گونگے بہرے ہو کر اٹھیں گے۔ یہ ابتدائے حشر کا ذکر ہے پھر آنکھیں اور زبانیں اور کان کھول دیئے جائیں گے تاکہ محشر کے حالات اور اس کی سختیاں دیکھ سکیں اور حساب کتاب کے موقعہ پر ان سے جواب سوال کیو جاوے (کمالین عالم التنزیل)

کافروں کی آنکھیں نیلی ہوں گی

ونحشر المجرمین یومئذ زرقاًیتخافتون بینهم ان لم لبثتم الا عشراً۔

''اور ہم جمع کریں گے اس دن گنہ گاروں کو اس حال میں کہ ان کی آنکھیں نیلی ہوں گی چپکے چپکے آپس میں کہتے ہوں گے کہ دنیا میں بس تم دس دن رہے ہو۔''

یعنی بد نمائی کے لیے ان کی آنکھیں نیلی کر دی جائیں گی، جب قیامت کو اٹھ کھڑے ہوں گے تو آپس میں آہستہ آہستہ باتیں کریں گے کہ دنیا میں کتنے دن رہے پھر خود ہی آپس میں جواب دیں گے کوئی کہے گا کہ دنیا میں ہم دس دن رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے بعد دوسری آیت میں فرمایا:

دنیا میں کتنے دن رہے؟

نحن اعلم بما یقولون اذ یقول امثلهم طریقة ان لبثتم الا یوماً (ہم کو اچھی طرح معلوم ہے کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں جب بولے گا ان میں کا اچھی روش والا کہ تم دنیا میں ایک دن سے زیادہ نہیں رہے۔)

آخرت کا طول اور وہاں کے ہولناک مناظر دیکھ کر دنیا میں یا قبر میں رہنا اتنا کم نظر آئے گا کہ گویا عشرہ سے زیادہ نہیں رہے، عشرہ بھی کسی کے خیال میں گزرے گا ورنہ جو ان میں زیادہ عقل مند

نے سب سے پہلے فقیروں کو کپڑے پہنائے تھے یا اس لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دینے کی وجہ سے سب پہلے فقیروں کو کپڑے پہنائے تھے یا اس لئے کہ وہ اللہ تعالے کی طرف دعوت دینے کی وجہ سے سب سے پہلے ننگے کئے گئے جب کہ کافروں نے ان کو آگ میں ڈالا تھا۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سب سے پہلے جس کو کپڑے پہنائے جائیں گے وہ ابراہیمؑ ہوں گے اللہ تعالیٰ فرمائیں گے میرے دوست کو پہناؤ چنانچہ جنت کے کپڑوں میں سے دو باریک اور نرم سفید کپڑے ان کو پہنانے کے لئے لائے جائیں گے ان کے بعد مجھے کپڑے پہنائے جائیں گے۔

قبروں سے اٹھ کر میدان حشر میں جمع ہونے کے لئے چلنا!

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے روز لوگ تین قسم سے جمع کئے جائیں گے (۱) ایک جماعت پیدل (۲) دوسری سوار (۳) تیسری وہ جماعت ہوگی کو اپنے چہروں کے بل چلیں گے، سوال کیا گیا کہ یارسول اللہ وہ لوگ چہروں کے بل کیوں کر چلیں گے! جواب میں سید عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بے شک جس ذات پاک نے ان قدموں پر چلایا وہ اس پر قادر ہے کہ ان کو چہروں کے بل چلا دے پھر فرمایا کہ خبردار وہ (چہروں کے بل اس طرح چلیں گے) کہ زمین کے ابھرے ہوئے حصہ اور کانٹوں تک سے اپنے چہروں کے ذریعے بچاؤ کریں گے۔ (ترمذی)

یہ حال کافروں کا ہوگا، چونکہ ان نالائقوں نے دنیا میں اپنے چہرے کو حضور خداوندی میں رکھنے سے انکار کیا اور تکبر و غرور کے باعث سجدہ میں سر رکھنے سے انکار کیا اس لیے قیامت کے روز ان کے چہروں سے ان کو پاؤں کا کام دلایا جائے گا تاکہ خوب ذلیل ہوں اور چہروں کے خالق و مالک کو سجدہ کرنے سے جو انکار کیا تھا اس کا مزا چکھ لیں۔ اللہ تعالیٰ کو سب کچھ قدرت ہے وہ اپنی مخلوق کے جسم کے ہر حصہ کو اس کی ہر خدمت میں استعمال فرماسکتے ہیں دنیا ہی میں دیکھ لیا جائے کہ بعض چیزیں چار پیروں پر اور بعض دو پیروں پر چلتی ہیں اور بعض صرف اپنے پیٹ سے (فمنهم من یمشی علیٰ بطنه الآیه) وہ لوگ جن کے ایک ہاتھ ہے وہ اسی ایک ہاتھ سے دونوں ہاتھوں کا کام کر لیتے ہیں جو لوگ نابینا ہوتے ہیں جن سے بڑی حد تک بینائی نہ ہونے کی تلافی ہو جاتی ہے، قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کافروں کو چہرے کے بل چلائیں گے یہ عقلاً ذرا بھی بعید نہیں ہے۔

کفار گونگے بہرے اور اندھے اٹھائے جائیں گے

سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا:

ونحشرهم یوم القیٰمة علیٰ وجوههم عمیاً و بكماً و صماً (اور ہم ان کو قیامت کے

انسانوں کا قبر سے نکلنا

حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سب سے پہلے زمین پھٹ کر مجھے ظاہر کرے گی پھر ابوبکرؓ و عمرؓ قبروں سے ظاہر ہوں گے پھر بقیع (قبرستان) میں جاؤں گا لہذا وہ (قبروں سے نکل کر) میرے ساتھ جمع کر دیئے جائیں گے، پھر میں مکہ والوں کا انتظار کروں گا (حتیٰ کہ وہ بھی قبروں سے نکل کر میرے ساتھ ہو جائیں گے) پھر یہ کہ میں حرمین (والوں) کے درمیان (محشر میں) جمع ہو جاؤں گا۔ (ترمذی)

جو لوگ قبروں میں دفن ہیں (مسلم ہوں یا کافر) وہ تو دوسری مرتبہ صور کی آواز سن کر قبروں سے نکل کھڑے ہوں گے اور جو لوگ آگ میں جلا دیئے گئے یا سمندروں میں بہا دیئے گئے یا جن کو درندوں نے پھاڑ کھایا تھا ان کی روحوں کو بھی مجسم عطا کیا جائے گا اور لا محالہ وہ بھی محشر میں حاضر ہوں گے۔

قبروں سے ننگے اور غیر مختون نکلیںگے

حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ آنحضرت ﷺ سے سنا کہ قیامت کے روز لوگ ننگے پاؤں ننگے بدن بے ختنہ جمع کئے جائیں گے۔ میں نے عرض کیا یارسول اللہ کیا مرد و عورت سب (ننگے ہوں گے اور) ایک دوسرے کو دیکھتے ہوں گے (اگر ایسا ہوا تو بڑے شرم کا مقام ہوگا) اس کے جواب میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اے عائشہ قیامت کی سختی اس قدر ہوگی (اور لوگ گھبراہٹ اور پریشانی سے ایسے بدحال ہوں گے کہ کسی کو دوسرے کی طرف دیکھنے کا دھیان ہی نہ ہوگا۔ (بخاری و مسلم)

دوسری حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بیشک قیامت کے روز تم ننگے پاؤں، ننگے بدن، بے ختنہ جمع کئے جاؤ گے، یہ فرما کر قرآن مجید کی آیت کما بدأنا اول خلق نعیدہ (ہم نے جس طرح اول بار پیدا کرنے کے وقت ابتدا کی تھی اس کو دوبارہ اسی طرح لوٹائیں گے) تلاوت فرمائی پھر فرمایا کہ سب سے پہلے قیامت کے روز ابراہیمؑ کو کپڑے پہنائے جائیں گے (بخاری) علما نے لکھا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو اس لیے کپڑے پہنائے جائیں گے کہ انہوں

عہدۂ قضا

خلیفہ منصور نے حضرت امام اعظمؒ کو بلا کر کہا کہ آپ عہدۂ قضا قبول کر لیں اور میری مملکت کے آپ قاضی یعنی چیف جج بن جائیں۔ حضرت امام اعظمؒ نے فرمایا "میں اس عہدہ کے قابل نہیں ہوں۔" خلیفہ نے کہا "آپ جھوٹ کہتے ہیں آپ سے زیادہ اس عہدہ کے اور کون قابل ہوگا۔" آپ نے فرمایا "اگر میں جھوٹ بولتا ہوں تو آپ نے خود ہی فیصلہ کر دیا کہ میں جج بننے کے قابل نہیں ہوں اس لیے کہ جھوٹا آدمی جج نہیں بن سکتا۔" یہ کہہ کر آپ وہاں سے اٹھ کر چلے آئے۔

(تذکرۃ الاولیا)

چرا نہ کریں۔

زمین کھینچ کر ربڑ کی طرح بڑھادی جاویگی اور عمارتیں اور پہاڑ وغیرہ سب برابر کر دیئے جائیں گے تاکہ ایک سطح مستوی پر سب اولین و آخرین بیک وقت کھڑے ہو سکیں اور کوئی حجاب حائل باقی نہ رہے۔ زمین اپنے اندر کی چیزوں کو باہر ڈال دے گی اور خالی ہو جائے گی یعنی وہ اپنے اندر سے خزانے اور مردے اور مردوں کے اجزاء اگل ڈالے گی اور ان تمام چیزوں سے خالی ہو جائے گی جن کا تعلق بندوں کے اعمال کی جزا ملنے سے ہوگا۔

چاند سورج اور ستارے

سورۂ تکویر میں فرمایا: اذا الشمس کورت واذا النجوم انکدرت (جب آفتاب بے نور ہو جائے گا اور جب ستارے ٹوٹ کر گر پڑیں گے)۔

سورۂ انفطار میں فرمایا: اذا السماء انفطرت واذاالکواکب انتثرت (جب آسمان پھٹ جاوے گا اور جب ستارے جھڑ پڑیں گے)۔

ان آیات سے آسمان کا پھٹنا اور ستاروں کا جھڑنا واضح ہوا سورۂ مرسلت میں فرمایا ہے کہ اس روز ستاروں کی روشنی ختم کر دی جائے گی، چنانچہ ارشاد ہے: فاذا النجوم طمست (سو جب ستارے بے نور ہو جائیں گے)۔

سورۂ قیامہ میں ارشاد فرمایا:

پوچھتا ہے انسان کب ہوگا دن قیامت۔ پس جب چندھیانے لگے آنکھ اور بے نور ہو جائے چاند اور جمع کیئے جائیں چاند اور سورج اس روز، کہے گا انسان کہاں چلا جاؤں بھاگ کر، ہرگز نہیں کہیں پناہ کی جگہ نہیں، اس دن صرف تیرے رب کی طرف جا ٹھہرنا ہے۔

ان آیات کریمہ سے واضح ہوا کہ قیامت کے روز چاند بھی بے نور ہو جائے گا، چاند کے بے نور ہونے کا ذکر فرماکر ارشاد فرمایا و جمع الشمس والقمر بحسبان (سورج اور چاند جمع کیئے جائیں گے) یعنی صرف چاند ہی بے نور نہ ہوگا بلکہ بے نور ہونے میں دونوں شریک ہوں گے، چاند کے بے نور ہونے کا خصوصیت کے ساتھ شاید اس لیے ذکر فرمایا کہ اہل عرب کو قمری حساب رکھنے کی وجہ سے اس کا حال دیکھنے کا زیادہ اہتمام تھا۔

حضرت ابو ہریرہؓ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے روز چاند اور سورج دونوں لپیٹ دیئے جائیں گے۔ یعنی ان کی روشنی لپیٹ دی جائے گی جس کے باعث روشنی نہ پھیل سکے گی نہ کسی چیز پر پڑے گی۔ بیہقی نے کتاب البعث والنشور میں حضرت حسن بصریؒ سے روایت کی ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے آنحضرت ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہوئے فرمایا کہ سورج اور چاند بے نور کر کے دو ٹکڑے بنا کر قیامت کے روز دوزخ میں ڈال دیئے جائیں گے۔ یہ سن کر حضرت حسنؒ نے سوال کیا کہ ان کی کیا وجہ ہے؟ حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ آنحضرت ﷺ کا فرمان نقل کر رہا ہوں (اس سے زیادہ مجھے علم نہیں) یہ سن کر حسن خاموش ہوگئے (مشکوٰۃ)

جب قیامت ہوگی تو آسمان میں یہ تبدیلی ہوگی کہ اس کے ستارے جھڑ پڑیں گے اور بے نور ہو جائیں گے اور چاند سورج کی روشنی لپیٹ دی جائے گی نیز آسمان پھٹ پڑے گا اور اس میں دروازے ہو جائیں گے۔

سورۂ نبا میں فرمایا:

یوم ینفخ فی الصور فتاتون افواجاً و فتحت السماء فکانت ابوابًا	جس دن پھونکا جائے گا صور میں تو تم چلے آؤ گے غول کے غول اور کھولا جائے گا آسمان تو ہو جائیں گے اس میں دروازے۔

یعنی آسمان پھٹ کر ایسا ہو جائے گا کہ گویا دروازے ہی دروازے ہیں۔ سورۂ مرسلت میں فرمایا واذا السماء فرجت (اور جب آسمان میں جھروکے پڑ جائیں گے)۔

سورۂ فرقان میں فرمایا:

ویوم تشقق السماء بالغمام و نزل الملئکة تنزیلا	جس روز پھٹ جائے آسمان بادل سے اور اتار دیئے جائیں فرشتے لگاتار۔

سورۂ حاقہ میں فرمایا:

"پھر جب صور میں پھونک ماری جاوے ایک پھونک اور اٹھا دیئے جائیں (اپنی جگہ سے) زمین اور پہاڑ پھر دونوں ایک دفعہ ریزہ ریزہ کر دیئے جائیں گے تو اس روز ہو پڑنے والی ہو پڑے گی (یعنی قیامت) اور آسمان پھٹ جائے گا تو وہ اس روز بودا ہوگا اور فرشتے آسمان کے کناروں پر آجائیں گے اور آپ کے پروردگار کے عرش کو اس روز آٹھ فرشتے اٹھائے ہوں گے۔"

جس وقت درمیان سے آسمان پھٹنے لگے گا تو فرشتے اس کے کناروں پر چلیں گے۔

سورۂ رحمٰن میں ارشاد فرمایا:

فاذا انشقت السماء فکانت وردةً کالدهان	پس جب آسمان پھٹ جائیگا تو ایسا سرخ ہو جائے گا جیسے سرخ نری۔

اور سورۂ معارج میں فرمایا ہے کہ آسمان اس روز مہمل یعنی پگھلے ہوئے تانبے کی طرح ہوگا یعنی پھٹنے کے ساتھ اس کا رنگ بھی بدل جائے گا اور سرخ ہو جائے گا سورۂ طور میں فرمایا ہے کہ اس روز آسمان کپکپائے گا (یوم تمور السماء موراً یعنی کپکپا کر پھٹ پڑے گا)

سورۂ انشقاق میں فرمایا:

اذا السماء انشقت واذنت لربها وحقت و اذا لارض مدت والقت ما فیها وتخلت واذنت لربها وحقت	جب آسمان پھٹ جائے گا اور اپنے رب کا حکم سن لے گا اور وہ اسی لائق ہے اور جب زمین کھینچ کر بڑھا دی جائے گی اور اپنے اندر کی چیزوں کو باہر ڈال دے گی اور خالی ہو جائے گی اور اپنے رب کا حکم سن لے گی اور وہ اسی لائق ہے۔

آسمان کو پھٹنے کا اور زمین کو کھینچ کر بڑھ جانے اور پھیل جانے کا حکم ان کے رب کی طرف سے ہوگا، دونوں اللہ کی مخلوق ہیں، مخلوق کو خالق کا حکم سننا اور عمل کرنا لازمی امر ہے یہ دونوں بھی اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کریں گے اور ان کو یہی لائق بھی ہے کہ اپنے خالق و مالک کے حکم کے آگے جھک جائیں اور فرماں برداری میں ذرا چون و

جس نے درست کی ہر چیز کو)۔

یعنی یہ بڑے بڑے پہاڑ جن کو تم اس وقت دیکھ کر یہ خیال کرتے ہو کہ یہ ایسے جمے ہوئے ہیں کہ کبھی اپنی جگہ سے جنبش ہی نہ کھا سکیں گے ان پر ایک دن ایسا آنے والا ہے کہ یہ روئی کے گالوں کی طرح اڑے اڑے پھریں گے اور بادل کی طرح تیز رفتار ہوں گے، اللہ رب العزت نے حکمت کے مطابق ہر چیز کو درست کیا اسی نے آج پہاڑوں کو ایسا بوجھل اور بھاری اور جامد بنایا کہ زمین کو بھی ہلنے سے روکے ہوئے ہیں۔ والقیٰ فی الارض رواسی ان تمید بکم ۔ پھر قیامت کے روز ان کا مالک اور خالق ذرہ ذرہ کر کے اڑا دے گا، یہ سب اس صانع حقیقی کی کاریگری ہے جس کا کوئی تصرف حکمت سے خالی نہیں۔ سورۂ واقعہ میں فرمایا وبست الجبال بسا فکانت ھباءً منبثا (اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے پہاڑ پھر ہو جائیں گے اڑتا ہوں غبار)

آسمان و زمین

سورۂ طٰہٰ میں فرمایا:

ویسئلونك عن الجبال فقل ینسفھا ربی نسفا. فیذرھا قاعاً صفصفاً لا تریٰ فیھا عوجاً ولا امتاً

اور وہ آپ سے پہاڑوں کے متعلق دریافت کرتے ہیں آپ فرما دیجئے کہ میرا رب ان کو اچھی طرح اڑا دے گا پھر زمین کو چھوڑ دے گا چٹیل میدان، نہ دیکھے گا تو اس میں مڑا اور ٹیلا

یعنی قیامت کے روز پہاڑ اڑا دیئے جائیں گے اور زمین صاف اور ہموار میدان بنا دی جائے گی کوئی ٹیلا اس پر نہ رہے گا سورۂ ابراہیم میں فرمایا:

یوم تبدل الارض غیر الارض والسمٰوٰت وبرزوا للہ الواحد القھار

جس دن بدل دی جائے اس زمین سے دوسری زمین اور بدلے جائیں آسمان اور لوگ نکل کھڑے ہوں گے اللہ واحد قہار کے سامنے۔

اس آیت شریفہ سے معلوم ہوا کہ آسمان و زمین قیامت کے روز بدل دیئے جائیں گے اور اپنی اس ہیئت موجودہ پر برقرار نہ رہیں گے اس آیت کے متعلق حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ جب آسمان و زمین بدلے جائیں گے تو اس روز لوگ کہاں ہوں گے؟ اس کے جواب میں فخر دو عالم ﷺ نے فرمایا کہ پل صراط پر ہوں گے۔ (مسلم) اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت شریفہ میں جو آسمان و زمین کے بدلے جانے کا ذکر ہے وہ حساب کتاب ہونے کے بعد اس وقت ہوگا جب کہ لوگ جنت یا دوزخ میں بھیجے جانے کے لیے پل صراط پر پہنچ جائیں گے۔

پہلی آیت میں جو ذکر ہوا کہ زمین ہموار اور صاف میدان کر دی جائے گی یہ حساب و کتاب شروع ہونے سے پہلے کا ذکر ہے، حضرت سہیل بن سعدؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت سید عالم ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے روز لوگ ایسی زمین پر جمع کیے جائیں گے جس کا رنگ سفید ہوگا لیکن سفیدی مٹیالے رنگ کی طرف مائل ہوگی۔ اس وقت زمین مثل میدہ کی روٹی کے ہوگی کسی کی اس میں نشانی نہ ہوگی (بخاری)

والا نہ ہوگا لہٰذا خود ہی جواب میں فرمائیں گے لله الواحد القهار (آج بس اللہ ہی کا راج ہے جو تنہا (اور) قہار ہے)۔

یعنی آج کے روز بس اسی شہنشاہِ مطلق کا راج ہے جس کے سامنے ہر طاقت دبی ہوئی ہے، تمام مجازی سلطنتیں اور حکومتیں اس وقت فنا ہیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بیشک لوگ قیامت کے روز بے ہوش ہو جائیں گے اور میں بھی ان کے ساتھ بے ہوش ہو جاؤں گا پھر سب سے پہلے میری ہی بے ہوشی دور ہوگی تو اچانک دیکھوں گا کہ موسیٰ (پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام) عرش الٰہی کو ایک جانب پکڑے کھڑے ہیں، میں نہیں جانتا کہ وہ بے ہوش ہو کر مجھ سے پہلے ہوش میں آچکے ہوں گے یا ان پر بے ہوشی آئی نہ ہوگی اور وہ ان میں سے ہوں گے جن کے بارے میں ارشاد خداوندی الا ماشاء اللہ ہے۔

(مشکوٰۃ شریف باب بدء الخلق وذکر الانبیاء علیہم السلام)

کائنات عالم کا درہم برہم ہونا

صور پھونکے جانے سے نہ صرف یہ نہ نسان مر جائیں گے بلکہ کائنات کا نظام ہی درہم برہم ہو جائے گا، آسمان پھٹ جائے گا ستارے جھڑ جائیں گے اور بے نور ہو جائیں گے چاند و سورج کی روشنی ختم کردی جائے گی زمین ہموار میدان بن جائے گی، پہاڑ اڑتے پھریں گے۔

ذیل کی آیات واحادیث سے یہ باتیں واضح طور پر ظاہر ہو رہی ہیں۔ ارشاد باری ہے:

پہاڑوں کا حال

القارعة ما القارعة.	وہ کھڑ کھڑانے والی، کیا ہے
وما ادراك ما القارعة. يوم يكون الناس كالفراش المبثوث و تكون الجبال كالعهن المنفوش.	وہ کھڑ کھڑانے والی اور تو کیا سمجھا ہے وہ کھڑ کھڑانے والی۔ جس روز لوگ پروانوں کی طرح اور پہاڑ دھنی ہوئی رنگین اون کی طرح ہوں گے۔

القارعہ (کھڑ کھڑانے والی) قیامت کو فرمایا گیا ہے۔ یہ نام اس کا اس لئے رکھا گیا ہے کہ وہ دلوں کو گھبراہٹ سے اور کانوں کو سخت آواز سے کھڑ کھڑا دے گی۔ اس روز انسان پروانوں کی طرح بے تابانہ بدحواس ہو کر محشر کی طرف جمع ہونے کے لیے چل پڑیں گے ایسے غیر منظم طریقہ پر چلیں گے کہ جیسے پروانے اندھادھند چراغ پر گرتے جاتے ہیں اور پہاڑوں کا یہ حال ہوگا کہ جیسے دھنیا اون یا روئی کو دھن کر ایک ایک پھایہ اڑا دیتا ہے اسی طرح پہاڑ متفرق ہو کر اڑ جائیں گے۔ سورۂ مرسلت میں فرمایا واذا الجبال نسفت (اور جب پہاڑ اڑا دیئے جائیں گے) سورۂ نبا میں فرمایا و سيرت الجبال فكانت سرابا (اور چلائے جائیں گے پہاڑ تو ہو جائیں گے چمکتا ہوا ریت)۔ سورۂ نحل میں فرمایا وترى الجبال تحسبها جامدة وهى تمر مر السحاب۔ صنع الله الذى اتقن كل شيئ (اور تو دیکھے پہاڑوں کو سمجھتے ہوئے کہ وہ جمے ہوئے ہیں حالانکہ وہ چلیں گے بادل کے چلنے کی طرح کاریگری اللہ کی

پھونکا جائے گا تو سب بے ہوش ہو جائیں گے (الا من شاء الله) پھر زندہ تو مر جائیں گے اور جو مر چکے تھے ان کی روحوں پر بے ہوشی کی کیفیت طاری ہو جائے گی ، اس کے بعد دوبارہ صور پھونکا جائے گا تو مردوں کی روحیں ان کے بدنوں میں واپس آجائیں گی اور جو بے ہوش تھے ان کی بے ہوشی چلی جائے گی اور افاقہ ہو جائے گا، اس وقت کا عجیب وغریب حال دیکھ کر سب حیرانی سے تکتے ہوں گے اور خداوند کریم کی بارگاہ میں پیشی کے لیے تیزی ساتھ حاضر کئے جائیں گے۔

سورۂ یٰسین شریف میں فرمایا :

ونفخ فی الصور فاذاهم من الاجداث الیٰ ربهم ینسلون قالوا یٰویلنا من بعثنا من مرقدنا هذا ما وعد الرحمٰن و صدق المرسلون . ان كانت الا صیحة واحدة فاذاهم جمیع لدینا محضرون.	اور صور میں پھونکا جائے گا پس اچانک وہ اپنے رب کی طرف جلدی جلدی چل پڑیں گے کہیں گے کہ ہائے ہماری خرابی کس نے ہم کو اٹھا دیا ہمارے لیٹنے کی جگہ سے (جواب ملے گا کہ) یہ وہ ماجرا ہے جس کا رحمٰن نے وعدہ کیا ہے اور پیغمبروں نے سچی خبر دی ، بس ایک چنگھاڑ ہوگی پھر اسی وقت وہ سب کے سب ہمارے سامنے حاضر کر دیئے جائیں گے۔

یعنی کوئی نہ روپوش ہو سکے گا نہ چھپ سکے گا ، سب خداوند عالم کے حضور میں موجود کر دیئے جائیں گے۔

حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ آنحضرت ﷺ نے پہلی بار اور دوسری بار صور پھونکنے کا درمیانی فاصلہ بتاتے ہوئے چالیس کا عدد فرمایا۔ حاضرین نے حضرت ابو ہریرہؓ سے پوچھا کہ کیا چالیس ؟ چالیس دن یا چالیس سال، آنحضرت ﷺ نے کیا فرمایا؟ اس سوال کے جواب میں حضرت ابو ہریرہؓ نے اپنی لاعلمی ظاہر کی اور فرمایا کہ مجھے خبر نہیں (یایاد نہیں) کہ آنحضرت ﷺ نے صرف چالیس سال یا چالیس دن فرمایا دوبارہ صور پھونکے جانے کے بعد پھر اللہ تعالیٰ آسمان سے پانی برسا دیں گے جس کی وجہ سے لوگ (بردں سے) اگ جائیں گے جیسے (زمین سے) سبزی (اگ جاتی ہے) یہ بھی فرمایا کہ انسان کے جسم کی ہر چیز گل سڑ جاتی ہے یعنی مٹی میں مل کر مٹی ہو جاتی ہے سوائے ایک ہڈی کے کہ وہ باقی رہتی ہے قیامت کے روز اسی سے جسم بنا دیئے جائیں گے یہ ہڈی ریڑھ کی ہڈی ہے۔

سورۂ زمر کی آیت میں یہ جو فرمایا کہ صور پھونکے جانے سے سب بے ہوش ہو جائیں گے سوائے ان کے جن کو اللہ چاہے اس کے متعلق مفسرین کے چند اقوال ہیں کسی نے فرمایا کہ شہداء مراد ہیں، کسی نے کہا کہ جبرئیل و میکائیل اور اسرافیل و عزرائیل کے متعلق فرمایا ہے کسی نے حاملین عرش کو بھی اس استثناء میں شامل کیا ہے، ان کے علاوہ اور بھی اقوال ہیں۔ (واللہ اعلم)

ممکن ہے کہ بعد میں ان پر بھی فنا طاری ہو جن کو استثناء میں بیان کیا جاتا ہے جیسا کہ لمن الملك الیوم ـلله الواحد القهار کی تفسیر میں صاحب معالم التنزیل لکھتے ہیں کہ جب مخلوق کے فنا ہو جانے کے بعد اللہ تعالیٰ لمن الملك الیوم (کس کا راج ہے آج) فرمائیں گے تو جواب دینے

اس آیت مبارکہ سے اوراس سے پہلی آیت سے معلوم ہوا کہ قیامت اچانک آجائے گی، حضرت رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ البتہ قیامت ضرور اس حالت میں قائم ہوگی کہ دو شخصوں نے اپنے درمیان (خرید و فروخت کے لئے) کپڑا کھول رکھا ہوگا اور ابھی معاملہ طے کرنے اور کپڑا لپیٹنے بھی نہ پائیں گے کہ قیامت قائم ہو جائے گی۔ (پھر فرمایا کہ) البتہ قیامت ضرور اس حال میں قائم ہوگی کہ ایک انسان اپنی اونٹنی کا دودھ نکال کر جارہا ہوگا اور پی بھی نہ سکے گا، اور قیامت اس حال میں قائم ہوگی کہ انسان اپنا حوض لیپ رہا ہوگا اور ابھی اس میں (مویشیوں کو) پانی بھی نہ پلا پائے گا، اور واقعی قیامت اس حال میں قائم ہوگی کہ انسان اپنے منہ کی طرف لقمہ اٹھائے گا اور اسے کھا بھی نہ سکے گا۔ (بخاری و مسلم)

یعنی جیسے آج کل لوگ کاروبار میں لگے ہوئے ہیں اسی طرح قیامت کے آنے والے دن بھی مشغول ہوں گے کہ اچانک قیامت آپہنچے گی۔ جس روز قیامت قائم ہوگی وہ جمعہ کا روز ہوگا، آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا سب دنوں سے بہتر جمعہ کا دن ہے، اسی دن آدم علیہ السلام پیدا کئے گئے اور اسی دن وہ جنت میں داخل کئے گئے اور اسی دن وہ جنت سے نکالے گئے اور قیامت جمعہ ہی کے روز قائم ہوگی۔ (مسلم)

دوسری حدیث میں ہے کہ آنحضرت سید عالم ﷺ نے فرمایا کہ جمعہ کے روز قیامت قائم ہوگی۔ ہر مقرب فرشتہ اور آسمان و زمین اور پہاڑ و سمندر یہ سب جمعہ کے دن سے ڈرتے ہیں (کہ کہیں آج قیامت نہ ہو جائے)۔

صور اور نفخ صور

قیامت کی ابتدا صور پھونکنے سے ہوگی، آنحضرت سید عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ صور ایک سینگ ہے جس میں پھونکا جائے گا اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ میں مزے کی زندگی کیوں کر گزاروں گا حالانکہ صور پھونکنے والے (فرشتہ) نے منہ میں صور لے رکھا ہے اور اپنا کان لگا رکھا ہے اور ماتھا جھکا رکھا ہے اس انتظار میں کہ کب صور پھونکنے کا حکم ہو۔ سورۂ مدثر میں صور کو ناقور فرمایا ہے چنانچہ ارشاد ہے:

فاذا نقر فی الناقور فذالك يومئذ يوم عسير على الكٰفرين غير يسير.	پھر جب ناقور (یعنی صور) پھونکا جائے گا تو وہ کافروں پر ایک سخت دن ہوگا جس میں ذرا آسانی نہ ہوگی۔

سورۂ زمر میں فرمایا:

ونفخ فی الصور فصعق من فی السمٰوٰت ومن فی الارض الا من شاء الله ثم نفخ فيه اخرىٰ فاذا هم قيام ينظرون	اور صور میں پھونکا جائے گا سو بے ہوش ہو جائیں گے جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہیں سوائے ان کے جن کا ہوش میں رہنا اللہ چاہیں پھر دوبارہ صور میں پھونکا جائے گا تو وہ فوراً کھڑے ہو جائیں گے ہر طرف دیکھتے ہوئے۔

آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ میں دو مرتبہ صور پھونکے جانے کا ذکر ہے پہلی مرتبہ صور

کے جسم بن جائیں گے) پھر دوبارہ صور پھونکا جائے گا تواچانک سب کھڑے دیکھتے ہوں گے۔ اس کے بعد اعلان ہوگا کہ اے لوگو چلو اپنے رب کی طرف اور (فرشتوں کو حکم ہوگا کہ) ان کو ٹھہراؤ ان سے سوال ہوگا پھر اعلان ہوگا کہ (اس سارے مجمع سے) دوزخیوں کو علیحدہ کردو اس پر دریافت کیا جائے گا (اللہ جل شانہ سے) کہ کس تعداد میں سے کتنے دوزخی نکالے جائیں۔ جواب ملے گا کہ فی ہزار ۹۹۹ دوزخی نکالو، اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ وہ دن ہوگا کہ جس کی ہیبت اور دہشت سے بچے بوڑھے ہو جائیں گے اور یہ دن بڑا ہی مصیبت کا ہوگا۔ (مسلم شریف)

ان احادیث شریفہ سے معلوم ہوا کہ قیامت قائم ہونے کے وقت کوئی مسلمان دنیا میں موجود نہ ہوگا، اس عظیم مصیبت سے خداوند عالم ان انسانوں کو محفوظ رکھیں گے جن کے دل میں ذرا سا بھی ایمان ہوگا۔

قیامت کی تاریخ سے باخبر نہیں کیا گیا

اللہ رب العزت ہی جانتا ہے کہ قیامت کب آئے گی۔ قرآن شریف میں بتایا گیا ہے کہ قیامت اچانک آجائے گی باقی اس کی مقررہ تاریخ سے باخبر نہیں کیا گیا ایک مرتبہ حضرت جبریل علیہ السلام نے انسانی صورت میں آکر حاضرین مجلس کو موجودگی میں آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا کہ قیامت کب قائم ہوگی تو ان کے اس سوال کے جواب میں آنحضرت سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

ما المسئول عنها باعلم من السائل. (بخاری و مسلم)	اس کے بارے میں سوال کرنے والے سے زیادہ اس کو علم نہیں ہے جس سے سوال کیا گیا ہے۔

یعنی اس بارے میں ہم اور تم دونوں برابر ہیں نہ مجھے اس کے قائم ہونے کے وقت کا علم ہے اور نہ تم کو ہے، ایک مرتبہ جب لوگوں نے آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ قیامت کب آئے گی تو اللہ جل شانہ کی طرف سے حکم ہوا:

قل انما علمها عند ربی لا یجلیها لوقتها الا هو . ثقلت فی السمٰوٰت والارض لا تاتیکم الا بغتة . یسئلونك كانك حفی عنها قل انما علمها عند الله ولكن اكثر الناس لا یعلمون (الاعراف)	آپ فرما دیجئے کہ اس کا علم صرف میرے رب ہی کے پاس ہے اس کے وقت پر اس کو سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی ظاہر نہ کرے گا آسمان و زمین میں بڑا بھاری حادثہ ہوگا وہ تم پر محض اچانک آپڑے گی، وہ آپ سے اس طرح پوچھتے ہیں جیسے گویا آپ اس تحقیقات کر چکے ہیں، آپ فرما دیجئے کہ اس کا علم صرف اللہ کے پاس ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

قیامت اچانک آئے گی

سورہ انبیاء میں فرمایا:

بل تاتیهم بغتة فتبهتهم فلا یستطیعون ردها ولا هم ینظرون.	بلکہ وہ آجائے گی اچانک ان پر اور ان کو بدحواس کردے گی نہ اس کے ہٹانے کی ان کو قدرت ہوگی اور نہ مہلت دی جائے گی۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ دجال کو قتل کرنے کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام سات برس لوگوں میں رہیں گے، اس دور میں دو آدمیوں کے درمیان ذرا دشمنی نہ ہو گی پھر اللہ تعالیٰ ملک شام کی طرف سے ایک ٹھنڈی ہوا بھیج دیں گے جس کی وجہ سے تمام مومن ختم ہو جائیں گے (اور) زمین پر کوئی بھی ایسا شخص باقی نہ رہے گا جس کے دل میں خیر کا (یا فرمایا ایمان کا) کوئی ذرہ ہو گا۔ یہاں تک کہ اگر تم (مسلمانوں میں سے) کوئی شخص کسی پہاڑ کے اندر (گھو میں) داخل ہو جائے گا تو وہ ہوا وہاں بھی داخل ہو کر اس کی روح قبض کر لے گی۔

اس کے بعد بدترین لوگ رہ جائیں گے (جو برے کرتوتوں اور شرارت کی طرف بڑھنے میں) ہلکے پرندوں کی طرح (تیزی سے اڑنے والے) ہوں گے۔ اور (خون بہانے اور جان لینے میں) درندوں جیسے اخلاق والے ہوں گے، نہ بھلائی کو پہچانتے ہوں گے نہ برائی کو برا سمجھتے ہوں گے ان کا حال دیکھ کر انسانی صورتوں میں شیطان ان کے پاس آکر کہے گا کہ (افسوس تم کیسے ہو گئے) تمہیں شرم نہیں آتی (کہ اپنے باپ دادوں کا دین چھوڑ بیٹھے) وہ اس سے کہیں گے کہ تو ہی بتا ہم کیا کریں؟ لہٰذا وہ ان کو بت پرستی کی تعلیم دے گا (اور وہ بت کی پوجا کرنے لگیں گے) وہ اسی حال میں ہوں گے (یعنی قتل و خون، شر و فسادات اور بت پرستی میں مصروف ہوں گے) اور ان کو خوب رزق دیا جائے گا۔ اور اچھی زندگی گزر رہی ہو گی کہ صور پھونک دیا جائے گا۔ صور کی آواز سب ہی سنیں گے۔ جو جو سنتا جائے گا (دہشت کے سبب حیران ہو کر) ایک طرف کو گردن جھکا دے گا اور دوسری طرف کو اٹھا دے گا۔

پھر فرمایا سب سے پہلے جو شخص اس کی آواز سنے گا وہ ہو گا جو اونٹوں کو پانی پلانے کا حوض لیپ رہا ہو گا، یہ شخص صور کی آواز سن کر بے ہوش ہو جائے گا اور پھر سب لوگ بے ہوش ہو جائیں گے پھر خدا ایک بارش بھیجے گا جو شبنم کی طرح ہو گی اس سے آدمی اگ جائیں گے (یعنی قبروں میں مٹی

امام اعظم کی شخصیت

امام ترمذی نے کتاب العلل میں امام صاحبؒ سے ایک روایت نقل کی ہے کہ جو مصری نسخہ میں موجود ہے اور حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں بھی اس کا تذکرہ کیا ہے البتہ موجودہ متداول و مطبوعہ نسخوں سے غائب ہے جو معاندین کے حذف والحاق کی خطرناک پالیسی کے لئے نتیجہ ہے روایت یہ ہے" حدثنا محمود بن غیلان حدثنا ابو یحیٰ الحمانی قال سمعت ابا حنیفة یقول ما رأیت الکذب من جابر الجعفی ولا افضل من عطاء بن ابی رباح۔"

اس روایت کا تعلق رجال کی جرح و تعدیل سے ہے اور امام ترمذی نے اس کو سند کے طور پر نقل کیا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ امام ممدوح کے نزدیک امام ابو حنیفہ کا شمار ان ائمہ میں ہے جن کے قول سے جرح و تعدیل کے باب میں سند پکڑی جاتی ہے۔

بلکہ قیامت قائم ہونے کا یقین دلانے کے لیے وقوع قیامت کے دعویٰ کو دہرادیا ہے چنانچہ سورۂ صافات میں اول منکرین کی بات نقل فرمائی پھر جواب میں دعویٰ کو دہرادیا چنانچہ ارشاد فرمایا :

واذا متنا و کنا تراباً و عظاماً ء انا لمبعثون. اوآبائنا الاولون قل نعم وانتم داخرون . فانما هی جزرة واحدة فاذا هم ینظرون وقالوا یٰویلنا هذا یوم الدین هذا یوم الفصل الذی کنتم به تکذبون	کیا جب ہم مر گئے اور مٹی اور ہڈیاں ہی ہڈیاں ہو گئے تو کیا ہم اٹھائے جائیں گے۔ کیا ہمارے اگلے باپ دادے بھی اٹھائے جائیں گے، آپ کہہ دیجئے کہ ہاں (تم اٹھائے جاؤ گے) اور ذلت کی حالت میں ہو گئے اور کہیں گے کہ ہائے ہماری خرابی یہ آگیا بدلہ کا دن ہے (جواب ملے گا کہ) یہ ہے دن فیصلے کا جس کو تم جھٹلاتے تھے۔

سورۂ سبا میں ارشاد فرمایا :

وقال الذین کفروا هل ندلکم علیٰ رجل ینبئکم اذا مزقتم کل ممزق. انکم لفی خلق جدید . افتریٰ علی الله کذبا ام به جنة. بل الذین لا یومنون بالآخرة فی العذاب والضلل البعید	اور کہنے لگے کافر کیا ہم بتلائیں تم کو ایک مرد جو تمہیں خبر دیتا ہے کہ جب تم پھٹ کر ذرا ذرا سے ریزے ہو جاؤ گے تم کو پھر نئے سرے سے بنتا ہے، کیا بنا لایا ہے اللہ پر جھوٹ یا اس کو جنون ہے کچھ بھی نہیں لیکن جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، آفت میں ہیں اور گمراہی میں دور جا پڑے ہیں۔

الحاصل قیامت برحق ہے اللہ تعالیٰ کی جب مشیت ہوگی صور پھونک دیا جائیگا قیامت آموجود ہوگی تو کوئی بھی اس کا جھٹلانے والا نہ ہوگا، اس کے آنے کا وقت اللہ تعالیٰ کے علم میں مقرر ہے لوگوں کے اعتراض کرنے سے اللہ تعالیٰ وقت سے پہلے ظاہر نہ فرمائیں گے۔

سورۂ سبا میں یہ بھی ارشاد ہے :

ویقولون متیٰ هذا الوعد ان کنتم صٰدقین قل لکم میعاد لا تستاخرون عنه ساعة ولا تستقدمون	اور وہ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کب پورا ہوگا اگر تم سچے ہو۔ آپ کہہ دیجیے کہ تمہارے لیے وعدہ ہے ایک دن کا یہ ایک گھڑی۔ اس لیے لیٹ کئے جاؤ گے اور نہ مقدم۔

قیامت کن لوگوں پر قائم ہو گی

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ حضرت رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت بدترین مخلوق پر قائم ہو گی نیز ارشاد فرمایا کہ اس وقت تک قیامت قائم نہ ہو گی جب تک زمین میں اللہ اللہ کیا جاتا رہے گا، یہ بھی ارشاد ہے کہ قیامت کسی ایسے شخص پر قائم نہ ہو گی جو اللہ اللہ کہتا ہو گا۔

ایک طویل حدیث میں ہے کہ (چونکہ کسی مسلمان کی موجودگی میں قیامت قائم نہ ہو گی اس لئے دنیا کے اسی لیل و نہار کے ہوتے ہوئے) اچانک اللہ تعالیٰ ایک عمدہ ہوا بھیج دیں گے جو مسلمانوں کی بغلوں میں لگ کر ہر مومن اور مسلم کی روح قبض کر لے گی اور بدترین لوگ باقی رہ جائیں گے جو (سب سے سامنے بے حیائی سے) گدھوں کی طرح عورتوں سے زنا کریں گے۔ (مشکوٰۃ شریف)

غور کرنا چاہیے کہ جس نے نطفہ کو مختلف حالات سے گزار کر جیتی جاگتی تصویر دے کر روح ڈال دی بھلا اس کے لیے یہ کیوں کر ممکن ہے کہ وہ مردوں کو زندہ نہ کر سکے الیس ذٰلک بقٰدر علیٰ ان یحیی الموتیٰ

انسانی سمجھ کا تقاضہ تو یہ ہے کہ پہلی مرتبہ عدم سے وجود بخشنے کے بعد دوبارہ زندگی دینا آسان ہے سورۂ روم میں فرمایا:

وھوالــــذی یبدؤ الخلــق ثم یعیــده وھو اھون علیــه	اور وہی ہے جو اول بار پیدا کرتا ہے پھر اس کو دوبارہ پیدا کر دے گا اور یہ (دہرانا) اس کے لیے (اول مرتبہ پیدا کرنے سے) زیادہ آسان ہے۔

یعنی تم خود ہی سمجھ لو کہ جس نے پہلی مرتبہ بغیر نظیر اور نقشہ اور خاکہ کے وجود بخش دیا وہ دوبارہ پیدا کرنے پر کیوں کر قادر نہ ہوگا، گو اس کے لیے اولین پیدائش اور دوسری پیدائش سب برابر ہیں۔ لیکن تمہارے محسوسات کے اعتبار سے اول بار پیدا کرنے سے دوسری بار دہرا دینا آسان ہونا چاہیے یہ عجیب بات ہے کہ جس نے پہلی بار وجود بخشا وہ موت دے کر دوبارہ زندہ نہ کر سکے، کچھ تو سمجھو۔ سورۂ احقاف میں فرمایا:

اولم یروا ان اللہ الذی خلق السمٰــــوٰت والارض ولم یعی بخلقھن بقٰدر علیٰ ان یحیی الموتیٰ بلیٰ انه علیٰ کل شیئٍ قدیر	کیا نہیں دیکھتے کہ وہ اللہ جس نے بنائے آسمان و زمین اور ان کے بنانے سے وہ تھکا نہیں وہ قدرت رکھتا ہے کہ مردوں کو زندہ کر دے ضرور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

یعنی جس نے آسمانوں اور زمین جیسی بڑی بڑی چیزیں محض اپنی قدرت کاملہ سے پیدا فرما دیں کیا اس چیز پر قدرت نہیں رکھتا کہ مردوں کو زندہ کرے بلا شبہ اس پر وہ ضرور قادر ہے۔

سورۂ سجدہ میں فرمایا:

ومن آیاته انك تری الارض خاشعة فاذا انزلنا علیھا الماء اھتزت وربت ان الذی احیاھا لمحی الموتیٰ وھو علیٰ کل شیئٍ قدیر	اور منجملہ اس کی نشانیوں کے ایک یہ ہے کہ تو زمین کو دیکھتا ہے دبی پڑی ہے پھر جب ہم اس پر پانی برساتے ہیں وہ ابھرتی ہے بیشک جس نے اس زمین کو زندہ کر دیا وہی مردوں کو زندہ کرنے والا ہے بیشک وہ ہر چیز پر قادر ہے

یعنی جس خداوند کریم نے اس زمین کو زندہ کر دیا وہی مردوں کے جسموں میں دوبارہ جان ڈال دے گا۔

ایک مرتبہ ایک صحابیؓ نے حضرت رسول کریم ﷺ سے سوال کیا کہ یا رسول اللہؐ خداوند تعالیٰ مخلوق کو کیسے دوبارہ زندہ فرمائے گا۔ اور (موجودہ) مخلوق میں اس کی نظیر کیا ہے؟ اس پر آنحضرت سید عالم ﷺ نے فرمایا کیا ایسا نہیں ہوا کہ تم اپنی قوم کے جنگل پر اس وقت نہیں گزرے جب کہ زمین سوکھی ہوئی تھی پھر دوبارہ اس وقت گزرے جب وہ ہری بھری ہو کر لہلہاتی ہوئی تھی؟ انہوں نے عرض کیا کہ جی ہاں ایسا تو ہوا ہے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ یہی اللہ کی نشانی ہے اس کی مخلوق میں (موت کے بعد زندہ کرنے کی ایک نظیر ہے) اسی طرح اللہ مردوں کو زندہ فرمائے گا۔ (مشکوٰۃ شریف)

بعض جگہ قرآن مجید میں قیامت کے منکروں کا اشکال نقل فرما کر ان کا جواب دلیل سے نہیں دیا

مل کی وجہ سے مل رہی ہے، اگر آرام پانے والے یا سزا بھگتنے والے کو اس کا علم نہ ہو کہ یہ آرام یا تکلیف فلاں عمل کے باعث ہے تو اس کو سزا کہنا بے معنی ہوا۔ دنیا میں جو لوگ موجود ہیں جب کہ ان کو یہ معلوم نہیں کہ یہ آرام یا تکلیف فلاں جگہ کے فلاں عمل کی وجہ سے ہے تو دنیا کے آرام وراحت یا تکلیف و مصیبت کو کسی پچھلے جنم کا نتیجہ کیوں کر تسلیم کیا جائے؟ سزا بھگتنے والے کو جب ہی تو یہ پشیمانی اور پچھتاوا ہوگا جب کہ اسے یہ خبر ہو کہ یہ فلاں عمل کی سزا ہے، کاش وہ عمل میں نہ کرتا۔

بہر حال حق وہی ہے جو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اور بتایا۔ انھوں نے جو کچھ فرمایا صحیح فرمایا جو بتایا اللہ کی طرف سے فرمایا، ظن و گمان اور اٹکل کو انھوں نے بے معنی قرار دیا۔

اب میں قرآن حکیم اور ارشادات نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ کی روشنی میں قیامت کے حالات مفصل لکھتا ہوں۔ یہ حالات حق ہیں ان کو سچا جانو اپنی عاقبت کی فکر کرو۔

قیامت کا آنا ضروری ہے۔ کوئی مانے یا نہ مانے وعدہ سچا ہے جو ہو کر رہے گا۔ جس وقت قرآن کریم نازل ہوتا تھا اس وقت بھی قیامت کے منکر تھے اور آج بھی اس حقیقت ثابتہ کے انکار کرنے والے موجود ہیں۔ نزولِ وحی کے وقت جو لوگوں کو اس بارے میں شکوک وشبہات تھے متعدد مواقع میں قرآن شریف میں ان کے جوابات دیئے گئے ہیں ذیل میں چند آیات اسی عنوان کی درج کی جاتی ہیں سورہ یٰسین میں فرمایا:

وضرب لنا مثلا و نسی خلقہ قال من یحیی العظام وھی رمیم	اور بیان کی (انسان نے ہمارے لئے مثال اور بھول گیا اپنی پیدائش کو کہنے لگا کون ہڈیوں کو زندہ کرے گا جبکہ وہ کھوکری ہوگئی ہوں گی۔

اس آیت کریمہ میں انسان کی جرأت بیجا کی شکایت فرمائی ہے کہ دیکھو وہ خدا پر بھی فقرے چسپاں کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میاں گلی سڑی ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا؟ بس یہ سب کہنے کی باتیں ہیں!! ایسا سوال کرتے وقت انسان اپنی پیدائش کو بھول جاتا ہے اگر اسے اپنی پیدائش کا خیال ہوتا اور اس بات کو بھول نہ جاتا کہ اس کی پیدائش ایک قطرۂ ذلیل سے ہے تو اللہ جل شانہ کے متعلق ایسے لفظ کہنے میں کچھ تو شرماتا اور عقل سے کام لیتا تو اس سوال کا جواب بھی اپنی پیدائش میں غور کرنے سے پالیتا آگے اس سوال کا مفصل جواب دیتے ہوئے فرمایا:

قل یحییھا الذی انشأھا اول مرۃ وھو بکل خلق علیم	آپ فرما دیجیے کہ ان ہڈیوں کو وہی زندہ کریگا جس نے ان کو پہلی مرتبہ پیدا فرمایا تھا اور وہ سب بنانا جانتا ہے

یعنی جس نے پہلی مرتبہ ہڈیوں کو وجود بخشا اور ان میں جان ڈالی وہی دوبارہ ان کو زندگی بخشے گا وہ قادرِ مطلق ہے اس کے لئے سب کچھ آسان ہے بدن کے اجزاء اور ہڈیوں کے ذرے جہاں کہیں بھی منتشر ہوں ان کا ایک ایک ذرہ اس کے علم میں ہے وہ ہر طرح بنانے پر قدرت رکھتا ہے،

قیامت اور میدان حشر

ادارہ

انسان کے اعمال کا بدلہ جو دوزخ یا جنت کی شکل میں ملے گا اور اس کے اعمال کے فیصلے جو قیامت کے دن ہوں گے ان کے احوال اور تفصیلات قرآن و حدیث میں خوب کھول کر بیان کیے گئے ہیں۔ مسلمانوں کے علاوہ دوسری قوموں میں بھی مرنے کے بعد اعمال کا بدلہ ملنے کے بارے میں کچھ تصورات و توہمات ہیں لیکن ان کے توہمات اور تصورات کی کوئی صحیح بنیاد نہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تصورات انھوں نے اپنی اٹکل سے تجویز کر لئے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے رسولوں کی تعلیمات اور ان کے ارشاد فرمودہ اعتقادات کے خلاف ہیں مثلاً بعض قوموں میں عقیدۂ تناسخ چلا آرہا ہے جسے ان لوگوں نے اپنی طرف سے تجویز کیا ہے ان لوگوں کا خیال ہے کہ مرنے کے بعد انسان کی روح دوسرے انسان یا حیوان کے قالب میں جگہ پا کر نیا جنم لے لیتی ہے اور ہمیشہ یہی ہوتا رہتا ہے۔ ان کا نام انھوں نے آواگون تجویز کیا ہے اس عقیدہ کا باعث یہ نہیں ہے کہ خدا کے پیغمبروں کی بتائی ہوئی بات کو مان کر ایسا کر رہے ہیں بلکہ اس عقیدہ کے گڑھنے کا باعث یہ ہے کہ ان لوگوں کو دنیا میں انسانوں کے مختلف مراتب اور درجات اس طرح نظر آئے کہ کوئی حاکم ہے کوئی محکوم، کوئی امیر ہے کوئی غریب کوئی خادم ہے کوئی مخدوم اور اسی طرح کے بیشمار فرق ہیں اس اختلاف مراتب اور اعلیٰ وادنیٰ ہونے کا کیا باعث ہے؟ اس کا فلسفہ ان لوگوں کی سمجھ میں نہ آیا۔ ہادیٔ ثقلین حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی شریعت کی طرف رجوع کرتے تو اس اختلافِ مراتب کے اسباب بہت سے معلوم ہو جاتے۔ خود سمجھنا چاہا اس لیے سمجھنے سے عاجز رہے۔ ناچار اپنی طرف سے یہ تجویز کیا کہ پچھلے جنم میں جو کرم کئے تھے یہ اچھا یا برا حال اسی کا نتیجہ ہے۔ ان نادانوں کا یہ عقیدہ جو ان کا خود ساختہ ہے مختلف پہلوؤں سے غلط ہے۔ اگر غور کیا جائے تو سرسری نظر میں ایک بڑا اشکال اور اعتراض اس عقیدہ کے تسلیم کرنے کے ساتھ ہی معمولی سمجھ والے انسان کی عقل میں یہ آتا ہے کہ عمل کا بدلہ (عذاب کی حیثیت میں) حقیقتہً وہی بدلہ سمجھا جا سکتا ہے جس کے بارے میں بدلہ ملنے والے کو اس کا علم اور یقین ہو کہ مجھے یہ آرام یا تکلیف فلاں

ہے۔اس لیے اس کا عذاب اس کی مشابہت کی وجہ سے چہرے کے زخموں کی صورت میں متمثل ہوگا۔
(حجۃ اللہ البالغہ اردو جلد دوم صفحہ ۲۸۳)

نوٹ: 'متمثل' سے مراد ہے جرم اور سزا کے مابین ایک گونہ مناسبت و مشابہت کا ہونا۔

صرف اللہ سے مانگو اور کسی کی سامنے ہاتھ نہ پھیلاؤ' کے مضامین پر مشتمل احادیث کی تشریح کرتے ہوئے ہمارے دور کے بالغ النظر عالم مولانا سید محمود الحسن صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"انسان خدا کے سوا کسی کے سامنے دست سوال نہ پھیلائے۔اپنی ہر ضرورت اور مشکل کو حل کرنے کے لیے صرف اللہ سے رجوع کرے۔ خلق خدا سے بے نیازی اور اللہ کی بارگاہ میں سراپا فقر و عاجزی توحید کا بنیادی تقاضا ہے۔ نظریہ توحید کی غیرت تو یہ بھی گوارا نہیں کرتی کہ جوتے کا تسمہ اور نمک کا ٹکڑا غیر اللہ سے مانگا جائے۔

اگر بندہ اپنی ضرورت کے لیے اللہ کو چھوڑ کر اس کے کسی بندے کے دروازے پر دستک دیتا ہے تو یوں سمجھئے کہ اس نے خدا کے غضب کو دعوت دی کیونکہ اسے جس کے دروازے پر کاسۂ گدائی لے کر جانا چاہئے تھا اس سے اس نے منہ موڑ کر ایک ایسے شخص کو اپنی محتاجی کی داستان سنائی جو خود تہی دست ہے اور ہر معاملہ میں اللہ غنی کا دست نگر ہے۔

اگر اللہ سے سوال نہ کیا جائے تو وہ ناراض ہوتا ہے کیونکہ ہر سائل اور محتاج کی ہر حاجت اور ضرورت کا انتظام وہی کر سکتا ہے کیونکہ ہر چیز کے ختم نہ ہونے والے خزانوں کا مالک بھی وہی ہے۔انسان سے سوال کیا جائے تو وہ ناراض ہوتا ہے کیونکہ دینے کے لیے اس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔اس لیے اگر وہ کسی سائل سے غصہ کرتا ہے تو اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں۔ (انتخاب حدیث صفحہ ۱۳۸-۱۳۹)

اس موضوع پر حضرت خواجہ علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

"اہل حق کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ حق تعالیٰ کے سوا کسی سے سوال نہ کرنا چاہئے اور بجز اس کے کسی کو حاجت روا نہیں سمجھنا چاہئے کیونکہ سوال کرنا گویا حق تعالیٰ سے روگردانی ہے اور ہو سکتا ہے کہ روگردانی کرنے والے کو روگرداں ہی چھوڑ دیا جائے۔ کہتے ہیں کہ ایک دنیادار آدمی نے 'رابعہ عدویہ' سے کہا: "جس چیز کی بھی ضرورت ہو مانگ' میں مہیا کردوں گا۔" انہوں نے جواب دیا: "مجھے اپنے رب سے دنیا مانگتے ہوئے شرم آتی ہے چہ جائیکہ میں اپنے جیسے انسان سے کوئی دنیاوی چیز طلب کروں۔"

سنا ہے ایک دفعہ ابو مسلم مروزی نے ایک خدار سیدہ بزرگ کو چوری کے الزام کی بنا پر جیل میں ڈال دیا۔اسی رات ابو مسلم نے خواب میں پیغمبر ﷺ کو دیکھا آپؐ نے فرمایا: 'ابو مسلم! میں خدا کے حکم سے آیا ہوں حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ تو نے اس کے ایک دوست کو بے جرم قید خانے میں ڈال دیا ہے۔اسی وقت جا کر اسے رہا کر۔" ابو مسلم چونک اٹھا ننگے سر اور ننگے پاؤں قید خانے پہنچا۔ جیل کا دروازہ کھول کر درویش کو رہا کر دیا معافی مانگی اور کہا کچھ ضرورت ہو تو حکم دیجئے...... درویش نے کہا میرا مالک تو ایسا ہے کہ آدھی رات کے وقت ابو مسلم کو بستر سے اٹھا کر مجھے مصیبت سے نجات دینے کے لیے بھیج سکتا ہے میں کیوں کسی غیر کے آگے ہاتھ پھیلاؤں؟ ابو مسلم رونے لگا اور درویش چلا گیا۔ (کشف المحجوب اردو صفحہ ۴۹۵)

اسی موضوع پر مدیر 'الفرقان' مولانا منظور احمد نعمانی لکھتے ہیں:

"افسوس! جس پیغمبر کی یہ ہدایت اور یہ طرز عمل تھا اس کی امت میں پیشہ ور سائلوں اور گداگروں کا ایک طبقہ موجود ہے اور کچھ لوگ وہ بھی ہیں جو عالم یا پیر بن کر معزز قسم کی گداگری کرتے ہیں۔

اس نے کہا: "بس ایک کمبل ہے جس کا کچھ حصہ ہم بچھا لیتے ہیں اور کچھ اوڑھ لیتے ہیں۔ اور ایک پیالہ ہے جس سے ہم پانی پیتے ہیں۔" آپ نے فرمایا: "یہی دونوں چیزیں میرے پاس لے آؤ۔" اس شخص نے وہ دونوں چیزیں لا کر آپ کی خدمت میں پیش کر دیں۔ آپ نے وہ کمبل اور پیالہ ہاتھ میں لے کر نیلام کے انداز میں حاضرین سے کہا: "کون ان دونوں چیزوں کے خریدنے پر تیار ہے؟" ایک صاحب نے عرض کیا کہ میں ایک درہم کے بدلے خریدنے پر آمادہ ہوں۔ "آپ نے فرمایا: "کون ایک درہم سے زیادہ کی بولی دیتا ہے؟" یہ بات آپ نے دو یا تین دفعہ فرمائی۔ اس پر ایک دوسرے صاحب نے دو درہم دینے پر آمادگی ظاہر کی۔ آپ نے اس سے دو درہم لے کر یہ دونوں چیزیں دے دیں۔ آقائے نامدار ﷺ نے یہ دو درہم اس انصاری کو دے کر فرمایا: "ان میں سے ایک درہم کا کھانے کا سامان خرید کر بال بچوں کو دے دو اور دوسرے درہم کی کلہاڑی خرید کر میرے پاس لے آؤ۔ اس انصاری نے ایسا ہی کیا اور کلہاڑی لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے اپنے دست مبارک سے اس کلہاڑی میں لکڑی کا ایک مضبوط دستہ لگا دیا اور فرمایا: "جاؤ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاؤ اور بیچو اور اب پندرہ دن تک میں تم کو نہ دیکھوں۔" چنانچہ وہ شخص چلا گیا اور آپ کی ہدایت کے مطابق لکڑیاں لا کر بیچتا رہا۔ پھر وہ ایک دن آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بتایا کہ میں نے اپنی محنت و مشقت سے اب تک دس درہم کما لیے ہیں جن میں سے کچھ کا کپڑا اور کچھ کا غلہ خرید چکا ہوں۔ اس پر آپ نے فرمایا: "اپنی محنت سے یہ کمانا تمہارے لیے اس سے بہت ہی بہتر ہے کہ قیامت کے دن لوگوں سے مانگنے کا داغ تمہارے چہرے پر ہو۔" پھر آپ نے حاضرین سے مخاطب ہو کر فرمایا: "سوال کرنا صرف تین قسم کے آدمیوں کے لیے درست ہے۔ ایک وہ آدمی جسے فقر و فاقہ نے زمین سے لگا دیا ہو اور بالکل لاچار و بے بس کر دیا ہو۔ دوسرے وہ جس پر قرض یا کسی تاوان کا اتنا بھاری بوجھ ہو جو اس کی برداشت سے باہر ہو اور تیسرے وہ جسے کوئی خون بہا ادا کرنا ہو اور اسے ادا نہ کر سکتا ہو۔" (ابو داؤد)

دست سوال دراز کرنے کی قباحت بیان کرتے ہوئے حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے بلیغانہ انداز میں رقم طراز ہیں:

"دوسروں کے سامنے سوال کے لیے ہاتھ پھیلانا موجب ذلت ہے اور ہمیشہ اس پر قائم رہنے سے انسان میں بے حیائی اور بے مروتی پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی لیے آنحضرت ﷺ نے نہایت سختی کے ساتھ اس ذلیل کام سے منع فرمایا ہے۔ اور سوائے سخت ضرورت کے اس کی اجازت نہیں دی۔ نیز اگر اس کو غیر معیوب سمجھ کر عادت بنا لیا جائے اور پیشہ کے طور پر اسے مال کمانے کا ذریعہ قرار دے دیا جائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ کمائی کے جائز طریقے اختیار کرنے سے گریز کریں گے جس سے سوسائٹی کے نظام میں خلل اور بگاڑ کا پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ اس کے علاوہ مفت خوروں کا وجود سماج کے لیے وبال ہے اور یہ لوگ ہر وقت شریف آدمیوں کو تنگ کرتے پھرتے ہیں۔ بنابریں حکمت الٰہی کا تقاضا یہ ہوا کہ اس کام کی برائی کو لوگوں کے سامنے اس انداز میں پیش کیا جائے کہ سخت مجبوری کی حالت کے سوا کوئی بھی اسے اختیار کرنے پر تیار نہ ہو۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے۔ "جو شخص اس لیے سوال کرتا پھرتا ہے کہ اپنا مال اور اپنی دولت بڑھائے قیامت کے دن اس کے چہرے پر زخم ہوں گے اور جو کچھ وہ اس طرح حاصل کرتا ہے وہ دوزخ کے انگارے ہیں جن کو پھانکتا ہے۔"

اس حدیث کے مطابق مانگنے والا جو کرب و الم قیامت کے دن محسوس کرے گا اسے متمثل کر کے دکھایا گیا ہے کیونکہ چہرے پر زخم ہونا یا انگاروں کو نگلنا یقیناً سخت عذاب کا موجب ہے اور چونکہ ایسا شخص ذلیل ہوتا ہے اور لوگ اسے حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اس سے نفرت کرتے ہیں جس کی وجہ سے اس کے چہرے کی آب چلی جاتی

آدمی سے کوئی چیز نہیں مانگتے تھے۔ (نسائی۔ ابو داؤد)

اگر سوال ناگزیر ہو تو نیک بندوں سے کرے

حضرت فراسی رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ میں نے ہادی برحق ﷺ سے دریافت کیا کہ میں اپنی ضرورت کے لیے لوگوں سے سوال کر سکتا ہوں؟ آپ نے فرمایا: "جہاں تک ہو سکے سوال نہ کرو اور اگر تم سوال کے لیے مجبور ہو جاؤ تو اللہ کے نیک بندوں سے کرو۔" (ابو داؤد۔ نسائی)

سوال کرنے میں ذلت ہی ہے

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے دست سوال دراز کرنے کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا: "اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔ اوپر والا ہاتھ دینے والا ہاتھ ہے اور نیچے والا ہاتھ مانگنے والا ہاتھ ہے۔" (بخاری۔ مسلم)

لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے والے کا انجام

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ محسن انسانیت ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جو شخص ضروریات سے مجبور ہو کر نہیں بلکہ زیادہ مال و دولت حاصل کرنے کے لیے لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے اور ان سے بھیک مانگتا ہے تو درحقیقت وہ اپنے لیے جہنم کا انگارہ مانگتا ہے۔ یعنی مانگ کر وہ جو کچھ حاصل کرے گا آخرت میں اس کے لیے دوزخ کا انگارہ بن جائے گا۔" (مسلم)

کن حالات میں سوال کرنے کی اجازت ہے

حضرت حبشی بن جنادہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "تندرست و توانا اور مالدار شخص کے لیے بندگان خدا کے سامنے سوال کے لیے ہاتھ پھیلانا جائز نہیں۔ البتہ ایسے شخص کے لیے اجازت ہے جسے غربت و افلاس نے زمین پر گرا دیا ہو۔ یا جس پر قرض یا کسی تاوان کا بھاری بوجھ پڑ گیا ہو۔ اور جو آدمی محتاجی اور ناداری کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے مال میں اضافے کی خاطر لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتا اور مانگتا ہے تو قیامت کے دن اس کا یہ سوال اس کے چہرے پر ایک زخم اور گھاؤ کی شکل میں نمایاں ہوگا اور جہنم کا جلتا ہوا گرم پتھر ہوگا جس کو وہ وہاں کھائے گا...... اس کے بعد جس کا جی چاہے سوال کم کرے اور جس کا جی چاہے زیادہ کرے اور آخرت میں اس کا یہ نتیجہ بھگتے۔" (ترمذی)

محنت و مشقت کا برکات

حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رحمۃ للعالمین ﷺ نے فرمایا: "تم میں سے کسی حاجت مند آدمی کا یہ رویہ کہ وہ رسی لے کر جنگل جائے اور لکڑیوں کا ایک گٹھا اپنی کمر پر لاد کر لائے اور بیچے اور اس طرح اللہ کی توفیق سے وہ سوال کی ذلت سے اپنے کو بچا لے اس سے بہتر ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلائے پھر خواہ وہ اس کو دیں یا نہ دیں۔" (بخاری)

ہاتھ سے روزی کمانے کی فضیلت اور برکت

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انصار میں سے ایک غریب شخص حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور اپنی حاجت بیان کر کے آپؐ سے کچھ مانگا۔ آپؐ نے فرمایا: "کیا تمہارے گھر میں کوئی چیز بھی نہیں ہے؟"

(ایسے فرشتے) جن کے دو دو اور تین تین اور چار چار بازو ہیں۔ وہ اپنی مخلوق کی ساخت میں جیسا چاہتا ہے اضافہ کرتا ہے۔ یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اللہ جس رحمت کا دروازہ بھی لوگوں کے لیے کھول دے اسے کوئی روکنے والا نہیں اور جسے وہ بند کردے اسے اللہ کے بعد پھر کوئی دوسرا کھولنے والا نہیں۔ وہ زبردست اور حکیم ہے۔

لوگو، تم پر اللہ کے جو احسانات ہیں انہیں یاد رکھو۔ کیا اللہ کے سوا کوئی اور خالق بھی ہے جو تمہیں آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہو؟...... کوئی معبود اس کے سوا نہیں، آخر تم...... کہاں سے دھوکہ کھا رہے ہو؟"

(سورۂ فاطر آیات ۱ تا ۳)

صرف اللہ کارساز

"اے نبی، کہو، حمد ہے اللہ کے لیے، اور سلام اس کے ان بندوں پر جنہیں اس نے برگزیدہ کیا۔ (ان سے پوچھو) اللہ بہتر ہے یا وہ معبود جنہیں یہ لوگ شریک بنا رہے ہیں؟ بھلا وہ کون ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تمہارے لیے آسمان سے پانی برسایا پھر اس کے ذریعے سے وہ خوشنما باغ اگائے جن کے درختوں کا اگانا تمہارے بس میں نہ تھا۔ کیا اللہ کے سوا کوئی دوسرا خدا بھی ان کاموں میں شریک ہے؟ (نہیں) بلکہ یہ لوگ راہ راست سے ہٹ کر چلے جا رہے ہیں۔

اور وہ کون ہے جس نے زمین کو جائے قرار بنایا اور اس کے اندر دریا رواں کیے اور اس میں پہاڑوں کی میخیں گاڑ دیں اور پانی کے دو ذخیروں کے درمیان پردے حائل کر دیے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی ان کاموں میں شریک ہے؟ نہیں، بلکہ ان میں سے اکثر لوگ نادان ہیں۔ کون ہے جو بے قرار کی دعا سنتا ہے جبکہ وہ اسے پکارے اور کون اس کی تکلیف رفع کرتا ہے؟ اور کون ہے جو تمہیں زمین کا خلیفہ بناتا ہے؟ کیا اللہ کے سوا کوئی اور خدا بھی یہ کام کرنے والا ہے؟ تم لوگ کم ہی سوچتے ہو اور وہ کون ہے جو خشکی اور سمندر کی تاریکیوں میں تم کو راستہ دکھاتا ہے اور کون اپنی رحمت کے آگے ہواؤں کو خوشخبری لے کر بھیجتا ہے؟ کیا اللہ کے سوا کوئی اور خدا بھی یہ کام کرتا ہے؟ بہت بالا و برتر ہے اللہ اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں"

(سورۂ النمل آیات ۵۹ تا ۶۳)

فرمان رسول صلی اللہ علیہ وسلم

اپنی حاجت بندوں کے سامنے نہیں بلکہ اللہ کے سامنے رکھو

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رحمۃ للعالمین ﷺ نے فرمایا: "جس آدمی کو کوئی سخت حاجت پیش آئی اور اس نے اسے بندوں کے سامنے رکھا اور ان سے مدد چاہی تو اسے اس مصیبت سے مستقل نجات نہیں ملے گی اور جس آدمی نے اسے اللہ کے سامنے رکھا اور اس نے دعا کی تو پوری امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی یہ حاجت جلد ہی ختم کردے گا۔ یا تو جلدی موت دے کر اگر اس کی موت کا مقررہ وقت آگیا ہو یا کچھ تاخیر سے خوشحالی دے کر۔"

(ابوداؤد۔ ترمذی)

بندوں کے سامنے دست سوال نہ پھیلانے پر جنت کی ضمانت

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جو مجھ سے اس بات کا عہد کرے کہ وہ اللہ کے بندوں سے اپنی کوئی حاجت نہ مانگے گا تو میں اس کے لیے جنت کا ضامن ہوں۔" ثوبانؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: "حضور! میں اس کا عہد کرتا ہوں۔" راوی کا بیان ہے کہ یہی وجہ تھی کہ وہ کسی

قارئین ھدیٰ کی زبردست فواہش پر
اسلامی ڈائجسٹ ھدیٰ کا
اصحابِ رسول نمبر
حصہ اوّل
دوبارہ چھپ چکا ہے۔!

حافظ افروغ حسن

مالک حقیقی کے بجائے کسی اور کے سامنے دست سوال دراز کرنا ذلت وخواری کو دعوت دینا ہے

اللہ ہی سے اس کا فضل مانگو

"اور جو کچھ اللہ نے تم میں سے کسی کو دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ دیا ہے اس کی تمنا نہ کرو۔ جو کچھ مردوں نے کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ ہے اور جو کچھ عورتوں نے کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ۔ ہاں اللہ سے اس کے فضل کی دعا مانگتے رہو' یقیناً اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔" (سورہ النساء آیت ۳۲)

اللہ اپنے بندوں کے قریب ہے

"اور اے نبی' میرے بندے اگر تم سے میرے متعلق پوچھیں' تو انہیں بتادو کہ میں ان سے قریب ہی ہوں۔ پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے' میں اس کی پکار سنتا اور جواب دیتا ہوں۔ لہذا انہیں چاہئے کہ میری دعوت پر لبیک کہیں اور مجھ پر ایمان لائیں شاید کہ وہ راہ راست پائیں۔" (سورہ البقرہ آیت ۱۸۶)

رازق حقیقی صرف اللہ ہی ہے۔ اسی کے سامنے دست سوال دراز کرو

"تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو آسمانوں اور زمین کا بنانے والا اور فرشتوں کو پیغام رساں مقرر کرنے والا ہے۔

کو میرا نقطہ نظر معلوم ہو گا' میں پھر وضاحت کیے دیتا ہوں کہ میں اپنی خلافت کے لیے خود کسی سے کوئی بات نہ کہوں گا اور خدانخواستہ تمام لوگ اگر مجھے خلیفہ منتخب کرلیں اور صرف ایک آدمی کو میری خلافت منظور نہ ہو تو اس صورت میں بھی میں خلافت قبول نہ کروں گا۔ میں مکہ میں مقیم تھا۔ عبداللہ بن زبیر کی ناروائی دیکھ کر جی میں آیا کہ آپ کی دعوت قبول کرکے شام میں بودوباش اختیار کرلوں۔ لیکن آپ نے اندیشے کا اظہار کیا ہے تو انشاء اللہ یہاں سے بھی واپس ہو جاؤں گا۔"

خط لکھ کر قاصد کے حوالے کیا اور شام سے نکل پڑے لیکن جہاں پہنچے' تنگ کیے گئے' کہیں کوئی جائے امان نہ ملی۔ اسی دوران حجاج بن یوسف نے عبداللہؓ بن زبیرؓ کا خاتمہ کردیا اور تمام امت اسلامیہ نے عبدالملک کو متفقہ طور پر اپنا خلیفہ تسلیم کرلیا' تو انہوں نے بھی اس کی بیعت قبول کرلی اور تحریری طور پر عبدالملک کو اس کی اطلاع بھیج دی۔ عبدالملک نے حجاج کو لکھا کہ وہ ان کی خاطر خواہ تعظیم و تکریم کرے اور ان کے مرتبہ و مقام اور حقوق و واجبات کا پورا پورا خیال رکھے' لیکن محمدؒ بن حنفیہ تھوڑے دنوں بعد ہی دنیا سے رخصت ہوگئے۔ اللہ ان کی روح کو شاد رکھے!

"میں چھپا ہوا خزانہ تھا
پس میں نے محبت سے
انسان کو تخلیق کیا تاکہ
میں پہچانا جاؤں"۔
(حدیث قدسی)

انجام کار محمدؒ بن حنفیہ کے خلاف ان کے رویے میں سختی آگئی اور انہوں نے ان کو حکم دے دیا کہ وہ مکہ میں اپنی گھاٹی سے باہر نہ نکلیں' مزید برآں ان پر نگران مقرر کردیے جو ان کی ہر نقل و حرکت پر نگاہ رکھیں۔ اس کے بعد ان سے کہا: "آپ بیعت کریں ورنہ زندہ جلا دیے جائیں گے۔"

اس تہدیدی حکم کے بعد ان کو ان کے پیروؤں کے ساتھ ایک گھر میں اکٹھا کیا گیا اور اس گھر کے چاروں طرف دیواروں تک لکڑیاں چن دی گئیں۔ بس ایک شتابہ دکھانے کی دیر تھی' سارے کے سارے لوگ راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو جاتے۔

ان کے پیروؤں میں سے کسی نے کہا: "اجازت دیں تو امت کی جاں بخشی کے لیے عبداللہؓ بن زبیرؓ کا سر قلم کردوں۔" ایسے نازک ترین موقع پر بھی محمدؒ بن حنفیہ کی محتاط روش دیکھئے' ان کا جواب تھا کہ بتاؤ جس فتنے سے بچنے کے لیے ہم نے غیر جانبداری کی راہ اپنائی' اسی فتنے کے بارود کو ہم شتابہ کیونکر دکھائیں۔ کیا صحابہ اور ان کی اولاد کے قاتل ہم لوگ ہوں گے؟ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔

ادھر عبدالملک بن مروان کو معلوم ہوا کہ عبداللہؓ بن زبیرؓ' محمدؒ بن حنفیہ کے درپے آزار ہیں تو انہوں نے ان کی دلجوئی کے لیے بڑا اثر انگیز خط لکھا۔ خط کا مضمون کچھ اس طرح تھا:

"بڑے دکھ کی بات ہے کہ عبداللہ آپ کے ساتھ حق ناشناسی کر رہے ہیں۔ ہمارے ملک شام کی سرزمین کا چپہ چپہ آپ کے خیر مقدم کے لیے بے چین ہے اور ہماری آنکھیں آپ کے لیے مشتاق دید۔ آپ یہاں آکر جہاں چاہیں قیام فرمائیں' ہر جگہ آپ کی یکساں عزت و پذیرائی ہوگی اور ہر شخص کو آپ اپنا مخلص و جاں نثار پاکر خوش ہوں گے۔"

محمدؒ بن حنفیہ تنگ آچکے تھے' اس لیے خط پاتے ہی اپنے پیروؤں کو لے کر ملک شام کی طرف روانہ ہو گئے' ایلہ پہنچ کر قیام فرمایا۔ لوگوں نے طرح طرح سے پذیرائی کی اور ان کی عبادت و تقویٰ گساری دیکھی تو ان کے گرویدہ و شیدا ہو گئے۔

عبدالملک بن مروان کو جب معلوم ہوا کہ اس کے ملک کے باشندے بھی جوق در جوق ان کے پرستار و جاں نثار ہو رہے ہیں تو اسے بھی تشویش ہونے لگی کہ کہیں یہ طاقتور ہو کر سرچشمہ ء شورش نہ بن جائیں۔

اس نے اپنے مشیروں سے پوچھا تو انہوں نے کہا: "آپ محمدؒ بن حنفیہ کی ہر دلعزیزی اور محبوبیت سے واقف ہیں۔ عام لوگوں کے دلوں میں ان کے احترام و محبت کا جو جذبہ پایا جاتا ہے اس کے پیش نظر آپ کے حق میں یہ بات بہتر نہ ہوگی کہ ان کو اس طرح کھلے عام حلقہ بنانے اور عوامی طاقت کا مرکز بننے کی کھلی اجازت دے دیں الا یہ کہ وہ بھی آپ کی خلافت کو تسلیم کرلیں اور بیعت کر کے اطاعت کا اقرار کرلیں۔"

اس مشورے کے بعد عبدالملک نے ان کو دوسرا خط یوں لکھا:

"آپ کو معلوم ہے کہ عبداللہؓ بن زبیرؓ سے ہماری جنگ چل رہی ہے' ایسی صورت میں بیعت خلافت کے بغیر کسی ملک میں رہنے کی اجازت دینا دور اندیشی کے خلاف ہے' اس لیے بہتر ہوگا کہ آپ بیعت قبول کرلیں' مال و اسباب سے لدی ہوئی سو کشتیاں آپ کی نظر کرتا ہوں جو بندرگاہ قلزم سے آئی ہیں۔ اس کے علاوہ مزید دو لاکھ درہم آپ کا وظیفہ مقرر کیے دیتا ہوں تاکہ آپ خانگی امور و معاملات کو استوار رکھ سکیں۔ خدانخواستہ بیعت منظور نہ ہو تو میری مملکت سے کہیں اور منتقل ہو جائیں۔"

محمدؒ بن حنفیہ نے جواب دیا: "ہر حال میں اللہ کا شکر و احسان ہے' میری جانب سے آپ مبتلاء تشویش ہیں۔ میرا گمان تھا کہ امر خلافت کے تعلق سے آپ

روکو' میں تمہیں کھینچتا ہوں۔ یہ کہہ کر انہوں نے تھوڑا سا زور لگا کر اسے کھینچا' وہ اپنی جگہ چھوڑ کر اس طرح کھڑا ہو گیا جیسے کوئی کمسن بچہ جوان کے مقابلے میں۔

رومی پہلوان شکست کھا چکا تھا' لیکن اس کی طاقت کے غرور نے اسے اپنی شکست کو تسلیم نہ کرنے دیا' وہ طیش میں آکر بولا: "میں اس مقابلے کو تسلیم نہیں کرتا' آپ نے میرے ساتھ چالاکی کی ہے۔"

محمدؒ بن حنفیہ نے پوچھا: "کیسے؟"

اس نے کہا: "یہی کہ آپ نے مجھے بٹھا دیا اور خود کھڑے رہے۔"

محمدؒ بن حنفیہ نے کہا: "آؤ میں بیٹھتا ہوں' تم کھڑے ہو کر میرا ہاتھ پکڑو اور کھینچ کر مجھے اٹھا دو۔"

محمدؒ بن حنفیہ نے بیٹھ کر اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا اور کہا کہ زور لگا کر کھینچو۔ اس نے منہ بنا بنا کر مختلف زاویوں سے ان کو کھینچ کر اٹھانا چاہا لیکن تھک ہار کر بے بس ہو گیا۔ تب محمدؒ بن حنفیہ نے کہا: "اب میں تم کو کھینچ کر زمین پر بٹھاتا ہوں' تم اپنے آپ کو پوری قوت سے سنبھالو۔"

وہ زمین پر اپنی پوری قوت سے پہاڑ کی طرح گڑ گیا۔ محمدؒ بن حنفیہ نے ہلکا سا جھٹکا دیا اور شاخ سے ٹوٹ کر گرنے والے پھل کی طرح وہ یک لخت زمین سے آلگا اور پھر شرم سے سر اوپر نہ اٹھا سکا۔

دونوں رومی شکست خوردہ و خوار یہ احساس لے کر لوٹے کہ مسلمان کسی معاملے میں مفتوح نہیں ہو سکتا کہ یہ قوم غلبہ و قوت کی قوم ہے جو کبھی کسی پہلو سے زیر نہیں ہو سکتی۔ زمانہ گزرتا رہا' حالات کروٹیں بدلتے رہے' معاویہؓ اور یزید و مروان یکے بعد دیگرے دنیا سے رخصت ہو گئے اور عبدالملک بن مروان تخت نشین خلافت ہوا۔ ملک کا تمام علاقہ اس کی خلافت پر متفق تھا' لیکن حجاز و عراق میں عبداللہؓ بن زبیرؓ کی خلافت قائم تھی۔ جو لوگ اس معاملہ میں غیر جانبدار تھے اور انہوں نے اب تک کسی کی خلافت کے لیے بیعت نہیں کی تھی' یہ دونوں اپنی اپنی بیعت کے لیے ان پر دباؤ ڈالنے لگے کیونکہ دونوں ہی اپنے اپنے سور پر خود کو خلافت کا حقدار سمجھتے تھے۔ اس طرح مسلمانوں میں انتشار پیدا ہو گیا۔

چونکہ تمام اہل حجاز نے عبداللہ بن زبیرؓ کو متفقہ طور پر اپنا خلیفہ تسلیم کر لیا تھا' اس لیے انہوں نے محمدؒ بن حنفیہ سے بھی اپنی بیعت کا مطالبہ کیا' لیکن محمدؒ بن حنفیہ اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ خلافت کے دو مرکز ہوں گے تو ان میں ٹکراؤ ضرور ہو گا اور ٹکراؤ کی صورت میں مسلمانوں کا خون ہی بہے گا' اس لیے اگر کسی ایک کی خلافت تسلیم کر لی جائے تو پھر ضروری ہو گا کہ دوسرے کے خلاف تلوار اٹھالی جائے' جبکہ صفین میں مسلمانوں کی خون کی ارزانی کا منظر دیکھ کر وہ خدا سے عہد کر چکے تھے کہ کسی مسلمان کے خلاف تلوار نہیں اٹھاؤں گا' اس لیے انہوں نے عبداللہ بن زبیرؓ سے کہا:

"آپ کو معلوم ہو گا کہ خلافت کی مجھے تمنا ہے نہ اس کا کوئی ارادہ' میں صرف اس بات کا انتظار کر رہا ہوں کہ سارے مسلمان کسی ایک کی خلافت پر متفق ہو جائیں تو میں بھی الجماعۃ میں شامل ہو کر بیعت کر لوں۔ بصورت دیگر میں فتنوں سے دور رہنے کی کوشش کروں گا۔"

اس کے بعد عبداللہ بن زبیرؓ ان سے نرمی کا معاملہ کرنے لگے' لیکن جلد ہی پھر سختی پر اتر آئے۔

محمد بن حنفیہ فتنوں سے کنارہ کش ہو کر تنہا رہنا چاہتے تھے لیکن تنہا نہ رہ سکے' رفتہ رفتہ بہت سارے لوگ ہم خیال و ہمراہ ہوتے گئے' دھیرے دھیرے ان کے متبعین کی تعداد سات ہزار سے متجاوز ہو گئی' ان کے پیروؤں کی تعداد میں جیسے جیسے اضافہ ہوتا جاتا' عبداللہؓ بن زبیرؓ کی تشویش بھی دوچند ہوتی جاتی۔

ہو سکے گا؟"

حضرت معاویہؓ نے کہا: "اسلام کی سربلندی کے لیے وہ ضرور تیار ہو جائیں گے۔"

قیس بن سعدؓ اور محمدؒ بن حنفیہ کو بلاوا بھیجا گیا۔ دونوں آئے تو رومیوں سے ان کے مقابلے کا اہتمام کیا گیا۔ دونوں رومی غرور سے اکڑتے' اپنے شانوں کو جھٹکا دیتے اس طرح سامنے آئے جیسے دنیا میں کوئی ان کا مدمقابل پیدا ہی نہ ہوا ہو۔

قیس بن سعدؓ نے ایک کافر کی یہ شیخی اور طنطنہ دیکھا تو ان کا ایمان بھر گیا' فوراً اپنا پائجامہ اتار کر اس کی جانب پھینکا' اس نے پہنا تو وہ اس کی گردن تک چڑھ گیا' ساری تماشگاہ قہقہوں سے گونج اٹھی' وہ پانی پانی ہو گیا اور شرم سے پھر سر اوپر نہ اٹھا سکا۔

اب طاقت کے مظاہرے کے لیے رومی پہلوان اچک کر آگے آیا۔ اسے یقین تھا کہ پہلی شکست کی شرمندگی کو وہ اپنی قوت اور شہ زوری کے بل پر سرخروئی میں بدل دے گا۔ وہ طاقت کے نشے میں بدمست ہاتھی کی طرح جھومتا خم ٹھونک کر میدان میں آیا۔ ساری تماشگاہ حیرت و استعجاب میں ڈوب گئی کہ ایسا دیو پیکر انسان کبھی آنکھوں نے دیکھا ہی نہیں تھا۔

محمدؒ بن حنفیہ اس کے مقابلے کے لیے سامنے آئے۔ انہوں نے رومی کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیا اور کہا کہ تمہارا جی چاہے تو بیٹھ کر میرا ہاتھ کھینچو اور کھینچ کر مجھے زمین پر بٹھا دو یا جی چاہے تو میں بیٹھتا ہوں' تم کھڑے ہو کر میرا ہاتھ کھینچو اور کھینچ کر مجھے کھڑا کر دو۔ اس نے کہا میں بیٹھ کر مقابلہ کروں گا' چنانچہ بیٹھ کر اس نے ان کا ہاتھ پکڑا اور پوری قوت سے کھینچا۔ اس کے پسینے چھوٹ گئے لیکن محمدؒ بن حنفیہ مضبوط چٹان کی طرح اپنی جگہ کھڑے رہے۔ کوئی ادنیٰ جنبش بھی نہ ہوئی۔

جب رومی پہلوان اپنی پوری طاقت کا مظاہرہ کر چکا تو محمدؒ بن حنفیہ نے کہا: اب تم اپنے آپ کو

ھدیٰ ڈائجسٹ کی ملکیت اور دوسری تفاصیل کے متعلق بیان جو اخبارات کے رجسٹریشن کے مرکزی قواعد ۱۹۵۶ء کی رو سے شائع کرنا لازمی ہے۔

فارم نمبر ۴

۱۔ مقام اشاعت: ۴۵/۳ جنگ پورہ "بی" متھرا روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۴

۲۔ وقفۂ اشاعت: ماہنامہ۔

۳۔ طابع: احمد مصطفیٰ صدیقی راہی۔
قومیت: ہندوستانی۔ پتہ۔ ۴۵/۳ جنگپورہ "بی" متھرا روڈ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۴

۴۔ ناشر: احمد مصطفیٰ صدیقی راہی
قومیت: ہندوستانی۔ پتہ۔ ۴۵/۳ جنگپورہ متھرا روڈ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۴

۵۔ مدیر۔ احمد مصطفیٰ صدیقی راہی۔ قومیت ہندوستانی پتہ۔ ۴۵/۳ جنگپورہ "بی" متھرا روڈ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۴

۶۔ اخبار کے مالکان یا حصہ دار یا شرکت دار جن کا اخبار کی ملکیت اور سرمایہ میں ایک فی صدی سے زیادہ حصہ ہے۔

احمد مصطفیٰ صدیقی راہی۔ قومیت ہندوستانی۔ پتہ: ۴۵/۳ جنگپورہ "بی"، متھرا روڈ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۴

میں احمد مصطفیٰ صدیقی راہی۔ طابع و ناشر و پرنٹر پبلیشر اقرار کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات جہاں تک میرے علم و یقین کا تعلق ہے حق اور سچائی پر مبنی ہیں۔

دستخط
یکم مارچ ۲۰۰۰ء احمد مصطفیٰ صدیقی راہی پرنٹر پبلیشر

محمدؒ بن حنفیہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے آخری دور میں پیدا ہوئے' اپنے والد ماجد حضرت علیؓ کی تعلیم و تربیت میں نشوونما پائی' چنانچہ علم و فضل' زہد و قناعت' عبادت و ریاضت' قوت و شجاعت اور فصاحت و بلاغت میں ان ہی کا نمونہ ثابت ہوئے۔ شیر خدا کی طرح یہ بھی میدان کارزار کے شہسوار اور رات کے اندھیروں میں انہی کی طرح صاحب محراب تھے۔ حضرت علیؓ جنگ میں ہمیشہ ان کو اپنے ساتھ رکھتے جبکہ حضرات حسنینؓ کو جنگ و جدل کی ہولناکیوں سے اکثر دور رکھتے۔ ایک مرتبہ کسی نے ان سے کہا:

"کیا وجہ ہے کہ آپ کے والد جنگوں میں ہمیشہ آپ کو ساتھ رکھتے ہیں جبکہ حسنؓ و حسینؓ کو جنگ میں لے جانا پسند نہیں کرتے؟"

محمد بن حنفیہ نے جواب دیا: "میرے وہ دونوں بھائی ان کی دو آنکھیں ہیں اور میں ان کا ہاتھ' ہاتھ سے وہ اپنی آنکھوں کی حفاظت کرتے ہیں۔"

جنگ صفین میں حضرت علیؓ کے علمبردار محمدؒ بن حنفیہ ہی تھے۔ وہ اس جنگ کا اپنا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں:

"دونوں فوجیں برسر پیکار تھیں۔ لاشوں پہ لاشیں بچھی جا رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ فریقین میں سے کوئی سلامت نہیں رہ پائے گا اور سارے مسلمان کٹ مر کے ختم ہو جائیں گے۔ میں بے چین خون کے آنسو پی رہا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی:

"مسلمانو! اللہ سے ڈرو۔ کل تمہاری عورتوں اور بچوں کا کون سہارا بنے گا' تمہاری عزت و آبرو کا دفاع کون کرے گا؟ روم اور دیلم حملہ آور ہوں گے تو کون ان کا جواب دے گا؟ مسلمانو! اللہ سے ڈرو اور ملت اسلامیہ پر ترس کھاؤ۔"

یہ آواز میرے کانوں سے ٹکرائی تو میں نے فوراً قسم کھالی کہ آج سے کسی مسلمان پر تلوار نہیں اٹھاؤں گا۔"

پھر یہ ہوا کہ حضرت علیؓ شہید کر دیے گئے اور معاویہؓ بن ابوسفیان کو لوگوں نے متفقہ طور پر خلیفہ تسلیم کر لیا۔ محمدؒ بن حنفیہ نے صرف احوال ملت کی اصلاح' ملت کی شیرازہ بندی اور اسلام کی سربلندی کے لیے ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ حضرت معاویہؓ کو بھی ان کی بیعت کے مخلصانہ ہونے کا یقین و احساس تھا' اس لیے وہ موقع بہ موقع ان کی دلجوئی کرتے اور دمشق میں ان کے گھر آ کر ان سے ملاقات کرتے۔

ایک موقع اس طرح پیش آیا کہ شہنشاہ روم نے خلیفہ کو لکھا کہ بادشاہوں میں نوادرات کے باہمی تبادلے کا دستور رہا ہے' اس لیے چاہتا ہوں کہ ہم دونوں کے مابین بھی یہ رسم کہن زندہ رہے۔ خط کے ساتھ اس نے دو نادرۂ روزگار آدمی بھی بھیجے اور لکھا کہ ان دونوں کا مدمقابل آپ کے پاس ہو تو سامنا کرا کے دیکھ لیں۔ ان میں سے ایک جثہ و جسامت اور دراز قامتی میں بھاری بھرکم اونچی چٹان نظر آتا تھا جبکہ دوسرا فولاد و آہن کی طرح نہایت طاقتور اور درندوں کی طرح خونخوار معلوم ہوتا تھا۔

امیر معاویہؓ نے عمرو بن عاصؓ سے کہا: "ایسا بالا قد آدمی تو میری نگاہ میں ہے جو اس آدمی کو مات دے سکے' دیکھو' قیس بن سعدؓ بن عبادہ اس رومی سے کہیں زیادہ دراز قامت ہیں' البتہ کوئی ایسا طاقتور آدمی نگاہ میں نہیں ہے جو اس رومی کو زیر کر سکے۔"

عمروؓ بن عاص نے کہا: "دو آدمی تو ہیں' لیکن دونوں آپ سے کوئی لگاؤ اور ملاپ نہیں رکھتے۔ ایک محمدؒ بن حنفیہ اور دوسرے عبداللہؓ بن زبیرؓ۔"

امیر معاویہؓ نے کہا: محمدؒ بن حنفیہ کا تو ہم سے کچھ نہ کچھ لگاؤ ہے۔"

عمروؓ بن عاص نے کہا: "لیکن کیا ان جیسا باوقار و پرجلال آدمی بطور تماشہ مقابلہ آرائی کے لیے تیار

محمد بن حنفیہؒ

ایک جلیل القدر تابعی کا ذکر جمیل جو اسلامی
قوت و حشمت کا کوہِ گراں تھا

ابو جلیس ندوی

محمد بن حنفیہ کی اپنے بھائی حسنؓ بن علیؓ سے کسی بات پر ان بن ہو گئی۔ انہوں نے کہلا بھیجا: "اللہ نے آپ کو گوناگوں فضیلتوں سے نوازا ہے۔ آپ کی والدہ فاطمہؓ بنت محمد رسول اللہ ہیں جبکہ میری ماں بنو حنیفہ کی ایک ادنیٰ خاتون۔ آپ کے نانا محمد رسول اللہ ﷺ ہیں جبکہ میرے نانا جعفر بن قیس۔

چہ نسبت خاک را با آسماں باد

اس لیے عاجزانہ درخواست ہے کہ یہ پیغام پہنچتے ہی آپ صلح کے لیے تشریف لانے کی زحمت گوارا فرمائیں تاکہ اس معاملے میں بھی آپ کی فضیلت کا پہلو روشن ہو جائے۔"

درخواست کا یہ قرینہ دیکھا تو حضرت حسنؓ مچل اٹھے، فوراً چھوٹے بھائی کے گھر پہنچے اور صلح صفائی کرکے باہمی محبت کو زندگی کی نئی روح بخش دی۔

یہ محمد بن حنفیہؒ کون ہیں جن کے قرینہ ٔ درخواست نے رنجشوں کی بیڑیاں کاٹ کے اڑا دیں، آیئے ان کی زندگی کا شروع سے مطالعہ کریں۔

رسول اللہ ﷺ کی زندگی کا آخری دور ہے۔ حضرت علیؓ آپ کی خدمت میں حاضر ہیں، ایک دن عرض کرتے ہیں: "اے اللہ کے رسول! میری تمنا ہے کہ آپ کے بعد اگر میرے کوئی بچہ پیدا ہوا تو اس کا نام محمد رکھوں اور کنیت ابوالقاسم۔" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "بڑی اچھی بات ہے۔"

بات ختم ہو گئی، زمانہ کروٹیں بدلتا رہا۔ نبی اکرم ﷺ کا وصال ہو گیا، آپ کی وفات کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد حضرت فاطمہؓ بھی رحلت کر گئیں۔

حضرت علیؓ نے بنو حنیفہ کے خانوادے کی ایک خاتون خولہ بنت جعفر بن قیس حنفیہ سے شادی کر لی۔ ان کے بطن سے ان کا ایک لڑکا پیدا ہوا، اس کا نام حضرت علیؓ نے محمد رکھا اور اس کی کنیت ابوالقاسم ہی تجویز کی لیکن ان کو لوگ محمدؒ بن حنفیہ کے نام ہی سے پکارا کرتے تاکہ ان کے مقابلے میں حضرت فاطمہؓ کے صاحبزادے حسنؓ و حسینؓ کا امتیاز باقی رہے، چنانچہ وہ اسی نام سے مشہور و معروف بھی ہوئے۔

اللہ کے لئے شام گئے۔ اثنائے سفر میں ہیت کے مقام پر طبیعت خراب ہو گئی۔ یہاں تک کہ جانبری کی کوئی امید نہ رہی۔ انتقال سے پہلے غلام سے فرمایا "میرا سر زمین پر رکھ دو۔" غلام یہ سن کر رونے لگا۔ پوچھا "روتے کیوں ہو؟" اس نے عرض کیا "مجھے آپ کے مقام بلند کا خیال آگیا کہ اللہ اللہ اپنے وقت کی عظیم ترین ہستی اس طرح جان دے رہی ہے"۔ فرمایا "بھائی! اس میں رنج کی کوئی بات نہیں، میں نے خود بارگاہ الٰہی میں دعا کی تھی کہ میں بے کسی اور فروتنی کی حالت میں جان دوں"۔

ایک اور روایت میں ہے کہ مرض الموت میں آواز بیٹھ گئی تھی اس لئے اندیشہ ہوا کہ مرتے وقت کلمہ شہادت پڑھنے سے محروم نہ رہ جاؤں، اپنے شاگرد حسن بن ربیعؒ سے جو ساتھ تھے، فرمایا کہ دم نزع تم میرے سامنے کلمہ شہادت بلند آواز سے پڑھنا، جب تم ایسا کرو گے تو میری زبان پر بھی کلمہ شہادت خود بخود جاری ہو جائے گا۔ چنانچہ انہوں نے اسی حالت میں 13 رمضان المبارک 181ھ، 8 نومبر 797ء کو بروز چہار شنبہ وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر 63 برس کی تھی۔ مقام وفات، ہیت اگرچہ ان کے وطن سے سینکڑوں میل دور تھا لیکن مخلوق خدا کے دلوں پر ان کی حکمرانی کا یہ عالم تھا کہ وفات کی خبر پھیلتے ہی لوگ جوق در جوق اس دور افتادہ قصبے کی طرف دوڑ پڑے۔ جنازے پر اس قدر ہجوم ہوا کہ ہیت کے حاکم کو اس واقعہ کی اطلاع بغداد بھیجنی پڑی۔ خلیفہ ہارون الرشید نے یہ خبر سنی تو اس کی زبان پر بے ساختہ یہ الفاظ آگئے "افسوس علماء کے سردار کا انتقال ہو گیا"۔ حضرت فضیل بن عیاضؒ نے فرمایا "ابن المبارک فوت ہو گئے لیکن افسوس اس کا ہے کہ جو باقی رہ گئے ان میں کوئی بھی ان کا مثل نہیں ہے"۔

سفیان بن عیینہؒ بولے "اللہ عبد اللہ بن مبارک کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ انہوں نے خراسان میں اپنا کوئی ثانی نہیں چھوڑا"۔

اسی طرح دوسرے تمام علماء عصر نے بھی شاندار الفاظ میں انہیں خراج تحسین پیش کیا اور ان کی وفات پر اپنے دلی کرب کا اظہار کیا۔

مختلف تذکروں میں حضرت ابن المبارکؒ کو بہت سی کتابوں کا مصنف بتایا گیا ہے لیکن ان میں سے بیشتر کتابیں نایاب ہو چکی ہیں۔ خوش قسمتی سے چند سال پہلے ان کی ایک معرکہ آراء تصنیف "کتاب الزہد و الرقائق" ...... چھپ کر منظر عام پر آگئی۔ اس کتاب کے گیارہ حصے ہیں اور اس میں 2063 روایات ہیں (مجلس احیاء المعارف مالیگاؤں ...... نے شائع کیا ہے)

[illegible] دفعہ ایک نوجوان آدمی امام صاحبؒ کی مجلس میں حاضر ہوا اور ایک گوشہ میں کھڑا ہو کر زور [illegible] آپ پر تنقید کرنے لگا۔ لوگوں کو اس کی اس حرکت پر سخت غصہ آیا لیکن آپ نے سب کو منع کر دیا کہ اس [illegible] نہ کہا جائے جب امام صاحبؒ اپنے دروازے پر پہونچے تو فرمایا بھائی! اگر کچھ کمی رہ گئی ہو تو اور کہہ [illegible] اندر جاتا ہوں۔ یہ حلم دیکھ کر وہ آدمی شرمندہ ہوا اور معافی چاہی۔

آئے۔ گھر آ کر دیکھا تو یاد آیا افسوس کیا اور مرو سے شام تک کا طویل سفر دوبارہ صرف اس لئے کیا کہ وہ قلم اس کے مالک کے حوالے کر سکیں۔

حسن ادب کی یہ کیفیت تھی کہ ان کے سامنے کوئی شاگرد قرات حدیث کرتا تو وہ اس سے کسی عبارت کو دوبارہ نہیں پڑھواتے تھے بلکہ توجہ اور خاموشی کے ساتھ سنتے رہتے تھے۔ ایک بار مجلس میں کسی شخص کو چھینک آ گئی' اس نے الحمد للہ نہیں کی۔ حضرت ابن المبارکؒ نے کچھ دیر انتظار کیا پھر اس سے پوچھا "جب کسی کو چھینک آئے تو اس کو کیا کہنا چاہئے"۔ اس نے کہا "الحمد للہ۔" اس پر انہوں نے فوراً کہا "یرحمک اللہ"۔

زندگی نہایت محتاط اور زاہدانہ تھی' ابو اسامہؒ اور شعیب بن حربؒ کہا کرتے تھے کہ "ہم سال بھر میں تین دن بھی ابن المبارکؒ کی طرح نہیں گزار سکتے۔" ان کے زہد و ورع کی بناء پر اہل سیر نے انہیں زہاد تبع تابعین میں شمار کیا ہے۔ اسی طرح بعض ارباب سیر نے انہیں اولیاء اللہ میں شامل کیا ہے اور ان کی بہت سی کرامات بیان کی ہیں۔ علامہ خطیب بغدادی نے "تاریخ بغداد" میں ابو وہبؒ کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ ابن المبارکؒ کا گزر ایک نابینا پر ہوا تو اس نے بڑی لجاجت سے عرض کیا کہ میرے لئے بینائی کی دعا کیجئے۔ چنانچہ انہوں نے نہایت خشوع و خضوع سے دعا کی اور اللہ تعالیٰ نے اس کی بینائی بحال کر دی۔

وعظ و نصیحت اور ارشاد و اصلاح کا طریقہ نہایت بلیغ اور حکیمانہ ہوتا تھا۔ تذکروں میں ان کے سینکڑوں پر معارف اقوال ملتے ہیں جن میں سے کچھ یہ ہیں۔

○ بہت سے چھوٹے عمل ایسے ہوتے ہیں جن کو نیت بڑا بنا دیتی ہے اور بہت سے بڑے عمل ایسے ہوتے ہیں جن کو نیت چھوٹا بنا دیتی ہے۔

○ سب سے سفلہ اور کمینہ وہ شخص ہے جو دین کو عیاشی کا ذریعہ بنائے۔

○ عالم ہونے کے لئے یہ شرط ہے کہ دنیا کی محبت سے اس کا دل ہمیشہ خالی رہے۔

○ دنیا کے مال پر کبھی غرور نہ کرو۔

○ حق پر جمے رہنا سب سے بڑا جہاد ہے۔

○ ہر کام میں ادب اور تہذیب کا خیال رکھو۔ دین کے دو حصے ادب اور تہذیب ہیں۔

○ ایسا دوست ملنا بہت مشکل ہے جو صرف اللہ کے لئے محبت کرے لیکن دوست فی الحقیقت یہی ہے۔

○ آدمی اس وقت تک عالم رہتا ہے جب تک یہ سمجھتا رہے کہ شہر میں اس سے زیادہ علم رکھنے والے بھی موجود ہیں مگر جب وہ یہ سمجھنے لگ جائے کہ میں ہی سب سے بڑا عالم ہوں تو یوں سمجھ لو کہ اب وہ جاہلوں کی صف میں جا کھڑا ہوا۔

○ گمنامی کو پسند کرو اور شہرت سے دور رہو۔ مگر یہ ظاہر نہ کرو کہ تم گمنامی کو پسند کرتے ہو اس لئے کہ اس سے بھی غرور پیدا ہو گا۔

○ سب سے گرے ہوئے لوگ وہ ہیں جو قرض پر زندگی بسر کرتے ہیں اور ہاتھ پیر نہیں ہلاتے۔

○ تواضع یہ ہے کہ اغنیا کے مقابلہ میں خودداری کو ہاتھ سے نہ دیا جائے۔

○ حسن خلق یہ ہے کہ غصہ نہ کیا جائے۔

○ شریف وہ ہے جسے اطاعت الٰہی کی توفیق ہوئی اور رذیل وہ جس نے بے مقصد زندگی گزار دی۔

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ 81ھ میں جمادی سبیل

دے گا اللہ اس کی مغفرت کردے گا۔ میں نے دانستہ سات سو کے بجائے سات ہزار درہم لکھے تھے تاکہ یہ شخص اتنی خطیر رقم اچانک پاکر خوش ہو جائے۔ دوسری مرتبہ میں نے اپنے خط میں چودہ ہزار بھی سوچ سمجھ کر لکھے اور اس لئے کہ سات ہزار کی بھنک اس شخص کے کان میں پڑ چکی تھی۔ چودہ ہزار اس کے لئے یقیناً غیر متوقع ہوں گے اور اور یوں میں حضورؐ کے ارشاد کے مطابق اجر آخرت کا حقدار ٹھہروں گا۔

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ اکثر طرطوس آتے جاتے رہتے تھے۔ راستہ میں رقہ پڑتا تھا وہاں کی ایک سرائے میں قیام کیا کرتے تھے۔ سرائے میں مقیم ایک نوجوان نہایت اخلاص سے ان کی خدمت کیا کرتا تھا اور ان سے حدیث کا درس بھی لیتا تھا۔ ایک مرتبہ حسب معمول رقہ کی اس سرائے میں ٹھہرے تو اس نوجوان کو نہ دیکھا۔ لوگوں سے اس کے بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اس پر فلاں شخص کا دس ہزار درہم کا قرضہ تھا اسے ادا نہ کرسکا تو قرض خواہ نے دعویٰ کردیا اور اس نوجوان کو قرض کی عدم ادائیگی کی پاداش میں قید خانے بھیج دیا گیا۔ حضرت ابن المبارکؒ نے قرض خواہ کو رات کے وقت تنہائی میں بلایا اور اسے دس ہزار درہم دے کر کہا کہ بھائی اس نوجوان کو رہا کرادو۔ ساتھ ہی اس سے قسم لی کہ وہ اس بات کا تذکرہ کسی سے نہ کرے گا۔ نوجوان کی رہائی کا انتظام کرکے ابن المبارکؒ اسی رات سرائے سے روانہ ہو گئے۔ نوجوان رہا ہو کر سرائے میں آیا تو اسے ابن المبارکؒ کی آمد اور روانگی کی اطلاع ملی۔ اس کو حضرتؒ سے شرف نیاز حاصل نہ کرنے کا اتنا قلق ہوا کہ اسی وقت طرطوس کی طرف روانہ ہو گیا۔ تین چار منزل کے بعد ان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے اس کا حال احوال پوچھا۔ اس نے عرض کیا "جناب میں قید میں تھا۔ ایک نامعلوم شخص نے میرا قرض اپنی طرف سے ادا کرکے مجھے رہا کرادیا۔ معلوم نہیں وہ فرشتہ رحمت کون تھا؟" حضرت ابن المبارکؒ نے فرمایا "بھائی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ اس نے اس نامعلوم شخص کو تمہیں اس مصیبت سے نجات دلانے کی توفیق بخشی۔

راوی (محمد بن عیسیٰ) کا بیان ہے کہ ابن المبارکؒ کی وفات کے بعد قرض خواہ نے یہ واقعہ لوگوں کو بتایا۔

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ عبادت و ریاضت، زہد و ورع، امانت و دیانت، اور حسن معاشرت کے اعتبار سے بھی اپنی مثال آپ تھے۔ حافظ ذہبیؒ نے "تذکرۃ الحفاظ" میں اسماعیل بن عیاشؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ روئے زمین پر عبداللہ بن مبارکؒ جیسی کوئی شخصیت نہیں ہے اور میری دانست میں کوئی اچھی خصلت ایسی نہیں ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ان کی ذات میں ودیعت نہ کر دیا ہو۔

حضرت فضیل بن عیاضؒ فرمایا کرتے تھے، رب کعبہ کی قسم میری آنکھوں نے ابن المبارکؒ جیسا کوئی شخص نہیں دیکھا۔

عبادت و ریاضت سے بہت شغف تھا۔ پنجگانہ باجماعت فرض نمازوں کے علاوہ سنن و نوافل کا بھی خاص اہتمام تھا۔ بعض اوقات ساری ساری رات عبادت میں گزر جاتی تھی۔ کثرت سے روزے رکھتے تھے۔ حج بیت اللہ کے لئے بھی اکثر تشریف لے جاتے تھے۔ دیانت و امانت کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ قیام شام کے دوران میں کسی شخص سے قلم عاریتاً لیا۔ واپسی پر اسے قلم لوٹانا بھول گئے اور اسے اپنے ساتھ مرو لے

اس زمانے کے حجاج کے دستور کے مطابق ان کے مکانات پر سفیدی وغیرہ کراتے- تین دن کے بعد تمام رفقائے سفر اور ان کے اعزہ واقارب کی پر تکلف دعوت کرتے اس سے فارغ ہو کر صندوق کھول کر ہر ایک کی تھیلی جس پر اس کا نام لکھا ہوتا تھا اس کے حوالے کر دیتے تھے- راوی کا بیان ہے کہ زندگی بھر ان کا یہی شعار رہا-

4-جود و سخا اور اہل حاجت کی امداد: خطیب بغدادی نے "تاریخ بغداد" میں علی بن حسن بن شفیق سے روایت کی ہے کہ ابن المبارکؒ ہر سال فقراء پر ایک لاکھ درہم خرچ کرتے تھے-

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کی کتاب سیرت میں متعدد ایسے واقعات ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بے حد فیاض اور سیر چشم تھے اور اہل حاجت کی امداد کے لئے ہر وقت کمر بستہ رہتے تھے-

ایک مرتبہ (غالباً) جہاد میں شریک ہونے کے لئے بغداد سے مصیصہ کی جانب روانہ ہوئے تو کچھ صوفیہ بھی ان کے شریک سفر ہو گئے- انہوں نے ان حضرات سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ آپ حضرات کے نفوس قانعہ اس بات پر انقباض تو محسوس کریں گے کہ آپ کی خدمت میں کوئی سفر خرچ پیش کیا جائے پھر بھی زاد راہ کی ضرورت سے بے نیاز رہنا ممکن نہیں- یہ کہہ کر ایک غلام کو حکم دیا کہ ایک طشت لائے وہ طشت لایا تو انہوں نے اس میں ایک معقول رقم رکھ دی اور اس کو ایک رومال سے ڈھانپ دیا پھر ان حضرات سے فرمایا کہ ہر صاحب باری باری اس رومال کے نیچے ہاتھ ڈال کر جو کچھ مٹھی میں آئے لے لیں- انہوں نے ایسا ہی کیا کسی کو درہم مل گئے کسی کو بیس یا اس سے کم و بیش-

مصیصہ پہنچ کر فرمایا کہ یہ پردیس ہے اور ضروریات باقی ہیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ باقی رہ گیا ہے اسے بھی تقسیم کر لیا جائے- یہ کہہ کر ہر ایک کو بیس بیس دینار عطا کئے-

ایک مرتبہ ایک شخص حضرت ابن المبارکؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ میں سات سو درہم کا مقروض ہوں' مجھے اس قرض سے نجات دلائیے- انہوں نے اسی وقت اپنے منشی کو لکھا کہ اس شخص کو سات ہزار درہم دے دیئے جائیں- وہ آدمی یہ خط لے کر منشی کے پاس پہنچا- اس نے پوچھا تم پر کتنا قرض ہے اور تم نے کتنی رقم ابن المبارکؒ سے طلب کی تھی- اس نے کہا "سات سو درہم" منشی نے سمجھا کہ ابن المبارکؒ سے سہو قلم ہو گیا ہے اور وہ سات سو کے بجائے سات ہزار لکھ گئے ہیں- چنانچہ اس نے ابن المبارکؒ کو لکھ بھیجا کہ یہ شخص تو صرف سات سو درہم کا مقروض ہے اور آپ نے سات ہزار دینے کا حکم دیا ہے کہیں سہو قلم تو نہیں ہو گیا؟ ابن المبارک نے جواب میں لکھا کہ جس وقت میرا یہ خط تم کو ملے اسی وقت اس شخص کو چودہ ہزار درہم دے دو- منشی اور بھی حیران ہوا اور اس نے ازراہ ہمدردی ان کو دوبارہ لکھا کہ آپ اس طرح اپنا سرمایہ بے دریغ لٹاتے رہے تو یہ بہت جلد ختم ہو جائے گا- منشی کا خط پڑھ کر ابن المبارکؒ سخت برہم ہوئے اور اس کو سخت الفاظ میں لکھا کہ میں نے جو حکم دیا ہے اس پر عمل کرو ورنہ میری جگہ پر آبیٹھو تم جو حکم دو گے میں اس پر عمل کروں گا- میرے نزدیک دولت دنیوی سے زیادہ قیمتی سرمایہ ثواب آخرت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد مبارک ہے کہ جو شخص اپنے کسی مسلمان بھائی کو غیر متوقع طور پر خوش کر

سب کو دعوت عام تھی۔ کم از کم دو بچھڑوں کا گوشت روزانہ مہمان نوازی میں خرچ ہو تا تھا۔ مرغیوں اور بکریوں کا گوشت بھی پکتا تھا۔ ابو اسحاق طالقانی کا بیان ہے کہ ایک دفعہ سفر کر رہے تھے تو ان کے ساتھ دو اونٹنیوں پر بھنی ہوئی مرغیاں لدی ہوئی تھیں۔ ان مسافروں کے لئے تھیں جو ان کے ہمسفر تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ سفر میں ان کے دسترخوان کا سامان ایک یا دو گاڑیوں پر لادا جاتا تھا۔

اگر کوئی چیز کھانے کو دل چاہتا تو کبھی نہ کھاتے کسی نہ کسی مہمان یا مہمانوں کے ساتھ بیٹھ کر تناول کرتے اور فرمایا کرتے کہ مہمان کے ساتھ جو کھانا کھایا جاتا ہے آخرت میں اس کا محاسبہ نہیں ہو گا۔ خود روزے کثرت سے رکھتے تھے لیکن اپنے ساتھیوں کو فالودہ اور حلوا بنوا کر کھلایا کرتے تھے۔

2۔علماء اور طلبہ کی اعانت: علماء اور طلبہ کی اعانت کے لئے ابن المبارکؒ اپنا مال بے دریغ لٹاتے رہتے تھے۔ اس معاملے میں ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ علماء اور طلبہ کی ڈھونڈ ڈھونڈ کر مدد کرتے تھے۔ جو معاشی لحاظ سے پریشان حال ہوتے۔ اس مقصد کے لئے وہ جتنا روپیہ اپنے شہر کے علماء و طلبہ پر خرچ کرتے تھے اس سے کہیں زیادہ مال دوسرے شہروں کے علماء و طلبہ میں تقسیم کرتے تھے۔ خطیب بغدادیؒ نے حبان بن موسیٰؒ سے روایت کی ہے کہ بعض لوگوں نے ان سے شکایت کی کہ آپ اپنے اہل شہر پر اتنا مال تقسیم نہیں کرتے جتنا دوسرے شہروں میں تقسیم کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا:

"جن علماء و طلبہ پر میں اپنا مال خرچ کرتا ہوں، میں ان کے علم و فضل اور صدق و دیانت سے بخوبی واقف ہوں۔ یہ لوگ علم دین کی اشاعت و طلب میں لگے ہوئے ہیں۔ آخر ان کی ذاتی (خانگی) ضرورتیں بھی تو وہی ہیں جو دوسرے لوگوں کی ہیں۔ اگر یہ لوگ بھی اپنی ضروریات زندگی پوری کرنے میں لگ جائیں تو علم ضائع ہو جائے گا۔ اگر ہم نے انہیں فکر معاش سے بے نیاز کر دیا تو یہ یکسوئی کے ساتھ علم کی اشاعت کریں گے اور میرے نزدیک نبوت کے ختم ہونے کے بعد علم کی اشاعت سے افضل دوسرا کوئی کام نہیں ہے"۔

ایک مرتبہ ان سے کہا گیا کہ اہل علم (یعنی طالبین علم) کی ایک جماعت لوگوں سے اموال زکوٰۃ لیتی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ پھر ہم کیا کریں اگر ہم ان کو اس سے منع کر دیں تو وہ طلب علم سے رک جائیں گے جب کہ معاش کا کوئی ذریعہ ان کے پاس نہیں ہے اور اگر ہم ان کو اس کے لئے اجازت دے دیں تو وہ یکسوئی کے ساتھ حصول علم میں لگے رہیں گے اور یہ کام دوسرے سب کاموں سے افضل ہے۔

حجاج کی امداد: حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کا معمول تھا کہ جب حج کے لئے روانہ ہونے لگتے تو اپنے تمام رفقائے سفر سے فرماتے کہ تم لوگ اپنا اپنا سفر خرچ میرے پاس جمع کرا دو۔ جب وہ اپنی رقمیں ان کے حوالے کر دیتے تو وہ ہر ایک کی رقم کو الگ الگ تھیلیوں میں بند کر کے ہر تھیلی پر اس کے مالک کا نام لکھ دیتے پھر ان سب تھیلیوں کو ایک صندوق میں رکھ کر اس کو مقفل کر دیتے۔ پورے سفر میں جو کچھ خرچ ہوتا اس کو خود برداشت کرتے۔ ان لوگوں کو اچھے اچھے کھانے کھلاتے اور ہر طرح کی آسائشیں مہیا کرتے۔ فریضۂ حج سے فارغ ہونے کے بعد مدینہ منورہ پہنچتے تو ان سے پوچھ پوچھ کر سب کے اہل و عیال کے لئے حسب منشاء تحفے تحائف خرید کر دیتے۔ سفر حج ختم کر کے گھر واپس آتے تو

امراء و سلاطین سے ملنا ناپسند تھا بلکہ وہ اپنے احباب و اقرباء کو بھی اس سے منع کیا کرتے تھے۔ ان کے ایک نہایت عزیز دوست اور شاگرد اسماعیل بن علیہ تھے وہ بھی بہت بڑے عالم اور محدث تھے اور کاروبار میں بھی ان کے شریک تھے' انہوں نے بعض حاکموں اور امیروں کے پاس آنا جانا شروع کردیا۔ بعض روایتوں میں ہے کہ امراء و حکام کے ساتھ ان کا یہ اٹھنا بیٹھنا اس سبب سے تھا کہ انہوں نے زکوۃ و صدقات کی تحصیلداری کا عہدہ قبول کرلیا تھا۔ حضرت عبداللہ بن مبارک کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے سخت ناگواری کا اظہار کیا۔ ایک دن اسماعیل ان کی مجلس میں آئے تو ان سے مخاطب نہیں ہوئے۔ اسماعیل کو بہت رنج ہوا گھر جا کر ابن المبارک کی خدمت میں ایک خط لکھا جس میں ان کی بے توجہی اور ناراضی پر اپنے رنج و غم اور ندامت کا اظہار کیا اور نہایت لجاجت کے ساتھ ان کی ناراضی کا سبب دریافت کیا۔ اس خط کے جواب میں حضرت عبداللہ چند اشعار لکھ بھیجے جن کا مطلب یہ تھا:

"تم نے علم دین کو ایسا باز بنادیا ہے جو غریبوں کا مال سمیٹ کر کھا جاتا ہے تم نے دنیا اور اس کی لذتوں کے لئے ایسی تدبیر اختیار کی ہے جو تمہارے دین کو پھونک کر رکھ دے گی۔ تمہاری وہ روایتیں کیا ہوئیں جو تم خود بیان کیا کرتے تھے اور جن میں دنیادار حاکموں سے میل جول رکھنے کی وعید آئی ہے دیکھو دنیا پرست پادریوں کی طرح دین سے دنیا نہ کماؤ"۔ اسماعیل یہ اشعار پڑھ کر رونے لگے اور اسی وقت اپنے عہدے سے مستعفی ہوگئے۔

حضرت عبداللہ بن مبارک کے نزدیک علم دین کو دولت کمانے کا ذریعہ بنانا جائز نہیں تھا۔ اس لئے انہوں نے تجارت کو اپنا ذریعہ معاش بنایا تھا وہ عموماً خراسان سے قیمتی سامان لاتے اور حجاز میں فروخت کرتے تھے۔ اللہ نے تجارت میں خوب برکت دی تھی۔ لاکھوں ہی کماتے تھے اور لاکھوں ہی رضائے الٰہی کی خاطر کارہائے خیر میں صرف کرتے تھے۔ ان کی تجارت کا مقصد سرمایہ دار بن کر اپنی ذات کے لئے سامان عیش و راحت جمع کرنا نہیں تھا بلکہ اس ذریعے سے ایک تو وہ اپنی معیشت میں دوسروں کی دست نگری سے بے نیاز ہونا چاہتے تھے اور دوسرے مخلوق خدا کی خدمت کرنا چاہتے تھے۔ ایک مرتبہ ان کے شاگرد حضرت فضیل بن عیاض نے پوچھا حضرت آپ ہمیں تو نصیحت کرتے ہیں کہ دنیا میں دل نہ لگاؤ اور آخرت کی فکر کرو لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ آپ خود خراسان سے بیش قیمت سامان تجارت لاتے ہیں اور اسے بلد الحرام میں فروخت کرتے ہیں؟

فرمایا "اے ابو علی یہ میں اس لئے کرتا ہوں کہ مصائب سے بچ سکوں اور اپنی عزت و آبرو کی حفاظت کر سکوں اور اس کی مدد سے اللہ کی اطاعت زیادہ سے زیادہ کروں اور اللہ کی طرف سے اپنوں پرایوں کے جو حقوق مجھ پر عائد ہوتے ہیں ان کی طرف سبقت کرکے اچھی طرح ادا کر سکوں"۔ ایک اور موقع پر حضرت فضیل سے فرمایا "اگر تم اور تمہارے ساتھی نہ ہوتے تو میں تجارت کا کھکھیڑ نہ اٹھاتا"۔

حضرت ابن السارک کی آمدنی کے مصارف کی بڑی بڑی مدیں یہ تھیں:

1۔ مہمان نوازی: دسترخوان بہت وسیع تھا' سفر میں ہوں یا حضر میں مہمان نوازی کا خاص التزام تھا۔ دوست احباب ہوں یا اعزہ و اقارب' فقراء ہوں یا امراء' پڑوسی ہوں یا اجنبی' مسافر ہوں یا مقامی' ان کے دسترخوان پر

ھدیٰ اسلامی ڈائجسٹ کا
دین اور شریعت نمبر
دینِ اسلام میں تنگی نہیں آسانیاں ہیں
ہر مسلمان کی سماجی زندگی میں درپیش چھوٹے چھوٹے مسائل
سے لے کر عبادات کے بنیادی عقائد تک، ہر مسئلے کا
قرآن و حدیث کی روشنی میں انتہائی آسان الفاظ میں بیش بہا حل
پیدائش سے کفن دفن تک ہر مسلمان کی
ضرورت
دینِ اسلام کے بنیادی مسائل کے احکام ● ضروری اصطلاحات
● ارکان و عقائد اسلام کا بیان ● طہارت اور پاکی و ناپاکی کے
مسائل ● کلمہ، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کے مکمل احکامات
اس کے علاوہ
روزانہ پیش آنے والے ہر دینی مسئلے کا حل اور وہ سب کچھ جس کی
آپ ادارہ ھدیٰ سے توقع کر سکتے ہیں۔
پانچ سو کے لگ بھگ صفحات
ھدیہ صرف پچاس روپے
(محصول ڈاک علاوہ)
۶۵ روپے بذریعہ منی آرڈر بھیج کر منگایا جا سکتا ہے
مسند بقی طباعت گھر 3/45 جنگپورہ (بی) متھرا روڈ، نئی دہلی ۱۴ ۱۱۰۰

دوران میں مجوسی کی عبادت کا وقت آگیا۔ اس نے ان سے مہلت چاہی کہ میں عبادت سے فارغ ہو لوں اس کے بعد تم سے نبرد آزما ہوں گا۔ وہ مان گئے۔ مجوسی نے سورج کے سامنے سجدہ کیا تو ان کو سخت غصہ آیا اور اس کو قتل کرنا چاہا لیکن پھر حکم الٰہی کا خیال آیا کہ عہد کی باز پرس ہو گی تو ضبط سے کام لیا۔ مجوسی عبادت سے فارغ ہوا تو ان کی پاسداری عہد سے اتنا متاثر ہوا کہ اسی وقت حلقہ بگوش اسلام ہو گیا۔

دینی و دنیوی وجاہت اور جلالت قدر کے باوجود حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کی طبیعت میں عجز و انکسار اور فروتنی کا مادہ حد سے زیادہ تھا۔ اپنی تعریف سننا گوارا نہیں کرتے تھے اور اپنی تعظیم و تکریم کے مظاہرے بھی پسند نہ کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ابو وہب مروزی نے پوچھا کہ تکبر کی تعریف کیا ہے؟ فرمایا "تکبر یہ ہے کہ دوسروں کو حقیر اور خود کو باعزت سمجھا جائے"۔ پھر فرمایا "تکبر میں یہ بھی داخل ہے کہ تم اپنی کسی چیز کی نسبت یہ خیال کرو کہ یہ کسی اور کے پاس نہیں ہے"۔

فرمایا کرتے تھے "جس شخص نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس کی علامت یہ ہو گی کہ وہ اپنے آپ کو کتے سے بھی ذلیل سمجھنے لگا"۔

ایک مرتبہ کسی سبیل پر پانی پینے کے لئے گئے وہاں بھیڑ تھی لوگوں کا ریلا جو آیا تو دھکا لگنے سے دور جا گرے۔ جب وہاں سے واپس چلنے لگے تو حسنؒ سے جو ان کے ساتھ تھے کہنے لگے "زندگی ایسی ہی ہو کہ نہ لوگ ہمیں پہچانیں اور نہ ہماری توقیر کریں"۔

مرو میں ان کے پاس ایک وسیع مکان تھا جس میں ہر وقت عقیدت مندوں کا ہجوم رہتا ان کو یہ عقیدت پسندی ناپسند تھی کچھ عرصہ تو اسے برداشت کیا لیکن جب دیکھا کہ اس میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے تو مرو سے کوفہ چلے گئے اور وہاں ایک تنگ و تاریک مکان میں قیام پذیر ہوئے۔ لوگوں نے پوچھا حضرت اتنا کشادہ مکان چھوڑ کر اس تنگ و تاریک مکان میں رہنے سے آپ کی طبیعت نہیں گھبراتی؟ فرمایا لوگ عقیدت مندوں کے ہجوم میں رہنا پسند کرتے ہیں لیکن میں اس کو ناپسند کرتا ہوں اسی لئے تو مرو سے کوفہ بھاگ آیا ہوں۔

عام لوگوں کے ساتھ تو ان کے عجز و انکسار کی یہی کیفیت تھی لیکن حاکموں اور امیروں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے اور ان کے پاس جانا وقار علم کے منافی سمجھتے تھے۔ ابراہیم موصلی کا بیان ہے کہ خلیفہ ہارون الرشید عین ذربہ آیا تو اس نے دو تین مرتبہ عبداللہ بن مبارکؒ سے ملنے کی خواہش کی لیکن میں نے کسی نہ کسی حیلے سے ٹال دیا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ ان کے سامنے دین و شریعت کے خلاف کوئی بات ہو گی تو وہ خلیفہ کو سختی سے روکیں گے اور یہ بات اسے ناگوار گزرے گی۔ اتفاقاً ایک دن عبداللہ بن مبارکؒ خود ہی خلیفہ سے ملنے تشریف لے آئے۔ ملاقات کے بعد کسی نے ان سے پوچھا، آپ تو ہارون الرشید کی ملاقات سے گریز کرتے تھے اب کیسے آگئے؟ فرمایا میں اپنے دل کو موت پر راضی کرنا چاہتا تھا مگر وہ نہیں ہوتا تھا۔ اب جبکہ وہ راضی ہو گیا تو میں ہارون سے ملنے آگیا۔ گویا وہ ہارون الرشید کے سامنے حق گوئی سے باز نہیں رہ سکتے تھے اور اس کا نتیجہ ان کے قتل کی صورت میں بھی نکل سکتا تھا۔ جب ان کا نفس اپنی موت پر راضی ہو گیا تو وہ بے دھڑک خلیفہ کے پاس آگئے۔

کسی دنیوی غرض کے لئے تو حکمرانوں سے ان کے ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ان کو نہ صرف خود

بن عبدالعزیزؒ (تابعی) میں سے کون افضل ہے؟ ابن المبارکؒ نے جواب دیا واللہ وہ غبار راہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ہمرکابی میں حضرت معاویہؓ کی ناک میں داخل ہوا ہے وہ بھی عمر بن عبدالعزیزؒ پر ہزار درجہ فضیلت رکھتا ہے۔ حضرت معاویہؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی اقتدا میں نماز پڑھنے کا شرف حاصل ہوا ہے اور جب حضورؐ نے سمع اللہ لمن حمدہ فرمایا تو جواب میں حضرت معاویہؓ نے ربنا لک الحمد کہا ہے۔ کیا اس کے بعد بھی اس سوال کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ (وفیات الاعیان)

خشیت الٰہی کی یہ کیفیت تھی کہ ہر وقت اللہ کے خوف سے لرزاں و ترساں رہتے تھے۔ نعیم بن حمادؒ سے روایت ہے کہ جب وہ (اپنی تالیف) "کتاب الزہد و الرقائق" طلبہ کے سامنے پڑھتے تو ان پر سخت رقت طاری ہو جاتی تھی اور (جوش گریہ میں) ان کے منہ سے اس طرح آواز نکلتی تھی جیسے ذبح کی ہوئی گائے کے منہ سے۔ اس وقت وہ بات کرنے کے قابل نہیں رہتے تھے۔ (تاریخ خطیب بغدادی)

حضرت امام احمد بن حنبلؒ فرمایا کرتے تھے کہ عبداللہ بن مبارک کو اللہ تعالیٰ نے جو اونچا مرتبہ دیا وہ اس بناء پر تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے بہت زیادہ ڈرتے تھے۔ (صفوۃ الصوۃ ابن جوزی)

ابن المبارکؒ کے ایک ہمعصر عالم قاسم بن محمدؒ سے روایت ہے کہ میں اکثر سفر میں عبداللہ بن مبارک کے ساتھ رہتا تھا۔ کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا تھا کہ آخر ان میں وہ کون سی خوبی ہے جس کی بنا پر ان کی اتنی قدر ہے اور مخلوق خدا ان کی راہ میں آنکھیں بچھاتی ہے۔ نماز وہ بھی پڑھتے ہیں ہم بھی پڑھتے ہیں، روزہ وہ رکھتے ہیں تو ہم بھی رکھتے ہیں، وہ حج کو جاتے ہیں تو ہم بھی جاتے ہیں، وہ خدا کی راہ میں جہاد کرتے ہیں تو ہم بھی جہاد میں شریک ہوتے ہیں لیکن جہاں دیکھیں ہر ایک کی زبان پر عبداللہ بن مبارک ہی کا نام ہے۔

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ہم لوگ شام کی طرف سفر کر رہے تھے۔ راستے میں رات آگئی ایک جگہ قیام کیا۔ کھانے کے لئے جب سب دسترخوان پر بیٹھے تو اتفاقاً چراغ بجھ گیا اور اندھیرا ہو گیا۔ ایک آدمی نے چراغ جلایا۔ جب روشنی ہوئی تو کیا دیکھتا ہوں کہ عبداللہ بن مبارکؒ کی ڈاڑھی آنسوؤں سے تر ہے۔ میں سمجھ گیا کہ اندھیرے میں ان کو قبر کا اندھیرا یاد آگیا اور ان پر رقت طاری ہو گئی۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ یہی خوف خدا ان کے فضل و شرف کا باعث ہے۔ (صفوۃ الصفوۃ ابن جوزی)

ابن المبارکؒ اگر خالق اور مخلوق کے معاملہ میں انتہائی رقیق القلب تھے تو باطل کے مقابلے میں شیر ژیاں تھے۔ جب بھی موقع ملتا جہاد میں شریک ہوتے اور میدان جنگ میں شجاعت و بسالت کا حق ادا کر دیتے۔ ایک دفعہ کچھ لوگوں کو شبہ پیدا ہوا کہ وہ عزلت پسند ہیں اور جہاد سے کوئی رغبت نہیں رکھتے لیکن جب رومیوں کے خلاف ایک لڑائی میں ایک نقاب پوش مجاہد نے کئی رومیوں کو یکے بعد دیگرے ڈھیر کر دیا تو اس مجاہد کے چہرے سے کپڑا ہٹانے کے بعد وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ یہ مجاہد عبداللہ بن مبارکؒ تھے۔ اہل سیر کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہؒ اکثر مصیصہ اور طرطوس وغیرہ کا سفر کرتے تھے اور سفر محض شرکت جہاد کے لئے ہوا کرتا تھا۔

ایک دفعہ کسی مجوسی سے مقابلہ پیش آگیا۔ لڑائی کے

لیکن خدا کی قدرت، جس قدر بھی انہوں نے گمنام رہنے کی کوشش کی اسی قدر شہرت بڑھتی گئی اور وہ مرجع خلائق بن گئے۔

آج کل سفر کے لئے جس قدر آسانیاں اور سہولتیں میسر ہیں ابن المبارکؒ کے زمانے میں ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ آج جو سفر چند ساعتوں میں طے ہو جاتا ہے اس زمانے میں ہفتوں اور مہینوں میں طے ہوتا تھا اور پھر راستے میں جو دشواریاں اور مصیبتیں پیش آتی تھیں ان کی تفصیل جان کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کے لاتعداد سفروں پر نظر ڈالیں تو لامحالہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ان کی زندگی بالکل مجاہدانہ تھی کبھی مرو میں ہیں تو کبھی بغداد میں، کبھی بصرہ میں ہیں تو کبھی رقہ میں، کبھی شام میں ہیں تو کبھی مصر میں، کبھی حجاز میں ہیں تو کبھی یمن میں۔ انہوں نے تجارت میں لاکھوں روپے پیدا کئے اور لاکھوں ہی راہ خدا میں صرف کئے۔ فی الحقیقت ان کے سفر کا عنوان ''تجارت'' ہوتا تھا لیکن اس کی روح علمی افادہ و استفادہ اور مخلوق خدا کی خدمت ہوتی تھی۔

حضرت ابن المبارکؒ کے چند خاص تلامیذ اور رواۃ کے اسماء گرامی یہ ہیں ان میں ایسی عظیم المرتبت ہستیاں بھی ہیں جن کی روایات کو صحاح ستہ کے محدثین نے اپنی کتابوں میں درج کیا ہے اور ایسی بھی کہ جن کو درجۂ امامت حاصل ہوا اور خلق کثیر نے ان سے کسب فیض کیا۔

امام احمد بن حنبلؒ، یحییٰ بن معینؒ، فضیل بن عیاضؒ، اسحاق بن راہویہؒ، ابو داؤد الطیالسی، یحییٰ بن سعید القطانؒ، نعیم بن حماد الخزاعی مروزیؒ، محمد بن العلاء کوفی، ابو بکر بن عیاش، علی بن الحسن بن شقیق مروزی، سلیمان المروزی وغیرہ۔ ابن مبارکؒ کے رواۃ میں امام سفیان ثوریؒ، معمر بن راشدؒ، سفیان بن عینیہؒ، عبدالرحمٰن بن مہدی بصریؒ اور ابو اسحاق الفزاریؒ بھی شامل ہیں۔ یہ اصحاب ابن مبارکؒ کے استاد بھی تھے۔

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کے گلشن اخلاق میں خشیت الٰہی، شجاعت، شوق شہادت، تواضع و انکسار، جود و سخا، خدمت خلق، اکرام ضیف، رقت قلب، زہد و تقویٰ، عبادت و ریاضت، خودداری اور ارباب حکومت سے گریز، سب سے خوش رنگ پھول ہیں۔ ان کی سیرت و کردار میں صحابہ کرامؓ کی پر عظمت اور پاکیزہ زندگی کی جھلک نظر آتی تھی۔

حضرت سفیان بن عینیہؒ فرماتے ہیں:

''میں نے صحابہ کرامؓ کے حالات پر غور کیا اور عبداللہ بن المبارک کے حالات بھی دیکھے تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ صحابہ کرامؓ کو اس بناء پر ابن المبارکؒ پر فضیلت حاصل ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے جمال جہاں آرا سے اپنی آنکھیں روشن کیں اور آپؐ کی صحبت اور غزوات میں ہمرکابی کا شرف حاصل کیا۔ (تاریخ خطیب بغدادی)

گویا مخصوص فضائل کے سوا عادات و اخلاق میں ابن مبارکؒ صحابہ کرامؓ کا نمونہ تھے۔ فی الحقیقت ان کو صحابہ کرامؓ سے اس قدر عقیدت اور محبت تھی کہ اپنے طور طریقوں کو انہی کے سانچہ میں ڈھال لیا تھا۔ اصحابؓ رسولؐ کا ان کے نزدیک جو بلند مقام تھا اس کا اندازہ اس روایت سے کیا جا سکتا ہے جو ابن خلکانؒ نے ابو علی غسانی سے نقل کی ہے وہ کہتے ہیں کہ کسی نے ابن المبارکؒ سے پوچھا، حضرت معاویہؓ بن ابو سفیانؓ اور حضرت عمر

کرے)۔(تذکرۃ الحفاظ ذہبیؒ)

اپنے تبحر علمی اور زبردست قوت حافظہ کے باوجود اس قدر محتاط تھے کہ محض حافظہ سے روایت نہیں کرتے تھے بلکہ کتاب دیکھ کر بیان کرتے تھے۔ امام احمد بن حنبلؒ کا قول ہے "ابن المبارکؒ صاحب حدیث اور حافظ الحدیث تھے اور کتاب سے حدیث بیان کرتے تھے"۔(تہذیب التہذیب)

حدیث نبویؐ کا ان کے دل میں حد سے زیادہ احترام تھا۔ روایت و سماع کے خاص اوقات مقرر کر رکھے تھے۔ صرف سماع حدیث کے اہل حضرات کے سامنے ہی حدیث بیان کرتے تھے۔ وہ ایسی کسی بات کو برداشت نہیں کرتے تھے جس سے حدیث کی شان اور وقار میں ذرا بھی تخفیف کا پہلو نکلتا ہو۔ ایک مرتبہ ایک شخص طویل مسافت طے کر کے سماع حدیث کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور آتے ہی روایت حدیث کی درخواست کی۔ انہوں نے انکار کر دیا۔ اس نے اپنے ملازم سے کہا "چلو" اور سواری پر بیٹھ کر چلنے لگا۔ حضرت عبداللہ؟ نے فوراً اٹھ کر رکاب تھام لی۔ اس شخص نے کہا، آپ نے حدیث تو سنائی نہیں لیکن میری سواری کی رکاب تھام رہے ہیں۔ فرمایا، ہاں میں یہ بہتر سمجھتا ہوں کہ تمہارے لئے اپنی ذات کو ذلیل کر دوں لیکن حدیث نبویؐ کی توہین مجھے گوارا نہیں۔(تذکرۃ الحفاظ)

ایک اور موقع پر کسی شخص نے راستہ میں ان سے روایت حدیث کی درخواست کی۔ فرمایا "یہ موقع حدیث کی روایت و سماع کا نہیں ہے"۔(تبع تابعین)

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ اگرچہ علم و فضل کے بحر بے کراں بن گئے تھے لیکن ان کے سینے میں تحصیل علم کے شوق کی شمع عمر بھر فروزاں رہی۔ حافظ ابن عبدالبرؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ابن المبارکؒ سے پوچھا گیا کہ آپ کب تک علم حاصل کرتے رہیں گے تو انہوں نے جواب دیا "موت تک انشاء اللہ"۔

ایک اور موقع پر اسی قسم کے سوال کے جواب میں فرمایا "شاید وہ کلمہ اب تک میں نے نہ سنا ہو جو میرے کام آئے"۔(العلم والعلماء)

چنانچہ جہاں ایک دنیا ان کے خوان علم کی ریزہ چین تھی، وہ خود بھی زندگی کے کسی دور میں بھی دوسروں کے فیوض علمی سے بہرہ یاب ہونے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کی زندگی کا بیشتر حصہ سفروں میں گزرا۔ لڑکپن سے جوانی تک کے زمانے میں تحصیل علم کے سلسلے میں سفر کرتے رہے۔ اس کے بعد وہ اکثر تجارت، حج، جہاد فی سبیل اللہ، دعوت و تبلیغ اور ارشاد و اصلاح کے لئے پا بہ رکاب رہتے۔ یہی سبب تھا کہ وہ کسی خاص مقام پر مجلس درس قائم نہیں کر سکے لیکن ان کے کمالات علمی نے ایک دنیا کو مسخر کر لیا تھا۔ جہاں بھی جاتے لوگ جوق در جوق ان کے گرد جمع ہو جاتے اور مقدور بھر اکتساب فیض کرتے تھے۔ حافظ ذہبیؒ کا بیان ہے کہ ممالک اسلامیہ کے اس قدر لوگوں نے ان سے استفاضہ کیا کہ ان کا شمار کرنا ممکن نہیں۔

طبعاً شہرت سے متنفر تھے اور گمنام رہنا پسند کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اگر انہیں معلوم ہو جاتا کہ کسی شاگرد نے ان کا قول نقل کرتے ہوئے "قال عبداللہ بن المبارک" لکھا ہے تو اس کے پاس چاقو بھیجتے تھے کہ اس سے میرا نام اپنی تصنیف میں سے چھیل دو، میری کیا حقیقت ہے کہ کسی قول کو میری طرف منسوب کیا جائے

باہر نہیں تھا۔ حافظ ذہبیؒ نے "تذکرۃ الحفاظ" میں حسن بن محمدؒ سے روایت کی ہے کہ ابن مبارکؒ ایک دن امام سفیان ثوریؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو دیکھا کہ وہ شدت کرب سے کراہ رہے ہیں۔ دریافت کیا' آپ کو کیا تکلیف ہے؟ انہوں نے اپنے مرض کی کیفیت بیان کی۔ حضرت عبداللہؒ نے اسی وقت پیاز کی ایک گٹھی منگوائی اور اسے کاٹ کر حضرت سفیان ثوریؒ سے کہا اسے سونگھیے۔ انہوں نے تھوڑی دیر اس کو سونگھا تو ایک چھینک آئی اور طبیعت بالکل بحال ہو گئی۔ اس وقت حضرت امام ثوریؒ کی زبان پر بے ساختہ یہ الفاظ آگئے:

"سبحان اللہ! آپ فقیہ بھی ہیں اور طبیب بھی"۔

شعر و شاعری کا ذوق نہایت پاکیزہ تھا' خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں ان کے جو اشعار نقل کئے ہیں ان پر اخلاقی تعلیمات کی گہری چھاپ ہے۔

فقہ میں اتنا بلند مقام حاصل تھا کہ ان کی موجودگی میں بڑے بڑے علماء و فقہاء مسئلہ بتانے سے احتراز کرتے تھے۔ اگر فقہ و اجتہاد میں وہ اپنے جلیل القدر استاد حضرت امام ابوحنیفہؒ کے مرتبے کو نہیں پہنچے۔ تاہم امام مالکؒ' امام نوویؒ' امام ذہبیؒ' ابن حماد حنبلیؒ' ابن شماسؒ اور حافظ ابن حجرؒ سبھی نے ان کے تفقہ کا اعتراف کیا ہے۔

علم حدیث سے حضرت عبداللہؒ کو خاص شغف تھا۔ اسی لئے وہ ایک یگانہ ء روزگار محدث اور امام العصر تسلیم کئے گئے۔ علم حدیث میں ان کے مرتبہ کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ان کے ہم عصر محدثین میں اگر کسی حدیث کے بارے میں اختلاف ہوتا تو وہ فیصلہ کے لئے ان کی طرف رجوع کرتے کیونکہ تمام محدثین کے نزدیک ابن مبارکؒ حفظ حدیث کے اعتبار سے حکم فی الحدیث کی حیثیت رکھتے تھے۔ علم حدیث کے لئے جس قوت حافظہ کی ضرورت ہوتی ہے اللہ تعالیٰ نے ابن مبارکؒ کو اس سے حصہء وافر عطا فرمایا تھا۔ خطیب بغدادیؒ نے ان کے ایک دوست صخر کی زبانی اپنی تاریخ میں یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ میں اور ابن مبارکؒ نے ایک خطیب کا طویل خطبہ سنا۔ خطبہ ختم ہوا تو ابن مبارکؒ نے فرمایا مجھ کو یہ تمام خطبہ یاد ہو گیا۔ پھر انہوں نے ایک شخص کی فرمائش پر اسی وقت وہ تمام خطبہ شروع سے اخیر تک سنا دیا۔

حافظ ذہبیؒ کا بیان ہے کہ ایک دن عشاء کی نماز کے بعد علی بن الحسن بن شقیق سے ایک حدیث کے بارے میں گفتگو چھڑ گئی۔ ساری رات اسی گفتگو میں مسجد کے دروازے پر کھڑے کھڑے گزر گئی لیکن ابن السبارکؒ کو احساس بھی نہ ہوا۔ (تذکرۃ الحفاظ)

امام احمد بن حنبلؒ کا قول ہے کہ ابن السبارکؒ صاحب الحدیث اور حافظ الحدیث تھے۔ (تہذیب التہذیب ابن حجرؒ)

حدیث سے اپنے والہانہ شغف کی بناء پر گھر سے بہت کم باہر نکلتے تھے۔ نعیم بن حمادؒ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ کسی نے پوچھا' آپ کو مکان میں ہر وقت تنہا بیٹھے رہنے سے وحشت نہیں ہوتی؟ فرمایا وحشت کیسے ہو سکتی ہے جب کہ اس تنہائی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہؓ کے فیض صحبت سے شرف یاب ہوتا ہوں"۔ (تاریخ بغداد خطیب بغدادی)

کتب حدیث میں حضرت ابن السبارکؒ سے مروی روایات کی تعداد بیس ہزار کے لگ بھگ ہے۔ اپنی روایات کے بارے میں اسناد کا خاص خیال رکھتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ روایت کو ہر مرحلہ میں ثقہ عن ثقہ ہونا چاہئے (یعنی معتبر شخص' معتبر شخص سے روایت

بسم اللہ الرحمن الرحیم
یا ودود یا حی، یا قیوم ایاک نعبد وایاک نستعین
ھدیٰ اسلامی ڈائجسٹ نئی دہلی کا
دیدارِ نبی ﷺ
نمبر
خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات وہدایات کا شرف
اور جمال مصطفیٰ کا نظارہ کرنے والوں کے ہزاروں پاکیزہ واقعات
• رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال سے آج تک چودہ سو سال میں سیکڑوں کتابوں کے مطالعے کے بعد ہزاروں خواب مع حوالہ جات
• وہ برگزیدہ بندے جنہوں نے آپ کی زیارت بابرکت کی • زیارت نبی بحالت بیداری کی سچی روایات • ممتاز اور منفرد مقام حاصل کرنے والے خوش نصیب
• نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خواب میں فرمودہ درجنوں ارشادات جو آپ کی زیارت کا باعث اور سیکڑوں بیماریوں سے شفا اور ہزاروں مصیبت زدگان کی مشکل کشائی کا سبب بنے • ہمارے نبی زندہ نبی
• سیرت النبی بعد از وصال النبی پر درجنوں مضامین
اور وہ سب کچھ جو ھدیٰ کے نمبروں کی خصوصیات ہیں
پانچ سو کے لگ بھگ صفحات — ھدیہ صرف پچاس روپے علاوہ محصول ڈاک
حسین وخوبصورت نقش، طغرے اور ہفت رنگ لیمینیشن شدہ سرورق
۶۵ روپے بذریعہ منی آرڈر بھیج کر براہ راست منگایا جاسکتا ہے
صدیقی طباعت گھر 3/45 جنگپورہ (بی) مہتمرا روڈ، نئی دہلی ۱۴۰۰۱۴

سرداروں میں سے ایک سردار تھے (سید المسلمین)۔
(تاریخ خطیب بغدادی)

علامہ ابن سعدؒ لکھتے ہیں: "ابن المبارکؒ نے علم کی تحصیل کا حق ادا کر دیا۔ کثیر روایات بیان کیں، علم کے مختلف ابواب و اقسام پر متعدد کتابیں تصنیف کیں، زہد اور ترغیب جہاد میں اشعار کہے۔ وہ معتبر تھے، مقتداء تھے، حجت تھے، کثیر الحدیث تھے اور اس قابل تھے کہ ان کے قول کو سند تسلیم کیا جائے"۔(تہذیب الاسماء)

حسن بن عیسیٰؒ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ علماء کے ایک اجتماع میں حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کے اوصاف و خصائل کا ذکر چھڑ گیا تو سب نے بالاتفاق تسلیم کیا کہ وہ ایک جامع الصفات ہستی ہیں، علم دین، فقہ، ادب، نحو، لغت، شعر، فصاحت، زہد، تقویٰ، کم گوئی، قیام اللیل، عبادت، حج، جہاد، شہسواری، شجاعت، صحتمندی، شتوری، کم آمیزی اور مہمل گوئی سے اجتناب وغیرہ صفات ان کی ذات میں جمع ہو گئی تھیں۔(تذکرۃ الحفاظ)

غرض حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کے ہمعصر اور بعد کے علماء سلف سبھی نے ان کے کمالات علمی اور سیرت و کردار کی بڑے موثر الفاظ میں تعریف و توصیف کی ہے۔ ابن مبارکؒ کے ہمعصر علماء جن میں سے بعض امام وقت تھے، نہ صرف ان کی تعریف زبان سے کرتے تھے بلکہ عملی طور پر بھی ان کی بے حد تعظیم و تکریم کرتے تھے۔

یحییٰ بن یحییٰ اندلسیؒ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ ہم امام مالک بن انسؒ کی مجلس میں بیٹھے تھے کہ ابن المبارکؒ تشریف لائے۔ امام مالکؒ جو کبھی کسی کے لئے نہ اٹھتے تھے اور نہ اپنی نشست تبدیل کرتے تھے، اٹھ بیٹھے اور اپنی نشست بدل کر ابن المبارک کو اپنے پاس بٹھا لیا۔
(تہذیب التہذیب ابن حجر)

حافظ ذہبیؒ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ امام مالک بن انسؒ حدیث کا درس دے رہے تھے۔ اتفاق سے عبداللہ بن مبارکؒ بھی پہنچ گئے۔ ایک شاگرد پڑھتا جاتا تھا۔ دوران درس میں کئی مقامات ایسے آئے جہاں امام مالکؒ نے ابن المبارکؒ سے مخاطب ہو کر فرمایا، اس مسئلہ کے بارے میں آپ لوگوں یعنی اہل خراسان کے پاس کوئی حدیث یا اثر ہو تو پیش کیجئے۔ ابن المبارکؒ غایت احترام میں اور ازراہ حسن ادب بہت آہستہ آہستہ جواب دیتے رہے۔ امام مالکؒ کو ان کا حسن ادب اور انداز تکلم بہت پسند آیا۔ جب وہ چلے گئے تو انہوں نے اہل مجلس سے مخاطب ہو کر فرمایا "یہ عبداللہ بن مبارکؒ خراسان کے فقیہہ ہیں"۔(تذکرۃ الحفاظ)

احمد بن سنانؒ سے روایت ہے کہ عبداللہ بن مبارکؒ پہلی مرتبہ حماد بن زیدؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے دریافت کیا، آپ کہاں سے آ رہے ہیں؟ جواب دیا، خراسان سے۔ پوچھا، خراسان کے کس شہر سے؟ عرض کیا، مرو سے۔ اب حمادؒ نے پوچھا، وہاں کے ایک صاحب عبداللہ بن المبارک کو بھی آپ جانتے ہیں؟ عرض کیا، جانتا ہوں۔ پوچھا وہ کیسے ہیں؟ بولے، عبداللہ بن مبارکؒ ہی تو اس وقت آپ کے سامنے حاضر ہے۔ حمادؒ یہ سن کر بے قرار ہو گئے۔ سلام کیا اور مرحبا کہتے ہوئے گلے لگا لیا۔(تاریخ خطیب بغدادی)

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ قرآن، حدیث، فقہ، سیرت و مغازی اور دوسرے دینی علوم کے علاوہ دنیوی علوم، زبان و ادب، نحو و بلاغت، لغت و شاعری وغیرہ کے بھی بحر زخار تھے۔ گویا ان کی ذات دینی و دنیوی علوم کی جامع تھی۔ یہاں تک کہ علم طب بھی ان کی دسترس سے

میں امام اوزاعیؒ کے غائبانہ غلط فہمی کو نہایت خوبصورت انداز سے دور کر دیا اور پھر امام اوزاعیؒ کے فیضان علمی سے بھی خوب بہرہ یاب ہوئے۔

اللہ تعالٰی نے حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کو غیر معمولی قوت حافظہ عطا کی تھی اور وہ نہایت ذہین اور ذکی تھے۔ اپنے بے پناہ شوق علم، محنت، جستجو، قوت حافظہ، ذہانت، ذکاوت اور بڑے بڑے ائمہء عصر کے فیض صحبت کی بدولت چند سال کے اندر اندر وہ مسند علم و فن کے صدر نشین بن گئے۔ یہاں تک کہ ان کے شیوخ اور اساتذہ نے بھی ان کے کمالات علمی کا برملا اعتراف کیا۔

امام سفیان ثوریؒ سے ایک مرتبہ کسی خراسانی نے کوئی مسئلہ پوچھا۔ انہوں نے فرمایا تمہارے پاس مشرق و مغرب کے سب سے بڑے عالم عبداللہ بن مبارک موجود ہیں ان سے کیوں دریافت نہیں کرتے؟

ایک اور روایت میں ہے کہ کسی شخص نے امام سفیان ثوریؒ کے سامنے حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کو "یاعالم المشرق" کہہ کر خطاب کیا۔ امام سفیان ثوریؒ نے فرمایا کہ کیا کہہ رہے ہو وہ تو "عالم المشرق والمغرب" ہیں۔ (خطیب بغدادی)۔

عبداللہ بن سنانؒ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ مکہ معظمہ سے روانہ ہوئے تو حضرت سفیان بن عینیہؒ اور حضرت فضیل بن عیاضؒ ان کو رخصت کرنے دور تک ساتھ گئے۔ اثنائے راہ میں ان میں سے ایک نے کہا، یہ فقیہ اہل مشرق ہیں تو دوسرے نے ٹوکتے ہوئے کہا "اہل مشرق ہی کے نہیں، مغرب کے بھی فقیہ ہیں"۔ (تذکرۃ الحفاظ۔ ذہبیؒ)

ابن حبانؒ کا قول ہے کہ ابن مبارکؒ میں اہل علم کے اتنے خصائل جمع ہو گئے تھے کہ ان کے عہد میں تمام کرۂ ارض پر کسی میں مجتمع نہیں ہوئے تھے۔ (تہذیب التہذیب۔ ابن حجرؒ)

علی بن المدینیؒ، عثمان بن طالوتؒ سے روایت کرتے ہیں کہ کمال علم دو آدمیوں پر ختم ہو گیا، عبداللہ بن ملکؒ اور یحییٰ بن معینؒ پر۔ (تاریخ خطیب بغدادی)۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں "عبداللہ بن مبارکؒ کی امامت و جلالت پر سب کا اتفاق ہے وہ تمام چیزوں میں امام تھے۔ ان کے ذکر سے نزول رحمت ہوتا تھا اور ان کی محبت کی وجہ سے بخشش کی امید کی جاتی تھی"۔ (تہذیب الاسماء جلد ۱)

امام ذہبیؒ ان کا تعارف یوں کراتے ہیں "ابن المبارکؒ امام، حافظ، علامہ، شیخ الاسلام، فخر المجاہدین اور قدوۃ الزاہدین تھے"۔ (تذکرۃ الحفاظ)

اسماعیل بن عیاشؒ فرماتے ہیں "روئے زمین پر ابن المبارکؒ کی مثل موجود نہیں"۔

امام نسائیؒ کا قول ہے کہ میں ابن المبارک کے زمانے میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا جو مرتبے میں ان سے زیادہ ہو اور جس کے اندر تمام خصائل حمیدہ اس جامعیت کے ساتھ پائے جاتے ہوں۔

امام مالک بن انسؒ فرمایا کرتے تھے "ابن المبارک خراسان کے فقیہ ہیں" ابو اسحاق الفزاریؒ کا قول ہے "حضرت عبداللہ بن مبارکؒ تمام مسلمانوں کے امام ہیں"۔ (تاریخ خطیب بغدادی)

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں "ابن المبارکؒ ماہر حدیث اور حافظ الحدیث تھے"۔ (تہذیب التہذیب)

یحییٰ بن معینؒ کے سامنے کسی نے حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کا ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا "وہ مسلمانوں کے

سعید بن ابی عروبہ مہران بصریؒ، حماد بن سلمہؒ، ابن ابی ذیبؒ، صالح بن صالحؒ، عمرو بن میمون جرزیؒ، معمر بن راشد بصریؒ، عبداللہ بن عون بصریؒ، ابوالصلت زائدہ بن قدامہ کوفیؒ، برید بن عبداللہ بن ابی بردہ بن ابی موسیٰ شعریؒ، عاصم بن سلمان الاحولؒ، داؤد بن قیس فرا قرشی مدنیؒ، ابوسعید ابراہیم بن طہمان خراسانیؒ، زکریا بن ابی زائدہ کوفیؒ وغیرہم۔

امام ابوحنیفہؒ اور امام سفیان ثوریؒ سے ابن مبارکؒ کو بے حد عقیدت و محبت تھی۔ حافظ ابن حجرؒ نے "تہذیب التہذیب" میں ان کا یہ قول نقل کیا ہے:

"اگر اللہ تعالیٰ امام ابوحنیفہؒ اور سفیان ثوریؒ کے ذریعہ میری مدد نہ کرتا تو میں عام آدمیوں کی طرح ہوتا"۔

حافظ ذہبیؒ نے بھی "مناقب" میں حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کا اسی سے ملتا جلتا قول نقل کیا ہے البتہ اس میں "تو میں عام آدمیوں کی طرح ہوتا" (کنت کسائر الناس) کے بجائے "تو میں ایک بدعتی شخص ہوتا" (کنت بدعیا) کے الفاظ ہیں۔

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ، امام ابوحنیفہؒ کا ذکر ہمیشہ بڑے احترام اور عقیدت سے کرتے۔ انہوں نے ان کی شان میں بہت سے اشعار بھی کہے۔ (تاریخ بغداد خطیب بغدادی)

حافظ ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ ابن مبارکؒ نے حضرت امام ابوحنیفہؒ کے چشمۂ علم سے پوری طرح سیراب ہونے کے بعد امام سفیان ثوریؒ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ اس ضمن میں انہوں نے خود حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کا یہ قول نقل کیا ہے:

"میں سفیان ثوریؒ کے ساتھ اس وقت تک وابستہ نہیں ہوا جب تک میں نے امام ابوحنیفہؒ کے علوم پر پوری دسترس حاصل نہ کرلی" (دسترس کی وضاحت انہوں نے ہاتھ کی مٹھی بند کر کے کی)۔

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ تحصیل علم کے سلسلے میں امام اوزاعیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو عجیب واقعہ پیش آیا۔ علامہ خطیب بغدادیؒ نے اسے "تاریخ بغداد" میں "ابن مبارکؒ" کی زبانی یوں نقل کیا ہے:

"میں طلب علم کے لئے شام گیا اور بیروت (جو اس زمانے میں شام کا ایک حصہ تھا) جا کر امام اوزاعیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا اے خراسانی! کوفہ میں یہ کون بدعتی ابوحنیفہ نامی پیدا ہوا ہے؟ یہ سن کر میں گھر واپس آیا، امام ابوحنیفہؒ کی کتابیں نکالیں اور ان میں سے چیدہ چیدہ مسائل چھانٹ کر نکالے (اور انہیں ایک کتاب کی صورت میں مرتب کیا) اس میں تین دن لگ گئے۔ تیسرے روز یہ کتاب ہاتھ میں لئے ان کے پاس پھر گیا۔ وہ مسجد کے موذن بھی تھے اور امام بھی۔ میرے ہاتھ میں کتاب دیکھ کر کہا یہ کیا ہے؟ میں نے عرض کیا، یہ لیجئے ملاحظہ فرمایئے۔ انہوں نے ایک مسئلہ پر نظر ڈالی جس پر لکھا تھا" قال النعمان" اذان کہہ کر کھڑے کھڑے کتاب کا پہلا حصہ پڑھ لیا۔ پڑھ کر کتاب آستین میں رکھ لی۔ پھر تکبیر کہہ کر نماز پڑھی۔ نماز سے فارغ ہو کر کتاب نکالی اور سب پڑھ لی۔ اس کے بعد مجھ سے دریافت فرمایا "اے خراسانی! یہ نعمان بن ثابت کون ہیں؟" میں نے کہا ایک شیخ ہیں، عراق میں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ امام اوزاعیؒ نے فرمایا "بڑی شان کے شیخ ہیں، جاؤ اور ان سے بہت سا فیض حاصل کرو"۔ میں نے کہا یہ وہی ابوحنیفہ ہیں جن سے مجھ کو آپ نے روکا تھا۔

اس طرح ابن مبارکؒ نے امام ابوحنیفہؒ کے بارے

بہتر کوئی شخص نظر نہیں آتا"۔

بیوی نے پہلے تو مبارک کے افلاس اور کم حیثیتی کا عذر پیش کیا لیکن بالآخر وہ بھی شوہر سے متفق ہو گئی اور اپنی بیٹی کی شادی مبارک سے کردی ساتھ ہی انہوں نے مبارک کو آزاد کر دیا۔

حضرت عبداللہ اسی رئیس زادی کے بطن اور مبارک جیسے صاحب تقویٰ باپ کی صلب سے 118ھ میں مرو (Merv) میں پیدا ہوئے اور اسی نسبت سے مروزی مشہور ہوئے۔

حضرت عبداللہؒ کے والد مبارکؒ بن واضح نہ صرف ایک متقی آدمی تھے بلکہ علم کی قدر و قیمت سے بھی بخوبی آشنا تھے۔ انہوں نے اپنے فرزند دلبند کی تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام کیا اور پوری کوشش کی کہ ان کا بیٹا علم کے آسمان پر سورج بن کر چمکے۔ اس وقت صحابہ کرامؓ کا دور گزر چکا تھا البتہ ہزاروں تابعین و تبع تابعین اور دوسرے ارباب علم و فضل دنیائے اسلام کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے تھے۔ کوئی معروف شہر اور قصبہ ایسا نہیں تھا جو اہل فضل و کمال سے خالی ہو۔ حضرت عبداللہ مبارک کی ابتدائی تعلیم و تربیت مرو میں ہوئی۔ اس کے بعد وہ حصول علم کے لئے مرو سے نکلے اور سالہا سال تک شہر شہر اور قصبہ قصبہ میں گھوم پھر کر جواہر علم اپنے دامن میں سمیٹتے رہے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے فاصلہ دیکھا نہ اس زمانے کے سفر کی صعوبتیں، جہاں بھی کسی صاحب علم کا پتہ چلا اس کی خدمت میں پہنچے اور مقدور بھر اکتساب فیض کیا۔ امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں:

"ابن المبارکؒ کے زمانے میں ان سے زیادہ علم کا حریص اور علم کی جستجو کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ طلب علم کے لئے انہوں نے دور دراز ملکوں اور شہروں کا سفر کیا تھا مثلاً شام، عراق، یمن، مصر، کوفہ و بصرہ وغیرہ"۔

حضرت ابو اسامہ گواہی دیتے ہیں کہ:

"میں نے عبداللہ بن مبارکؒ سے بڑھ کر کسی کو ملک در ملک گھوم کر طلب علم کرنے والا نہیں دیکھا"۔ (تذکرۃ الحفاظ، حافظ ذہبیؒ)

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ لکھتے ہیں:

"ابن مبارکؒ کے دور میں ان سے زیادہ علم کی تلاش کرنے والا کوئی دوسرا نہیں تھا"۔ (تہذیب التہذیب)

حافظ ذہبی فرماتے ہیں:

"تحصیل علم کے شوق میں عبداللہ بن مبارکؒ کو اپنی حیثیت کی پروا بھی نہیں ہوتی تھی۔ وہ اپنے سے چھوٹے اور فروتر لوگوں سے بھی معلومات حاصل کرتے تھے"۔ (تہذیب الاسماء)

خود حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کا بیان ہے کہ "میں نے (مختلف دیار و امصار) کے چار ہزار شیوخ و اساتذہ سے کسب فیض کیا ان میں سے ایک ہزار کی روایتوں کو میں نے لکھ لیا ہے"۔

حضرت عبداللہ بن مبارک نے جن شیوخ اساتذہ سے جملہ دینی علوم حاصل کئے ان میں سرفہرست حضرت امام اعظم حضرت ابو حنیفہؒ، حضرت امام سفیان ثوریؒ اور حضرت امام اوزاعیؒ ہیں۔ دوسرے شیوخ اساتذہ میں سے چند کے اسماء گرامی یہ ہیں:

امام مالک بن انس مدنیؒ، امام اعمشؒ، ہشام بن عروہؒ، حمید بن ابی حمید الطویلؒ، موسیٰ بن عقبہ صاحب المغازیؒ، یحییٰ بن سعید الانصاریؒ، سلیمان التیمیؒ، عبدالرحمٰن بن یزیدؒ، اسماعیل بن ابی خالد الحمسیؒ، سفیان بن عینیہؒ، لیث بن سعدؒ، مسعر بن کدام کوفیؒ، شعبہ بن حجاجؒ، ابن جریجؒ،

شاہی محل (قصر الخشب) کے برج سے یہ نظارہ دیکھا تو ملازموں سے پوچھا یہ اژدھام کیسا ہے؟ انہوں نے بتایا کہ خراسان کے ایک عالم آرہے ہیں جن کا نام عبداللہ بن مبارک ہے یہ سب لوگ ان کے استقبال میں ایک دوسرے پر بازی لے جانے کے لئے کشمکش کر رہے ہیں۔

بے ساختہ بولی "واللہ بادشاہ تو حقیقت میں یہ ہیں۔ بھلا ہارون الرشید کیا بادشاہ ہے جو لوگوں کو سپاہیوں، چوبداروں کو کوڑوں اور ڈنڈوں کی مدد سے اپنے گرد جمع کرتا ہے"۔

حضرت ابو عبدالرحمٰن عبداللہ بن مبارک" تبع تابعین کی اس مقدس جماعت کے گل سرسبد ہیں جس کا ہر فرد اپنی ذات میں دین کا ستون اور زمانہ کا امام تھا۔ ان کے والد مبارک بن واضح ترک، بنو حنظلہ کے ایک رئیس کے غلام تھے۔ وہ نہایت ہی نیک اور دیندار آدمی تھے اور زہد و تقویٰ، دیانت و امانت اور خوف خدا کے اعتبار سے فی الواقع اسم با مسمیٰ تھے۔ حنظلی رئیس نے اپنے باغ کی نگرانی ان کے سپرد کر رکھی تھی۔ ایک مرتبہ اس نے مبارک کو حکم دیا کہ باغ سے ایک شیریں انار توڑ کر لاؤ۔ وہ گئے اور ایک انار لا کر پیش کر دیا۔ مالک نے اسے چیر کر چکھا تو ترش نکلا۔ اس نے خفا ہو کر کہا میں نے میٹھا انار مانگا، تم نے کھٹا لا کر دے دیا جاؤ کوئی اچھا سا شیریں انار لاؤ۔ وہ گئے اور دوسرے درخت کا انار لا کر پیش کیا۔ بد قسمتی سے وہ بھی کھٹا نکلا۔ آقا کا غصہ اب اور بھڑک اٹھا اور اس نے انہیں ڈانٹتے ہوئے تیسری مرتبہ پھر میٹھا انار لانے کے لئے بھیجا۔ اب کی بار بھی انار ترش نکلا تو اس نے برافروختہ ہو کر کہا "کیا تمہاری قوت ذائقہ ترش و شیریں کی تمیز نہیں کر سکتی؟" مبارک نے کہا "نہیں"۔ آقا نے سبب پوچھا تو انہوں نے کہا "آپ نے مجھے انار کھانے کی اجازت نہیں دی ہے اس لئے میں نے آج تک باغ کے کسی انار کو چکھا تک نہیں۔ میرا کام تو باغ کی دیکھ بھال کرنا ہے اس سے کوئی غرض نہیں کہ کس درخت کے انار میٹھے ہیں اور کس کے کھٹے"۔

آقا نے اپنے طور پر حالات کی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ مبارک نے جو کچھ کہا تھا وہ بالکل صحیح تھا۔ اسے ان کی غیر معمولی دیانتداری اور خوف خدا پر بڑی حیرت ہوئی اور وہ ان کی بہت عزت و تکریم کرنے لگا۔

اس رئیس کی ایک ناکتخدا لڑکی تھی جس کے لئے اونچے اونچے گھرانوں کی طرف سے پیغام پر پیغام آرہے تھے۔ دنیاوی ثروت کے لحاظ سے پیغام دینے والوں میں ایک سے ایک بڑھ کر تھا اس لئے رئیس فیصلہ نہیں کر پاتا تھا کہ کون سا پیغام قبول کرے اور کونسا رد کرے۔ اسی شش و پنج میں ایک دن اس نے مبارک سے بھی اس بارے میں مشورہ کیا۔ انہوں نے بڑے اخلاص کے ساتھ کہا کہ:

"زمانہء جاہلیت میں لوگ اعلیٰ حسب نسب والا داماد تلاش کرتے تھے۔ یہودیوں کے نزدیک داماد کے لئے مالدار ہونا ضروری تھا اور عیسائی حسن و جمال کو اہمیت دیتے تھے لیکن امت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوۃ والسلام کے نزدیک دیندار ہونا وجہ ترجیح ہے۔ آپ جو طریقہ مناسب سمجھیں اختیار کریں"۔

آقا کو مبارک کا یہ مخلصانہ مشورہ بے حد پسند آیا۔ اس مشورے پر غور و فکر کے بعد ایک دن اس نے اپنی بیوی سے کہا:

"مجھے اپنی لخت جگر کا شوہر بننے کے لئے مبارک سے

عاشقِ امام ابو حنیفہؒ

حضرت عبداللہ بن مبارک مروزی

طالب ہاشمی

خلیفہ ہارون الرشید عباسی (170ھ تا 193ھ) کے عہد میں مسلمانوں اور رومیوں کے درمیان سرحدوں پر وقتاً فوقتاً معرکہ آرائی ہوتی رہتی تھی۔ ایک دفعہ ایسے ہی ایک معرکے میں رومی اور اسلامی لشکر ایک دوسرے کے مقابل ہوئے تو رومی لشکر سے ایک زرہ پوش جنگجو نے اپنی صف سے نکل کر مسلمانوں کو مقابلے کے لئے للکارا۔ اسلامی لشکر سے ایک مجاہد، جس نے اپنے چہرے پر ڈھاٹا باندھ رکھا تھا، جھپٹ کر اس کی طرف بڑھا اور ایک ہی وار میں رومی جنگجو کا کام تمام کر دیا۔ پھر ایک اور رومی سپاہی بنکارتا ہوا میدان میں آیا۔ نقاب پوش مجاہد نے اس کو بھی ڈھیر کر دیا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے کئی رومی جنگجو مقابلہ میں آئے اور نقاب پوش مجاہد نے اپنی تلوار یا نیزے کے وار سے سب کو جہنم رسید کر دیا۔ مسلمانوں نے فرط

مسرت میں نعرۂ تکبیر بلند کیا اور دوڑ کر اس مجاہد کو
کے لئے گھیر لیا کہ آخر یہ شیر بیشۂ شجاعت کو
جس کو اپنی شناخت کرانا بھی پسند نہیں۔ انہوں
زور اور اصرار سے اس کے چہرے سے ڈھاٹا
دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ وہ کوئی عام لشکری نہیں
علم و فضل کے مجمع البحرین فقیہ المشرق والمغرب
عبداللہ بن مبارکؒ تھے ——— وہی عبداللہ بن
جن کے فضل و کمال کے تمام دنیائے اسلام میں
رہے تھے اور جن کے مرجوعۂ خلائق ہو
کیفیت تھی کہ ایک دفعہ رقہ تشریف لے گئے تو
لوگ استقبال کے لئے دیوانہ وار اٹھ دوڑے،
ہنگامہ ہوا کہ لوگوں کی جوتیاں ٹوٹ گئیں اور
غبار آلود ہو گئی۔ اتفاق سے خلیفہ ہارون الرشید
دنوں رقہ آیا ہوا تھا۔ اس کے حرم کی ایک خا

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم، یا ودود، یا حی، یا قیوم، ایاك نعبد و ایاك نستعین

اسلامی ڈائجسٹ **ھدیٰ** نئی دھلی کے اولیاء اللّٰہ نمبروں

جلد اوّل | جلد دوئم | جلد سوئم | جلد چہارم | جلد پنجم | جلد ششم

اور جلد ھفتم کے بعد

عظیم اولیاء اللّٰہ نمبر جلد ہشتم

بزرگوں کی تحقیق کا نچوڑ، اولیاء اللّٰہ، مشائخ، صوفیاء اور برگزیدہ ہستیوں کے ایمان افروز واقعات، تذکرے جو پچھلے نمبروں میں شامل نہ ہوسکے تھے۔

بغداد سے لے کر ھندوستان کے گوشے گوشے تك اولیاء اللّٰہ کے عظیم اور طویل داستانیں

اولیاء اللّٰہ کی ایمان افروز کرامتیں، معمولات اور وہ سب کچھ جس کی آپ ادارہ ھدیٰ سے توقع کرسکتے ھیں

پچھلے نمبروں کی طرح حسین و خوبصورت، نفیس طرز طباعت [illegible]

باوجود بے شمار خصائص و فضائل کے

ہدیہ صرف پچاس روپے

(محصول ڈاک کے علاوہ)

۶۵ روپے کا منی آرڈر بھیج کر بذریعہ رجسٹری ڈاک براہِ راست منگایا جاسکتا ہے

صدیقی طباعت گھر: 3/45 جنگ پورہ (بی) متھرا روڈ، نئی دہلی 110014

اصول بن گیا۔ اگرچہ افسوس ہے کہ اس پر عمل کم کیا گیا اور تکفیر کے غلغلے اب بھی پست نہ ہوئے۔

اہلِ قبلہ سب مومن ہیں

امام صاحب کی یہ رائے بہت غور و تحقیق و تجربہ کے بعد قائم ہوئی، بڑے بڑے مشہور بانیان مذہب انہی کے زمانے میں پیدا ہوئے تھے اور امام صاحب کو ان سے ملنے کا موقع حاصل ہوا تھا۔ خارجیوں کا صدر مقام بصرہ تھا جو امام صاحب کے شہر سے نہایت قریب تھا۔ واصل بن عطاء و عمرو بن عبید جو مذہب اعتزال کے بانی اور مروج تھے، بصرہ ہی کے رہنے والے اور امام صاحب کے ہم عصر تھے، جہم بن صفوان جس کے نام پر فرقہ جہمیہ مشہور ہے۔ اسی زمانہ میں تھا۔ امام صاحب ان میں سے اکثروں سے ملے اور ان کے خیالات سے مطلع ہوئے۔ ان فرقوں کی نسبت جو اقوال مشہور تھے کچھ تو سرے سے غلط اور افترا تھے، بعض کی تعبیر غلط طور پر کی گئی تھی، بعض در اصل لغو و باطل تھے، لیکن کفر کی حد تک نہ پہنچے تھے۔ اس لیے امام ابو حنیفہؒ نے یہ عام حکم دیا کہ "اہلِ قبلہ سب مومن ہیں۔" وہ دیکھ رہے تھے کہ جن مسائل پر قیامتیں برپا ہیں، جو کفر و اسلام کی معیار قرار دی گئی ہیں وہ صرف لفظی بحثیں اور فرضی اصطلاحیں ہیں۔ سب سے بڑا مسئلہ قِدمِ قرآن کا تھا۔ جن کو لوگوں نے کلمہ توحید کے برابر قرار دیا تھا۔ بڑے بڑے علماء کا قول ہے کہ اسلام کو دو شخصوں نے نہایت نازک وقتوں میں محفوظ رکھا، حضرت ابو بکر صدیقؓ جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد مرتدین عرب کا استیصال کیا اور امام احمد بن حنبل جو مامون رشید کے زمانے میں حدوثِ قرآن کے منکر رہے بلکہ ایک اعتبار سے امام احمد بن حنبل کو ترجیح ہے کیونکہ صحابہ حضرت ابو بکرؓ کے معاون اور انصار تھے لیکن امام احمد کا کوئی مددگار نہ تھا۔

(تحریر: رئیس الدین احمد جعفری)

کے بعد اسلام میں اس کی بہت کم نظیریں ملتی ہیں۔ اسلام کو کسی چیز نے ان مشاجرات سے زیادہ نقصان نہیں پہنچایا جو اختلافِ آراء کی بناپر قائم ہو گئے ان اختلافات کی بنیاد اگر چہ خود صحابہ کے زمانے سے شروع ہو چکی تھی۔ عبداللہ بن عباسؓ اور بہت سے صحابہ کا اعتقاد تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے معراج میں خدا کو آنکھوں سے دیکھا، حضرت عائشہؓ نہایت اصرار سے اس کے مخالف تھیں، امیر معاویہؓ کو معراج جسمانی سے انکار تھا۔ حضرت عائشہ سماع موتی کی قائل نہ تھیں، لیکن اس زمانہ تک ان اختلافات پر ہدایت و گمراہی کا مدار نہ تھا جو لوگ مختلف رائیں رکھتے تھے ان میں بھی کسی نے کسی کی تکفیر یا تفسیق نہیں کی۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے ایک شخص نے پوچھا کہ کچھ لوگ پیدا ہوئے ہیں جو غلط تاویل کرتے ہیں اور ہم کو کافر قرار دیتے ہیں وہ خود کافر ہیں یا نہیں؟ حضرت عبداللہؓ نے فرمایا کہ اس وقت تک کوئی شخص کافر نہیں ہو سکتا جب تک خدا کو دو نہ کہے۔ صحابہ کے بعد یہ اختلافات زور پکڑتے گئے اور رفتہ رفتہ مستقل فرقے قائم ہو گئے۔ اعتقادی اور فقہی مسائل اکثر ایسے ہیں جن میں نص قاطع موجود نہیں اور ہیں تو متعارض ہیں۔ اس لیے استنباط اور رفع تعارض کی ضرورت نے اجتہاد کو بہت وسعت دی اور سینکڑوں رائیں قائم ہو گئیں۔ بے شبہ ان میں بہت سی رائیں صحیح نہیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ سب کفر ہوں۔

افسوس ہے کہ سرگرم طبیعتیں جو مذہبی جوش اور تقدس کے نشہ میں سرشار تھیں۔ اختلاف رائے کے صدمہ کی تاب نہ لا سکیں اور نہایت بے صبری سے مخالفت پر آمادہ ہو گئیں، بات بات پر کفر کے فتوے ہونے لگے، جو لوگ جس قدر زیادہ مذہبی حرارت رکھتے تھے اسی قدر کفر کے اطلاق میں کم احتیاط کرتے تھے، رفتہ رفتہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ ہر فریق نے دوسرے کی ضلالت و گمراہی ثابت کرنے کے لیے موضوع روایتوں سے اعانت لی اور اس قسم کی حدیثیں ایجاد ہونے لگیں کہ میری امت میں ۷۲ فرقے پیدا ہوں گے جن میں صرف ایک جنتی ہوگا باقی سب دوزخی۔ اس فرضی تعداد کو بھی تھوڑا کرنا ضرور تھا اس لیے کھینچ تان کر ۷۳ فرقے قرار دیے اور سب کے الگ الگ نام رکھے اس پر بھی تسکین نہ ہوئی تو ہر ہر فرقے کے لیے جدا جدا روایتیں گھڑیں مثلاً القدرية مجوس هذه الامة وغیرہ وغیرہ

تکفیر نہیں کرتے تھے

ان تعصبات اور جھگڑوں نے جماعت اسلامی کے تمام اجزاء پراگندہ کر دیے اور مذہب، اخلاق، حکومت، تمدن، معاشرت کا سب نقشہ بگڑ گیا۔ اس عالم گیر آشوب میں صرف ایک امام ابو حنیفہ تھے جن کی صدا سب سے الگ تھی اور جو پکار کر کہتے "لا نکفر من اهل القبله یعنی ہم اہل قبلہ میں سے کسی کی تکفیر نہیں کرتے۔ اس وقت تو اس صدا پر چنداں توجہ نہیں ہوئی لیکن زمانہ جس قدر ترقی کرتا گیا اس جملہ کی قدر بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ وہ علم کلام کا ایک بیش بہا

ہے جو شخص اعمال کا پابند ہے وہ زیادہ مومن ہے جو گناہگار ہے وہ کم مومن ہے۔ محدثین صراحتہً اس کے مدعی ہیں اور اس پر دلیلیں لاتے ہیں علامہ قسطلانی صحیح بخاری کی شرح میں لکھتے ہیں فاعلم ان الایمان یزید بالطاعات و ینقص بالمعصیہ یعنی ایمان ثواب کا کام کرنے سے زیادہ ہوتا ہے اور گناہ کرنے سے گھٹ جاتا ہے۔ اور محدثین نے بھی جابجا اس کی تصریح کی ہے۔ امام ابو حنیفہؒ اس اعتبار سے ایمان کی زیادت و نقصان کے منکر تھے، ان کے نزدیک جب اعمال جزوِ ایمان نہیں تو اعمال کی کمی بیشی سے ایمان میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ اور یہ بالکل صحیح ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ ابو بکرؓ کو تم لوگوں پر جو ترجیح ہے وہ صوم و صلوٰۃ کی وجہ سے نہیں بلکہ اس چیز کی وجہ سے ہے جو اس کے دل میں ہے غرضیکہ امام صاحب کا دعویٰ نہیں ہے کہ ایمان بلحاظ کیفیت یعنی شدت و ضعف کے زیادہ یا کم نہیں ہو سکتا بلکہ ان کا یہ دعویٰ ہے کہ ایمان مقدار کے اعتبار سے کم و بیش نہیں ہوتا۔ یہ دعویٰ اس بات کی فرع ہے کہ اعمال جزو ایمان نہیں ہیں اور اس کو ہم ابھی ثابت کر چکے ہیں۔

ایمان میں سب برابر ہیں

امام صاحب اس بات کے بھی قائل ہیں کہ مطلق ایمان میں کچھ تفاوت نہیں ہے یعنی معتقدات کے لحاظ سے سب مسلمان برابر ہیں۔ ایمان کے لیے جن مسائل پر اعتقاد رکھنا ضروری ہے وہ سب کے لیے یکساں ہیں۔ صحابہ اور عام مسلمان اس لحاظ سے برابر ہیں کہ دونوں ایک ہی چیز یعنی توحید و نبوت کا اعتقاد رکھتے ہیں۔ فرق ہے تو اعتقاد کی شدت اور ضعف میں ہے اسی مطلب کو امام صاحب نے عثمان بتی کے جواب میں ان الفاظ سے بیان کیا ہے کہ دین احدی السماء والارض یعنی آسمان و زمین والوں کا ایک ہی دین ہے۔ پھر اس دعویٰ پر آیت قرآنی سے استدلال کیا ہے شرع لکم من الدین ما وصینا به نوحا یعنی ہم نے تمہارے لیے وہی دین شروع کیا جس کی وصیت نوح کو کی تھی۔

مخالفین نے بڑے زور شور سے امام صاحب پر الزام لگایا ہے کہ وہ اس بات کے قائل تھے کہ میرا ایمان اور ابو بکر صدیقؓ کا ایمان برابر ہے اگرچہ امام صاحب کی طرف اس قول کی اسناد ثابت نہیں لیکن اگر ثابت ہو تو کیا نقصان ہے جس اعتبار سے وہ مساوات کے مدعی ہیں اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ تعجب اور سخت تعجب ہے کہ ایسا صاف مسئلہ معترضوں کی سمجھ میں نہ آیا۔ خطیب بغدادی نے صفحے صفحے سیاہ کر دیے اور یہ نہ سمجھے کہ امام صاحب کا دعویٰ کیا ہے۔ ان کو یہ الفاظ نہایت گراں گزرتے ہیں کہ ہمارا اور صحابہ کا ایمان برابر ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ بہت سی چیزوں میں ہم اور صحابہ برابر ہیں تاہم ہم میں اور صحابہ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

اگرچہ اس قسم کے تمام مسائل میں امام صاحب اپنی خاص رائیں رکھتے تھے لیکن وہ مخالف راویوں پر کفر و فسق کا الزام نہیں لگاتے تھے، فیاض دلی امام صاحب کا خاصہ ہے اور قرن اول

ہیں اور فرائض کے ترک سے کافر نہیں ہو سکتے جو شخص ایمان کے تمام فرائض بجالاتا ہے وہ مومن اور جنتی ہے جو ایمان اور اعمال دونوں کا تارک ہے وہ کافر اور دوزخی ہے، جو شخص ایمان رکھتا ہے اور فرائض اس سے ترک ہو جاتے ہیں وہ مسلمان ضرور ہے لیکن گنہگار مسلمان ہے۔ خدا کو اختیار ہے اس پر عذاب کرے یا معاف کردے۔"

امام صاحب نے جس خوبی سے اس دعوے کو ثابت کیا ہے انصاف یہ ہے کہ اس سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا، فرائض اور ایمان کے باہمی امتیاز کی اس سے عمدہ تر کیا دلیل ہو گی کہ آغاز اسلام میں ایمان کی دعوت ہوتی تھی اور فرائض کا وجود نہ تھا۔ امام صاحب نے قرآن کی جو آیتیں استدلال میں پیش کی ہیں ان سے بداہتہً ثابت ہوتا ہے کہ دونوں دو چیزیں ہیں کیونکہ ان تمام آیتوں میں عمل کو، ایمان پر معطوف کیا ہے اور ظاہر ہے کہ جزو کل پر معطوف نہیں ہو سکتا من یومن باللہ فیعمل صالحاً میں حرف تعقیب آیا ہے جس سے اس بحث کا قطعی فیصلہ ہو جاتا ہے۔

ان دلائل قاطعہ کے مقابلے میں دوسری طرف بعض اور حدیثیں ہیں لیکن ان میں سے کوئی اثباتِ مدعا کے لیے کافی نہیں، بڑا استدلال اس حدیث پر ہے کہ مومن ہو کر زنا اور چوری نہیں کرتا۔ حالانکہ یہ کلام کے زور دینے کا ایک پیرایہ ہے۔ ہم اپنی زبان میں کہتے ہیں کہ بھلا آدمی ہو کر تو ایسا کام نہیں کر سکتا جس کا صرف یہ مطلب ہوتا ہے کہ وہ کام شان شرافت کے خلاف ہے۔ بے شبہ زنا اور سرقہ بھی ایمان کی شان کے خلاف ہیں اور حدیث کا مقصد اسی قدر ہے۔ ورنہ ابو ذرؓ کی حدیث میں صراحتہً یہ الفاظ موجود ہیں کہ جو شخص لا الہ الا اللہ کا قائل ہے جنت میں جائیگا گو زانی اور چور ہو۔

ایمان کم اور زیادہ نہیں

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ الایمان لا یزید ولا ینقص یعنی ایمان کم و بیش نہیں ہو سکتا، بے شبہ یہ امام صاحب کا قول ہے لیکن اس کی تعبیر میں لوگوں نے غلطی کی ہے، نہ صرف محدثین اور شافعیہ نے بلکہ خود احناف نے بھی۔ ایمان کی کمی و زیادتی دو لحاظ سے ہو سکتی ہے۔ ایک اس اعتبار سے کہ وہ مقولہ کیف سے ہے جس میں شدت اور ضعف ممکن ہے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ ایمان یقین کا نام ہے اور یقین کے مراتب متضاد ہوتے ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب خدا سے کہا کہ "اے خدا تو مُردوں کو کیونکر جلاتا ہے۔" تو ارشاد ہوا" ولم یومن یعنی کیا اب تک تجھ کو یقین نہیں آیا۔" عرض کیا کہ "یقین ضرور ہے لیکن لیطمئن قلبی اور زیادہ اطمینان خاطر چاہتا ہوں۔" خدا نے متعدد آیتوں میں تصریح کر دی ہے کہ ایمان میں ترقی ہوتی ہے وزادھم ایمانا اس مسئلے میں نص صریح ہے لیکن امام ابو حنیفہ کو بلحاظ اس معنی کے نہ انکار ہے نہ یہ امر اس وقت زیر بحث تھا امام صاحب کے دعویٰ کا اور منشاء ہے اور وہ بالکل صحیح ہے جن لوگوں نے عمل کو جزو ایمان قرار دیا، ان کا مذہب ہے کہ ایمان بلحاظ مقدار کے زیادہ کم ہوتا

لوگوں کو اس بات کی طرف دعوت دی کہ خدا کو ایک مانیں اور رسول اللہ (ﷺ) جو کچھ لائے ہیں اس کو تسلیم کریں۔ پس جو شخص اسلام میں داخل ہوتا تھا اور جو ایمان لا چکے تھے فرائض کے احکام اس کو تسلیم کریں۔ پس جو شخص اسلام میں داخل ہوتا تھا اور شرک چھوڑ دیتا تھا اس کی جان اور مال حرام ہو جاتا تھا۔ پھر خاص ان لوگوں کے لیے جو ایمان لا چکے تھے فرائض کے احکام آئے، اس کا پابند ہونا عمل ٹھہرا اور خدا نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ الذین آمنو و عملو ا الصالحات. ومن یومن باللہ و یعمل صالحا اس قسم کی اور آیتیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ عمل کے نہ ہونے سے ایمان نہیں جاتا رہتا البتہ اگر تصدیق واعتقاد نہ ہو تو مومن کا اطلاق نہیں ہو سکتا، عمل و تصدیق کا دو جداگانہ چیز ہونا اس سے بھی ظاہر ہے کہ تصدیق کے لحاظ سے سب مسلمان برابر ہیں، لیکن اعمال کے لحاظ سے مراتب میں فرق ہوتا ہے کیونکہ دین و مذہب سب کا ایک ہی ہے خدا نے خود کہا ہے شرع لکم عن الذین ما وصیٰ به نوحاً و الذی اوحینا الیك وما وصیٰ به ابراهیم و موسیٰ و عیسیٰ ان اقیمو الدین فتنفرقوا فیهم یعنی تمہارے لیے اسی دین کو مشروع کیا جس کی وصیت نوح کو کی تھی اور جو تجھ پر وحی بھیجی اور جس کی وصیت ابراہیم و موسیٰ و عیسیٰ کو ملی وہ یہ ہے کہ دین کو قائم رکھو اور اس میں متفرق نہ ہو۔"

آپ کو جاننا چاہیے کہ تصدیق میں ہدایت اور اعمال میں ہدایت یہ دونوں دو چیزیں ہیں، آپ ایک شخص کو جو فرائض سے ناواقف ہو مومن کہہ سکتے ہیں پس ایسا شخص فرائض کے لحاظ سے جاہل اور تصدیق کے لحاظ سے مومن ہے۔ خود خدا نے قرآن پاک میں یہ اطلاقات کیے ہیں کیا آپ اس شخص کو جو خدا اور رسول خدا کے پہچاننے میں گمراہ ہوا اس شخص کے برابر قرار دیں گے جو مومن ہو لیکن اعمال سے ناواقف ہو، خدا نے جہاں فرائض بتائے ہیں اس موقع پر ارشاد فرمایا ہے یبین اللہ لکم ان تضلوا (یعنی خدا نے اس لیے بیان کیا کہ تم گمراہ نہ ہو) دوسری آیت میں ہے ان تضل احدٰهما فتذکر احدٰهما الاخریٰ (یعنی ایک بھول جائے تو دوسرا یاد دلائے) حضرت موسیٰ کی زبان سے فرمایا "میں نے جب وہ کام کیا تب میں گمراہ تھا۔" ان آیتوں کے علاوہ اور بہت سی آیتیں ہیں جو اس دعوے کے ثبوت کے لیے دلائل قاطعہ ہیں اور حدیثیں تو اور بھی واضح اور صاف ہیں۔ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ امیر المومنین کے لقب سے پکارے جاتے تھے، تو کیا اس کے یہ معنے تھے کہ وہ صرف ان لوگوں کے امیر تھے جو فرائض اور اعمال کے پابند تھے۔ حضرت علیؓ نے شام والوں کو جو ان سے لڑتے تھے مومن کہا، کیا قتل سے بڑھ کر کوئی گناہ ہے، پھر جو لوگ قتل کے مرتکب ہوئے، کیا آپ قاتلین اور مقتولین دونوں کو برسر حق قرار دیتے ہیں۔ اگر آپ صرف ایک (یعنی حضرت علیؓ اور طرفداران علیؓ کو برسر حق تسلیم کریں گے تو دوسرے فریق کو کیا کہیں گے اس کو خوب سمجھ لیجیے۔ میرا یہ قول ہے کہ اہل قبلہ سب مومن

مرتکب کبائر کو کافر سمجھتے ہیں۔ اگر چہ اکثر محدثین ایسے شخص کو کافر نہیں سمجھتے تھے لیکن یہ نہ سمجھنا اس وجہ سے تھا کہ وہ لزوم سے ناواقف تھا حالانکہ لزوم قطعی اور یقینی ہے جس سے انکار نہیں ہو سکتا۔

امام رازی نے جو امام شافعی کے بہت بڑے حامی ہیں کتاب مناقب الشافعی میں لکھا ہے کہ لوگوں نے امام شافعی پر یہ اعتراض کیا ہے کہ وہ متناقض باتوں کے قائل ہیں کیونکہ ایک طرف تو وہ یہ کہتے ہیں کہ ایمان تصدیق و عمل کے مجموعہ کا نام ہے ساتھ ہی اس بات کے بھی قائل ہیں کہ ترکِ عمل سے کوئی شخص کافر نہیں ہوتا۔ حالانکہ مرکب چیز کا جب ایک جزو نہ رہا تو وہ مرکب بھی من حیث المرکب نہ رہا اسی لیے معتزلہ جو اس بات کے قائل ہیں کہ عمل نہ ہو تو ایمان بھی نہیں، لیکن امام شافعی کی طرف سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اصل ایمان اقرار اور اعتقاد کا نام ہے، باقی رہے اعمال تو وہ ایمان کے ثمرات اور توابع ہیں، لیکن چونکہ توابع پر بھی کبھی کبھی مجازاً اصل شے کا اطلاق ہوتا ہے، اس لیے مجازاً اعمال پر بھی ایمان کا اطلاق ہوا اور یہ مسلم ہے کہ توابع کے فوت ہونے سے اصل شے فوت نہیں ہوتی۔

لیکن یہ جواب توجیه القول بما لا یرضی به قائله ہے اور خود امام رازی کو اس کا اعتراف کرنا پڑا۔ چنانچہ جواب کے بعد فرماتے ہیں کہ فيه ترك لهذا المذهب یعنی اس جواب سے یہ مذہب ترک ہوا جاتا ہے۔ امام رازی گو شافعی المذہب اور اپنے امام کے نہایت طرفدار ہیں لیکن چونکہ صاحب نظر اور نکتہ شناس ہیں ان کو تسلیم کرنا پڑا کہ یا عمل کو ایمان کے توابع سے شمار کرنا چاہیے یا مان لینا چاہیے کہ جو شخص پابند عمل نہیں مومن بھی نہیں۔

اس بحث کے متعلق امام ابو حنیفہ کی ایک تحریر موجود ہے جس کی طرز استدلال و استنباطِ نتائج سے امام صاحب کی دقتِ نظر کا اندازہ ہو سکتا ہے اور اصل مسئلہ کی حقیقت کھلتی ہے اس لیے اس موقع پر ہم اس کا حوالہ دینا مناسب سمجھتے ہیں۔ یہ تحریر عثمان بتی کے ایک خط کا جواب ہے جو انہوں نے امام صاحب کو لکھا تھا۔ عثمان اس زمانہ کے ایک مشہور محدث تھے، عام لوگوں میں جب امام ابو حنیفہ کے ان خیالات کے چرچے ہوئے تو انہوں نے امام صاحب کو ایک دوستانہ خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا کہ لوگ آپ کو مرجیہ کہتے ہیں اور بیان کرتے ہیں کہ آپ مومن کا ضال (گمراہ) ہونا جائز قرار دیتے ہیں، مجھ کو ان باتوں کے سننے سے نہایت رنج ہوتا ہے کیا یہ باتیں صحیح ہیں؟ اس خط کے جواب میں امام صاحب نے ایک طولانی خط لکھا ہے جس کے فقرے ہم کہیں کہیں سے انتخاب کرتے ہیں حمد و صلوٰۃ کے بعد عثمان بتی کی دوستانہ اور خیر خواہی کا شکریہ ادا کر کے اصل مضمون اس طرح شروع کیا:

امام صاحب کی تحریر

میں آپ کو بتاتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کے مبعوث ہونے سے پہلے تمام لوگ مشرک تھے، رسول اللہ ﷺ جب مبعوث ہوئے تو

بھی مطابق تھا۔ انہی مسائل میں ایمان و عمل کا بھی مسئلہ تھا۔ مرجیہ کا مذہب ہے کہ ایمانو عمل دو مختلف چیزیں ہیں اور ایمان اور تصدق کامل ہو تو عمل کا نہ ہونا کچھ ضرر نہیں کرتا۔ ایک شخص اگر دل سے توحید و نبوت کا معترف ہے اور فرائض نہیں ادا کرتا تو وہ مواخذہ سے بری ہے۔ اس رائے کا پہلا حصہ گو صحیح تھا مگر محدثین نے کچھ تفریق نہ کی اور کلیۃً اس مذہب کے مخالف ہو گئے۔ چونکہ قرآن کی بعض آیتیں بھی بظاہر اس کے موئد تھیں۔ ان کی رائے کو اور بھی قوت و شدت ہو گئی، یہ ایک اجتہاد رائے تھا اور یہیں تک رہتا تو چنداں مضائقہ نہ تھا لیکن افسوس یہ ہے کہ ان بزرگوں نے یہاں تک شدت کی کہ جو شخص ان کی رائے کے ساتھ متفق نہ ہوتا تھا اس کو فاسق یا کافر سمجھتے تھے۔ قاضی ابو یوسف ایک بار شریک کی عدالت میں گواہ ہو کر گئے تو انہوں نے کہا میں اس شخص کی شہادت قبول نہیں کرتا جس کا یہ قول ہو کہ نماز جزوِ ایمان نہیں۔

ایمان اور عمل دو جداگانہ چیزیں

امام ابو حنیفہ کو اس سے کچھ بحث نہ تھی کہ یہ مسئلہ فلاں شخص یا فلاں فرد کا ہے وہ در اصل حقیقت کو دیکھتے تھے اور مغز سخن کو پہنچتے تھے۔ جب یہ بحث ان کے سامنے پیش کی گئی تو انہوں نے علانیہ کہا کہ "ایمان اور عمل دو جداگانہ چیزیں ہیں اور دونوں کا حکم مختلف ہے۔" اس پر بہت سے لوگوں نے انہیں بھی مرجیہ کہا لیکن وہ ایسا مرجیہ ہونا خود پسند کرتے تھے۔ محدثین اور فقہا میں سے جو لوگ امام صاحب کے ہم زبان تھے ان کو بھی یہی خطابت عنایت ہوا۔

جو لوگ مرجیہ کہلائے

محدث ابن قتیبہ نے اپنی مشہور اور مستند کتاب "المعارف" میں مرجیہ کے عنوان سے بہت سے فقہاء اور محدثین کے نام گنائے ہیں جن میں سے چند یہ ہیں: ابراہیم تیمی، عمرو بن مرہ، طلق الجیب، حماد بن سلیمان، عبد العزیز بن ابی داؤد، خارجہ بن مصعب، عمرو بن قیس الاصر، ابو معاویہ الضریر، یحیٰ ابن زکریا، مسعر بن کدام وغیرہ حالانکہ ان میں سے اکثر حدیث و روایت کے امام ہیں اور صحیح بخاری و مسلم میں ان لوگوں کی سینکڑوں روایتیں موجود ہیں۔ ہمارے زمانے میں بعض کوتاہ بین جو اس پر غش ہیں کہ امام صاحب کو بعض محدثین نے مرجیہ کہا ہے، ابن قتیبہ کی فہرست دیکھتے تو شاید ان کو ندامت ہوتی۔ محدث ذہبی نے میزان الاعتدال میں مسعر بن کدام کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ ارجا (مرجیہ ہونا) بہت سے علمائے کبار کا مذہب ہے اور اس مذہب کے قائل پر مواخذہ نہ کرنا چاہیے، یہ اسی کی طرف اشارہ ہے جو امام ابو حنیفہ کا مذہب تھا۔

یہ مسئلہ اگرچہ بظاہر چنداں مہتم بالشان نہ تھا لیکن اس کے نتائج بہت بڑا اثر رکھتے تھے، اسی لحاظ سے امام صاحب نے نہایت آزادی سے اس کا اظہار کیا، عمل کو جزو ایمان قرار دینا اس بات کو مستلزم ہے کہ جو شخص اعمال کا پابند نہ ہو وہ مومن بھی نہ ہو۔ جیسا کہ خارجیوں کا مذہب ہے جو

ہوتا۔ دوسری تیسری بلکہ چوتھی صدی کی تصنیفات میں اس کتاب کا پتہ نہیں چلتا، قدیم سے قدیم تصنیف جس میں اس رسالہ کا ذکر کیا گیا ہے (جہاں تک ہم کو معلوم ہے) فخر الاسلام بزودی کی کتاب الاصول ہے جو پانچویں صدی کی تصنیف ہے۔ امام ابو حنیفہ کے ہزاروں شاگرد تھے جن میں سے اکثر بجائے خود استاد تھے اور واسطہ در واسطہ ان کے ہزاروں لاکھوں شاگرد ہوئے، نہایت خلاف قیاس ہے کہ امام صاحب کی کوئی تصنیف ہوتی اور اتنے بڑے گروہ میں اس کا نام تک نہ لیا جاتا۔ علم عقائد اور اس کے متعلقات پر بڑی بڑی کتابیں مثلاً صحائف، شروح مقاصد، شرح مواقف، ملل و نحل وغیرہ تصنیف ہوئیں ان میں کہیں اس کا ذکر تک نہیں ہے۔ اس کتاب کی جس قدر شرحیں ہوئیں سب آٹھویں صدی میں یا اس کے بعد ہوئیں، اس کے علاوہ ابو مطیع بلخی جو اس کتاب کے راوی ہیں۔ حدیث و روایت میں چنداں مستند نہیں ہیں۔ کتب رجال میں ان کی نسبت محدثین نے نہایت سخت ریمارک کیے ہیں۔ اگرچہ میں ان کو کلیۃً تسلیم نہیں کرتا تاہم ایک ایسی مشتبہ کتاب جس کا ثبوت صرف ابو مطیع بلخی کی روایت پر منحصر ہو محدثانہ اصول پر قابل تسلیم نہیں ہو سکتی۔

اعمال جزو ایمان نہیں

صحابہ کے زمانہ تک اسلامی عقائد کی سطح نہایت ہموار اور متحرک رہی۔ اہل عرب کو موشگافیوں اور باریک بینیوں سے سروکار نہ تھا،

بنو امیہ کے وسط زمانے میں جب فوجی قوت کو زوال ہوا تو تمدن و معاشرت کی وسعت نے اور قسم کے اشغال پیدا کر دیے۔ جبر و قدر، تشبیہ و تنزیہ، عدل و جور کی بحثیں چھڑ گئیں، ان بحثوں کی ابتدا ان لوگوں نے کی جو عجم کی خاک سے تھے۔ ان پر عجم کا پر تو پڑا تھا۔ چونکہ یہ نامانوس صدائیں تھیں ان باتوں پر مذہبی گروہ میں جو زیادہ تر عرب سے تعلق رکھتا تھا برہمی پیدا ہو گئی۔ اور محدثین و فقہا نہایت سختی سے بدعتیوں کے مقابلے کو اٹھے۔ اس مقابلے کی بناء پر ان بزرگوں کو خود بھی ان مسائل میں نفی یا اثبات کا پہلو اختیار کرنا پڑا لیکن جوش مخالفت نے اکثروں کو اعتدال کی حد پر نہ رہنے دیا، معتزلہ کا مذہب تھا کہ قرآن مجید خدا کا ایک جدید کلام ہے جو رسول اللہ کی نبوت کے ساتھ وجود میں آیا، لوگوں نے اس کی یہاں تک مخالفت کی کہ بعض محدثین نے تلفظ بالقرآن کو بھی قدیم ٹھہرایا، امام ذہلی جو امام بخاری کے اساتذہ میں سے تھے اور صحیح بخاری سے ایسے ناراض ہوئے کہ ان کو حلقۂ درس سے نکلوا دیا اور عام حکم دے دیا کہ جو شخص بخاری کے پاس آمد و رفت رکھے وہ ہمارے حلقہ میں نہ آنے پائے۔ امام بخاری خود قرآن کے قدم کے قائل تھے۔ لیکن قرأت کو حادث کہتے تھے۔ ذہلی کو اصرار تھا یہ بھی قدیم ہیں۔

اور مسائل میں بھی اس قسم کی بے اعتدالیاں ہوئیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ امام ابو حنیفہ نے ان تمام بحثوں میں وہی پہلو اختیار کیا جو مغز سخن تھا اور جو عقل کے ساتھ نقل کے

امام صاحب کی طرف جو کتابیں منسوب ہیں ان کے نام یہ ہیں: فقہ اکبر، العالم والمتعلم، مسند وغیرہ۔

فقہ اکبر

عقائد کا ایک مختصر رسالہ ہے۔ مسائل اور ترتیب قریب قریب وہی ہے جو عقائد نسفی وغیرہ کی ہے۔ یہ رسالہ چھپ گیا ہے اور ہر جگہ مل سکتا ہے۔ لوگوں نے اس پر شرحیں لکھی ہیں۔ مثلاً محی الدین بن بہاء الدین المتوفی ۹۳۵ء، مولیٰ الیاس بن ابراہیم السنوبی، مولیٰ احمد بن محمد للعتساوی، حکیم اسحاق شیخ اکمل الدین، ملا علی قاری۔ ملا علی قاری کی شرح متداول ہے۔ بعض اور شرحوں کے نسخے بھی جابجا قلمی پائے جاتے ہیں۔ حکیم اسحاق کی شرح کو ابو البقاء احمدی نے ۹۱۸ء میں نظم کیا۔ اور اصل کتاب کو ابراہیم بن حسام نے جو شریفی کے نام سے مشہور ہیں۔

العالم والمتعلم

العالم والمتعلم سوال وجواب کے طور پر ایک مختصر سا رسالہ ہے لیکن ہماری نظر سے نہیں گزری۔

فقہ اکبر

فقہ اکبر کو اگرچہ فخر الاسلام بزودی، عبد العلی بحر العلوم وشارحین فقہ اکبر نے امام صاحب کی طرف منسوب کیا ہے۔ لیکن ہم مشکل سے اس پر یقین کر سکتے ہیں۔ یہ کتاب جس زمانے کی تصنیف بیان کی جاتی ہے اس وقت تک یہ طرزِ تحریر پیدا نہیں ہوا تھا۔ وہ بطور ایک متن کے ہے اور اس اختصار اور ترتیب کے ساتھ لکھی گئی ہے جو متأخرین کا خاص انداز ہے۔ ایک جگہ اس میں جوہر وعرض کا لفظ آیا ہے۔ حالانکہ یہ فلسفیانہ الفاظ اس وقت تک زبان میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ بے شبہ منصور عباسی کے زمانے میں فلسفہ کی کتابیں یونانی زبان سے عربی میں ترجمہ کی گئی تھیں، لیکن یہ زمانہ امام صاحب کی آخری زندگی کا زمانہ ہے۔ کسی طرف قیاس نہیں کیا جا سکتا کہ ترجمہ ہوتے ہی یہ الفاظ اس قدر جلد شائع ہو جائیں کہ عام تصنیفات میں ان کا رواج ہو جائے۔ فلسفہ کے الفاظ نے مذہبی دائرہ میں اس وقت پایا ہے جب کثرتِ استعمال کی وجہ سے وہ زبان کا جز بن گئے۔ اور عام بول چال میں بھی ان کے استعمال کے بغیر چارہ نہ رہا۔ لیکن یہ دور امام صاحب کے زمانہ کے بعد شروع ہوتا ہے۔

یہ بحث تو درایت کی حیثیت سے تھی۔ اصول روایت کے لحاظ سے بھی یہ امر ثابت نہیں

جبرئیل (علیہ السلام) میرے پاس آئے اور مجھ سے یوں کہا "کیا آپ کو اس سے خوشی نہیں ہوگی کہ اللہ نے ارشاد فرمایا کہ جو آپؐ پر درود بھیجے گا میں اس پر سلام بھیجوں گا اور جو آپؐ پر سلام بھیجے گا اس پر میں سلام بھیجوں گا اور ہر درود پر دس نیکیاں لکھے گا اور اُن کے دس گناہ مٹائے جائیں گے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ" قیامت کے دن مجھ سے زیادہ قریب وہ شخص ہوگا جو سب سے زیادہ مجھ پر درود بھیجے گا"۔

درود شریف کثرت سے پڑھنا اس بات کی دلیل ہے کہ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو مجھ پر درود بھیجتا ہے قیامت کے دن وہ (درود) پل صراط کے اندھیرے میں نور ہے اور جو یہ چاہے کہ اس کے اعمال بہت بڑی ترازو میں تلیں اس کو چاہیئے کہ مجھ پر کثرت سے درود بھیجا کرے۔ اور تین آدمی قیامت کے دن اللہ کے عرش کے سایہ میں ہوں گے۔ جس دن اس کے سائے کے علاوہ کسی چیز کا سایہ نہ ہوگا۔ ایک وہ شخص جو کسی مصیبت زدہ کی مصیبت ہٹائے، دوسرا جو میری سنّت کو زندہ کرے اور تیسرا وہ جو میرے اوپر کثرت سے درود بھیجے۔"

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا کہ" اللہ تعالیٰ نے ایک خاص فرشتہ مقرر کیا ہے جس کو ساری مخلوق کی باتیں سُننے کی قدرت عطا فرمائی ہے، وہ قیامت تک میری قبر پر متعین رہے گا اور جو شخص مجھ پر قیامت تک درود بھیجتا رہے گا وہ فرشتہ مجھ کو اس کا اور اس کے باپ کا نام لے کر درود بھیجتا رہے گا یعنی فلاں شخص فلاں کا بیٹا ہے اس نے آپ پر درود بھیجا ہے اور اللہ تعالیٰ نے مجھ سے یہ ذمہ لیا ہے کہ جو مجھ پر ایک دفعہ درود بھیجے گا اللہ جل شانہ اس کو دس نیکیاں بدلے میں دے گا۔"

لوگ دنیا کے کاموں کے لئے کس قدر بھاگ دوڑ کرتے ہیں اور اس کی تکمیل کے لئے سفارش کا ذریعہ بھی نکالتے ہیں، جب کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اللہ کے حبیب اور سارے رسولوں کے سردار ہیں، کتنے آسان عمل پر اپنی سفارش کا وعدہ فرمایا ہے، اور وعدہ بھی ایسا کہ فرماتے ہیں "مجھ پر اس کی شفاعت واجب ہے"۔ اس کے باوجود اگر کوئی شخص اس (درود شریف) عمل سے فائدہ نہ اٹھائے تو کتنی بدنصیبی کی بات ہے۔

قیامت کے دن جب مومن کا حساب ہوگا اور اس کی نیکیوں کا وزن کم ہوگا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک پرچہ سر انگشت کے برابر نکال کر میزان میں رکھ دیں گے جس سے نیکیوں کا پلہ وزنی ہو جائیگا۔ وہ بندہ مومن کہے گا کہ" میرے ماں باپ آپ پر قربان! آپ کون ہیں؟" آپ فرمائیں گے کہ" میں تیرا نبی ہوں؟ اور یہ درود شریف ہے جو تونے مجھ پر پڑھا تھا، میں نے تیری حاجت کے وقت ادا کر دیا"۔ قربان جائیں اپنے پیارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم پر کہ آپ کیسے کیسے گنہگاروں کی شفاعت کریں گے۔ لہٰذا ہمیں یہ جان لینا چاہیئے کہ درود شریف کی ہماری زندگی میں کتنی بڑی اہمیت ہے۔ جو سراسر ہمارے لئے فائدہ اور بخشش کا ذریعہ بنے گی۔ ہم سب کو چاہیئے کہ پابندی کے ساتھ اپنے آقا پر درود وسلام بھیجیں اور فضول باتوں میں وقت ضائع کرنے سے گریز کریں۔

●

سمیع الدین خاں لئیق کی تحریر

الحدیث: جو شخص مجھ پر ایک دفعہ درود پڑھے
اللہ اس پر دس دفعہ صلوٰۃ بھیجتا ہے۔

جس طرح قرآن پاک پڑھنے کی اہمیت ہے، ساتھ ہی ساتھ درود شریف کی بھی بہت اہمیت و فضیلت ہے۔ اللہ پاک کا ارشاد اور حکم ہے کہ "بے شک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے رحمت بھیجتے ہیں ان پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر۔ اے ایمان والو! تم بھی رحمت بھیجا کرو اور خوب سلام بھیجا کرو۔" قرآن پاک میں بہت سارے احکامات اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمائے ہیں اور بہت سے انبیاء کرام کی تعریفیں بھی فرمائیں حضرت آدم علیٰ نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام کو پیدا فرمایا تو فرشتوں کو حکم فرمایا کہ "ان کو سجدہ کیا جائے" لیکن حکم یا کسی اعزاز و اکرام میں یہ نہیں فرمایا کہ "میں بھی یہ کام کرتا ہوں اور تم بھی کرو۔" یہ اعزاز صرف سید الکونین فخر دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے لئے ہے۔ اللہ جل شانہٗ نے صلوٰۃ کی اہمیت اولاً اپنی طرف، اس کے بعد اپنے پاک فرشتوں کی طرف کرنے کے بعد مسلمانوں کو حکم فرمایا: "اللہ اور اس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں۔ اے مومنو! تم بھی درود بھیجو۔" اس سے بڑھ کر اور کیا فضیلت ہو گی کہ اس عمل میں اللہ اور اس کے فرشتوں کے ساتھ مومنین کی شرکت ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "جو شخص مجھ پر ایک دفعہ درود پڑھے اللہ جل شانہٗ اس دس دفعہ صلوٰۃ بھیجتا ہے۔" اللہ کی طرف سے ایک ہی درود اور ایک ہی رحمت ساری دنیا کے لئے کافی ہے۔ ایک دفعہ درود پڑھنے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے دس رحمتیں نازل ہوتی ہیں، اس سے بڑھ کر اور فضیلت درود شریف کی کیا ہو گی کہ اس کے ایک دفعہ درود پڑھنے پر اللہ کی طرف سے دس رحمتیں نازل ہوں اور وہ لوگ کس قدر خوش نصیب ہیں جن کے معمول میں روزانہ لاکھوں درودوں کا عمل ہے علامہ سخاویؒ نے امام زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر کثرت سے درود بھیجنا اہل سنت ہونے کی علامت ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ جس کے سامنے میرا تذکرہ آئے، اس کو چاہئے کہ مجھ پر درود بھیجے اور جو مجھ پر ایک دفعہ درود بھیجے گا اللہ تعالیٰ اس کی دس خطائیں معاف کرے گا اور اس کے درجے بلند کرے گا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ نماز میں طویل سجدہ کیا اور جب سجدہ سے فارغ ہوئے تو ارشاد فرمایا کہ "اللہ جل شانہٗ نے میری امت کے بارے میں مجھ پر ایک انعام فرمایا ہے، جس کے شکرانے میں اتنا طویل سجدہ میں نے کیا۔" حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابھی

کر چکے ہیں کہ:

"قضى المديون الدين المؤجل قبل الحلول أو مات. فحل بموته، فأخذ من تركته لا يأخذ من المرابحة التي جرت بينهما إلا بقدر ما مضى من الأيام وهو جواب المتأخرين. قنية وبه أفتى المرحوم أبو السعود افندي مفتي الروم وعلله بالرفق للجانبين."

"یعنی اگر مدیون نے اپنا دین مؤجل وقت سے پہلے ادا کر دیا، یا مشتری کا انتقال ہو گیا اور اس کے انتقال کی وجہ سے وہ دین فی الحال واجب الادا ہو گیا، چنانچہ وہ اس کے ترکہ سے وصول کیا گیا تو ان دونوں صورتوں میں بائع اور مشتری کے درمیان جو ثمن طے ہوا تھا اس میں سے صرف اسی قدر لے گا، جو گزشتہ مدت کے مقابلے میں ہوگا۔ یہی متاخرین حنفیہ کا جواب ہے۔ قنیہ۔ روم کے مفتی ابو السعود آفندی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی قول پر فتوی دیا ہے، اور اس کی علت یہ بیان کی ہے کہ اس قول میں جانبین (بائع اور مشتری) کی رعایت موجود ہے۔"

اس عبارت کے تحت علامہ ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

"صورته اشترى شيئا بعشرة نقدا وباعه لآخر بعشرين إلى أجل، هو عشرة أشهر فإذا قضاه بعد تمام خمسة، أو مات بعدها يأخذ خمسة ويترك خمسة"۔

"اس مسئلے کی صورت یہ ہے کہ ایک شخص نے ایک چیز دس روپے میں نقد پر خریدی اور پھر وہ چیز تیسرے شخص کو دس ماہ کے ادھار پر بیس روپے میں بیچ دی، لہٰذا اس صورت میں اگر مشتری دس ماہ کے بجائے ۵ ماہ بعد قیمت ادا کرے، یا پانچ ماہ بعد اس مشتری کا انتقال ہو جائے، تو اس صورت میں بائع نفع کے پانچ روپے وصول کریگا اور پانچ روپے چھوڑ دے گا (یعنی کل پندرہ روپے وصول کرے گا)" (رد المحتار جلد ۶ ص ۷۵۶)

میرے نزدیک اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ اگرچہ جمہور فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ مدیون کی موت سے وہ دین فی الفور واجب الادا ہو جائے گا، لیکن "بیع بالتقسیط" اور "مرابحہ مؤجلہ"، جن میں ثمن کا کچھ حصہ "مدت" کے مقابلے میں بھی ہوتا ہے، اگر ان میں ہم "فوری واجب الادا" والا قول لے لیں، تو اس صورت میں مدیون کے ورثاء کا نقصان ہے لہٰذا مناسب یہ ہے کہ دو قولوں میں سے ایک قول کو اختیار کر لیا جائے: یا تو متاخرین حنفیہ کا یہ قول لے لیا جائے کہ ادا دین کی جو مدت متفق علیہ تھی، اس کے آنے میں جتنا وقت باقی ہے، اس وقت کے مقابلے میں جتنا ثمن آتا ہو، وہ ساقط کر دیا جائے لہٰذا مدیون کے ترکہ میں سے صرف ایام گزشتہ کے مقابل جو ثمن ہو، وہ وصول کر لیا جائے، یا پھر حنابلہ کا قول اختیار کرتے ہوئے جس طرح وہ دین مؤجل تھا اب بھی اسی طرح مؤجل رہنے دیا جائے البتہ اسکے لئے شرط یہ ہے کہ مدیون کے ورثاء کسی قابل اعتماد ذریعہ سے اس دین کی توثیق کر دیں، شاید حنابلہ کا یہ قول اختیار کرنا زیادہ بہتر ہے، اسلئے کہ مدتوں کے اختلاف کیوجہ سے ثمن میں جو تذبذب کی صورت ہوتی ہے اور جسکی وجہ سے صورۃ سودی معاملات سے مشابہت ہو جاتی ہے، وہ تذبذب اس صورت میں نہیں پایا جاتا ہے۔

واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم ولہ الحمد فی الاولیٰ والآخرۃ وصلی اللّٰہ تعالیٰ علی نبیہ وعلی آلہ وصحبہ وتابعیہم ومن والاہم ●

منقول ہے۔

دوسری روایت یہ ہے کہ مدیون کی موت کی وجہ سے وہ دین فی الفور واجب الاداء ہوجائیگا، یہ قول امام شافعی، امام نخعی، سوار، امام مالک، امام ثوری، امام شعبی اور اصحاب الرائے سے منقول ہے اس لئے کہ اس دین کے بارے میں تین صورتوں میں سے ایک صورت ضرور ہوگی، یا تو وہ دین میت کے ذمے باقی رہے گا یا ورثاء کے ذمہ ہوگا یا میت کے مال سے معلق ہوگا، جہاں تک میت کے ذمہ کا تعلق ہے تو میت کے ذمے دین کا باقی رہنا جائز نہیں، اس لئے کہ موت کی وجہ سے اس کا ذمہ فاسد ہوچکا ہے اور اس سے مطالبہ کرنا بھی متعذر ہے اور جہاں تک ورثاء کے ذمہ داری کا تعلق ہے تو ورثاء کی ذمہ داری بھی درست نہیں، اس لئے کہ نہ تو ورثاء نے اس دین کی ذمہ داری قبول کی ہے اور نہ ہی دائن ان ورثاء کی ذمہ داری پر رضامند ہے جبکہ ان ورثاء کی ذمہ داریاں مختلف اور متفاوت بھی ہیں، جہاں تک میت کے مال سے معلق کرنے کا تعلق ہے تو میت کے مال سے معلق کرکے اس کو مؤجل کرنا بھی جائز نہیں، اس لئے کہ اس صورت میں میت کا بھی ضرر ہے اور صاحب دین کا بھی ضرر ہے اور ورثاء کا کوئی نفع اس میں نہیں ہے، میت کا ضرر تو یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "المیت مرتهن بدينه حتى يقضى عنه" یعنی میت اپنے دین کی وجہ سے معلق رہتا ہے جب تک اس کا قرض ادا نہ کردیا جائے اور صاحب قرض کا ضرر یہ ہے کہ اس کا حق اور زیادہ مؤخر ہوجائے گا اور بعض اوقات وہ مال ضائع ہوجاتا ہے اس صورت میں صاحب حق کا حق بالکل ساقط ہوجائیگا۔

جہاں تک ورثاء کے نفع کا تعلق ہے تو ورثاء عام طور پر میت کے اشیاء سے براہ راست منتفع نہیں ہوتے اور نہ ان میں تصرف کرتے ہیں اور اگر ان ورثاء کو نفع حاصل بھی ہوجائے تب بھی انکی وجہ سے میت کا حق اور صاحب دین کا حق اس مال سے ساقط نہ ہوگا۔

اس عبارت کے بعد علامہ ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ نے ان لوگوں کے قول کو ترجیح دی ہے جن کے نزدیک وہ دین مؤجل ہی رہے گا بشرطیکہ ورثاء کسی ضامن یا رہن کے ذریعہ اس دین کی توثیق کردیں اور اس کے دلائل بھی ذکر فرماتے ہیں۔

جہاں تک حنفیہ کا تعلق ہے اگرچہ جمہور فقہاء کے مذہب کے مطابق ان کا اصل مسلک یہ ہے کہ مدیون کی موت کی وجہ سے وہ دین فی الفور واجب الاداء ہوگا، لیکن متاخرین حنفیہ نے اس قول پر فتوی نہیں دیا ہے اس لئے کہ جیسا کہ ہم پیچھے بیان کرچکے ہیں کہ مرابحہ مؤجلہ میں ثمن کا کچھ حصہ "مدت" کے مقابلے میں ہوتا ہے، لہذا اگر مشتری (میت) کے ترکہ میں سے پورا ثمن فی الفور ادا کرنے کا حکم لگادیں تو اس صورت میں ثمن کا جتنا حصہ مدت کے مقابلے میں تھا وہ بلاعوض ہونا لازم آجائے گا اور اس میں مشتری کا نقصان ہے کیونکہ مشتری اس ثمن پر اس شرط پر راضی ہوا تھا کہ وہ ثمن فی الفور ادا نہیں کریگا، بلکہ ایک متفقہ مدت گزرنے کے بعد ادا کرے گا، اسی وجہ سے متاخرین حنفیہ نے یہ فتوی دیا ہے کہ اگر یہ صورت پیش آجائے تو اس صورت میں مشتری ثمن مرابحہ میں سے صرف اسی قدر ادا کریگا جو گزشتہ مدت کے مقابل ہوگا اور پیچھے ہم "مرابحہ مؤجلہ" کی بحث میں درمختار کی یہ عبارت نقل

ایسے ہیں جو لوگوں کی ضرورت کی وجہ سے لازم ہو جاتے ہیں۔ (دیکھئے: رد المحتار بحث البیع بالوفاء) لہٰذا اس قول کی بنیاد پر میرے خیال میں ٹال مٹول کے سدباب کے لئے اور لوگوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے مجوزہ تبرع کو لازم قرار دینے کی گنجائش ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

مدیون کی موت سے قرض کی ادائیگی

اس بحث کا سب سے آخری مسئلہ یہ ہے کہ اگر قرض کی ادائیگی کی مدت کے دوران مدیون کا انتقال ہو جائے تو کیا وہ دین پہلے کی طرح مؤجل ہی رہے گا، یا وہ دین فی الفور واجب الاداء ہوگا؟ اور دائن کو مدیون کے ورثاء سے اس دین کی ادائیگی کا فی الفور مطالبے کا حق حاصل ہو جائے گا یا نہیں؟ اس مسئلہ میں فقہاء کے مختلف اقوال ہیں، حنفیہ، شافعیہ اور مالکیہ کے جمہور فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ مدیون کی موت کی وجہ سے دین مؤجل فوری واجب الاداء ہو جاتا ہے اور امام احمد بن حنبلؒ سے بھی ایک روایت اسی طرح منقول ہے لیکن حنابلہ کے نزدیک مختار قول یہ ہے کہ اگر مدیون کے ورثاء اس دین کی توثیق کر دیں اور اس کی ادائیگی پر اطمینان دلادیں تو اس صورت میں وہ دین مدیون کی موت سے فوری واجب الاداء نہیں ہوگا بلکہ وہ پہلے کی طرح مؤجل ہی رہے گا چنانچہ علامہ ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

فَاَمَّا اِنْ مَاتَ وَعَلَيْهِ دُيُوْنٌ مُؤَجَّلَةٌ، فَهَلْ تَحِلُّ بِالْمَوْتِ؟ فِيْهِ رِوَايَتَانِ: احدهما لَا تَحِلُّ اِذَا وَثَّقَ الْوَرَثَةُ وَهُوَ قَوْلُ ابْنِ سِيْرِيْنَ وَعُبَيْدِ اللهِ بْنِ الْحَسَنِ وَاِسْحَاقَ وَاَبِيْ عُبَيْدٍ وَقَالَ طَاؤُسٌ وَاَبُوْبَكْرِ بْنُ مُحَمَّدٍ وَالزُّهْرِيُّ وَسَعِيْدُ بْنُ اِبْرَاهِيْمَ: اَلدَّيْنُ اِلٰى اَجَلِهٖ. وَحُكِيَ ذٰلِكَ عَنِ الْحَسَنِ وَالرِّوَايَةُ الاخرىٰ: اَنَّهٗ يَحِلُّ بِالْمَوْتِ وَبِهٖ قَالَ الشَّعْبِيُّ النخعي وسوار ومالك وَالثَّوْرِيُّ والشَّافِعِيُّ وَاَصْحَابُ الرَّاْيِ. لِاَنَّهٗ لَا يَخْلُوْ اما ان يَبْقٰى فِيْ ذِمَّةِ الْمَيِّتِ، اَوِ الْوَرَثَةِ اَوْ يَتَعَلَّقَ بِالْمَالِ لَا يَجُوْزُ بَقَاءُهٗ فِيْ ذِمَّةِ الْمَيِّتِ لِخَرَابِهَا وَتَعَذُّرِ مُطَالَبَتِهٖ بِهَا، وَلَا ذِمَّةِ الْوَرَثَةِ لِاَنَّهُمْ لَمْ يَلْتَزِمُوْهَا، ولا رضي صاحب الدين بِذِمَمِهِمْ وَهُوَ مُخْتَلِفَةٌ مُتَبَايِنَةٌ، وَلَا يَجُوْزُ تَعْلِيْقُهٗ عَلَى الْاَعْيَانِ وَتَاْجِيْلُهٗ، لِاَنَّهٗ ضَرَرٌ بِالْمَيِّتِ، وَصَاحِبِ الدَّيْنِ وَلَا نَفْعَ لِلْوَرَثَةِ فِيْهِ، اَمَّا الْمَيِّتُ فَلِاَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "اَلْمَيِّتُ مُرْتَهَنٌ بِدَيْنِهٖ حَتّٰى يُقْضٰى عَنْهُ" وَاَمَّا صَاحِبُهٗ فَيَتَاَخَّرُ حَقُّهٗ وَقَدْ تَتْلَفُ الْعَيْنُ فيسقط حقه وَاَمَّا الْوَرَثَةُ فَاِنَّهُمْ لَا يَنْتَفِعُوْنَ بِالْاَعْيَانِ وَلَا يَتَصَرَّفُوْنَ فِيْهَا وَاِنْ حَصَلَتْ لَهُمْ مَنْفَعَةٌ فَلَا يَسْقُطُ حَظُّ الْمَيِّتِ وَصَاحِبِ الدَّيْنِ لِمَنْفَعَةٍ لَهُمْ۔

(المغنی لابن قدامہ ۴: ۴۸۶ کتاب المفلس)

اگر کسی کا انتقال ہو جائے اور اس پر دین مؤجل ہو تو کیا موت کی وجہ سے وہ دین فوری واجب الاداء ہو جائے گا؟ اس بارے میں دو روایتیں ہیں: ایک روایت یہ ہے کہ اگر ورثہ اس دین کی توثیق کر دیں تو یہ فوری واجب الاداء نہیں ہوگا، یہ قول علامہ ابن سیرین، عبید اللہ بن حسن، اسحاق اور ابوعبید کا ہے، البتہ علامہ طاؤس، ابوبکر بن محمد، علامہ زہری، سعید بن ابراہیم فرماتے ہیں کہ وہ دین اپنی مدت تک مؤجل ہی رہے گا اور امام حسن سے بھی یہی قول

علامہ باجیؒ نے اگرچہ اتفاق نقل کیا کہ علیٰ وجہ الیمین التزام کی صورت میں قضاءً لزوم نہیں ہوتا، مگر یہ نقل قابل تسلیم نہیں، کیونکہ قضاءً لازم ہونے یا نہ ہونے میں علماء کا اختلاف موجود ہے جیسا کہ پیچھے گزر چکا اور آئندہ آنے والا ہے۔

علامہ حطاب رحمۃ اللہ علیہ نے اگرچہ قضاءً عدم لزوم کی قول کو ترجیح دی ہے لیکن اس بحث کے آخر میں وہ خود فرماتے ہیں کہ:

"اِذَا قُلْنَا اِنَّ الاِلْتِزَامَ الْمُعَلَّقَ عَلٰی فِعْلِ الْمُلْتَزِمِ الَّذِیْ عَلٰی وَجْہِ الْیَمِیْنِ لَا یُقْضٰی بِہٖ عَلَی الْمَشْہُوْرِ، فَاعْلَمْ اَنَّ ھٰذَا مَا لَمْ یَحْکُمْ بِصِحَّۃِ الْاِلْتِزَامِ الْمَذْکُوْرِ حَاکِمٌ، وَاَمَّا اِذَا حَکَمَ حَاکِمٌ بِصِحَّتِہٖ، اَوْ بِلُزُوْمِہٖ. فَقَدْ تَعَیَّنَ الْحُکْمُ بِہٖ، لِاَنَّ الْحَاکِمَ اِذَا حَکَمَ بِقَوْلٍ. لَزِمَ الْعَمَلُ بِہٖ، وَارْتَفَعَ الْخِلَافُ"۔ (حوالہ سابقہ ص ۱۸۵)

اگرچہ ہم نے یہ کہا کہ ملتزم جب اپنے کسی فعل پر علیٰ وجہ الیمین التزام کر لے، تو قضاءً لازم نہیں، جیسا کہ مشہور مذہب یہی ہے، مگر سمجھ لینا چاہئے کہ یہ اس وقت تک ہے جب تک کسی حاکم نے التزام مذکورہ کے بارے میں فیصلہ جاری نہ کیا ہو، لیکن اگر کسی حاکم نے اس التزام کی صحیح ہونے یا اس کے لازم ہونے پر فیصلہ دیا ہو تو اس صورت میں وہ التزام درست ہو جائے گا، اس لئے کہ جب حاکم کسی بات کا فیصلہ کر دے تو اس پر عمل کرنا لازم ہو جاتا ہے اور اختلاف بھی ختم ہو جاتا ہے۔

بہرحال یہ حکم بعض فقہاء مالکیہ کے قول کے مطابق ہے جہاں تک حنفیہ کا تعلق ہے ان کے نزدیک "وعدہ" قضاءً لازم نہیں ہوتا لیکن فقہاء حنفیہ نے اس کی تصریح کی ہے کہ بعض وعدے

کو سود نہیں کہا جائے گا کیونکہ وہ رقم بینک کی ملکیت نہیں ہوگی، بلکہ اس کو خیراتی کاموں میں صرف کیا جائے گا، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس قسم کی رقم کے لئے خاص فنڈ قائم کر دیا جائے جو بینک کی ملکیت نہ ہو، بلکہ خیراتی کاموں کے لئے وقف ہو، اور بینک اس فنڈ کی سرپرستی کرے اور اس فنڈ کے مقاصد میں ایک مقصد یہ بھی ہونا چاہئے کہ اس میں سے ضرورت مند لوگوں کو قرض حسنہ کے طور پر رقم دی جائے۔

مماطل بذریعہ معاہدہ اپنے ذمہ اس تبرع کا جو التزام کرے گا، جہاں تک اس کی شرعی حیثیت کا تعلق ہے تو شرعی اعتبار سے یہ التزام تمام فقہاء کے نزدیک جائز ہے اور بعض فقہاء مالکیہ کے نزدیک اس تبرع کی ادائیگی قضاءً بھی اس پر لازم ہوگی، مالکیہ کے نزدیک اس مسئلہ کی اصل یہ ہے کہ اگر یہ التزام علی وجہ القربہ ہو تو بالاتفاق اس کی ادائیگی ملتزم پر قضاءً لازم ہو جاتی ہے اور اگر یہ التزام علی وجہ القربہ نہ ہو بلکہ علی وجہ الیمین ہو، اور ایسے امر پر اسے معلق کیا جائے جس سے ملتزم کو خود رکنا مقصود ہو تو اس صورت میں قضاءً اس کے لازم ہونے میں اختلاف ہے، بعض فقہاء کے نزدیک قضاءً لازم نہیں ہوگی جبکہ دوسرے فقہاء نے اس سے اختلاف کیا ہے، ان کے نزدیک قضاءً لازم ہے، چنانچہ علامہ حطاب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب تحریر الکلام فی مسائل الالتزام میں تفصیل سے اس مسئلہ پر بحث کی ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

"اَمَّا اِذَا الْتَزَمَ الْمُدَّعٰى عَلَيْهِ لِلْمُدَّعِيْ اَنَّهُ اِنْ لَّمْ يُوْفِهِ حَقَّهُ فِيْ وَقْتِ كَذَا، فَلَهُ عَلَيْهِ كَذَا وَكَذَا، فَهٰذَا لَا يَخْتَلِفُ فِيْ بُطْلَانِهِ، لِاَنَّهُ صَرِيْحُ الرِّبَا، وَسَوَاءٌ كَانَ الشَّيْئُ الْمُلْتَزَمُ بِهِ مِنْ جِنْسِ الدَّيْنِ اَوْ غَيْرِهِ، وَسَوَاءٌ كَانَ شَيْئًا مُعَيَّنًا اَوْ مَنْفَعَةً .....

وَاَمَّا اِذَا الْتَزَمَ اَنَّهُ اِنْ لَّمْ يُوْفِهِ حَقَّهُ فِيْ وَقْتِ كَذَا، فَعَلَيْهِ كَذَا وَكَذَا لِفُلَانٍ، اَوْ صَدَقَةٌ لِلْمَسَاكِيْنِ، فَهٰذَا هُوَ مَحَلُّ الْخِلَافِ الْمَعْقُوْدِ لَهُ هٰذَا الْبَابُ، فَالْمَشْهُوْرُ اَنَّهُ لَا يُقْضٰى بِهِ كَمَا تَقَدَّمَ وَقَالَ ابْنُ دِيْنَارٍ يُقْضٰى بِهِ"

(تحریر الکلام للحطاب : ۱۷۶)

اگر مدعیٰ علیہ نے مدعی کے لئے یہ التزام کر لیا کہ اگر اس نے اس کا دین فلاں وقت تک ادا نہیں کیا تو اس کے ذمے فلاں چیز مدعی کے لئے لازم ہو جائے گی، صریح ربا ہونے کی وجہ سے یہ صورت باطل اور ناجائز ہے، جو چیز اپنے اوپر لازم کی ہے چاہے وہ دین کی جنس میں سے ہو، یا نہ ہو، اور چاہے وہ کوئی معین چیز ہو یا منفعت ہو....

اور اگر مدعیٰ علیہ نے یہ التزام کر لیا کہ اگر فلاں وقت پر تمہارا دین ادا نہیں کیا تو اس صورت میں فلاں چیز فلاں شخص کو دینی لازم ہوگی، یا فلاں چیز مساکین کو صدقہ دوں گا، یہ صورت فقہاء کے نزدیک محل اختلاف ہے، اور مشہور قول یہ ہے کہ اس کی ادائیگی قضاءً لازم نہیں ہوگی، البتہ علامہ ابن دینار فرماتے ہیں کہ یہ قضاءً بھی لازم ہے۔

اس سے پہلے ایک جگہ علامہ حطاب رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرما چکے ہیں:

وَحِكَايَةُ الْبَاجِيْ الْاِتِّفَاقَ عَلٰى عَدَمِ اللُّزُوْمِ فِيْمَا اِذَا كَانَ عَلٰى وَجْهِ الْيَمِيْنِ غَيْرُ مُسَلَّمَةٍ لِوُجُوْدِ الْخِلَافِ فِيْ ذٰلِكَ كَمَا تَقَدَّمَ وَكَمَا سَيَاْتِيْ.

(حوالہ سابقہ ص ۱۶۹)

مالی معاوضہ کا مطالبہ مدت کے دوران کیا جائیگا، کیا اس کا تصفیہ بھی مدت پوری ہونے پر موقوف رہے گا؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہوگا تو پھر یہ کیسے کہا جاسکتا ہے یہ "مالی معاوضہ" مماطلت کی مدت کے دوران ہونے والے واقعی منافع کے موافق ہوگا؟

اس کے علاوہ اس مسئلہ میں ایک دوسری بات بھی قابل تامل ہے، وہ یہ کہ سرمایہ کاری کے اکاؤنٹ میں نفع کا تناسب مرابحہ اور اجارہ کے معاملات کے مقابلے میں ہمیشہ کم ہوتا ہے لہٰذا اگر مدیون خیانت کرنا چاہے تو اس کیلئے یہ ممکن ہے کہ وہ دین کی رقم ہمیشہ ایسی تجارتی اسکیموں میں لگائے جس میں بنک کے سرمایہ کاری اکاؤنٹ کے مقابلے میں زیادہ منافع حاصل ہوتا ہو اور اب وہ مدیون مالی معاوضہ کی معمولی رقم تو بنک کو ادا کر دے گا اور باقی منافع خود رکھ لے گا اور اس طرح جب تک چلے گا دین کی ادائیگی میں ٹال مٹول کرتا رہے گا اور مالی معاوضہ بھی ادا کرتا رہے گا۔ لہٰذا پھر وہی خرابی واپس لوٹ آئے گی جس کی وجہ سے بنک مالی معاوضہ لازم کرنے پر مجبور ہوئے تھے۔

لہٰذا میرے نزدیک مماطلین پر مالی معاوضہ لازم کرنے کی تجویز نہ تو شرعی اعتبار سے مماطلت کی پریشانی کا حل پیش کرتی ہے اور نہ عملی اعتبار سے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس مشکل اور پریشانی کا کیا حل ہونا چاہئے؟

اس مشکل کا صحیح حل وہی ہے جو ہم نے اس بحث کے شروع میں ذکر کر دیا، لیکن یہ اس وقت مفید ہو سکتا ہے جب تمام بنک شرعی بنیادوں پر عمل شروع کر دیں لیکن موجودہ حالات میں جبکہ پوری دنیا میں پھیلے ہوئے سودی بنکوں کے مقابلے میں اسلامی بنکوں کی تعداد بہت معمولی ہے، اس حل پر عمل مفید نہیں ہوسکتا البتہ وقتی اور عارضی طور پر اسلامی بنک ایک دوسرے حل کو اختیار کر سکتے ہیں۔ وہ حل یہ ہے کہ مرابحہ اور اجارہ کے ایگریمنٹ پر مدیون سے دستخط لیتے وقت اس پر یہ لازم کر دیا جائے کہ مالی واجبات کی ادائیگی میں کوتاہی اور تاخیر کرنے کی صورت میں وہ دین کے تناسب سے ایک معین رقم خیراتی کاموں میں بطور تبرع صرف کرے گا، اور یہ رقم وہ پہلے بنک کو ادا کرے گا، اور پھر بنک اس کی طرف سے نیابتاً خیراتی کاموں میں لگا دے گا، لہٰذا دین کی ادائیگی میں تاخیر کی صورت میں مدیون وہ رقم بنک کو ادا کرے گا، البتہ یہ رقم نہ تو بنک کی ملکیت ہوگی اور نہ ہی اس کی آمدنی اور منافع کا حصہ ہوگی بلکہ خیراتی کاموں میں صرف کرنے کے لئے بطور امانت اس کے پاس محفوظ رہے گی۔

مندرجہ بالا تجویز مدیون کو وقت پر ادائے دین کرنے کے لئے بہترین دباؤ ہے اور امید ہے کہ یہ تجویز مماطلت کے سدباب کے لئے مالی معاوضہ کی تجویز کے مقابلے میں زیادہ مؤثر ہوگی، اس لئے کہ بطور تبرع جو رقم مدیون پر لازم کی جائے گی، اس کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ بنک کے سرمایہ کاری اکاؤنٹ میں مدت مماطلت کے دوران حاصل ہونے والے منافع کے برابر ہو۔ بلکہ اس سے زیادہ بھی ہو سکتی ہے، اور اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ رقم دین کے متناسب حصے کی بنیاد پر لازم کر دی جائے، تاکہ مدیون وقت پر دین ادا کرنے کا پابند ہو جائے اور بطور تبرع مدیون سے لی جانے والی اس رقم

دونوں کے درمیان … بارے میں …

دوسری طرف اسلامی بینکوں میں آج کل عملی طور پر جو طریقہ رائج ہے۔ اور جس کو مالی معاوضہ کے اصول میں بیان کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ دین کے ایگریمنٹ میں اس بات کی تصریح ہوتی ہے کہ مدیون اس وقت تک مالدار ہی تصور کیا جائیگا جب تک قانوناً اس پر افلاس کا فیصلہ نہ ہوجائے۔ اور یہ بالکل بدیہی بات ہے کہ قانوناً کسی شخص کے بارے میں افلاس کا حکم لگانا بالکل آخری حد ہے جو نادر الوجود ہے، جب کہ دوسری طرف یہ بات بالکل یقینی ہے کہ بہت سے لوگ ایسے بھی ہوں گے جن پر قانوناً افلاس کا حکم تو نہیں لگا ہوگا لیکن حقیقتاً وہ تنگدست ہوں گے۔ ان حالات میں یہ کہنا کیسے ممکن ہوگا کہ یہ اسلامی بنک مدیون کی تنگدستی کی صورت میں مالی معاوضہ کا مطالبہ نہیں کریں گے؟

اور یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے کو سود پر قرض دے اور پھر قرض لینے والا مفلس ہوجائے تو اس صورت میں قرض دینے والا صرف اس قدر رقم اس سے وصول کرے گا جتنی رقم وہ اس کے پاس پائے گا۔ لہٰذا افلاس والی صورت میں سود کے مطالبے اور مالی معاوضہ کے مطالبے میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔

جواز کے قائلین نے جو دوسرا فرق بیان کیا تھا کہ ادائے دین کی مدت گزرنے کے ایک ماہ بعد مالی معاوضہ واجب کیا جاتا ہے، اگر بینکوں میں یہ صورت عملاً نافذ اور جاری ہو تب تو یہ فرق درست ہے لیکن عام طور پر بینکوں میں عملاً ایک ماہ کی مدت مقرر نہیں ہے۔

تیسرے اور چوتھے فرق کا تعلق ہے۔ وہ یہ کہ دین کی ادائیگی میں ٹال مٹول کی مدت کے دوران حاصل ہونے والے منافع کے تناسب سے مالی معاوضہ لازم کیا جاتا ہے۔ اور یہ کہ مالی معاوضہ کی مقدار معلوم اور متعین نہیں ہوتی کیونکہ حاصل ہونے والے منافع پر اس کا دارومدار ہوتا ہے۔ "سود" اور "مالی معاوضہ" کے درمیان بیان کردہ یہ دونوں فرق نظریاتی اعتبار سے تو درست ہیں۔ لیکن جب عملی اعتبار سے ان دونوں فرق میں غور کریں گے تو یہ نظر آئے گا کہ اسلامی بینکوں کی زیادہ تر کارروائیاں "مرابحہ مؤجلہ" کے ارد گرد ہی گھومتی ہیں اور ان کارروائیوں کے نتیجے میں ہونے والے نفع اور اس کی مقدار بنک اور ایجنٹ دونوں کو پہلے سے معلوم ہوتی ہے، جس سے ظاہر ہوا کہ عملاً "مالی معاوضہ" کی مقدار فریقین کو پہلے سے معلوم ہوتی ہے۔

پھر اکثر اسلامی بنک ہر چھ ماہ بعد اپنے منافع کا حساب لگاتے ہیں، اس لئے یقینی طور پر منافع کی مقدار چھ ماہ کی مدت گزرنے کے بعد معلوم ہوگی۔ لہٰذا اگر "ٹال مٹول" کی مدت اس چھ ماہ کی عرصہ کے درمیان میں ہوگی تو اس صورت میں اس عرصہ کا یقینی منافع کیسے معلوم ہوگا؟ اور جو ڈیپازیٹرز چھ ماہ کی مدت پوری ہونے سے پہلے بنک سے اپنی رقم نکلوا لیتے ہیں۔ ان کو جو منافع دیا جاتا ہے، وہ علی الحساب دیا جاتا ہے اور پھر مدت پوری ہونے کے بعد علی الحساب دیئے ہوئے منافع کا تصفیہ کیا جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ مماطل … سے جس

اشیاء کرایہ پر دینے کے لئے تیار کی گئی ہوں، ان کے غصب کی صورت میں ان کا ضمان واجب ہوتا ہے۔

لیکن علماء معاصرین کا یہ استدلال "نقود مغصوبہ" میں درست نہیں، اس لئے کہ جو فقہاء منافع مغصوبہ کے ضمان کے قائل ہیں، ان کے نزدیک بھی اعیان مغصوبہ کے منافع کا ضمان واجب ہوتا ہے "نقود مغصوبہ" کے منافع کا ضمان واجب نہیں، حتیٰ کہ اگر غاصب "نقود مغصوبہ" سے تجارت کر کے نفع اٹھائے تو شوافع کے صحیح قول کے مطابق وہ نفع مغصوب منہ کو واپس نہیں کیا جائے گا۔

(دیکھئے، المہذب للشیرازی جلد اصفحہ ۳۷)

اور یہ تو اس نفع کی بات ہو رہی ہے جو حقیقتاً وجود میں آچکا ہے لیکن جو منافع ابھی سرے سے وجود ہی میں نہیں آیا، بلکہ صرف وجود میں آنے کی توقع تھی۔ اس کو واپس کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اسی وجہ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے "مدیون مماطل" کے بارے میں یہ تو فرمادیا کہ:

"لی الواجد یحل عقوبته وعرضه"

کہ مالدار شخص کی ٹال مٹول اس کی سزا اور آبرو کو حلال کر دیتی ہے۔

لیکن یہ نہیں فرمایا کہ "یحل ماله" یعنی اس کا مال حلال ہے۔ اس کے علاوہ فقہاء کے درمیان "تعزیر بالمال" کے جواز اور عدم جواز کے بارے میں تو اختلاف رہا ہے۔ لیکن فقہاء اور محدثین میں سے کسی نے لفظ "عقوبت" کی تفسیر "مالی معاوضہ" سے نہیں کی۔ اور اگر کوئی فقیہ "عقوبت" کی تفسیر "مالی معاوضہ" سے کرتا بھی تو یہ مالی معاوضہ لازم کرنے کا اختیار عدالت کو ہوتا۔ خود دائن کو یہ اختیار نہ ملتا، لہٰذا آج دائن جس مالی معاوضہ کا مطالبہ عدالت کے کسی فیصلے کے بغیر خود کر رہا ہے، یہ سزا اس پر کیسے منطبق ہو سکتی ہے؟ اور اگر شرعی سزاؤں کے نفاذ کا اختیار عدالت کے بجائے لوگوں کے سپرد کر دیا جائے تو اس سے لاقانونیت اور بدنظمی پیدا ہوگی جس کا نہ عقلاً کوئی جواز ہے اور نہ شرعاً۔

بہرحال مندرجہ بالا تفصیل تو "مالی معاوضہ" کے فکری پہلو کے اعتبار سے تھی۔ جہاں تک اس کے عملی پہلو کا تعلق ہے۔ اوپر ہم نے "مالی معاوضہ" کے جواز کے قائلین کی طرف سے "سود" اور "مالی معاوضہ" میں جو فرق ذکر کئے ہیں، ان میں عملی تطبیق کے لحاظ سے اگر غور کیا جائے تو یہ محض نظریاتی فرق معلوم ہوتا ہے۔ عملی تطبیق کے وقت ان دونوں کے اندر کوئی فرق ظاہر نہیں ہوگا۔ البتہ صرف ایسی نادر عملی صورتوں میں شاید فرق نکلے جنہیں شرعی حکم کا مدار نہیں بنایا جا سکتا۔

جواز کے قائلین نے پہلا فرق یہ بیان کیا تھا کہ اگر مدیون تنگدستی کی وجہ سے وقت پر دین ادا نہیں کر رہا ہے تو اس سے مالی معاوضہ کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔ لیکن مدیون کی تنگدستی اور مالداری ایسی چیز ہے جس پر بنک کو ہر معاملے میں علیحدہ علیحدہ تحقیق کرنا دشوار ہے اس لئے کہ ہر مدیون یہی دعویٰ کرے گا کہ وہ تنگدست ہے اور بینک کے پاس اس کے دعویٰ کے خلاف اس کو مالدار ثابت کرنے کی اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں ہوگی کہ وہ اس مدیون کا مقدمہ عدالت میں پیش کرے، اور جس کے نتیجے میں

مثلوں کے واقعات بکثرت پیش آتے رہتے ہیں۔

پھر دائن کا وہ نقصان جو شرعاً تسلیم شدہ ہے، وہ یہ ہے کہ اس کو وقت مقرر پر دین کی رقم ادا نہ کی جائے، اور اس نقصان کے ازالے کا طریقہ یہ ہے کہ دین کی رقم جو اس کا حق ہے، اس کو ادا کر دی جائے اور دین سے زائد رقم میں اس کا کوئی حق نہیں ہے، اس لئے کہ وہ تو سود ہے اور جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ دین سے زائد رقم میں دائن کا کوئی حق نہیں ہے، تو پھر اس زائد رقم کے نہ ملنے سے اس کا کوئی ایسا نقصان نہیں ہو رہا ہے جو شرعاً بھی معتبر ہو، لہٰذا دین کی رقم وصول ہو جانے سے اس کا نقصان ختم ہو جائے گا۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ اگر دائن کو یہ رقم مقررہ وقت پر مل جاتی تو وہ اس رقم کو تجارت میں لگا کر نفع حاصل کرتا، چوں کہ وقت پر یہ رقم اس کو نہیں ملی جس کی وجہ سے وہ نفع حاصل نہ کر سکا۔ اور اب اس نفع کے عدم حصول کا جو شخص سبب بنا ہے یعنی مدیون وہ اس نقصان کی تلافی کرے۔

یہ بات ان دو اصولوں پر مبنی ہے کہ ایک متوقع نفع کو حقیقی نفع شمار کیا جائے، اور یہ کہ نوٹ بذاد خود روزانہ کچھ نہ کچھ نفع لانے والے ہیں، ان دونوں اصولوں کی سودی نظام میں تو گنجائش ہے، لیکن اسلامی فقہ میں انکی کوئی حیثیت نہیں ہے، اور اگر یہ اصول اسلام میں بھی معتبر ہوتے تو ان کو غاصب اور چور پر ضرور منطبق کیا جاتا لیکن اسلامی فقہ کی پوری تاریخ میں اس کی ایک مثال بھی نہیں ملتی کہ کسی نے کرنسی نوٹ چوری کرنے والے یا انکو غصب کرنے والے پر اس بنیاد پر "مالی معاوضہ" لازم کر دیا ہو کہ غاصب نے مدت غصب کے دوران شئی مغصوب سے جو نفع متوقع تھا اس نے اس کو ضائع کر دیا، شریعت اسلامیہ نے چور پر قطع ید کی سزا تو لازم کی ہے لیکن مسروقہ کرنسی کی بنیاد پر اس پر "مالی معاوضہ" لازم نہیں کیا۔ لہٰذا یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ شریعت اسلامیہ نے "مالی معاوضہ" کسی بھی صورت میں لازم قرار نہیں دیا۔

اور "مدیون مماطل" چور اور غاصب سے زیادہ تعدی نہیں کر رہا ہے، لہٰذا زیادہ سے زیادہ اس پر چوری اور غصب کے احکام جاری کر دیئے جائیں۔ اور شریعت اسلامیہ نے چور اور غاصب پر محض نوٹوں کی بنا پر کوئی مالی معاوضہ لازم نہیں کیا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ چور اور غاصب نے مالک کا نقصان کیا ہے، اور ان دونوں نے مالک کو اصل مال سے ہی محروم نہیں کیا بلکہ اس متوقع منافع سے بھی محروم کر دیا جو مالک اس مدت کے دوران حاصل کرتا، لیکن شریعت اسلامیہ نے اس نقصان کے ازالے کے لئے صرف مالک کو اس کا مال واپس کرنے اور نقصان کرنے والے پر جسمانی سزا اور اس کو بے عزت کرنے کی سزا جاری کرنے کا حکم دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ متوقع منافع کا فوت ہو جانا کوئی ایسا نقصان نہیں ہے جس پر شرعاً کوئی معاوضہ لازم ہو جائے۔

"مالی معاوضہ" کے جواز پر بعض علماء معاصرین نے اس بات سے استدلال کیا ہے کہ اکثر فقہاء کے نزدیک منافع مغصوبہ غاصب کے ذمہ مضمون ہوتے ہیں، اور حنفیہ کے نزدیک بھی جو

چنانچہ "سود" اور "مالی معاوضہ" کے درمیان مندرجہ بالا چار فرق کی بنیاد پر ان علماء معاصرین کا یہ کہنا ہے کہ اس "مالی معاوضہ" کا "سود" سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور اس کے علاوہ "مالی معاوضہ" کے جواز پر اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں جس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"لاضرر ولاضرار"
نہ نقصان اٹھاؤ، نہ نقصان پہونچاؤ

(المقاصد الحسنة للسخاوی ص ۴۶۸، وحسنه النووی، والمناوی فی فیض القدیر ۶: ۴۳۲، لتعدد طرقه)

دوسری حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

"لی الواجد یحل عقوبته وعرضه"
مالدار شخص کی ٹال مٹول اس کی سزا اور اس کی آبرو کو حلال کر دیتی ہے۔

چنانچہ "مالی معاوضہ" کے جواز کے قائلین مندرجہ بالا احادیث سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ "مالی معاوضہ" ایک طرح کا مالی جرمانہ ہے جو دین کی ادائیگی میں ٹال مٹول کرنے والے کے ذمہ ڈالا جاتا ہے۔

لیکن "مالی معاوضہ" کے جواز کے بارے میں علماء معاصرین کے رائے فکری اور عملی دونوں لحاظ سے محل نظر ہے، فکری کے لحاظ سے تو اس طرح کہ دین کی ادائیگی میں ٹال مٹول کا مسئلہ یہ آج کے دور کا کوئی نیا پیدا ہونے والا مسئلہ نہیں ہے، بلکہ ہر زمانے اور ہر شہر میں تاجر اس مشکل سے دوچار ہوتے چلے آرہے ہیں، خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام اور بعد کے زمانوں میں بھی یہ مسئلہ درپیش رہا لیکن احادیث اور آثار میں کہیں یہ بات ثابت نہیں ہے کہ اس مشکل کے حل کے لئے ٹال مٹول کرنے والے پر کوئی مالی معاوضہ لازم کیا گیا ہو۔ اور پوری چودہ سو سال کی تاریخ میں مجھے یہ کہیں نظر نہیں آیا کہ کسی مفتی یا قاضی نے ٹال مٹول کرنے والے پر "مالی معاوضہ" کا حکم دیا ہو بلکہ مجھے فقہاء کی کتابوں میں "مالی معاوضہ" کے خلاف ہی حکم نظر آیا جیسا کہ انشاء اللہ میں آگے ذکر کروں گا۔

جہاں تک حدیث "لاضرر ولاضرار" سے استدلال کا تعلق ہے تو اس میں تو کوئی شک نہیں کہ اس حدیث سے اتنی تو بات ثابت ہے کہ دوسرے کو نقصان پہونچانا حرام ہے اور اس نقصان کو جائز طریقے سے دفع کرنا بھی جائز ہے لیکن ہر نقصان "مالی معاوضہ" کے ذریعہ ہی دور کیا جائے؟ یہ اس حدیث سے ثابت نہیں اور نہ صراحۃً اور نہ اشارۃً یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ٹال مٹول کے نقصان کو مالی معاوضہ کے ذریعہ دور کیا جائے۔ اگر اس حدیث سے یہ بات ثابت ہوتی کہ ٹال مٹول کے نقصان کو "مالی معاوضہ" لازم کر کے دور کیا جائے تو اس صورت میں "مالی معاوضہ" لازم کر دینا واجب اور ضروری ہو جاتا۔ اور پھر قاضی کے ذمہ یہ ضروری ہوتا کہ وہ اس کے مطابق فیصلہ کرے اور ہر مفتی اس کے مطابق فتویٰ دے لیکن پوری تاریخ میں کہیں یہ بات نظر نہیں آتی کہ کسی قاضی نے "مالی معاوضہ" لازم کر دینے کا فیصلہ دیا ہو یا کسی مفتی نے فتویٰ جاری کیا ہو جب کہ ہر دور اور ہر جگہ دین کی ادائیگی میں ٹال

سے فوری فیصلے نمٹائیں۔

اور چونکہ آج تمام ممالک اور اسلامی ممالک میں یہ دونوں صورتیں عملاً موجود نہیں ہیں، اس لئے فی الوقت اس مشکل کا یہ بنیادی حل اسلامی بنکوں کے اختیار سے باہر ہے۔

اسی وجہ سے موجودہ دور کے بعض علماء نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ دین کی ادائیگی میں تاخیر کی وجہ سے جو واقعی نقصان لاحق ہو، اس نقصان کی تلافی کے لئے مدیون پر کوئی جرمانہ لازم کر دیا جائے، چنانچہ بعض اسلامی بنکوں نے یہ صورت اختیار کی ہے کہ اس مدت کے دوران اتنی مقدار کی رقم پر جتنا منافع بنک نے اپنے اکاؤنٹ ہولڈروں کے درمیان تقسیم کیا ہے، اس کے بقدر مالی معاوضہ اس ٹال مٹول کرنے والے مدیون سے وصول کیا جائے اور اگر اس مدت کے دوران بنک کو سرمایہ کاری کے ذریعہ کوئی منافع حاصل نہ ہو تو اس صورت میں بنک بھی اپنے مدیون سے دین کی ادائیگی میں تاخیر کرنے کا کوئی مالی معاوضہ وصول نہیں کرے گا، ہاں، اگر اس مدت کے دوران سرمایہ کے ذریعہ نفع حاصل ہوا ہے تو وہ بنک بھی اسی حساب سے مدیون سے مالی معاوضہ وصول کرے گا۔

مالی معاوضہ کو جائز قرار دینے والے علماء نے "مالی معاویہ" اور "سود" کے درمیان مندرجہ ذیل فرق بیان کیئے ہیں؛

۱... "سود" ہر حال میں مدیون پر لازم ہوتا ہے چاہے وہ تنگدست ہو یا مالدار ہو۔ جبکہ "مالی معاوضہ" صرف اس صورت میں لازم ہو گا جب مدیون مالدار ہو لیکن مدیون اگر تنگدست ہو تو اس صورت میں کوئی مالی معاوضہ اس پر لازم نہیں ہو گا۔

۲... "سود" دین کی ادائیگی میں تاخیر کے بعد فوراً لازم ہو جاتا ہے، چاہے وہ ایک دن کی تاخیر کیوں نہ ہو، جب کہ "مالی معاوضہ" اس وقت لازم کیا جاتا ہے جب یہ ثابت ہو جائے کہ وہ واقعۃً ٹال مٹول کر رہا ہے، چنانچہ بعض اسلامی بنکوں کا یہ اصول ہے کہ وہ ایسے مدیون کو دین ادا کرنے کی مدت گزر جانے کے بعد اور مالی معاوضہ لازم کرنے سے پہلے چار نوٹس بھیجتے ہیں، اور ہر نوٹس کے درمیان ایک ہفتے کا وقفہ ہوتا ہے، اس طرح "مالی معاوضہ" ادائے دین کی مدت گزرنے کے ایک ماہ بعد لازم کیا جاتا ہے۔

۳... "سود" مدیون پر ہر حال میں لازم ہو جاتا ہے جب کہ "مالی معاوضہ" اس وقت لازم کیا جاتا ہے جب اس مدت تاخیر کے دوران بنک کی سرمایہ کاری میں منافع حاصل ہوا ہو، لیکن اگر اس مدت کے دوران بنک کو اپنی سرمایہ کاری کے اندر منافع نہیں ہوا تو اس صورت میں بنک مدیون سے بھی کوئی "مالی معاوضہ" وصول نہیں کرے گا۔

۴... دین کے معاہدے کے وقت سے ہی طرفین کو "سود" کی شرح کے بارے میں معلوم ہوتا ہے کہ اس دین پر اتنی شرح سود ہو گی، لیکن مرابحہ یا اجارہ کے ایگریمنٹ کرتے وقت طرفین کو "مالی معاوضہ" کی شرح معلوم نہیں ہوتی بلکہ ادائے دین میں تاخیر کی مدت کے دوران بنک کو سرمایہ کاری کے ذریعہ جو منافع حاصل ہو گا۔ اس منافع کی بنیاد پر "مالی معاوضہ" کی شرح متعین ہو گی۔

میں تاخیر تنگدستی کی وجہ سے نہیں کرتا، بلکہ اس کا اصل مقصد دین کی ادائیگی میں ٹال مٹول کرنا ہوتا ہے، اور پھر آج کل جب کہ لوگوں میں دینی اور اخلاقی اقدار کی اہمیت بھی کم ہوگئی ہے اور دیانتداری اور امانتداری کا معیار بھی گر چکا ہے اس لئے اکثر لوگ پر دین کی ادائیگی کا اہتمام نہیں کرتے ہیں، جس کی وجہ سے دائن کو بعض اوقات ضرر عظیم لاحق ہوجاتا ہے، اور آج ہر دائن دین کی ادائیگی میں ٹال مٹول کی پریشانی کا شکار ہے اور اس ٹال مٹول کے نتیجے میں اسلامی بنکوں کو جو نقصان لاحق ہو رہا ہے وہ تو بیان سے باہر ہے، کیونکہ دوسری طرف سودی نظام میں تو سود کے اضافے کا خوف مدیون کو وقت پر دین کی ادائیگی کرنے پر مجبور کر دیتا ہے، اس لئے کہ اگر مدیون وقت پر دین کی ادائیگی کرنے میں کوتاہی کرے گا تو خود بخود اس دین پر دگنا سود ہو جائے گا....

لیکن اسلامی بنک وقت پر دین کی ادائیگی نہ کرنے یا اس میں ٹال مٹول کی وجہ سے شرعاً اس دین میں نہ تو اضافہ کر سکتے ہیں اور نہ اس پر سود لگا سکتے ہیں، جس کی وجہ سے دائن اس طریقے سے فائدہ اٹھاتا ہے، اور وہ جب تک چاہتا ہے دین کی ادائیگی میں ٹال مٹول کرتا رہتا ہے، جب کہ آج کے تجارتی نظام میں اور خاص کر موجودہ بینکنگ نظام میں وقت کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا دائنین کو اور خاص کر اسلامی بنکوں کو دین کی ادائیگی میں تاخیر اور ٹال مٹول کے نقصان سے بچانے کی کوئی صورت ہے یا نہیں؟

میرے خیال میں اگر تمام اسلامی بنک ایک شرعی طریقے کو اختیار کرنے پر اتفاق کریں تو اس صورت میں اس مشکل پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ اور وہ یہ کہ دین کی ادائیگی میں تاخیر کرنے والے کو آئندہ مستقبل میں بنک کی سہولتوں سے محروم کر دیا جائے اور اس کا نام بلیک لسٹ میں شامل کر دیا جائے۔ اور کوئی بنک اس کے ساتھ کسی قسم کے لین دین کا معاملہ نہ کرے۔ یہ سزا دینا شرعاً جائز ہے۔ اور حقیقت میں یہ طریقہ وقت پر دین کی ادائیگی کرنے کے لئے بہت اچھا دباؤ ہے جو سود کے مقابلے میں زیادہ مؤثر ہے، اسی طرح ایسے ٹال مٹول کرنے والے پر شرعاً تعزیر کی سزا بھی جاری کی جا سکتی ہے چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"مطل الغنی ظلم"

"مالدار کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے"

(صحیح بخاری، کتاب الاستقراض حدیث نمبر ۲۴۰۰)

اور دوسری حدیث میں فرمایا کہ:

"لی الواجد یحل عقوبته وعرضه"

مالدار شخص کا ٹال مٹول کرنا اس کی سزا اور اس کی آبرو کو حلال کر دیتا ہے۔

(ذکرہ البخاری فی الاستقراض تعلیقاً و اخرجه ابوداؤد والنسائی واحمد واسحاق فی مسندیهما عن عمرو بن الشرید رضی اللہ عنه واسنادہ حسن کما صرح به الحافظ ابن حجر فی فتح الباری ۵: ۶۲)

لیکن پہلا طریقہ یعنی اس کا نام بلیک لسٹ کرنا اس وقت کارگر اور مؤثر ہو سکتا ہے جب تمام بنک یہ طریقہ اختیار کرنے پر اتفاق کر لیں، اور جہاں تک دوسرے طریقے کا تعلق ہے یعنی اس پر کوئی سزا یا تعزیر جاری کرنا اس کیلئے ایسی شرعی عدالتوں کی ضرورت ہے جو تیزی

وَعِبَارَۃُ الْخُلَاصَۃِ : وَاِبْطَالُ الْاَجَلِ يَبْطُلُ بِالشَّرْطِ الْفَاسِدِ وَلَوْ قَالَ : كُلَّمَا دَخَلَ نَجْمٌ وَلَمْ تُؤَدِّ فَالْمَالُ حَالٌّ صَحَّ، وَالْمَالُ يَصِيْرُ حَالًا. فَجَعَلَهَا مَسْئَلَتَيْنِ وَهُوَ الصَّوَابُ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ. ذَكَرَہُ الْغَزِّيُّ.

"بزازیہ میں ہے کہ مدت کا ابطال شرط فاسد سے باطل ہوجاتا ہے مثلاً بائع یہ کہے کہ: اگر قسط ادا کرنے کا وقت آیا اور تم نے اس وقت قسط ادا نہیں کی تو اس صورت میں تمام دین فی الفور واجب الادا ہوگا تو یہ معاملہ درست ہے، اور دین فی الفور واجب الادا ہوگا۔ اور خلاصۃ الفتاویٰ کی عبارت یہ ہے کہ" مدت کا ابطال شرط فاسد سے باطل ہوجاتا ہے اور بائع یہ کہے کہ اگر قسط کی ادائیگی کے وقت تم نے قسط ادا نہ کی تو اس صورت میں تمام دین فی الفور واجب الادا ہوگا تو یہ شرط درست ہے، لہٰذا وقت پر قسط ادا نہ کرنے کی صورت میں دین فی الفور واجب الادا ہوگا، پس انہوں نے یہ دو مسئلے الگ الگ کردیئے اور یہی صحیح ہے۔ واللہ اعلم"۔

(الفوائد الخیریۃ علیٰ جامع الفصولین جلد ۲ صفحہ ۴، طبع مصر)

مندرجہ بالا فقہی نصوص اس شرط کے جواز پر دلالت کرتی ہیں، لہٰذا اس صورت میں اگر مشتری نے ادا قسط کے مقررہ وقت پر قسط ادا نہ کی تو بائع کے لئے یہ جائز ہوگا کہ وہ بقیہ اقساط کا فی الفور مطالبہ کرے لیکن جیسا کہ ہم نے بعض متاخرین حنفیہ کا مسلک مرابحہ کے بارے میں ذکر کرچکے ہیں۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ اگر بیع مرابحہ میں یہ صورت پیش آئے تو بائع صرف ماضی کے بقدر نفع کا مطالبہ کرسکتا ہے، اس سے زیادہ نفع کا مطالبہ نہیں کرسکتا۔ لہٰذا جو شخص اس فتوے پر عمل کرے، اس کو چاہئے کہ اس بیع بالتقسیط کے مسئلہ میں بھی اسی پر عمل کرے۔ البتہ جو شخص اس فتوے پر عمل نہ کرے جیسا کہ ہمارے نزدیک بھی مناسب یہی ہے۔ اس کیلئے پورے ثمن کی فی الفور ادائیگی ہی کا فتویٰ دیا جائیگا۔

ادا دین میں ٹال مٹول کے نقصان کا عوض

"بیع موجل" سے متعلق ایک مسئلہ اور بھی ہے، وہ یہ ہے کہ بعض اوقات مدیون مشتری وقت مقررہ پر دین کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہے، یا دین کی کسی قسط کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہے اس وقت یہ دیکھا جائے گا کہ مشتری کس وجہ سے دین کی ادائیگی میں کوتاہی کررہا ہے؟ اگر تنگدستی کی وجہ سے وقت پر دین ادا نہیں کررہا ہے تو اس کا حکم تو قرآن کریم کے اندر واضح ہے کہ:

"وَاِنْ كَانَ ذُوْعُسْرَۃٍ فَنَظِرَۃٌ اِلٰى مَيْسَرَۃٍ"

(سورۃ البقرہ: ۲۸۰)

"یعنی اگر مدیون تنگدست ہو تو اسکو فراخی ہونے تک مہلت دو" لہٰذا اس صورت میں دائن پر واجب ہے کہ وہ مدیون کو مہلت دے تاوقتیکہ اس کی تنگی دور نہ ہوجائے اور اس کے لئے دین کی ادائیگی ممکن ہو اور دوسری طرف دائن کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ (مدیون کے وقت پر ادا نہ کرنے پر) اپنے دین میں اضافہ کردے۔ اس لئے کہ اس اضافے کے سود ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔

البتہ بعض اوقات مدیون دین کی ادائیگی

اللہ علیہ نے اس مسئلہ کی علت بیان کرتے ہوئے اسی بات کی طرف اشارہ فرمایا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ:

"وَوَجْهُهُ أَنَّ الرِّبْحَ فِي مُقَابَلَةِ الْأَجَلِ، لِأَنَّ الْأَجَلَ وَإِنْ لَمْ يَكُنْ مَالًا وَلَا يُقَابِلُهُ شَيْءٌ مِنَ الثَّمَنِ لَكِنِ اعْتَبَرُوهُ مَالًا فِي الْمُرَابَحَةِ إِذَا ذُكِرَ الْأَجَلُ بِمُقَابَلَةِ زِيَادَةِ الثَّمَنِ، فَلَوْ أَخَذَ كُلَّ الثَّمَنِ قَبْلَ الْحُلُولِ كَانَ أَخْذُهُ بِلَا عِوَضٍ"

"اور اس کی توجیہ یہ بیان کی گئی کہ نفع "مدت" کے مقابلے ہے اس لئے کہ "مدت" اگرچہ مال نہیں ہے اور اس کے مقابلے میں ثمن نہیں ہوتا ہے لیکن بیع مرابحہ میں جب زیادتی ثمن کے مقابلے میں "مدت" ذکر کی جائے تو اس صورت میں اس "مدت" کو مال کا درجہ دے دیا جاتا ہے لہٰذا وقت ادائیگی سے پہلے اگر کسی نے سارا ثمن لے لیا تو یہ منافع بلا عوض ہوگا"

(رد المحتار ۶: ۷۵۷، قبیل کتاب الفرائض)

اگرچہ مندرجہ بالا توجیہ اور علت کچھ وزن رکھتی ہے لیکن "ضع وتعجل" کے قانون کے عدم جواز پر جو دلائل ہم نے پیچھے ذکر کئے ہیں، وہ ہر دین مؤجل پر ثابت ہوتے ہیں، ان میں "بیع مساومہ" اور "بیع مرابحہ" کا کوئی فرق نہیں، اور اگر مندرجہ بالا فتوے پر عمل کیا گیا تو اس صورت میں "بیع مرابحہ" اور "قسطوں پر بیع" کی ان سودی معاملات سے زیادہ مشابہت ہو جائے گی جن میں مختلف مدتوں کے ساتھ ارتباط کی وجہ سے اصل واجب ہونے والی رقم میں شک رہتا ہے کہ وہ کم ہوگی یا زیادہ۔ لہٰذا میری رائے میں "بیع بالتقسیط" اور "بیع مرابحہ" کے وہ معاملات جو اسلامی بینکوں میں رائج ہیں، ان میں مندرجہ بالا فتوے پر عمل کرنا مناسب نہیں ہے۔

کسی قسط کی ادائیگی میں کوتاہی

"قسطوں پر بیع" کے بعض ایگریمنٹ میں اس بات کی صراحت ہوتی ہے کہ اگر مشتری مقرر وقت پر کوئی قسط ادا نہ کرسکا تو اس صورت میں آئندہ کی باقی اقساط بھی فوراً ادا کرنا ضروری ہوگا اور بائع کے لئے فی الحال تمام اقساط کا مطالبہ کرنا جائز ہوگا، سوال یہ ہے کہ "بیع بالتقسیط" میں ایسی شرط لگانا جائز ہے؟

یہ مسئلہ بعض کتب حنفیہ میں مذکور ہے چنانچہ خلاصۃ الفتاوی میں ہے کہ:

"وَلَوْ قَالَ: كُلَّمَا دَخَلَ نَجْمٌ وَلَمْ تُؤَدِّ فَالْمَالُ حَالٌّ صَحَّ وَيَصِيرُ الْمَالُ حَالًّا"

"اور اگر (بائع نے) کہا کہ اگر قسط ادا کرنے کا وقت آیا اور تم نے قسط ادا نہیں کی تو اس صورت میں وہ مال فوراً واجب الادا ہوگا، یہ شرط صحیح ہے اور وہ مال فی الفور واجب الادا ہوگا۔"

(خلاصۃ الفتاوی ۳/۵۴ کتاب البیوع)

یہ مسئلہ فتاوی بزازیہ میں بھی غلط تعبیر کے ساتھ مذکور ہے جس کا مفہوم درست نہیں، اس لئے علامہ رملی رحمۃ اللہ علیہ نے جامع الفصولین کے حاشیے میں اس پر تنبیہ فرمائی ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

"فِي الْبَزَّازِيَّةِ: وَإِبْطَالُ الْأَجَلِ يَبْطُلُ بِالشَّرْطِ الْفَاسِدِ بِأَنْ قَالَ: كُلَّمَا حَلَّ نَجْمٌ وَلَمْ تُؤَدِّ، فَالْمَالُ حَالٌّ، صَحَّ، وَصَارَ حَالًّا اھ

ہے۔ دیکھئے ۳: ۴۴ا،۴۴ : ۳۶۳)

بعینہٖ یہی مسئلہ تنقیح الفتاوی الحامدیۃ میں بھی یہی مذکور ہے البتہ اس میں مندرجہ ذیل اضافہ بھی ہے:

"سُئِلَ فِيمَا إِذَا كَانَ لِزَيْدٍ بِذِمَّةِ عَمْرٍو مَبْلَغُ دَيْنٍ مَعْلُومٍ، فَرَابَحَهُ عَلَيْهِ إِلَى سَنَةٍ، ثُمَّ بَعْدَ ذَالِكَ بِعِشْرِينَ يَوْمًا مَاتَ عَمْرٌو الْمَدْيُونُ فَحَلَّ الدَّيْنُ، وَدَفَعَهُ الْوَرَثَةُ لِزَيْدٍ، فَهَلْ يُؤْخَذُ مِنَ الْمُرَابَحَةِ شَيْءٌ أَوْلَا؟

الجواب: جَوَابُ الْمُتَأَخِّرِينَ أَنَّهُ لَا يُؤْخَذُ مِنَ الْمُرَابَحَةِ الَّتِي جَرَتِ الْمُبَايَعَةُ عَلَيْهَا بَيْنَهُمَا إِلَّا بِقَدْرِ مَا مَضَى مِنَ الْأَيَّامِ. قِيلَ لِلْعَلَّامَةِ نَجْمِ الدِّينِ: أَتُفْتِي بِهِ؟ قَالَ: نَعَمْ كَذَا فِي الْأَنْقِرَوِيِّ وَالتَّنْوِيرِ، وَأَفْتَى بِهِ عَلَّامَةُ الرُّومِ مَوْلَانَا أَبُو السُّعُودِ"

"اس مسئلے کے بارے میں سوال کیا گیا کہ زید کا عمرو کے ذمہ دین معلوم تھا، اب زید نے عمرو کے ساتھ ایک سال کے لئے مرابحہ کرلیا، اور پھر بیس روز کے بعد عمرو مدیون کا انتقال ہوگیا (اور انتقال کی وجہ سے) دین کی فوری ادائیگی کی گئی اور عمرو کے ورثاء نے زید کا دین ادا کردیا، اب سوال یہ ہے کہ کیا زید کے لئے مرابحہ نفع وصول کرنا جائز ہے؟

متاخرین علماء کا جواب یہ ہے کہ زید اور عمرو کے درمیان ایک سال کے لئے جو مرابحہ کا معاملہ ہوا تھا اس میں سے صرف بیس روز کے بقدر نفع لے سکتا ہے، اس سے زیادہ نہیں لے سکتا۔ علامہ نجم الدین رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے اس مسئلہ کے بارے میں پوچھا کہ کیا آپ اس کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہاں: کذا فی الانقروی والتنویر اور روم کے کے علامہ ابو السعود رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی کے مطابق فتویٰ دیا ہے۔

(تنقیح الفتاوی الحامدیۃ، ۱: ۲۹۳، شرح المجلۃ للاتاسی ۲: ۴۵۰)

متاخرین حنفیہ کے اس فتویٰ نے "بیع مساومہ" اور اس "بیع مرابحہ" کے درمیان فرق کردیا ہے جس میں بائع مدت کے سبب سے زیادتی ثمن کی صراحت کردے لہٰذا "ضع وتعجل" کا قانون بیوع مساومہ میں تو جاری کرنا جائز نہیں، البتہ بیوع مرابحہ میں جائز ہے۔ شاید متاخرین حنفیہ کے اس فتوے کی بنیاد اس بات پر ہے کہ اگرچہ مدت مستقل طور پر قابل عوض ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتی لیکن ضمناً اور تبعاً اس کے مقابلے میں کچھ ثمن مقرر کرنا جائز ہے، جیسے گائے کے حمل کی بیع مستقلاً تو جائز نہیں لیکن اس حمل کی وجہ سے اس گائے کی قیمت میں اضافہ کرنا جائز ہے، چنانچہ کئی چیزوں کی بیع مستقلاً تو جائز نہیں ہوتی لیکن بعض اوقات تبعاً ان کا عوض لینا جائز ہوتا ہے، لہٰذا جب "مرابحہ" کی بنیاد اس بات پر ہے کہ اس میں نفع کی مقدار بیان کردی جائے تو پھر اس میں مدت کے مقابلے میں نفع کی زیادتی کرنا بھی جائز ہے۔ اور اس صورت میں "مدت"، "بمنزلہ" "وصف مبیع" کے ہوجائے گی، لہٰذا اگر ادائے دین کا وقت آنے سے پہلے دین ادا کردیا جائے یا مدیون کی موت واقع ہونے کی وجہ سے ادائیگی فوری ہوجائے تو ان دونوں صورتوں میں چونکہ وہ وصف ناقص ہوتی ہے اس لئے اس کے بقدر ثمن میں بھی کمی ہوجائے گی۔ علامہ ابن عابدین رحمۃ

بغیر کسی شرط کے دین جلدی ادا کردے۔

مرابحہ مؤجلہ میں "ضع وتعجل"

دین مؤجل میں تعجیل کی شرط کے ساتھ دین کا کچھ حصہ ساقط کرنا "بیع مساومہ" میں تو ناجائز ہے یعنی ان بیوع کے اندر تو ناجائز ہے جس میں بائع اپنا منافع بیان کئے بغیر اپنی چیز مشتری کے ہاتھ بھاؤ تاؤ کے ذریعہ فروخت کرتا ہے۔ ہاں! اگر "بیع مرابحہ" ہو جس میں بائع مدت کے مقابلے میں ثمن میں جو زیادتی کر رہا ہے اس کو صراحۃً بیان کردے، اس کے بارے میں متاخرین احناف کا فتویٰ یہ ہے کہ اس صورت میں اگر مدیون مدت مقررہ سے پہلے اپنا دین ادا کردے، یا مدت مقررہ آنے سے پہلے اس کا انتقال ہوجائے تو اس صورت میں بائع صرف اتنا ثمن وصول کریگا جتنا سابقہ ایام کے مقابل میں ہوگا اور مقررہ مدت تک جتنے ایام باقی ہیں اس کے مقابل کا ثمن چھوڑنا ہوگا، چنانچہ علامہ حصکفی رحمۃ اللہ علیہ درمختار میں فرماتے ہیں:

"قَضَی الْمَدْیُوْنُ الدَّیْنَ الْمُؤَجَّلَ قَبْلَ الْحُلُوْلِ أَوْ مَاتَ، فَحَلَّ بِمَوْتِهِ، فَأَخَذَ مِنْ تَرِکَتِهِ لَا یَأْخُذُ مِنَ الْمُرَابَحَةِ الَّتِیْ جَرَتْ بَیْنَهُمَا إِلَّا بِقَدْرِ مَا مَضَی مِنَ الْأَیَّامِ، وَهُوَ جَوَابُ الْمُتَأَخِّرِیْنَ، قُنْیَة. وَبِهِ أَفْتَی الْمَرْحُوْمُ أَبُو السُّعُوْدِ آفَنْدِیْ مُفْتِیْ الرُّوْمِ وَعَلَّلَهُ بِالرِّفْقِ لِلْجَانِبَیْنِ۔"

"اگر مدیون نے اپنا دین مؤجل وقت سے پہلے ادا کردیا یا ادائیگی کا وقت آنے سے پہلے اس کا انتقال ہوجائے تو اس کی موت کی وجہ سے دین کی فوری ادائیگی ہونے لگے، اب دائن جب اپنا دین اس کے ترکہ سے وصول کرے گا تو اس صورت میں دائن مرابحہ کہ صرف اتنا وصول کرسکتا ہے جتنا گزشتہ ایام کے مقابل میں ہو، اور یہ متاخرین (حنفیہ) کا مسلک ہے۔ قنیہ۔ مفتی روم علامہ ابو السعود آفندی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس پر فتویٰ دیا، اور اس کی علت یہ بیان کی ہے کہ اس میں جانبین کی رعایت موجود ہے۔"

اس عبارت کے تحت علامہ ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

"قَوْلُهُ لَا یَأْخُذُ مِنَ الْمُرَابَحَةِ، صُوْرَتُهُ: اشْتَرَی شَیْئًا بِعَشَرَةٍ نَقْدًا، وَبَاعَهُ لِآخَرَ بِعِشْرِیْنَ إِلَی أَجَلٍ، هُوَ عَشَرَةُ أَشْهُرٍ، فَإِذَا قَضَاهُ بَعْدَ تَمَامِ خَمْسَةِ (أَشْهُرٍ) أَوْ مَاتَ بَعْدَهَا یَأْخُذُ خَمْسَةً وَیَتْرُكُ خَمْسَةً"

"علامہ حصکفی کا یہ قول "لا یأخذ من المرابحۃ" اس کی صورت یہ ہوگی کہ ایک شخص نے ایک چیز دس درہم کی نقد خریدی، اور پھر وہی چیز دوسرے کو دس ماہ ادھار پر بیس روپے میں بیچ دی، اب اگر مشتری ثانی پانچ ماہ بعد اسکی قیمت ادا کرے یا مشتری کا پانچ ماہ بعد انتقال ہوجائے تو بائع صرف پانچ روپے منافع کے لے گا اور پانچ روپے چھوڑ دے گا"

(رد المحتار لابن عابدین، ۶: ۷۵۷- آخر الحظر والاباحۃ قبیل کتاب الفرائض، یہی مسئلہ کتاب البیوع میں "فصل فی القرض" سے پہلے بھی ذکر کیا ہے۔ وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ علامہ حانوتی علامہ نجم الدین اور علامہ ابو السعود نے بھی اسی پر فتویٰ دیا ہے۔ دیکھئے شامی ۵: ۱۶۰۔ اور یہی مسئلہ "حاشیۃ الطحطاوی علی الدر" میں بھی مذکور

میں علماء کا اختلاف ہے، امام ابو حنیفہؒ اور انکے اصحاب فرماتے ہیں کہ قرض چاہے موجل ہو یا موجل، دونوں صورتوں میں دائن اپنا قرض ب چاہے وصول کرنے کا حق رکھتا ہے، اور ریت وغیرہ کا بھی یہی حکم ہے اس لئے کہ یہ ت ان کے نزدیک وعدہ اور ہبہ غیر مقبوض کی ح ہے۔ حارث عکلی اور ان کے اصحاب اور امام راہیم نخعی کا بھی یہی قول ہے اور ابن ابی شیبہ ماتے ہیں کہ ہم بھی اس کو اختیار کرتے ہیں امام لکؒ اور ان کے اصحاب فرماتے ہیں کہ جب ی مدت تک کے لئے قرض دے دیا تو پھر دائن ں مدت سے پہلے قرض واپس لینا چاہے تو پس نہیں لے سکتا۔"

لہٰذا جو فقہاء اور علماء یہ کہتے ہیں کہ "قرض وجل کرنے سے موجل نہیں ہوتا" انکے نزدیک ضع وتعجل" کا اصول قرض میں جائز ہے اس لئے ،ان کے نزدیک قرض دیون حالہ میں سے ہے، ذر" دیون حالہ" میں "ضع وتعجل" کا اصول جاری ،نا جائز ہے اور اس کی اصل حضرت کعب بن لک رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے، وہ یہ ہے کہ ضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کا حضرت عبداللہ ن ابی حدرد اسلمی رضی اللہ عنہ پر دین تھا۔ جب ضرت کعبؓ کی حضرت عبداللہؓ سے ملاقات ہوئی و ان کو پکڑ لیا اور دونوں قرض پر زور زور سے فتگو کرنے لگے۔ اتنے میں حضور اقدس صلے اللہ لیہ وسلم وہاں سے گزرے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ یہ دونوں قرض پر جھگڑ رہے ہیں و آپ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت کعبؓ سے خاطب ہو کر فرمایا: اے کعب! اور پھر آپ نے پنے ہاتھ سے اس طرح اشارہ فرمایا گویا کہ آپ

فرما رہے ہیں کہ نصف قرض لے لو اور نصف چھوڑ دو، چنانچہ انہوں نے نصف لے لیا اور نصف چھوڑ دیا۔

(امام بخاریؒ نے صحیح بخاری میں اس کو کئی جگہ روایت کیا ہے اور یہ الفاظ "کتاب الخصومات' باب فی الملازمۃ، حدیث نمبر ۲۴۲۴" میں مذکور ہیں)

دین کا کچھ حصہ چھوڑ دینا

دین موجل اگر جلد ادا کر دیا جائے تو اس صورت میں دین کا کچھ حصہ چھوڑنا اس وقت جائز ہے جب یہ "چھوڑنا" تعجیل کے لئے شرط نہ ہو، بلکہ تبرعاً دائن کچھ دین ساقط کر دے لیکن اگر یہ سقوط تعجیل کے ساتھ مشروط ہو تو اس صورت میں سقوط اور کمی جائز نہیں، چنانچہ علامہ جصاص رحمۃ اللہ علیہ نے "ضع وتعجل" کے جواز پر جتنے آثار اور روایات ملی ہیں ان کو اسی پر محمول کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

"وَمَنْ اَجَازَ مِنَ السَّلَفِ اِذَا قَالَ: عَجِّلْ لِیْ اُضَعْ عَنْكَ، فَجَائِزٌ اَنْ یَّكُوْنَ اَجَازُوْهُ اِذَا لَمْ یَجْعَلْهُ شَرْطًا فِیْهِ وَذٰلِكَ بِاَنْ یَّضَعَ عَنْهُ بِغَیْرِ شَرْطٍ، وَیُعَجِّلُ الْاٰخَرُ الْبَاقِیْ بِغَیْرِ شَرْطٍ"

(احکام القرآن للجصاص ج ۱ ص ۴۶۷ آیت ربا)

"جن اسلاف نے اس صورت کو جائز قرار دیا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے مدیون سے کہے کہ "تم میرا دین جلد ادا کر دو، میں تمہیں کچھ دین معاف کر دوں گا" بظاہر تو انہوں نے جواز کا یہ قول اس صورت میں اختیار کیا ہے جبکہ دین میں یہ کمی تعجیل کے ساتھ مشروط نہ ہو، دائن بغیر شرط کے دین کا کچھ حصہ ساقط کر دے اور مدیون

وَيُسْقِطَ الْبَعْضَ "

(المسوی علی المصفی ۲: ۳۸۲)

"اہل علم اس واقعہ کے درمیان اور ان آثار کے درمیان جو "ضع وتعجل" کے بارے میں مروی ہیں اس طرح تطبیق دیتے ہیں کہ ان آثار اور روایات کا تعلق دین موجل سے ہے اور یہ واقعہ دین حال سے متعلق ہے اور کتاب الرحمہ میں ہے کہ اگر ایک شخص کا دوسرے پر کسی مدت کے لئے دین واجب ہو تو دائن کو مدت کے آنے سے پہلے یہ کرنا جائز نہیں کہ دین کا کچھ حصہ معاف کردے تاکہ بقیہ دین فوراً وصول کرلے..... ہاں! اس میں کوئی حرج نہیں کہ جب دین کی ادائیگی کا وقت آجائے اس وقت کچھ دین وصول کرلے اور باقی معاف کردے "

دیون موجلہ اور دیون حالہ میں فرق اس لحاظ سے بالکل واضح ہے کہ دین حال میں مدت کی شرط نہیں ہوتی اور "تاخیر" مدیون کا حق نہیں ہوتا، لہٰذا چونکہ اس میں "مدت" منتفی ہے، اس لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ دین کا جو حصہ معاف کردیا ہے وہ "مدت" کے عوض معاف کیا ہے لہٰذا اس میں ربا کے معنی نہیں پائے جاتے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ قرض حسن، حنفیہ، شوافع اور حنابلہ کے نزدیک موجل کرنے سے موجل نہیں ہوتا (یعنی قرض میں مدت ذکر کرنے سے وہ مدت لازم نہیں ہوتی) مالکیہ کے نزدیک قرض موجل ہوجاتا ہے۔ علامہ ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

" وَاِنْ اَجَّلَ الْقَرْضَ لَمْ يَتَاَجَّلْ وَكَانَ حَالًّا وَكُلُّ دَيْنٍ حَلَّ اَجَلُهُ لَمْ يَصِرْ مُؤَجَّلًا بِتَاجِيْلِهِ، وَبِهٰذَا قَالَ الْحَارِثُ الْعَكْلِيُّ وَالْاَوْزَاعِيُّ وَابْنُ الْمُنْذِرِ وَالشَّافِعِيُّ وَقَالَ مَالِكٌ وَاللَّيْثُ: يَتَاَجَّلُ الْجَمِيْعُ بِالتَّاجِيْلِ.... وَقَالَ اَبُوْحَنِيْفَةَ فِي الْقَرْضِ وَبَدَلِ الْمُتْلَفِ كَقَوْلِنَا "

" قرض موجل کرنے سے موجل نہیں ہوتا بلکہ ادائیگی فوری واجب رہے گی اور ہر وہ دین جس کی ادائیگی کا وقت آچکا ہو، اب وہ دین موجل کرنے سے موجل نہیں ہوگا، امام حارث العکلی امام اوزاعی، ابن منذر اور امام شافعی کا یہی قول ہے اور امام مالک اور امام لیث فرماتے ہیں کہ ہر قرض موجل کرنے سے موجل ہوجاتا ہے..... قرض اور ہلاک شدہ چیز کے بدل کے بارے میں امام ابوحنیفہ کا بھی وہی قول ہے جو ہمارا ہے"

علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"اِخْتَلَفَ الْعُلَمَاءُ فِي تَاخِيْرِ الدَّيْنِ اِلٰى اَجَلٍ، فَقَالَ اَبُوْحَنِيْفَةَ وَاَصْحَابُهُ: سَوَ كَانَ الْقَرْضُ اِلٰى اَجَلٍ اَوْ غَيْرِ اَجَلٍ لَهُ اَنْ يَاْ مَتٰى اَحَبَّ وَكَذٰلِكَ الْعَارِيَةُ وَغَيْرُهَا، لِا عِنْدَهُمْ مِنْ بَابِ العدة والهبة غَيْرِ مَقْبُو وَهُوَ قَوْلُ الْحَارِثِ الْعَكْلِيِّ وَاَصْحَابِهِ وَاِبْرَ النَّخَعِيِّ. وَقَالَ ابْنُ اَبِيْ شَيْبَةَ: وَبِهِ نَا. وَقَالَ مَالِكٌ وَاَصْحَابُهُ: اِذَا اَقْرَضَهُ اِلٰى ثُمَّ اَرَادَ اَنْ يَاْخُذَ قَبْلَ الْاَجَلِ لَمْ يَكُنْ لَهُ ذ

(عمدۃ القاری للعینی، ۲: ۶۰، کتاب الاستـ باب اذا اقرضہ الی اجل مسمی، مزید د احکام القرآن للجصاص ج ۱ ص ۴۸۳ - آیۃ کے تحت، فتح الباری ج ۵ ص ۶۶، مسـ مع المصفی ج ۲ ص ۳۸۲ ۔ تنقیح الحامد ج ۱ ص ۲۷۷ ۔ شرح المجلۃ للاتاسی ص ۴۳۹)

کسی مدت تک دین کو موخر کرنے کے

تو بقیہ دین معاف ہے، یا تو تم ابھی نقد ادا کرو، یا فلاں وقت تک ادا کر دو، لہٰذا اگر مدیون فوراً ادا کر دے، یا اس کی مقرر کردہ مدت پر ادا کر دے مگر صرف ایک درہم یا نصف درہم یا کچھ زیادہ باقی رہ جائے تو کیا اس صورت میں بھی دائن کے لئے اسقاط دین لازم ہوگا جس کا اس نے وعدہ کیا تھا یا نہیں؟ جواب میں فرمایا کہ میری رائے میں اگر مدیون نے پوری رقم ادا نہیں کی تو اس صورت میں اسقاط دین دائن پر لازم نہیں ہوگا، اور میری رائے میں اسقاط دین شرط ادا پر موقوف تھا۔ محمد بن رشد فرماتے ہیں کہ اس میں چار اقوال ہیں، اور ایک قول وہی ہے جو اس روایت میں ہے اور یہی اصبغ اور واضحہ کا قول ہے اور مدونۃ الکبریٰ کی کتاب الصلح کے آخر میں بھی یہی قول مذکور ہے، وہ یہ کہ دائن پر دین میں کمی کرنا اس وقت تک لازم نہیں ہوگا جب تک مدیون مقررہ مدت پر پورا دین ادا نہ کر دے، اور یہی سب سے زیادہ صحیح قول ہے۔"

(تحریر الکلام فی مسائل الالتزام للحطاب ص ۲۳۱۔ دیکھئے فتح العلی المالک ج۱ ص ۲۸۹)

یہ عبارات اس بارے میں بالکل صریح ہیں کہ علماء مالکیہ کے نزدیک دیون حالہ میں "ضع وتعجل" کا اصول جاری کرنا جائز ہے، اور ظاہر یہ ہے کہ فقہاء مالکیہ کے علاوہ دوسرے فقہاء بھی اس مسئلہ میں ان کے ساتھ متفق ہیں اس لئے کہ دوسرے علماء نے جہاں کہیں "ضع وتعجل" کے حرام ہونے کا ذکر کیا ہے، وہاں "دیون مؤجلہ" کی قید بھی لگائی ہے جیسا کہ موطا میں امام محمد بن حسنؒ کی ذکر کردہ عبارت اور اس پر قائم کئے گئے ترجمۃ الباب سے بھی ظاہر ہو رہا ہے، اسی طرح علامہ ابن قدامہؒ نے بھی اس مسئلہ کو "دین مؤجل" کے ساتھ مقید کیا ہے (دونوں کی عبارات پیچھے گزر چکی ہیں) اور یہ بات بداہت کے ساتھ ثابت ہے کہ کتب فقہ میں مفہوم مخالف حجت ہوتا ہے، لہٰذا اس سے ظاہر ہوا کہ دیون حالہ میں "ضع وتعجل" جائز ہے، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نصف دین ساقط کر دینے کے بارے میں حضرت کعب اور حضرت ابن ابی حدرد رضی اللہ عنہما کا واقعہ ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ:

"فَقَالَ اَهْلُ الْعِلْمِ فِی التَّطْبِیقِ بَیْنَهٗ وَ بَیْنَ هٰذِهِ الْاٰثَارِ، اَنَّ الْاٰثَارَ فِی الْمُؤَجَّلِ وَ هٰذَا فِی الْحَالِ وَفِی کِتَابِ الرَّحْمَةِ: اِتَّفَقُوْا عَلٰی اَنَّ مَنْ کَانَ لَهٗ دَیْنٌ عَلٰی اِنْسَانٍ اِلٰی اَجَلٍ فَلَا یَحِلُّ لَهٗ اَنْ یَّضَعَ عَنْهُ بَعْضَ الدَّیْنِ قَبْلَ الْاَجَلِ لِیُعَجِّلَ لَهُ الْبَاقِیْ..... عَلٰی اَنَّهٗ لَا بَاْسَ اِذَا حَلَّ الْاَجَلُ اَنْ یَّاْخُذَ الْبَعْضَ

اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سنتے، جانتے ہیں (القرآن)

ذٰلِكَ: هَلْ تَكُوْنُ الْوَضِيْعَةُ لَازِمَةً؟ فَقَالَ: مَا اَرَى الْوَضِيْعَةَ تَلْزَمُهُ اِذَا لَمْ يُعَجِّلْ لَهُ جَمِيْعَ ذٰلِكَ. وَاَرَى الَّذِىْ لَهُ الْحَقُّ عَلٰى شَرْطِهِ، قَالَ مُحَمَّدُ بْنُ رُشْدٍ: هٰذِهِ مَسْئَلَةٌ يَتَحَصَّلُ فِيْهَا اَرْبَعَةُ اَقْوَالٍ: اَحَدُهُمَا قَوْلُهُ فِىْ هٰذِهِ الرِّوَايَةِ وَهُوَ قَوْلُ اَصْبَغَ فِى الْوَاضِحَةِ وَمِثْلُهُ فِىْ آخِرِ كِتَابِ الصُّلْحِ مِنَ الْمُدَوَّنَةِ اَنَّ

الْوَضِيْعَةَ لَا تَلْزَمُهُ اِلَّا اَنْ يُعَجِّلَ لَهُ جَمِيْعَ مَا شَرَطَ اِلَى الْاَجَلِ الَّذِىْ سَمّٰى وَهُوَ اَصَحُّ الْاَقْوَا
نوازل کی کتاب المدیان والتفلیس میں
عیسیٰ سے نقل کرتے ہوئے ذکر کیا ہے کہ ا
سے یہ مسئلہ پوچھا گیا کہ اگر ایک شخص اپنے ا
غریم (مدیون) سے کہے جس کے دین کی ادائ
کا وقت آچکا ہو: اگر تم نے میرا اتنا حق ادا کر

چنانچہ مندرجہ بالا نصوص فقہیہ کی بنیاد پر مدت کے مقابلے میں دین کے کچھ حصے کے سقوط کی حرمت کو راجح قرار دیا گیا ہے۔

"ضع وتعجل" کا اصول نافذ کرنا

مندرجہ بالا تفصیل سے ظاہر ہو رہا ہے کہ "ضع وتعجل" کی ممانعت صرف دیون مؤجلہ میں ہے، جہاں تک دیون حالہ کا تعلق ہے جن کی ادائیگی کے بارے میں عقد کے اندر کسی مدت کو شرط قرار نہیں دیا گیا ہے بلکہ مدیون ان کی ادائیگی میں کسی بھی وجہ سے تاخیر کر رہا ہے تو ظاہر یہی ہے کہ ایسے دیون میں دین کے کچھ حصے کو چھوڑنے پر صلح کرنے میں کوئی حرج نہیں، بشرطیکہ مدیون باقی دین فوراً ادا کر دے۔ علماء مالکیہ نے اس کے جواز کی تصریح کی ہے، چنانچہ المدونۃ الکبریٰ میں ہے کہ:

"قُلتُ: أرأيتَ لو أنّ لي على رجلٍ ألفَ درهمٍ قد حلّت، فقلتُ: اشهدوا إن أعطاني مائةَ درهمٍ عندَ رأسِ الشهرِ فالتسعُ مائةِ درهمٍ له، وإن لم يُعطِني فالألفُ كلُّها عليه، قال مالكٌ: لا بأسَ بهذا، وإن أعطاه رأسَ الهلالِ فهو كما قال، وتُوضَعُ عنه التسعُ مائة، فإن لم يُعطِه رأسَ الهلالِ فالمالُ كلُّه عليه"
(المدونۃ الکبریٰ ج ۱۱ ص ۲۷ آخر کتاب الصلح)

"میں نے ان سے کہا، اس مسئلے میں آپ کی کیا رائے ہے کہ اگر ایک شخص کے ذمہ میرے ایک ہزار روپے دین ہوں اور اس کی ادائیگی کا وقت آچکا ہو اور میں اس سے کہوں کہ اگر تم نے مہینہ شروع ہونے پر سو درہم ادا کر دیئے تو نو سو درہم تمہارے ہیں، اور اگر تم نے ادا نہیں کئے تو پھر پورے ایک ہزار درہم ادا کرنے پڑیں گے؟ اس کے جواب میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس میں کوئی حرج نہیں۔ اگر وہ مہینے کے شروع میں سو درہم ادا کر دے تو پھر ایسا ہی ہوگا جیسے تم نے کہا، اور نو سو درہم اس سے ساقط ہو جائیں گے، اور اگر مہینے کے شروع میں اس نے سو درہم ادا نہیں کئے تو پھر پورا دین اس کے ذمہ رہے گا۔"

پھر اس کے بعد اسی قسم کا ایک اور مسئلہ ذکر فرمایا کہ:

"قُلتُ: أرأيتَ لو أنّ لي على رجلٍ مائةَ دينارٍ ومائةَ درهمٍ حالّة فصالحتُه من ذلك على مائةِ دينارٍ ودرهمٍ نقداً، قال: لا بأسَ بذلك."
(المدونۃ الکبریٰ ج ۱۱ ص ۲۷ آخر کتاب الصلح)

"میں نے ان سے کہا کہ اس مسئلہ میں آپ کی کیا رائے ہے کہ اگر کسی کے ذمہ میرے ایک سو دینار اور ایک سو درہم فی الحال واجب ہوں، اور میں اس سے سو دینار اور ایک درہم نقد پر صلح کر لوں تو کیا یہ جائز ہے؟ امام مالک نے فرمایا اس میں کوئی حرج نہیں۔"

اور علامہ حطاب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"وما ذكره عن عيسى هو في نوازله من كتاب المديان والتفليس ونصّه: وسُئل عن الرجل يقول لغريمه وقد حلّ حقّه: إن عجّلتَ لي كذا وكذا من حقّي فبقيّته عنك موضوع، إن عجّلتَه لي نقداً الساعةَ أو إلى أجلٍ يُسمّيه. فعجّل له نقداً أو إلى الأجل، إلا الدرهم أو النصف أو الأكثر من

اور علامہ ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ "المغنی" میں فرماتے ہیں:

"إذا كان عليه دين مؤجل فقال لغريمه: ضع عني بعضه وأعجل لك بقيته، لم يجز، كرهه زيد بن ثابت وابن عمر والمقداد وسعيد بن المسيب وسالم والحسن وحماد والحكم والشافعي ومالك والثوري وهشيم وابن علية وإسحق وأبو حنيفة. وقال المقداد لرجلين فعلا ذلك: كلاكم قد آذن بحرب من الله ورسوله. وروي عن ابن عباس أنه لم ير به بأسا. وروي ذلك عن النخعي وأبي ثور، لأنه آخذ بعض حقه، تارك لبعضه، فجاز. كما لو كان الدين حالا، وقال الخرقي: لا بأس أن يعجل المكاتب لسيده ويضع عنه بعض كتابته، ولنا أنه بيع الحلول فلم يجز، كما لو زاده الذي له الدين فقال: أعطيك عشرة دراهم وتعجل لي المائة التي عليك فأما المكاتب فإن معاملته مع سيده وهو يبيع بعض ماله ببعض فدخلت المسامحة فيه ولأنه سبب العتق فسومح فيه بخلاف غيره."

"اگر ایک شخص کا دوسرے پر دین موجل ہو، اب وہ شخص اپنے غریم (قرض خواہ) سے کہے کہ مجھ سے دین کا کچھ حصہ ساقط کردو، بقیہ دین میں فوراً ادا کردوں گا، یہ صورت جائز نہیں، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابن عمر، حضرت مقداد، حضرت سعید بن المسیب اور حضرت سالم، حضرت حسن، حضرت حماد، حضرت حکم، امام شافعی، امام مالک، امام ثوری اور حضرت ہشیم، حضرت علیہ، امام اسحق اور امام ابوحنیفہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے اس صورت کو ناپسند قرار دیا ہے اور حضرت مقداد رضی اللہ عنہ نے ایسے دو شخصوں کو جنہوں نے ایسا معاملہ کیا تھا، خطاب کرتے ہوئے فرمایا: تم دونوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کا اعلان کیا ہے، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اس معاملے میں کوئی حرج نہیں ہے اور امام نخعی، امام ابوثور سے بھی یہی منقول ہے اس لئے کہ اس صورت میں قرضخواہ اپنے حق کا کچھ حصہ وصول کر رہا ہے اور کچھ حصہ معاف کر رہا ہے لہٰذا یہ صورت جائز ہے جیسا کہ دین حال (نقد) میں یہ صورت جائز ہوتی ہے۔ اور امام خرقی فرماتے ہیں کہ اگر مکاتب غلام اپنے آقا کو بدل کتابت جلد ادا کردے، اور اس کے بدلے میں آقا کچھ بدل کتابت معاف کردے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ ہمارے نزدیک چونکہ مذکورہ صورت میں مدت کی بیع ہو رہی ہے اس لئے جائز نہیں ہے جیسے کہ اگر قرض خواہ دین میں اضافہ کرتے ہوئے مقروض سے کہے کہ تم میرا سو درہم کا قرض فوراً ادا کردو، میں تمہیں دس درہم دوں گا، ظاہر ہے کہ یہ صورت جائز نہیں جہاں تک مکاتب غلام کا تعلق ہے، چونکہ اس کا معاملہ اپنے مولیٰ کے ساتھ ہو رہا ہے اور گویا کہ مولیٰ اپنے ایک مال کو دوسرے مال کے عوض فروخت کر رہا ہے اس لئے اس کے جواز میں مسامحت سے کام لیا گیا ہے، دوسرے اس لئے کہ یہ صورت اس غلام کی فوری آزادی کا سبب بھی بن رہی ہے اس لئے بھی اس میں تسامح سے کام لیا گیا ہے بخلاف مذکورہ صورت کے (اس میں یہ بات نہیں پائی جارہی ہے)

(مغنی لابن قدامہ مع الشرح الکبیر ۴/ ۱۷۴، ۷۵)

نے اصل راس المال جو اسی دینار تھے اس پر اس سے صلح کرلی اور جو زائد (سود کے) چالیس دینار تھے ان کو چھوڑ دیا۔"

(مغازی الواقدی ج ۱ ص ۳۷۴۔ علامہ واقدی لکھتے ہیں کہ قبیلہ بنی قینقاع کی جلاوطنی کے وقت بھی بعینہ یہی قصہ پیش آیا تھا۔ دیکھیے ص ۱۷۹ ج ۱)

یہ روایت اس بارے میں بالکل صریح ہے کہ دین کا جو حصہ ساقط کیا گیا تھا وہ سود ہی تھا اصل راس المال کا حصہ نہیں تھا۔

اس لئے جمہور علماء کے نزدیک "ضع وتعجل" (کچھ ساقط کرو اور فوراً دے دو) کا معاملہ حرام ہے، چنانچہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ حضرت زید بن ثابت اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے آثار ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ:

"قَالَ مَالِكٌ: وَالْأَمْرُ الْمَكْرُوهُ الَّذِي لَا اخْتِلَافَ فِيهِ عِنْدَنَا أَنْ يَكُونَ لِلرَّجُلِ عَلَى الرَّجُلِ الدَّيْنُ إِلَى أَجَلٍ، فَيَضَعُ عَنْهُ الطَّالِبُ وَيُعَجِّلُهُ الْمَطْلُوبُ .... قَالَ مَالِكٌ: وَذٰلِكَ عِنْدَنَا بِمَنْزِلَةِ الَّذِي يُؤَخِّرُ دَيْنَهُ بَعْدَ مَحِلِّهِ عَنْ غَرِيمِهِ وَيَزِيدُهُ الْغَرِيمُ فِي حَقِّهِ قَالَ: فَهٰذَا الرِّبَا بِعَيْنِهِ لَا شَكَّ فِيهِ"!

"امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وہ امر مکروہ جس میں ہمارے نزدیک کوئی اختلاف نہیں ہے، وہ یہ ہے کہ اگر ایک شخص کا دوسرے شخص کے ذمہ کسی مدت پر دین واجب ہو، اور وہ دائن (طالب) دین کا کچھ حصہ ساقط کر کے بقیہ دین کا فوری مطالبہ کرے۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ یہ صورت ہمارے نزدیک اس صورت ہی کی طرح ہے کہ کوئی شخص مدیون کو ادائے دین کی تاریخ کے بعد اور مہلت دے دے اور وہ مدیون اس مہلت کے بدلے دین میں کچھ اضافہ کر دے۔ فرماتے ہیں کہ یہ صریح ربا ہے، جس میں کسی شک کی گنجائش نہیں۔"

(موطا امام محمد، کتاب البیوع، باب ماجاء فی الربا فی الدین ج ۱ ص ۶۰۶)

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ موطا امام محمد میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا اثر ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ:

"قَالَ مُحَمَّدٌ: وَبِهٰذَا نَأْخُذُ. مَنْ وَجَبَ لَهُ دَيْنٌ عَلَى إِنْسَانٍ إِلَى أَجَلٍ، فَسَأَلَ أَنْ يَضَعَ عَنْهُ وَيُعَجِّلَ لَهُ مَا بَقِيَ، لَمْ يَنْبَغِ ذٰلِكَ، لِأَنَّهُ يُعَجِّلُ قَلِيلًا بِكَثِيرٍ دَيْنًا، فَكَأَنَّهُ يَبِيعُ قَلِيلًا نَقْدًا بِكَثِيرٍ دَيْنًا وَهُوَ قَوْلُ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ وَزَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ وَعَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ"

"امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ہم اس سے استدلال کرتے ہیں، اگر ایک شخص کا دوسرے شخص کے ذمہ کسی مدت پر دین واجب ہو، اور وہ اس سے کہے کہ وہ اس کا کچھ دین ساقط کر دے گا بشرطیکہ وہ بقیہ دین فوراً ادا کر دے تو یہ صورت درست نہیں، اس لئے کہ اس صورت میں وہ دین کثیر کے بدلے میں دین قلیل کو جلد طلب کر رہا ہے، گویا کہ وہ قلیل نقد کو کثیر دین کے عوض فروخت کر رہا ہے، یہی قول حضرت عمر بن الخطاب، حضرت زید بن ثابت اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا ہے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی مسلک ہے۔"

(موطا امام محمد ج ۱ ص ۳۳۲ باب الرجل بیع المتاع اوغیرہ نسیئۃ ثم یقول: انقدنی واضع عنک)

"وَلَمَّا اَجْلَى بَنِي النَّضِيْرِ قَالُوْا: اِنَّ لَنَا دُيُوْنًا عَلَى النَّاسِ، فَقَالَ: ضَعُوْا وَتَعَجَّلُوْا، وَمَعْلُوْمٌ اَنَّ مِثْلَ هٰذِهِ الْمُعَامَلَةِ لَا يَجُوْزُ بَيْنَ الْمُسْلِمِيْنَ، فَاِنَّ مَنْ كَانَ لَهٗ عَلٰى غَيْرِهٖ دَيْنٌ اِلٰى اَجَلٍ فَوَضَعَ عَنْهُ بَعْضَهٗ بِشَرْطِ اَنْ يُّعَجِّلَ بَعْضَهٗ لَمْ يَجُزْ. كَرِهَ ذٰلِكَ عُمَرُ وَزَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ وَابْنُ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ"

(شرح السیر الکبیر للسرخسی، ج ۴: ۱۲/۱۴ فقرہ نمبر ۲۷۳۸۔ پھر دوبارہ یہی مسئلہ صلاح الدین کی تحقیق کے ساتھ ج ۴: ۱۹۴ فقرہ نمبر ۱۲۹۲ پر ذکر کیا گیا ہے)

"جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو نضیر کو جلاوطن کر دیا تو وہ لوگ حضور کے پاس آئے اور کہا کہ لوگوں پر ہمارے دین ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: دین کا کچھ ساقط کر دو اور بقیہ دین فوراً لے لو اور یہ بات طے ہے کہ مسلمان کے درمیان آپس میں یہ معاملہ ناجائز ہے اس لئے کہ اگر کسی شخص کا دوسرے کے ذمہ دین ہو اور دین کی ادائیگی کا وقت ابھی نہ آیا ہو تو وہ دائن اگر اس شرط پر دین کا کچھ حصہ چھوڑ دے کہ مدیون دین فوراً ادا کر دے تو یہ معاملہ جائز نہیں اور حضرت عمر، حضرت زید بن ثابت اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم نے اس معاملہ کو مکروہ کہا ہے۔

اس جواب کا حاصل یہ ہے کہ چونکہ اس وقت مسلمان بنی نضیر کے ساتھ حالت جنگ میں تھے اور اس وقت ان کے لئے بنی نضیر کے پورے مال پر قبضہ کر لینا بھی جائز تھا۔ لہٰذا اگر مسلمانوں نے ان کے دین کا بعض حصہ کم کر دیا تو یہ بطریق اولیٰ جائز ہوگا۔

بنی نضیر کے قصہ سے استدلال درست نہ ہونے کی چوتھی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر یہود دوسرے لوگوں سے سود پر لین دین کا معاملہ کرتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کے جس حصے کو ساقط کرنے کا حکم فرمایا ہے اس سے مراد وہ سود ہے جو راس المال سے زائد ہو، راس المال میں کمی کرنے کا حکم نہیں دیا، اس بات کی تائید واقدی کی عبارت سے ہوتی ہے جو انہوں نے اس واقعہ کے بیان میں لکھی ہے، وہ لکھتے ہیں:

"فَاَجْلَاهُمْ (اَيْ بَنِي النَّضِيْرِ) رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْمَدِيْنَةِ وَوَلّٰى اِخْرَاجَهُمْ مُحَمَّدَ بْنَ مَسْلَمَةَ، فَقَالُوْا: اِنَّ لَنَا دُيُوْنًا عَلَى النَّاسِ اِلٰى آجَالٍ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: تَعَجَّلُوْا وَضَعُوْا۔ فَكَانَ لِاَبِيْ رَافِعٍ سَلَّامِ بْنِ الْحُقَيْقِ عَلٰى اُسَيْدِ بْنِ حُضَيْرٍ عِشْرُوْنَ وَمِائَةُ دِيْنَارٍ اِلٰى سَنَةٍ فَصَالَحَهٗ عَلٰى اَخْذِ رَاْسِ مَالِهٖ ثَمَانِيْنَ دِيْنَارًا وَاَبْطَلَ مَا فَضَلَ"

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ بنو نضیر کو مدینہ سے جلاوطن کر دیا اور حضرت محمد بن مسلمہ کو اس کا نگراں مقرر فرمایا، اس وقت وہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور آکر کہا کہ لوگوں پر ہمارے دین واجب ہیں، جن کی ادائیگی مختلف مدتوں پر ہوتی ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جلدی لے لو اور ساقط کر دو اور ابی رافع سلام بن الحقیق کے حضرت اسید بن حضیر کے ذمہ ایک سو بیس دینار دین تھے جن کی واپسی سال گزرنے پر ہونی تھی۔ چنانچہ حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ

ہیں۔

پہلی حدیث وہ ہے جو امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ :

"لَمَّا اَمَرَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بِاِخْرَاجِ بَنِی النَّضِیْرِ مِنَ الْمَدِیْنَةِ جَاءَهُ نَاسٌ مِّنْهُمْ، فَقَالُوْا : یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! اِنَّكَ اَمَرْتَ بِاِخْرَاجِهِمْ وَلَهُمْ عَلَی النَّاسِ دُیُوْنٌ لَمْ تَحِلَّ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: ضَعُوْا وَتَعَجَّلُوْا"

(السنن الکبریٰ للبیهقی، ۶ : ۲۸، کتاب البیوع باب من عجل له ادنی من حقه)

"جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی نضیر کو مدینہ طیبہ سے نکل جانے کا حکم فرمایا تو کچھ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ ! آپ نے بنی نضیر کو مدینہ سے نکلنے کا حکم فرمایا ہے حالانکہ لوگوں پر ان کے دیون باقی ہیں جن کی ادائیگی کا وقت ابھی نہیں آیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کچھ ساقط کر دو اور جلدی ادا کر دو"۔

اس حدیث سے اس معاملہ کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ اور ایک دوسری حدیث جو امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے اگلے باب میں حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے نقل کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ :

"اَسْلَفْتُ رَجُلًا مِائَةَ دِیْنَارٍ ثُمَّ خَرَجَ سَهْمِی فِیْ بَعْثٍ بَعَثَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ لَهُ : عَجِّلْ لِیْ تِسْعِیْنَ دِیْنَارًا وَاَحُطُّ عَشَرَةَ دَنَانِیْرَ، فَقَالَ : نَعَمْ فَذَكَرْتُ ذٰلِكَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ: اَكَلْتَ رِبًا یَا مِقْدَادُ وَاَطْعَمْتَهُ"

"میں نے ایک شخص کو ایک سو دینار بطور قرض دیئے، اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو وفد بھیج رہے تھے اس میں میرا نام بھی آگیا، میں نے اس شخص سے کہا کہ اگر تم مجھے نوے دینار فوراً دے دو، میں تمہیں دس دینار چھوڑ دیتا ہوں، اس نے منظور کر لیا، اور میں نے اس سے نوے دینار لے لئے، پھر بعد میں کسی وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس کا تذکرہ ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے مقداد! تم نے خود بھی سود کھایا اور دوسروں کو بھی کھلایا"۔ (حوالہ بالا)

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تصریح کر دی ہے کہ سند کے اعتبار سے دونوں حدیثیں ضعیف ہیں، اس لئے دونوں میں سے کسی ایک کو حجت اور دلیل کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا، البتہ فقہاء نے جانب حرمت کو ترجیح دی ہے، اسلئے کہ جب دین کی تاخیر کی صورت میں دین میں زیادتی کرنا سود میں داخل ہے، اسی طرح دین کی تعجیل اور جلدی کی صورت میں دین کے اندر کمی بھی اس میں داخل ہے۔

جہاں تک بنی نضیر کے واقعے کا تعلق ہے تو وہ حجت نہیں بن سکتا۔ اولاً تو اس لئے کہ اس کی سند ضعیف ہے، ثانیاً اس لئے کہ اگر سنداً اس واقعہ کو درست بھی تسلیم کر لی جائے تو یہ کہنا ممکن ہے کہ بنی نضیر کی جلا وطنی کا یہ واقعہ ۲ھ میں پیش آیا ہو، اس طرح یہ واقعہ سود کی حرمت کا حکم آنے سے پہلے کا ہو جائے گا۔

علامہ شمس الائمہ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ واقعہ ذکر کر کے اس سے یہ استدلال کیا ہے کہ مسلمان اور حربی کے درمیان سود نہیں ہے، چنانچہ فرماتے ہیں کہ :

اور دوسرا معاملہ اس لئے درست ہے کہ اس میں کسی زیادتی کی شرط کے بغیر قرض کا مطالبہ کیا جارہا ہے اور شرعاً یہ بھی جائز ہے۔

دین کا کچھ حصہ چھوڑ دینا

آج کل بعض تجار "دیون مؤجلہ" (وہ دین جس کی ادائیگی کی تاریخ ابھی نہیں آئی) میں یہ معاملہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے دین کے کچھ حصے کو اس شرط پر چھوڑ دیتے ہیں کہ مدیون باقی دین فی الحال ادا کر دے۔ مثلاً عمرو پر زید کے ایک ہزار روپیہ دین تھا۔ اب زید عمرو سے کہتا ہے کہ میں سو روپے دین کے چھوڑ دیتا ہوں بشرطیکہ تم نو سو روپے فی الحال ادا کر دو۔ فقہ کی اصطلاح میں اس معاملے کو "ضع وتعجل" (کچھ ساقط کرو اور جلدی حاصل کرلو) کا نام دیا جاتا ہے۔

اس کے حکم میں فقہاء کا اختلاف ہے، صحابہ میں سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، تابعین میں سے حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ، احناف میں سے امام زفر بن ہذیل اور شوافع میں سے شیخ ابو ثور اس کے جواز کے قائل ہیں۔

اور صحابہ میں سے حضرت عبداللہ بن عمر اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہما اور تابعین میں سے امام محمد بن سیرین اور حضرت حسن بصری، حضرت ابن مسیب، حضرت حکم بن عتیبہ اور امام شعبی رحمہم اللہ تعالیٰ اس کے عدم جواز کے قائل ہیں اور ائمہ اربعہ کا بھی یہی مسلک ہے۔

(دیکھئے موطا امام مالک ۱: ۶۰۶، مصنف عبدالرزاق ۸: ۷۱ تا ۷۴)

اس سلسلے میں دو مرفوع حدیثیں آپس میں متعارض ہیں اور سند کے اعتبار سے دونوں ضعیف

اس کو MATURITY DATE کہا جاتا ہے اور شرعاً کسی دستاویز کے ذریعہ دین کی توثیق جائز، بلکہ مندوب ہے، اس لئے کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

یَا اَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی فَاکْتُبُوْہُ ۔ (البقرہ: ۲۸۲)

"اے ایمان والو! جب معاملہ کرنے لگو ادھار کا ایک میعاد متعین تک تو اس کو لکھ لیا کرو"

لیکن مشکل یہ ہے کہ آج کل کے لین دین میں یہ دستاویز قابل انتقال آلہ (NEGOTIABLE INSTRUMENT) بن چکا ہے۔ اور بائع جو اصل دائن اور حامل دستاویز ہے وہ بعض اوقات یہ دستاویز تیسرے شخص کو اس پر تحریر شدہ دین کی مقدار سے کم پر بیچ دیتا ہے تاکہ معین تاریخ سے پہلے اس کو رقم وصول ہو جائے، اس بیع کو بل کی کٹوتی (DISCOUNTING OF THE BILL) کہا جاتا ہے لہٰذا حامل دستاویز جب رقم وصول کرنا چاہتا ہے تو وہ تیسرے شخص کے پاس چلا جاتا ہے اور وہ تیسرا شخص اکثر حالات میں بینک ہوتا ہے اور وہاں جا کر وہ دستاویز اس کے حوالے کر دیتا ہے اور بینک اس کے انڈورس مینٹ (ENDORSMENT) کے بعد وہ دستاویز قبول کر لیتا ہے۔ اور بینک دستاویز پر تحریر شدہ رقم میں سے فیصد کے اعتبار سے کٹوتی کر کے باقی رقم حامل کے حوالے کر دیتا ہے۔ ("انڈورس منٹ" کا طریقہ یہ ہے کہ حامل دستاویز اس دستاویز کی پشت پر دستخط کر دیتا ہے جو اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ دستاویز کا حامل بینک کے حق میں اس رقم سے دست بردار ہو رہا ہے۔)

اور بل آف ایکسچینج کی کٹوتی مندرجہ بالا طریقہ پر کرنا شرعاً ناجائز ہے اس لئے کہ یا تو یہ دین کی بیع اس شخص کے ساتھ کی جارہی ہے جس پر دین نہیں، جس کو فقہاء کی اصطلاح میں "بیع الدین من غیر من علیہ الدین" کہا جاتا ہے، یا یہ کرنسی کی بیع کرنسی سے ہو رہی ہے، جس میں کمی زیادتی اور ادھار دونوں ممنوعات پائی جارہی ہیں۔ اور احادیث ربا میں اس قسم کی بیع کا ناجائز ہونا منصوص ہے۔

لیکن مندرجہ بالا معاملے کو تھوڑی سی تبدیلی کے ذریعہ درست کیا جاسکتا ہے۔ وہ اس طرح کہ اولاً حامل دستاویز بینک کو مشتری (دستاویز جاری کرنے والا) سے دین وصول کرنے کا وکیل بنادے، اور اس وکالت پر یہ شخص بینک کو کچھ اجرت بھی دیدے، اس کے بعد نئے معاملہ کے ذریعہ یہ شخص (حامل دستاویز) دستاویز پر تحریر شدہ رقم کے بقدر بینک سے قرض لے لے، اور بینک کو اس کا اختیار دیدے کہ جب مشتری سے اس دستاویز کے عوض رقم وصول ہو جائے تو وہ اس رقم سے اپنا قرض وصول کر لے، اس طرح یہ دو معاملات علیحدہ علیحدہ ہو جائیں گے، پہلا معاملہ یہ کہ یہ شخص بینک کو قرض وصول کرنے کے لئے کسی معین اجرت پر اپنا وکیل بنادے اور دوسرا معاملہ یہ ہے کہ وہ خود بینک سے قرض لے لے اور بینک کو دستاویز کے بدلے وصول ہونے والی رقم سے اپنا قرض وصول کرنے کا اختیار دیدے۔ لہٰذا شرعی لحاظ سے یہ دونوں معاملات درست ہو جائیں گے، پہلا معاملہ تو اس لئے درست ہے کہ اس میں اجرت پر وکیل بنانا ہے۔ اور شرعاً اجرت پر وکیل بنانا جائز ہے

عوض میں ہیں جو میں نے تمہاری طرف سے دین ادا کرنے کی ہے۔

پھر بکر زید کے پاس آتا ہے کہ میں عمرو کے لئے تمہاری طرف سے دین کا ضامن بنتا ہوں، بشرطیکہ تم مجھے دس ڈالر اس ضمانت کی اجرت کے طور پر ادا کرو، اور جب تم دین ادا کرنے سے عاجز ہو جاؤ گے تو میں تمہاری طرف سے دین ادا کروں گا اور تمہارے ذمے یہ سو ڈالر قرض ہو جائے گا۔

اب جو لوگ کفالت پر اجرت لینے کے جواز کے قائل ہیں ان کے نزدیک بکر نے جس اجرت کا مطالبہ کیا ہے، وہ جائز ہے اور خالد نے جس اجرت کا مطالبہ کیا ہے وہ ناجائز ہے۔ جب کہ خالد بالفعل اپنا مال بھی لگا رہا ہے، دوسری طرف بکر نے اپنا کوئی مال نہیں لگایا، وہ تو صرف وقت مقررہ پر ادائیگی کی ذمہ داری لے رہا ہے۔ لہٰذا جو شخص اپنا مال لگا رہا ہے اس کے لئے اجرت کا مطالبہ کرنا حرام ہے تو وہ شخص جو ادائیگی کی صرف ذمہ داری لے رہا ہے۔ اس کے لئے اجرت کا مطالبہ بطریق اولیٰ حرام ہے۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اگر کفیل اصیل کی طرف سے ادائے دین پر مجبور ہو جائے تو اس صورت میں وہ اصیل سے صرف اتنی رقم کا مطالبہ کر سکتا ہے جتنی رقم اس نے ادا کی ہے۔ اس سے زیادہ رقم کا مطالبہ شرعاً سود ہونے کی بنا پر حرام ہے تو پھر اس کفیل کیلئے کسی مال کا مطالبہ کرنا کیسے جائز ہو سکتا ہے جس نے کوئی ادائیگی نہیں کی بلکہ اس نے صرف ادائیگی کی ذمہ داری لی ہے۔

بہرحال اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ضمانت پر اجرت لینا کسی حال میں جائز نہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اسلامی بینکوں کو بین الاقوامی تجارات اور لین دین میں اور کریڈٹ لیٹر (LETTER OF CREDIT) جاری کرنے میں اس کی ضرورت رہتی ہے تو پھر اس کی متبادل صورت کیا ہو سکتی ہے؟

جواب یہ ہے کہ بینک کیلئے اپنے عمیل سے دو چیزوں کا مطالبہ کرنا جائز ہے۔

(۱) لیٹر آف کریڈٹ (LETTER OF CREDIT) جاری کرنے کے عمل میں بینک کے جو واقعی اخراجات اور مصارف ہوتے ہیں ان کا مطالبہ کرنا عمیل سے جائز ہے۔

(۲) امپورٹر اور ایکسپورٹر کے درمیان معاملہ کی تکمیل کے سلسلہ میں بینک جو خدمات بجا لاتا ہے اس پر بحیثیت وکیل یا بحیثیت دلال، یا درمیانی واسطہ ہونے کی حیثیت سے اپنی خدمات پر اجرت کا مطالبہ کرنا بینک کے لئے جائز ہے، لیکن صرف کفالت اور گارنٹی پر کسی اجرت کا مطالبہ کرنا بینک کے لئے جائز نہیں۔

"بل آف ایکسچینج" کے ذریعہ

بعض اوقات دین کی توثیق اس طرح کی جاتی ہے کہ ایک دستاویز لکھی جاتی ہے جس پر یہ تحریر ہوتا ہے کہ وہ (مشتری) بائع کی اتنی رقم کا اتنی مدت کے لئے مدیون ہے اور وہ یہ رقم فلاں تاریخ پر بائع کو ادا کر دے گا اور پھر اس پر مشتری اپنے دستخط کر دیتا ہے۔ آج کل اس دستاویز کو "بل آف ایکسچینج" (BILL OF EXCHANGE) کہا جاتا ہے اور جس تاریخ پر مشتری دین ادا کرنے کا وعدہ کرتا ہے

دین ادا کرنے سے قاصر رہا تو میں دین ادا کروں گا اس قسم کی ضمانت کو "کفالہ" کہا جاتا ہے۔ کتب فقہا میں اس کے مفصل احکام مذکور ہیں۔ جنہیں یہاں بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن کفالت کا ایک مسئلہ ہم یہاں بیان کریں گے۔ وہ یہ کہ آیا ضمانت اور گارنٹی پر کسی اجرت اور حق محنت کا مطالبہ کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟ اسلئے کہ موجودہ دور میں بینک اس وقت تک دین کی ادائیگی کی گارنٹی نہیں دیتا جب تک (مکفول لہ) وہ شخص جس کی طرف سے بینک گارنٹی دے رہا ہے، بینک کو متعین اجرت ادا نہ کرے اور یہ اجرت کبھی دین کی مقدار کے لحاظ سے متعین کی جاتی ہے۔ مثلاً تین فیصد یا چار فیصد اور کبھی کسی اور طرح سے متعین کی جاتی ہے۔

اسلامی فقہ میں یہ بات معروف ہے کہ قرض کی طرح گارنٹی بھی ایک عقد تبرع ہے اور اس پر کسی طرح کی اجرت کا مطالبہ کرنا جائز نہیں لیکن دور حاضر کے بعض حضرات نے اجرت لینے کے جواز پر اس سے استدلال کیا ہے کہ چونکہ گارنٹی موجودہ دور کی تجارت کا ایک لازمی جز بن گیا ہے، یہی وجہ ہے اس کام کے لئے مستقل ادارے قائم ہو چکے ہیں اور ان خدمات کی فراہمی کیلئے وہ ادارے بڑی بڑی رقمیں صرف کر رہے ہیں، اس لئے اب یہ محض عقد تبرع نہیں رہا بلکہ یہ ایک تجارتی معاملہ بن چکا ہے جس کی تاجروں کو ضرورت رہتی ہے خاص کر بین الاقوامی تجارت میں اس کی زیادہ ضرورت پڑتی ہے۔ اور اجرت کے بغیر گارنٹی دینے والا کوئی میسر نہیں آتا۔ اس لئے گارنٹی پر اجرت دینا جائز ہے۔

لیکن یہ دلیل درست نہیں اس لئے کہ اگر اس کو درست مان لیا جائے تو پھر قرض پر بھی منافع کا مطالبہ جائز ہونا چاہئے، اس لئے کہ یہ دلیل قرض پر بھی پوری طرح صادق آتی ہے کیونکہ قرض بھی اصلاً محض ایک عقد تبرع ہے۔ لیکن موجودہ دور کی تجارت کی ایک ضرورت بن چکا ہے، اور قرض فراہم کرنے کے لئے مستقل ادارے اور بینک قائم ہیں اور مطلوبہ مقدار میں تبرعاً قرض دینے والا کوئی شخص نہیں ملے گا۔ ان تمام چیزوں کے باوجود کوئی بھی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ قرض پر منافع لینا جائز ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ عقد تبرع ہونے کے اعتبار سے گارنٹی اور قرض میں کوئی فرق نہیں ہے جس طرح قرض پر نفع لینا جائز نہیں ہے اسی طرح گارنٹی پر اجرت لینا بھی جائز نہیں ہے بلکہ گارنٹی پر اجرت کا مطالبہ کرنا قرض پر منافع کے مقابلے میں بطریق اولی جائز نہیں۔ اس لئے کہ کفالت (گارنٹی) میں مکفول لہ کی طرف سے دین کی ادائیگی کا محض التزام ہوتا ہے۔ اور جب وہ کفیل اس کی طرف سے دین ادا کر دیتا ہے اس وقت اصیل کے ذمہ کفیل کا قرض ہو جاتا ہے گویا کہ کفیل صرف قرض دینے کا اپنے اوپر التزام کر رہا ہے اور جب قرض دینے پر کسی منافع کا مطالبہ جائز نہیں ہے تو پھر صرف قرض دینے کے التزام پر منافع یا اجرت کا مطالبہ بطریق اولی جائز نہیں ہونا چاہئے۔

اس کی مثال یوں سمجھیں کہ زید نے عمرو سے سو ڈالر قرض طلب کئے۔ اب عمرو نے زید سے ضمانت کا مطالبہ کیا کہ کوئی ضامن لاؤ، اب خالد زید سے کہتا ہے کہ میں تمہارا قرض ابھی ادا کر دیتا ہوں بشرطیکہ بعد میں تم مجھے ایک سو دس ڈالر ادا کرو گے۔ اور یہ دس ڈالر زائد اس خدمت کے

دستاویزات پر قبضہ کرنے سے رہن تام ہوجائے گا، اور پھر وہ چیز بطور عاریت کے راہن کے قبضہ میں رہے گی۔

(۲) ــــ جیسا کہ فقہاء نے ذکر فرمایا ہے کہ راہن پر مرتہن کے قبضہ کو شرط قرار دینے کی علت یہ ہے کہ مرتہن ضرورت کے وقت اس چیز کو بیچ کر اپنا دین وصول کرلے اور مذکورہ "رہن سائل" میں قانوناً ایگریمنٹ میں مذکور شرائط کی بنیاد پر مرتہن کو یہ سہولت حاصل ہے کہ وہ ضرورت کے وقت اس کو بیچکر اپنا دین وصول کرلے۔ لہٰذا یہ بات محتمل ہے کہ راہن کی مذکورہ صورت میں حسی قبضہ شرط قرار نہ دیا جائے اس لئے کہ ان شرائط کی بنیاد پر قبضہ کا جو مقصود ہے وہ حاصل ہے۔

(۳) ــــ راہن کا مقصد دین کی توثیق ہے اور اس مقصد کے حصول کے لئے شریعت نے اس کی اجازت دی ہے کہ دائن مدیون کی ملک کو اپنے قبضہ میں لے لے، اور اس کو اس کے اندر تصرف کرنے سے روک دے جب تک کہ دین وصول نہ ہوجائے۔ لیکن اگر دائن خود اپنے مقصد کے حصول کے لئے اس سے کم پر راضی ہوجائے اس طرح کہ عین مرہون راہن کے قبضہ میں رہنے دے۔ اور مرتہن کو صرف اس شئ مرہون کے ذریعہ اپنا دین وصول کرنے کا حق باقی رہ جائے تو بظاہر شرعاً اس میں کوئی رکاوٹ نظر نہیں آتی۔

(۴) ــــ "رہن سائل" میں فریقین (راہن اور مرتہن) کو مصلحت اور فائدہ حاصل ہے۔ راہن کو جو مصلحت اور فائدہ حاصل ہے وہ تو ظاہر ہے کہ اس کو اپنی چیز کے انتفاع سے محروم نہیں ہونا پڑے گا۔ اور مرتہن کو یہ مصلحت اور فائدہ ہے کہ کسی ضمان کے لزوم کے بغیر اس کے پاس اپنا دین وصول کرنے کا حق محفوظ ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے رہن کی مذکورہ صورت میں اگر راہن مفلس ہوجائے تو دوسرے غرماء کو ضرر اور نقصان پہونچے گا۔ اس لئے کہ مرتہن دوسرے غرماء کے مقابلے میں اس چیز کا زیادہ حق دار ہوگا۔ لیکن دوسرے غرماء کو پہونچنے والا یہ ضرر نہ تو اس وقت شرعاً معتبر ہے جب رہن پر مرتہن کا قبضہ ہوا اور نہ اس وقت معتبر ہے جب مرتہن نے رہن پر قبضہ کرنے کے بعد راہن کو بطور عاریت دیدیا ہو جیسا کہ پیچھے بیان کیا گیا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ مجرد اس ضرر سے رہن فاسد نہیں ہوتا۔

(۵) ــــ موجودہ دور کی عالمی تجارات میں جب کہ بائع ایک شہر میں مقیم ہو اور مشتری دوسرے شہر میں، اس وقت شئ مرہون پر قبضہ کرنا متعذر ہوجاتا ہے اس لئے کہ شئ مرہون کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے میں بڑے اخراجات ہوتے ہیں، ایسی صورت میں دین کی توثیق کی "رہن سائل" کے علاوہ کوئی دوسری صورت میں نظر نہیں آتی۔

بہر حال مندرجہ بالا پانچ ملاحظات کی بنیاد پر میری رائے کا رجحان "رہن سائل" کے جواز کی طرف ہوتا ہے لیکن قطعی فیصلہ کیلئے علماء حضرات ان پر غور فرمالیں۔ واللہ سبحانہ اعلم۔

تیسرے شخص کی طرف سے گارنٹی

حصول قرض پر ضمانت کا ایک طریقہ یہ ہے کہ کوئی تیسرا شخص ادائیگی دین کی ضمانت لے لے، اور یہ ذمہ داری قبول کرے کہ مدیون اصیل اگر

ہونا چاہئے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ فقہاء نے اگرچہ شئ مرہون پر مرتہن کے قبضہ کی شرط لگائی ہے لیکن اس کے ساتھ اس کی بھی اجازت دی ہے کہ راہن اس چیز کو بطور عاریت کے اس سے واپس لے سکتا ہے اور اس سے منتفع ہو سکتا ہے اور اس عاریت کی وجہ سے یہ رہن فاسد نہ ہوگا۔ بلکہ مرتہن کو بھی یہ حق حاصل رہے گا کہ جب چاہے شئ مرہون واپس راہن سے طلب کرلے، اور اگر وہ چیز راہن کے قبضہ میں ہلاک ہوگئی تو اسی کی چیز ہلاک ہو جائے گی اور مرتہن کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ وہ دین کی ادائیگی کی مدت گذرنے کے بعد اس چیز کو بیچ کر اپنا دین وصول کرلے اور اگر راہن مفلس ہو جائے یا اس کا انتقال ہو جائے تو بھی شئ مرہون میں دین کی حد تک مرتہن کا حق ہوگا، دوسرے مدیون اس چیز میں شریک نہیں ہوں گے۔

چنانچہ صاحب ہدایہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

"وَاِذَا اَعَارَ الْمُرْتَهِنُ الرَّهْنَ الرَّاهِنَ لِيَخْدِمَهُ اَوْ لِيَعْمَلَ لَهُ عَمَلًا، فَقَبَضَهُ خَرَجَ مِنْ ضَمَانِ الْمُرْتَهِنِ لِمُنَافَاةٍ بَيْنَ يَدِ الْعَارِيَةِ وَيَدِ الرَّهْنِ، فَاِنْ هَلَكَ فِي يَدِ الرَّاهِنِ هَلَكَ بِغَيْرِ شَيْءٍ، لِفَوَاتِ الْقَبْضِ الْمَضْمُونِ وَلِلْمُرْتَهِنِ اَنْ يَسْتَرْجِعَهُ اِلَى يَدِهِ، لِاَنَّ عَقْدَ الرَّهْنِ بَاقٍ اِلَّا فِي حُكْمِ الضَّمَانِ فِي الْحَالِ، اَلَا تَرَى اَنَّهُ لَوْ هَلَكَ الرَّاهِنُ قَبْلَ اَنْ يَرُدَّهُ عَلَى الْمُرْتَهِنِ، كَانَ الْمُرْتَهِنُ اَحَقَّ بِهِ مِنْ سَائِرِ الْغُرَمَاءِ، وَهٰذَا لِاَنَّ يَدَ الْعَارِيَةِ لَيْسَتْ بِلَازِمَةٍ وَالضَّمَانُ لَيْسَ مِنْ لَوَازِمِ الرَّهْنِ عَلَى كُلِّ حَالٍ"

"اگر مرتہن وہ چیز خدمت اور استعمال کے لئے واپس راہن کو عاریت پر دیدے اور راہن اس پر قبضہ بھی کرلے تو وہ چیز مرتہن کے ضمان سے نکل جائے گی، اس لئے کہ ید رہن اور ید عاریہ ان دونوں میں منافات ہے، اب اگر راہن کے پاس وہ چیز ہلاک ہوگئی تو بغیر کسی ضمان کے ہلاک ہوگی اس لئے کہ اس چیز پر راہن کا قبضہ مضمون قبضہ نہیں ہے۔ اور مرتہن کے لئے اس چیز کو دوبارہ اپنے قبضے میں لینا بھی جائز ہے، اس لئے کہ معاملہ رہن ابھی باقی ہے۔ البتہ فی الحال وہ رہن مضمون نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوبارہ اس چیز کے مرتہن کے قبضہ میں آنے سے پہلے اگر راہن کا انتقال ہو جائے تو مرتہن دوسرے غرماء کے مقابلے میں اس چیز کا زیادہ حقدار ہوگا اور ضمان ہر حال میں رہن کے لوازم میں سے نہیں ہے۔"

(ھدایہ مع فتح القدیر ۹: ۱۱۶ - رد المحتار ۶: ۵۱۰)

لیکن مندرجہ بالا صورت اس وقت ہے جب عقد رہن ایک مرتبہ مرتہن کے قبضہ کے بعد مکمل ہو چکا ہو اور پھر مرتہن نے راہن کو وہ چیز عاریت پر دے دی ہو لیکن اگر مرتہن نے اس چیز پر سرے سے قبضہ ہی نہیں کیا تھا۔ کیا اس صورت پر عاریت کا حکم درست ہوگا یا نہیں؟ فقہاء کی عبارات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس پر عاریت کا حکم لگانا درست نہیں، اس لئے کہ رہن کی صحت کے لئے قبضہ شرط ہے اور یہاں قبضہ نہیں پایا گیا لیکن میں موجودہ دور کے فقہاء کی خدمت میں غور و تامل کے لئے چند قابل غور امور پیش کرتا ہوں:

(۱) ــــ رہن سائل میں اگرچہ مرتہن شئ مرہون پر قبضہ تو نہیں کرتا، لیکن تمام حالات میں وہ اس چیز کی ملکیتی دستاویزات پر قبضہ کرلیتا ہے۔ اس لئے اس بات کا احتمال ہے کہ ... ان

قول ہے اس لئے کہ جب مبیع کو بائع کے پاس بطور رہن رکھنے کی شرط لگائی گئی اس وقت وہ مبیع مشتری کی ملکیت میں نہیں تھی، چاہے یہ شرط ہو کہ مشتری اس مبیع پر قبضہ کرنے کے بعد رہن کے طور پر رکھوائے گا۔ یا قبضہ سے پہلے رہن رکھوانے کی شرط ہو۔۔۔ مگر ظاہر الروایۃ کے مطابق یہ رہن درست ہے۔۔۔ لیکن اگر بیع کے اندر رہن کی شرط نہیں لگائی مگر بیع مکمل ہونے کے بعد اسی بائع کے پاس مبیع کو رکھوایا تو اس صورت میں اگر بیع لازم ہونے کے بعد وہ مبیع بطور رہن رکھوائی ہے تو یہ صورت بطریق اولیٰ درست ہے۔ اس لئے کہ لزوم بیع کے بعد جب مشتری یہ مبیع غیر بائع کے پاس رہن رکھوا سکتا ہے تو پھر بائع کے پاس رکھوانا بھی جائز ہے۔ اور جب غیر ثمن کے بدلہ میں اس مبیع کو رہن رکھوا سکتا ہے تو ثمن کے بدلہ میں بھی رہن رکھوانا صحیح ہے۔ اور اگر لزوم بیع سے پہلے مشتری نے وہ مبیع رہن رکھوائی ہے تو اس صورت میں یہ مسئلہ اس امر پر متفرع ہو گا کہ مشتری کے لئے مبیع میں تصرف جائز ہو گیا تھا یا نہیں؟ لہٰذا بیع کی جس صورت میں مشتری کو مبیع کے اندر تصرف کرنا جائز ہو گا، اس صورت میں اس مبیع کو رہن رکھوانا بھی جائز ہے اور جہاں مبیع میں تصرف جائز نہیں، وہاں رہن رکھوانا بھی جائز نہیں، کیونکہ رہن رکھوانا درحقیقت ایک قسم کا تصرف ہے تو یہ رہن حکم میں بیع کے مشابہ ہو گا۔

الرہن السائل

اسلامی ممالک کے بہت سے قوانین میں رہن کی ایک اور صورت بھی ملتی ہے جس میں مرتہن شیٔ مرہون پر قبضہ نہیں کرتا بلکہ وہ چیز راہن کے پاس ہی رہتی ہے لیکن راہن مدیون جب ادائے دین سے قاصر رہے تو پھر مرہون دائن راہن سے مطالبہ کر سکتا ہے کہ وہ شیٔ مرہون کو بیچ کر دین ادا کرے، اس قسم کے رہن کو کبھی "الرہن السازج" (SIMPLE MORTGAGE) سادہ رہن کہا جاتا ہے۔ اور کبھی "الذمۃ السائلۃ" (FLOATING CHARGE) کہا جاتا ہے، مثال کے طور پر مدیون اپنی گاڑی دائن کے پاس بطور رہن رکھوائے لیکن گاڑی بدستور مدیون راہن کے قبضے میں رہے اور وہ اس کو اپنی ضروریات میں استعمال بھی کرتا رہے لیکن جب تک وہ راہن مرتہن دائن کا دین ادا نہیں کریگا اس وقت تک وہ اس گاڑی کو آگے فروخت نہیں کر سکتا، اور اگر وہ راہن مرتہن کا دین ادا کرنے سے قاصر ہو جائے تو پھر مرتہن کو اس چیز کے بیچنے کا حق بھی حاصل ہو جائے گا۔ اور اس بیچنے کے حق کو "الذمۃ السائلۃ" (FLOATING CHARGE) کہا جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا دین پر تصدیق اور اعتماد کے حصول کے لئے اس قسم کا رہن رکھنا جائز ہے یا نہیں؟

فقہی اعتبار سے اس کے جواز میں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ اکثر و بیشتر فقہاء نے رہن کے صحیح اور پورا ہونے کے لئے یہ شرط لگائی ہے کہ مرتہن اس شیٔ مرہون پر قبضہ کرے اور اس شرط کی بنیاد قرآن کریم کی یہ آیت ہے:

"فَرِهَانٌ مَّقْبُوضَةٌ" (سورۃ البقرہ: ۲۸۳)

جبکہ رہن کی مذکورہ صورت میں مرتہن شیٔ مرہون پر قبضہ نہیں کرتا، اسلئے یہ رہن درست نہ

کیا تھا، بلکہ قبضہ کرنے سے پہلے ہی مشتری نے بائع کے پاس مبیع بطور رہن کے رکھوادی تو اس صورت میں یہ مبیع رہن نہیں بنے گی۔ اس لئے کہ اب وہ مبیع حصول ثمن کے لئے محبوس ہے۔

اس عبارت کے تحت علامہ ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

قولہ: "لانّہ حینئذ یصلح الخ" أی لتعیّن ملکہ فیہ، حتی لو ھلك یھلك علی المشتری ولا ینفسخ العقد. قولہ: "لانّہ محبوس بالثمن" أی وضمانہ یخالف ضمان الرھن فلا یکون مضمونا بضمانین مختلفین لاستحالۃ اجتماعھما حتی لو قال: امسك المبیع حتی أعطیك الثمن قبل القبض فھلك انفسخ البیع. زیلعی۔

(رد المحتار مع الدر المختار کتاب الرھن ج ۶ ص ۴۹۷)

قولہ: "لانہ حینئذ یصلح الخ" اسلئے کہ اس میں مشتری کی ملکیت متعین ہو چکی تھی، یہی وجہ ہے کہ اگر اس کے بعد وہ چیز ہلاک بھی ہو جائے تو مشتری کی طرف سے ہلاک ہو گی اور ہلاکت کی بنیاد پر بیع فسخ نہیں ہو گی۔

قولہ: "لانہ محبوس بالثمن" اسلئے کہ محبوس بالثمن کا ضمان رہن کے ضمان سے مختلف ہے، اور ایک ہی چیز دو مختلف ضمانوں کی طرف سے مضمون نہیں ہو سکتی، اس لئے کہ دو مختلف ضمانوں کا ایک چیز میں جمع ہونا محال ہے حتی کہ اگر مشتری مبیع پر قبضہ کرنے سے پہلے ہی بائع سے یہ کہدے کہ جب تک میں تم کو ثمن ادا نہ کروں اس وقت تک مبیع اپنے پاس رکھنا، اس صورت میں اگر مبیع بائع کے پاس ہلاک ہو جائے تو بیع فسخ ہو جائے گی۔

بہرحال مندرجہ بالا عبارات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس قسم کے رہن کے جواز میں بعد کے فقہاء کرام کا کوئی اختلاف نہیں ہے بشرطیکہ صلب عقد میں یہ رہن مشروط نہ ہو، لیکن اگر صلب عقد ہی میں یہ رہن مشروط ہو تو پھر اس صورت کے جواز میں علامہ ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ نے اختلاف نقل کیا ہے، لیکن ان کے نزدیک صحیح اور قابل اعتماد مسلک جواز ہی کا ہے۔ چنانچہ المغنی میں فرماتے ہیں کہ:

وإذا تبایعا بشرط أن یکون المبیع رھنا علی ثمنہ لم یصح، قالہ ابن حامد رحمہ اللہ وھو قول الشافعی لأن المبیع حین شرط رھنہ لم یکن ملکا لہ وسواء شرط أنہ یقبضہ ثم یرھنہ أو شرط رھنہ قبل قبضہ. .... وظاھر الروایۃ صحۃ رھنہ ..... فأما إن لم یشترط ذلك فی البیع لکن رھنہ عندہ بعد البیع فإن کان بعد لزوم البیع فالأولی صحتہ، لأنہ یصح رھنہ عند غیرہ فصح عندہ کغیرہ، ولأنہ یصح رھنہ علی غیر ثمنہ فصح رھنہ علی ثمنہ. وإن کان قبل لزوم البیع ابتنی علی جواز التصرف فی المبیع، ففی کل موضع جاز التصرف فیہ جاز رھنہ وما لا فلا، لأنہ نوع تصرف فأشبہ بیعہ۔

(المغنی لابن قدامہ ج ۴ ص ۲۰۴ کتاب الرھن)

اگر بائع اور مشتری اس شرط پر بیع کا معاملہ کریں کہ مبیع بائع کے پاس ہی ثمن کے مقابلے میں بطور رہن کے رکھی جائے گی تو یہ بیع صحیح نہیں، علامہ ابن حامد رحمۃ اللہ علیہ نے ایسا ہی فرمایا ہے اور امام شافعی رحمۃ اللہ کا بھی یہی

خریدا اور پھر مشتری نے بائع سے کہا کہ اس کپڑے کو اپنے پاس ہی رکھو جب تک میں تمہیں اسکی قیمت ادا نہ کروں۔ اس صورت میں یہ کپڑا بائع کے پاس رہن سمجھا جائے گا۔

اسی عبارت کو صاحب ہدایہ نے بھی نقل کیا ہے اور پھر صاحب کفایہ اس کی شرح میں فرماتے ہیں کہ:

"لانَّ الثَّوبَ لَمَّا اشْتَرَاهُ وَقَبَضَهُ كَانَ هُوَ وَسَائِرُ الأَعْيَانِ الْمَمْلُوكَةِ سَوَاءً فِي صِحَّةِ الرَّهْنِ"

اس لئے کہ جب مشتری نے کپڑا خرید کر اس پر قبضہ بھی کر لیا تو پھر اس کپڑے کو بطور رہن رکھوانا جائز ہے جیسے دوسری مملوک اشیاء کا رہن جائز ہوتا ہے۔

(الکفایہ شرح ھدایہ برحاشیہ فتح القدیر ج ۹ ص ۹۹)

اور پھر علامہ حصکفی رحمۃ اللہ علیہ در مختار میں اور وضاحت کے ساتھ اس مسئلہ کو بیان فرماتے ہیں چنانچہ لکھتے ہیں کہ:

وَلَوْ كَانَ ذٰلِكَ الشَّيْئُ الَّذِي قَالَ لَهُ الْمُشْتَرِي، أَمْسِكْهُ هُوَ الْمَبِيعُ الَّذِي اشْتَرَاهُ بِعَيْنِهِ لَوْ بَعْدَ قَبْضِهِ لِأَنَّهُ حِينَئِذٍ يَصْلُحُ أَنْ يَكُونَ رَهْنًا بِثَمَنِهِ، وَلَوْ قَبْلَهُ لَا يَكُونُ رَهْنًا لِأَنَّهُ مَحْبُوسٌ بِالثَّمَنِ۔

وہ چیز جس کے بارے میں مشتری نے بائع سے یہ کہا کہ: تم اس کو اپنے پاس روک لو، اگر وہ چیز مبیع ہی تھی جس کو اس نے بائع سے خریدا تھا، اس صورت میں یہ دیکھا جائے گا کہ اگر مشتری نے اس چیز پر قبضہ کر لیا تھا تب تو وہ چیز ثمن کے مقابلے میں رہن بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اور اگر مشتری نے اس پر قبضہ نہیں

بیع موجل میں بائع کے لئے بیع کو محبوس کرنے کی مذکورہ بالا صورت دو طریقوں سے ممکن ہے:

ایک یہ کہ ثمن کی وصولیابی کے لئے بیع کو روک لیا جائے۔ دوسرے یہ کہ بطور رہن کے بیع کو روک لیا جائے۔

دونوں صورتوں میں فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں جب ثمن کی وصولی کے لئے بیع کو محبوس کیا جائے گا۔ اس وقت بیع مضمون بالثمن ہوگی، مضمون بالقیمۃ نہیں ہوگی لہٰذا اگر حالت حبس میں وہ بیع ہلاک ہوگئی تو اس صورت میں بیع فسخ ہو جائے گی اور بازاری قیمت کا ضمان اس پر نہیں آئے گا۔

دوسری یعنی رہن کی صورت میں اگر وہ بیع بائع کے پاس تعدی کے بغیر ہلاک ہو جائے تو بیع فسخ نہیں ہوگی، بلکہ وہ مشتری کے مال سے ہلاک ہوگی اور مشتری کے ذمہ سے ثمن ساقط نہ ہوگا، اور اگر بائع کی تعدی کی وجہ سے ہلاک ہوئی ہو تو مرتہن (بائع) اس چیز کی بازاری قیمت کا ضامن ہوگا ثمن کا ضامن نہ ہوگا۔

جہاں تک پہلی صورت کا تعلق ہے یعنی ثمن کی وصولیابی کے لئے بیع کو روکنا بیع بالتقسیط میں یہ صورت جائز نہیں ہے، اس لئے کہ بیع بالتقسیط بیع موجل ہے۔ اور بائع کو ثمن کے استیفاء کے لئے حبس بیع کا حق صرف نقد بیع میں حاصل ہوتا ہے۔ ادھار بیع میں یہ حق بائع کو نہیں ملتا، چنانچہ فتاوی ہندیہ میں ہے کہ:

قَالَ اَصْحَابُنَا رَحِمَهُمُ اللّٰهُ تَعَالٰى لِلْبَائِعِ حَقُّ حَبْسِ الْمَبِيْعِ لِاسْتِيْفَاءِ الثَّمَنِ اِذَا كَانَ حَالًا، كَذَا فِي الْمُحِيْطِ، وَاِنْ كَانَ مُؤَجَّلًا فَلَيْسَ لِلْبَائِعِ اَنْ يَحْبِسَ الْمَبِيْعَ قَبْلَ حُلُوْلِ الْاَجَلِ وَلَا بَعْدَهٗ، كَذَا فِي الْمَبْسُوْطِ۔

(فتاوی ہندیہ، ۳: ۱۵، باب نمبر ۴، کتاب البیوع)

ہمارے اصحاب رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ نقد بیع میں ثمن کی وصولیابی کے لئے بائع کو حبس بیع کا حق حاصل ہے لیکن بیع موجل میں بائع کو حبس بیع کا حق حاصل نہیں، نہ ادائیگی کے وقت سے پہلے اور نہ ادائیگی کے وقت کے بعد۔ مبسوط للسرخسی۔

جہاں تک دوسری صورت کا تعلق ہے وہ یہ ہے کہ مشتری کے ذمہ اس بیع کا جو ثمن واجب ہو چکا ہے اس کے عوض میں بائع وہی مبیع بطور رہن کے اپنے قبضے میں رکھے۔ یہ صورت دو طریقوں سے ممکن ہے۔

اول یہ کہ مشتری اس بیع پر قبضہ کرنے سے پہلے ہی بائع کے پاس بطور رہن چھوڑ دے۔ یہ صورت تو جائز نہیں۔ اس لئے کہ یہ وہی صورت بن جاتی ہے کہ بائع حصول ثمن کے لئے بیع کو اپنے پاس روک لے۔ اور حصول ثمن کیلئے حبس بیع بیع موجل میں جائز نہیں جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مشتری اس مبیع کو پہلے اپنے قبضے میں لے۔ اور پھر بطور رہن کے وہی بیع بائع کے پاس واپس رکھ دے۔ ایسی صورت اکثر فقہاء کے نزدیک جائز ہے۔ چنانچہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ الجامع الصغیر میں فرماتے ہیں:

وَمَنِ اشْتَرٰى ثَوْبًا بِدَرَاهِمَ، فَقَالَ الْبَائِعُ اَمْسِكْ هٰذَا الثَّوْبَ حَتّٰى اُعْطِيَكَ الثَّمَنَ فَالثَّوْبُ رَهْنٌ۔

اگر کسی شخص نے چند درہم کا کوئی کپڑا

مدت کی زیادتی کی بنیاد پر قیمت میں زیادتی نہیں ہوگی۔ اور دوسری صورت اس لئے ناجائز ہے کہ اس میں قیمت تو آٹھ روپے متعین ہوگئی اور پھر ادائیگی میں تاخیر کی بنیاد پر اس میں نفع کا اضافہ کیا گیا، اور اس کے بعد پھر ادائیگی میں جتنی تاخیر ہوتی جائے گی، نفع میں مزید اضافہ ہوتا جائے گا، مثلاً اس چیز کی اصل قیمت آٹھ روپے متعین ہوگئی، اور پھر ادائیگی میں ایک ماہ کی تاخیر کی بنیاد پر دو روپے نفع کا اضافہ ہوجائے گا، اور اگر مشتری نے دو ماہ بعد قیمت ادا کی تو اب چار روپے کا اضافہ ہوجائے گا اور تین ماہ کی تاخیر پر چھ روپے کا اضافہ ہوجائیگا۔ اس طرح ہر تاخیر پر قیمت میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ لہٰذا بیع کی پہلی صورت شرعاً جائز اور حلال ہے۔ اور دوسری صورت ربا میں داخل ہے اور شرعاً ناجائز ہے۔

دین کی توثیق اور اس کی قسمیں

چونکہ بیع مؤجل میں بیع کے مکمل ہوتے ہی ثمن مشتری کے ذمہ دین ہوجاتا ہے، اس لئے بائع کو مشتری سے اس دین پر کسی توثیق کا مطالبہ کرنا یا مقررہ وقت پر دین ادا کرنے پر کسی گارنٹی کا مطالبہ کرنا جائز ہے۔

رہن کا مطالبہ کرنا

دین کی ادائیگی پر گارنٹی کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں۔ ایک رہن رکھنا، دوسرے یہ کہ تیسرے شخص کا ضمانت دینا۔ پہلی صورت میں مشتری اپنی کوئی مملوکہ چیز بائع کے پاس بطور رہن رکھوائے اور بائع گارنٹی کے طور پر اس چیز کو اپنے پاس رکھ لے، لیکن اس شئ مرہون سے منتفع ہونا اس کے لئے کسی صورت میں جائز نہیں، اس لئے کہ اس شئ مرہون سے منتفع ہونا بھی ربا کی ایک صورت ہے، البتہ وہ چیز بائع کے پاس اس لئے رکھی رہے گی تاکہ مشتری اس رہن کے دباؤ کی وجہ سے وقت مقررہ پر دین ادا کرنے کا اہتمام کرے، ہاں اگر مشتری وقت مقررہ پر دین ادا کرنے سے قاصر ہوجائے تو پھر بائع اس چیز کو بیچکر اپنا دین وصول کرلے۔ لیکن عقد کے وقت جو قیمت مقرر ہوئی تھی، اس سے زیادہ وصول کرنا اس کے لئے جائز نہیں۔ لہٰذا اگر اس شئ مرہون کے بیچنے سے اتنی رقم وصول ہوئی ہو کہ بائع اپنا دین وصول کرنے کے بعد بھی کچھ رقم بچ جائے، تو وہ بچی ہوئی رقم مشتری کو واپس لوٹانا ضروری ہے اور جس طرح مشتری کے لئے اپنی مملوکہ اشیاء کو رہن رکھوانا جائز ہے۔ اسی طرح ان اشیاء کی صرف دستاویزات اور کاغذات کو رہن رکھوانا بھی جائز ہے۔

ادائیگی کی گارنٹی کے حصول کیلئے

آجکل لوگوں کے درمیان معاملات کی جو صورتیں اور طریقے رائج ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ بیع مؤجل (ادھار بیع) میں بائع مبیع کو اپنے پاس اس وقت تک محبوس رکھتا ہے جب تک مشتری اس چیز کی قیمت ادا نہ کردے، یا جب تک مشتری اس کی کچھ قسطیں ادا نہ کردے۔

قیمتوں میں اختلاف جائز ہے تو پھر مدتوں کے اختلاف کی بناء پر قیمتوں میں اختلاف بھی جائز ہے۔ اس لئے کہ دونوں صورتوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

البتہ مختلف قیمتوں کا تذکرہ صرف بھاؤ تاؤ کے وقت ہی جائز ہے۔ لیکن عقد بیع صرف اس وقت جائز ہے جب عاقدین کے درمیان قیمت اور مدت دونوں کی تعیین پر اتفاق ہو چکا ہو۔ لہٰذا بھاؤ تاؤ میں ذکر کردہ مختلف قیمتوں اور مدتوں میں سے کسی ایک کی تعیین بیع کے وقت ہی ضروری ہے ورنہ بیع جائز نہ ہوگی۔

اور اگر بھاؤ تاؤ کے وقت بائع مشتری سے کہے کہ اگر تم ایک ماہ بعد اس کی قیمت ادا کرو گے تو اس کی قیمت دس روپے ہے اور اگر دو ماہ بعد ادا کرو گے تو اس کی قیمت بارہ روپے ہے اور تین ماہ بعد ادا کرو گے تو اس کی قیمت چودہ روپے ہے اور پھر مجلس عقد میں کسی ایک شق کی تعیین کے بغیر عاقدین اس خیال سے جدا ہو گئے کہ مشتری ان تین شقوں میں سے ایک شق کو بعد میں اپنے حالات کے مطابق اختیار کرلے گا تو یہ بیع بالاجماع حرام ہے، اور عاقدین پر واجب ہے کہ وہ اس عقد کو فسخ کریں اور دوبارہ از سر نو جدید عقد کریں جس میں کسی ایک شق کو وضاحت کے ساتھ معین کریں۔

ثمن میں زیادتی جائز ہے

یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ اوپر اس بیع کے جواز کے بارے میں جو کچھ بیان کیا گیا وہ اس وقت ہے جب نفس ثمن میں زیادتی کر دی جائے لیکن اگر یہ بیع اس طرح کی جائے جس طرح بعض لوگ کرتے ہیں کہ نقد بیچنے کی بنیاد پر اس چیز کی ایک قیمت مقرر کر لیتے ہیں اور پھر اس قیمت کی ادائیگی میں تاخیر کی بنیاد پر اس کی اصل قیمت پر اضافہ کرتے ہیں، یہ صورت سود میں داخل ہے۔ مثلاً بائع یہ کہے میں فلاں چیز تم کو آٹھ روپے میں نقد فروخت کرتا ہوں لیکن اگر تم نے ایک ماہ تک قیمت ادا نہ کی تو تمہیں دو روپے مزید ادا کرنے ہوں گے۔ اب اس دو روپے کو "منافع" کا نام دیا جائے یا کچھ اور، لیکن اس کے سود ہونے میں کسی شک کی گنجائش نہیں۔ اس لئے کہ اس چیز کی اصل قیمت آٹھ روپے مقرر کر دی۔ اور یہ آٹھ روپے بیع کے نتیجے میں مشتری کے ذمہ دین ہو گئے۔ اب اس آٹھ روپے سے زیادہ مطالبہ کرنا یقیناً سود ہی ہے۔

دونوں صورتوں میں عملی فرق یہ ہے کہ پہلی صورت اس لئے جائز ہے کہ اس میں فریقین کے درمیان جن مختلف قیمتوں پر بھاؤ تاؤ ہو رہا تھا، ان میں سے ایک قیمت یقینی طور پر فریقین کے اتفاق سے طے ہو جاتی ہے۔ اور بیع مکمل ہونے کے بعد اس قیمت میں اضافہ یا کمی کا کوئی راستہ نہیں ہوتا، اور مشتری کی طرف سے قیمت کی ادائیگی میں تقدیم و تاخیر سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا، مثلاً اگر مشتری نے وہ چیز دس روپے میں اس شرط پر خریدی کہ ایک ماہ بعد قیمت ادا کرے گا لیکن کسی وجہ سے وہ ایک ماہ کے بجائے دو ماہ میں قیمت ادا کرے، تب بھی وہ دس روپے ہی ادا کرے گا، اب

رہے گی۔

ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء کا بھی وہی مسلک ہے جو امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا ہے (دیکھئے: المغنی لابن قدامہ ۴: ۱۷۷۔ المبسوط للسرخسی ۱۳: ۸۔ الدسوقی علی الشرح الکبیر ۳: ۵۸۔ مغنی المحتاج للشربینی ۲: ۳۱)۔

اور دلائل سے یہی راجح ہے۔ اس لئے کہ قرآن وحدیث میں اس بیع کے عدم جواز پر کوئی نص موجود نہیں، اور اس بیع میں ثمن کی جو زیادتی پائی جا رہی ہے، اس پر ربا کی تعریف بھی صادق نہیں آرہی ہے۔ کیونکہ وہ قرض نہیں ہے اور نہ ہی یہ اموال ربویہ کی بیع ہو رہی ہے بلکہ یہ ایک عام بیع ہے۔ اور عام بیع میں بائع کو شرعاً مکمل اختیار ہے کہ وہ اپنی چیز جتنی قیمت پر چاہے، فروخت کرے اور بائع کیلئے شرعاً یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی چیز بازاری دام پر ہی فروخت کرے۔ اور قیمت کی تعیین میں ہر تاجر کا علیحدہ اصول ہوتا ہے۔ بعض اوقات ایک ہی چیز کی قیمت حالات کے اختلاف سے مختلف ہو جاتی ہے اور اگر کوئی شخص اپنی چیز کی قیمت ایک حالت میں ایک مقرر کرے اور دوسری حالت میں دوسری مقرر کرے تو شریعت اس پر کوئی پابندی عائد نہیں کرتی۔

لہٰذا اگر کوئی شخص اپنی چیز نقد آٹھ روپے میں اور ادھار دس روپے میں بیچ رہا ہو، اس شخص کیلئے بالاتفاق اپنی چیز کو نقد دس روپے میں فروخت کرنا بھی جائز ہے بشرطیکہ اس میں دھوکہ فریب نہ ہو۔ اور جب نقد دس روپے میں بیچنا جائز ہے تو ادھار دس روپے میں بیچنا کیوں ناجائز ہوگا؟

چونکہ یہ مسئلہ ائمہ اربعہ کے درمیان متفق علیہ ہے اور اکثر فقہاء اور محدثین نے اس کو بیان کیا ہے، اس لئے قرآن وسنت سے اس بیع کے جواز پر دلائل بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

دو قیمتوں میں سے کسی ایک کی تعیین

جیسا کہ ہم نے پیچھے ذکر کیا کہ بائع کے لئے اس بات کی اجازت ہے کہ وہ بھاؤ تاؤ کے وقت مختلف قیمتیں بیان کرے، مثلاً یہ کہے کہ نقد آٹھ روپے میں اور ادھار دس روپے میں بیچوں گا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس کے لئے یہ جائز ہے کہ مختلف مدتوں کے مقابلے میں مختلف قیمتیں متعین کرے؟ مثلاً وہ کہے کہ ایک ماہ کے ادھار پر دس روپے میں اور دو ماہ کے ادھار پر بارہ روپے میں (اور تین ماہ کے ادھار پر چودہ روپے میں) بیچتا ہوں؟ اس بارے میں فقہاء کی کوئی عبارت تو نظر سے نہیں گزری البتہ فقہاء کے سابقہ اقوال پر قیاس کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صورت بھی جائز ہے اس لئے کہ جب نقد اور ادھار کی بنیاد پر

اس لئے عام طور پر "بیع بالتقسیط" میں نقد بیع کے مقابلے میں زیادہ قیمت مقرر کی جاتی ہے۔

مدت کے مقابلے پر قیمت زیادہ کرنا

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ادھار فروخت کرنے کی صورت میں نقد فروخت کے مقابلے میں قیمت زیادہ مقرر کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ پر قدیم اور جدید دونوں قسم کے فقہاء نے بحث کی ہے چنانچہ بعض علماء اس زیادتی کو ناجائز کہتے ہیں اس لئے کہ ثمن کی یہ زیادتی "مدت" کے عوض میں ہے اور جو ثمن "مدت" کے عوض میں دیا جائے، وہ سود ہے یا کم از کم سود کے مشابہ ضرور ہے۔ یہ زین العابدین علی بن الحسینؓ اور الناصر المنصور باللہ اور ہادویہ کا مسلک ہے۔ اور علامہ شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے ان فقہاء کا یہی مسلک نقل فرمایا ہے۔

(نیل الاوطار، ۵ : ۱۷۲)

لیکن ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء اور محدثین کا مسلک یہ ہے کہ ادھار بیع میں نقد بیع کے مقابلے میں قیمت زیادہ کرنا جائز ہے بشرطیکہ عاقدین عقد کے وقت ہی بیع موجل ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں قطعی فیصلہ کر کے کسی ایک ثمن پر متفق ہو جائیں، لہٰذا اگر بائع یہ کہے کہ نقد اتنے میں اور ادھار اتنے میں بیچتا ہوں اور اس کے بعد کسی ایک بیع پر اتفاق کئے بغیر دونوں جدا ہو جائیں تو یہ بیع ناجائز ہے لیکن اگر عاقدین مجلس عقد میں ہی کسی ایک شق اور کسی ایک ثمن پر اتفاق کرلیں تو یہ بیع جائز ہو جائے گی۔

چنانچہ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ جامع ترمذی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث "نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ بَيْعَتَيْنِ فِيْ بَيْعَةٍ" کے تحت تحریر فرماتے ہیں۔

وَقَدْ فَسَّرَ بَعْضُ اَهْلِ الْعِلْمِ، قَالُوْا بَيْعَتَيْنِ فِيْ بَيْعَةٍ اَنْ يَّقُوْلَ اَبِيْعُكَ هٰذَا الثَّوْبَ بِنَقْدٍ بِعَشَرَةٍ، وَبِنَسِيْئَةٍ بِعِشْرِيْنَ وَلَا يُفَارِقُهُ عَلٰى اَحَدِ الْبَيْعَيْنِ فَاِنْ فَارَقَهُ عَلٰى اَحَدِهِمَا فَلَا بَاْسَ اِذَا كَانَتِ الْعُقْدَةُ عَلٰى اَحَدٍ مِّنْهُمَا۔

(ترمذی کتاب البیوع باب نمبر ۱۸ حدیث نمبر ۱۲۳۱)

"بعض اہل علم نے اس حدیث کی یہ تشریح بیان کی ہے کہ "بَيْعَتَيْنِ فِيْ بَيْعَةٍ" سے مراد یہ ہے کہ بائع مشتری سے کہے کہ "میں یہ کپڑا تم کو نقد دس درہم میں بیچتا ہوں اور ادھار بیس درہم میں بیچتا ہوں۔ اور پھر کسی ایک بیع پر اتفاق کر کے جدائی نہیں ہوئی لیکن اگر ان دونوں میں سے کسی ایک پر اتفاق ہونے کے بعد جدائی ہوئی تو اس میں کوئی حرج نہیں (یعنی بیع جائز ہے) کیونکہ معاملہ ایک پر طے ہو گیا ہے۔"

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کا خلاصہ یہ ہے کہ مذکورہ بیع کے ناجائز ہونے کی علت یہ ہے کہ عقد کے وقت کسی ایک صورت کی عدم تعیین سے ثمن دو حالتوں میں متردد ہو جائے گا۔ اور یہ تردد جہالت ثمن کو مستلزم ہے جس کی بناء پر بیع ناجائز ہوئی مگر مدت کے مقابلے میں ثمن کی زیادتی ممانعت کا سبب نہیں لہٰذا اگر عقد کے وقت ہی کسی ایک حالت کی تعیین کر کے جہالت ثمن کی خرابی دور کر دی جائے تو پھر اس بیع کے جواز میں شرعاً کوئی قباحت نہیں

موجودہ دور کے اتفاق کے لئے

قسطوں پر خرید و فروخت

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ، وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ، وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ وَعَلٰی کُلِّ مَنْ تَبِعَھُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ، وَبَعْدُ:

موجودہ دور میں قسطوں پر بیچنے کا رواج تمام ممالک میں عام ہو چکا ہے اور بہت سے لوگ اپنی ضرورت کی اشیاء خریدنے اور مکانات کی تعمیر اور جدید قسم کے مہنگے آلات صرف قسطوں پر خرید سکتے ہیں۔ اور نقد خریدنا ان کی طاقت اور استطاعت سے باہر ہوتا ہے، اس لئے اس بیع کا شرعی حکم اور اس پر متفرع ہونے والے مختلف مسائل کو تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، انشاء اللہ یہ مختصر مقالہ اس بیع کے بارے میں ضروری احکام و مسائل کے لئے کافی ہوگا، اللہ تعالیٰ صحیح بات لکھنے کی توفیق عطا فرمائے اور وہ اپنی مرضیات کے مطابق اس کی تکمیل کرادے۔ آمین

(تقی عثمانی)

قسطوں پر بیع کا مطلب وہ بیع ہے جس میں بیچنے والا اپنا سامان خریدار کو اسی وقت دیدے لیکن خریدار اس چیز کی قیمت فی الحال ادا نہ کرے بلکہ وہ طے شدہ قسطوں کے مطابق اس کی قیمت ادا کرے۔ لہٰذا جس بیع میں مذکورہ بالا صورت پائی جائے اس کو "بیع بالتقسیط" کہیں گے چاہے اس چیز کی طے شدہ قیمت اس کی بازاری قیمت کے برابر ہو یا کم یا زیادہ لیکن

"بیع بالتقسیط" میں عام معمول یہ ہے کہ ا[illegible] میں چیز کی قیمت بازاری قیمت سے زیادہ کی جاتی ہے، لہٰذا اگر خریدار اس چیز کو نقد خریدنا چاہے تو وہ اس چیز کو مقررہ قیمت سے کم قیمت پر بازار سے خرید سکتا ہے لیکن اگر اس چیز کو ادھار خریدنا چاہے گا تو بیچنے والا اس وقت اس کو بیچنے پر تیار ہو گا جب ا[illegible] نقد کے مقابلے میں زیادہ قیمت وصول

وجہِ نمودِ عالم

وجہ نمودِ عالمِ امکاں تمہی تو ہو
افسانۂ حیات کا عنواں تمہی تو ہو

بزمِ رُسل میں فخرِ رسولاں تمہی تو ہو
ممتاز سب سے اور نمایاں تمہی تو ہو

تمہی سے جہانِ نبوّت فروغ گیر
پیغمبری کے نیّرِ تاباں تمہی تو ہو

جس کی ضیا ہے باعثِ تنویرِ دو جہاں
کونین کے وہ مہرِ درخشاں تمہی تو ہو

دُرِّ یتیم، خاتمِ کونین کے نگیں
خیر البشر محمدؐ ذیشاں تمہی تو ہو

تمہی سے ہے شگفتہ و شاداب پھول پھول
جانِ بہار و روحِ گلستاں تمہی تو ہو

دم ہے جو دہر میں تو تمہارے ہی دم سے ہے
روحِ روانِ عالمِ امکاں تمہی تو ہو

ہر مضطرب نگاہ ہے تم پر لگی ہوئی
تسکینِ قلبِ دہر کا ساماں تمہی تو ہو

بخشا تمہی نے دردِ محبت عزیز کو
اور اس کے اضطراب کا درماں تمہی تو ہو

(صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم)

عزیز حاصل پوری

حمد باری تعالیٰ

نادک حمزہ پوری

اللہ! تو ہے واحد و بے مثل و لاشریک
ذات و صفات میں نہیں کوئی ترا شریک
معبود اور کوئی نہیں ہے تیرے سوا
پایندہ اور زندہ فقط تو ہے کبریا
کیا ذکر نیند کا کہ کبھی اونگھتا نہیں
تجھ سا کوئی سمیع و بصیر اے خدا نہیں
جو کچھ زمیں سے تا بہ فلک ہے وہ ہے ترا
جو کچھ سما سے تا بہ سمک ہے وہ ہے ترا
جو کچھ ہے پیش و پس ہے سبھی تیرے علم میں
ہر چیز ہے جلی و خفی تیرے علم میں
غیب و حضور سے نہیں آگاہ دوسرا
البتہ کچھ بتا دے جو تو، تو تری رضا
اللہ تیری شان علی العظیم ہے
نادک کو بخش دے تو غفور الرحیم ہے

(جلّ جلالہٗ)

کہ اس میں عقلی اور منطقی تضاد نام کی کوئی سے
نہیں ہے۔ وہ ایسی صداقتوں کی تعلیم دیتا
ہے جو عقلی طور پر ایک دوسرے کی تائید
کرتی ہیں۔

اسلامی احکام تمام تر حکمت و دانش کے
...ر وابستہ ہیں۔ قرآن حکیم کی آیت :

...ؤتِ الحِکمَۃَ فَقَد اُوتِیَ خَیرًا کَثِیرًا (البقرہ
۲...) "اللہ تعالیٰ جس سے بھلائی کا ارادہ کرتا
...ہے دین کی سمجھ عطا کرتا ہے۔" اس امر پر
...کرتی ہے کہ دین کی سمجھ ایک ایسی اہم چیز
...ہر کسی کو عطا نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ
...یہ سمجھتے ہیں کہ احکام شرعیہ میں کوئی مصلحت
...ت نہیں ہوتی شریعت کی پابندی کا مقصد
...ندے کی اطاعت شعاری کا امتحان ہے
... لیکن شاہ ولی اللہ جنہوں نے اسرار
...ت کو اپنا خاص موضوع تحقیق بنایا ہے
...سے انکار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ خیال
...ہے، سنت اور خیر القرون کا اجماع اس
...کو غلط قرار دیتے ہیں۔

قرآن حکیم کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے
...ن حکیم نے اپنے خطاب کی بنیاد ہی عقل
...یا اور احکام الٰہی انہی لوگوں کی طرف متوجہ
...تے ہیں جو عاقل ہیں۔ قرآن حکیم نے تمام
...ی احکام کو عقلی حوالوں اور منطقی دلائل
...بھانے کی کوشش کی ہے مثلاً توحید کا
...ہ وہ بنیادی عقیدہ ہے جس پر دین کی تمام
...ت کی بنیاد کھڑی ہے اور اس عقیدے پر کسی
...کی کوئی مفاہمت ممکن نہیں۔ اس کے
...ود قرآن حکیم نے اس عقیدے کی تفہیم کے
لئے ہر طرح کے عقلی دلائل دیئے یہاں تک کہ
اس فریضہ کا کہ اگر کائنات میں ایک سے زائد
خدا ہوں، تجزیہ کیا اور بتایا کہ اسے درست
ماننے کی صورت میں نظام کائنات درہم برہم
ہو جائے گا۔

قرآن حکیم نے تفکر، تدبر اور تعقل کی بار بار
دعوت دی۔ ایک ذرے سے لے کر آفتاب
تک کائناتی امور کے مشاہدے کا حکم دیا۔ اجرام
فلکی جس خاموشی اور تیز رفتاری کے ساتھ
آسمانوں پر اپنے مقررہ راستوں پر رواں دواں
ہیں، بارش سوکھی زمین کی پیاس بجھانے کے
لئے برستی ہے، جہاز جو سمندروں کا سینہ
چیرتے ہوئے گزرتے ہیں اور انسانوں کی بہبود
کی اشیا سے لدے ہوئے ہیں کھجور کے درخت
اپنے سنہرے پھل سے جھکے پڑے ہیں، کائنات
کی یہ تنظیم کیا پتھر کے خداؤں کا کارنامہ ہو سکتا ہے؟
اگر یہ سب کچھ ایک قادر و قیوم ذات کی تخلیق
ہے اور اس نے اسے بے مقصد نہیں پیدا کیا تو
کیسے ممکن ہے کہ اس نے انسانوں کو جو احکام
دیئے وہ بے مقصد ہوں، ان کے پیچھے کوئی
حکمت و دانش نہ ہو، ان میں باہمی کوئی ربط و
تنظیم نہ ہو۔ ان میں منطقیت اور معقولیت عنقا
ہو۔ ارشاد ربانی ہے: وَمَا خَلَقنَا السَّمٰوٰتِ
وَالاَرضَ وَمَا بَینَہُمَا لٰعِبِینَ۔ مَا خَلَقنٰہُمَآ
اِلَّا بِالحَقِّ وَلٰکِنَّ اَکثَرَہُم لَا یَعلَمُونَ (الدخان
۴۴: ۳۸-۳۹) "ہم نے زمین و آسمان اور جو کچھ
ان کے درمیان ہے، کھیل تماشے کے لئے
پیدا نہیں کیا۔ ہم نے انہیں حق کے ساتھ تخلیق
کیا ہے لیکن اکثر لوگ علم نہیں رکھتے۔"

امام صاحب اور استفتا

ایک دن حسن اتفاق سے امام سفیان ثوری، قاضی ابن ابی لیلےٰ، شریک امام ابوحنیفہؒ ایک مجلس میں جمع تھے، شائقین علم کو اس سے عمدہ کیا موقع مل سکتا تھا۔ ایک شخص نے آکر مسئلہ پوچھا کہ "چند آدمی ایک جگہ مجتمع تھے۔ دفعتہً ایک سانپ نکلا اور شخص کے بدن پر چڑھنے لگا۔ اس نے گھبرا کر پھینک دیا۔ وہ دوسرے شخص پر جا گرا۔ اس نے بھی اضطراب میں ایسا ہی کیا۔ یونہی ایک دوسرے پر پھینکتے رہے۔ یہاں تک کہ اخیر شخص کو اس نے کاٹا اور وہ مر گیا، دیت کس پر لازم آئے گی" یہ فقہ کا ایک دقیق مسئلہ تھا۔ سب کو تامل ہوا کسی نے کہا سب کو دیت دینی ہوگی۔ بعضوں نے کہا صرف پہلا شخص ذمہ دار ہوگا۔ سب کے سب مختلف الرائے تھے اور باوجود بحث کے کچھ تصفیہ نہیں ہوتا تھا امام ابوحنیفہؒ چپ تھے اور مسکراتے جاتے تھے۔ آخر سب نے ان کی طرف خطاب کیا۔ آپ بھی تو اپنا خیال ظاہر کیجیے۔ امام صاحبؒ نے فرمایا جب پہلے شخص نے دوسرے پر پھینکا اور وہ محفوظ تو پہلا شخص بری الذمہ ہو چکا، اسی طرح دوسرا اور تیسرا بھی، بحث اگر ہے تو صرف اخیر شخص کی نسبت ہے۔ اس کی دو حالتیں ہیں۔ اگر اس کے پھینکنے کے ساتھ ہی سانپ نے اس شخص کو کاٹا تو اس پر دیت لازم آئے گی۔ اور اگر کچھ وقفہ ہوا تو یہ شخص بھی بری الذمہ ہو چکا۔ اب اگر سانپ نے اس کو کاٹا تو خود اس کی غفلت ہے کہ اس نے اپنی حفاظت میں جلدی اور تیز دستی کیوں نہ کی" اس رائے سے سب نے اتفاق کیا اور امام صاحبؒ کی جودت طبع کی تحسین کی۔

انسانوں سے خطاب کیا اور اپنی صداقت منوانے کے لئے منطقی، آفاقی، انفسی، تاریخی اور سائنسی دلائل دیئے اور کبھی یہ مطالبہ نہیں کیا کہ بے سوچے سمجھے وحی کی صداقت کو تسلیم کر لیا جائے۔

اس بات کا فیصلہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اسلام کی صحیح اور سچی تشریح کو پرکھنے کے لئے کوئی اصول وضع کریں اور اس کی کوئی خصوصیات معین کریں۔ اس کے بعد ہم آسانی سے کہہ سکیں گے کہ اسلام کی جو تشریح ان اصولوں کے مطابق ہے یا ان خصوصیات سے بہرہ ور ہے وہی صحیح ہے اور باقی سب غلط ہیں۔

خوش قسمتی سے قرآن ہمیں خود بتاتا ہے کہ قرآن کی صحیح اور سچی تشریح کی علامات اور خصوصیات کیا ہوتی ہیں اور اسے کیونکر پرکھا جا سکتا ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ اگر وہ خدا کی طرف سے نہ ہوتا تو اس میں کثرت سے اختلاف ہوتا۔ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا (النساء ۴: ۸۲) "اگر قرآن غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو وہ یقیناً اس کے اندر بیانات کا اختلاف پاتے"۔

بیانات کے اختلافات ہمیشہ عقلی اختلافات ہوتے ہیں کیونکہ عقل ہی ان کو معلوم کرتی ہے لہٰذا ظاہر ہے کہ اس آیت میں اختلافات سے مراد عقلی تضاد ہے۔ گویا قرآن حکیم نے بتایا ہے

کی کوئی امید نہ ہو اور اس کی وجہ سے بدن کے دوسرے حصوں میں زہر پھیلنے کا امکان ہو۔

تحفظ عقل

انسان محض عقل کی وجہ سے دوسرے حیوانات سے ممتاز ہے۔ انسانی عقل جزئی واقعات سے کلیات اور فارمولے بناتی ہے اور یہ معلومات ایک نسل دوسری نسل کو منتقل کرتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ انسانی تمدن مسلسل ارتقا پذیر ہے۔

انسانی عقل کے تحفظ کے لئے قرآن حکیم نے یہ اہتمام کیا ہے کہ انسان کو حصول علم کی طرف متوجہ کیا جائے۔ چنانچہ جو پہلی وحی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اس میں ایمان لانے کا مطالبہ نہیں کیا گیا بلکہ قرآن نے سب سے پہلا حکم یہ دیا: اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ۔ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ۔ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ۔ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ (العلق ۹۶: ۱-۵) "پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا، پڑھ اور تیرا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا، انسان کو نامعلوم حقائق سے آشنا کیا۔"

ان ابتدائی پانچ آیات میں تین بنیادی امور کی طرف انسان کو متوجہ کیا گیا:

۱۔ جو کچھ اس سے پہلے لکھا گیا ہے اسے پڑھے۔
۲۔ جو نئی باتیں اس نے سیکھی ہیں انہیں آئندہ نسل کے لئے لکھ لے۔
۳۔ معلوم حقائق کے ذریعے نامعلوم حقائق کی دریافت کرے۔

لکھنا پڑھنا اور تحقیق یہی وہ تین چیزیں ہیں جو انسانی عقل کو جلا بخشتی ہیں علم ہی ایک ایسا امتیازی وصف ہے جس کی بدولت آدم کو خلافت ارضی کی خلعت نصیب ہوئی اور علم نے ہی انسان کو اس قابل بنایا کہ وہ کائنات کی تسخیر کر سکے۔

عقل انسانی کے تحفظ کے لئے سلبی اہتمام یہ کیا گیا کہ ایسی تمام اشیا کا استعمال ممنوع قرار دیا گیا جن سے عقل انسانی پر پردہ پڑ جائے اور وہ کام کرنا چھوڑ دے۔ ارشاد نبوی ہے: "ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔" (ابو داؤد)

۸۔ معقولیت

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو عقل کے ذریعے دوسری مخلوق سے ممیز کیا اور انسان کو مکلف بنایا گویا انسان کو احکام الٰہی کی بجا آوری کی ذمہ داری اس وجہ سے دی گئی کہ یہ عقل و خرد رکھتا ہے، صحیح اور غلط میں امتیاز کر سکتا ہے، نفع اور نقصان جان سکتا ہے اور اچھائی اور برائی میں فرق کر سکتا ہے۔ جب اللہ کا انسان سے خطاب محض اس وجہ سے ہے کہ وہ عقل و خرد کی حامل مخلوق ہے تو اس کا لازمی تقاضا ہے کہ خطاب خداوندی سراسر مطابق عقل ہو تاکہ اس کی صحت جاننے میں انسان کو دقت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

انسانی تاریخ کے مختلف ادوار میں جب بھی اللہ کی طرف سے وحی نازل ہوئی تو اس نے محض عقلی اور استدلالی بنیادوں پر

رہے۔

تمام انبیاء کرام دین کے تحفظ کے لئے مبعوث کئے گئے۔ دین کی اس اہمیت کے باوجود کہ قرآن حکیم نے صراحت سے کہا ہے: وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ (آل عمران ۳: ۸۵) "جو کوئی اسلام کے علاوہ کوئی دین اختیار کرے گا تو وہ قبول نہیں کیا جائے گا"۔ اس امر کا اہتمام کیا گیا ہے کہ دین کی اشاعت، دعوت و تبلیغ کے ذریعے ہو کسی فرد کو زبردستی دین قبول کرنے پر مجبور نہ کیا جائے ارشاد ربانی ہے: لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ (البقرہ ۲: ۲۵۶) "دین کے بارے میں زبردستی نہیں ہے"۔

دین کی تفہیم کے لئے قرآن حکیم نے آفاق و انفس سے بے شمار دلائل دیئے ہیں جن سے توحید باری تعالیٰ، حقانیت، نبوت و رسالت اور امکان معاد پر سیر حاصل روشنی پڑتی ہے۔ اسی کو قرآن کہتا ہے: سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (حم السجدہ ۴۱: ۵۳) "عنقریب ہم ان کو خارج کی دنیا میں اور نفس انسانی کے اندر ایسے حقائق سے آشنا کریں گے جن سے ان پر واضح ہو جائے گا کہ قرآن حکیم سچی کتاب ہے"۔

نظریات کے تحفظ کیلئے دو گونہ عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔

۱۔ نظریات کا پرچار، ۲۔ ان کے مقابلے میں پیش آمدہ چیلنجوں کا مقابلہ۔

چنانچہ دین جو ابدی حقائق پر مشتمل نظریات کے مجموعے کا نام ہے اس کے تحفظ کے لئے ان دونوں امور کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔

نظریات کی دعوت و تبلیغ کے لئے ضروری قرار دیا گیا کہ پوری امت مسلمہ اسلامی افکار کی تبلیغ کو اپنا مقصد تخلیق سمجھتے ہوئے انجام دے: كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ (آل عمران ۳: ۱۱۰) "تم بہترین امت ہو جسے اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ اچھی باتوں کا حکم دو، برائیوں سے روکو اور اللہ پر ایمان لاؤ"۔

لیکن تنظیم و نسق کا اصول یہ ہے کہ جب کوئی کام سب کے سپرد کر دیا جائے تو اس امر کا امکان ہوتا ہے کہ کوئی بھی نہ کرے اور ہر شخص یہ سوچے کہ شاید دوسرا اسے انجام دے دے گا اس لئے اس امکان کو ختم کرتے ہوئے ضروری قرار دیا کہ ایک جماعت اس کام کے لئے مختص ہونی چاہئے۔ وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (آل عمران ۳: ۱۰۴) "تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہئے جو بھلائی کی طرف بلائے، اچھے کاموں کا حکم دے اور برائیوں سے روکے جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے"۔

دوسری طرف تحفظ دین کے لئے قتال مشروع قرار دیا گیا۔ جب خارجی طور پر دین کو خطرات لاحق ہوں یا کچھ قوتیں عام لوگوں کے دین قبول کرنے کی راہ میں حارج ہوں اور دین کو ختم کرنے کے درپے ہوں تو انہیں راہ سے ہٹانا اسی طرح ضروری ہے جیسے انسانی بدن کے کسی ایک حصے کو آپریشن کے ذریعے کاٹ پھینکنا ضروری ہوتا ہے جو خود اس حد تک گل سڑ گیا ہو کہ اس کے صحت یاب ہونے

بروں سے وابستہ ہوتے ہیں۔ گندی عورتیں گندے مردوں کے لئے ہیں اور گندے مرد گندی عورتوں کے لئے اور پاکباز عورتیں پاکباز مردوں کے لئے ہیں اور پاکباز مرد پاکباز عورتوں کے لئے۔ (النور ۲۴:۲۶)

۸۔ معاشرے میں پاکیزہ ماحول پیدا کرنے کے لئے بے حیائی کی اشاعت اور فحاشی کے پرچار کو انتہائی قابل مذمت اور قابل تعزیر جرم قرار دیا ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَۃُ فِی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ (النور ۲۴:۱۹) ”بے شک جن لوگوں کو یہ پسند ہے کہ اہل ایمان میں فحاشی پھیلے ان کے لئے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے“

۹۔ مردوں اور عورتوں دونوں کو اپنے قلب و نگاہ کو پاک رکھنے، اپنی وضع قطع، طور اطوار، نشست و برخاست اور چال چلن اس انداز سے رکھنے کا حکم دیا کہ اس سے پاکبازی مترشح ہو اور کسی بیمار دل میں کسی طرح کی ہوس پیدا نہ ہو۔ ”اے نبیؐ! اپنی بیویوں، بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دو کہ باہر نکلیں تو اپنی چادر لٹکا لیا کریں“ (الاحزاب ۳۳:۵۹) اس سلسلے میں قرآنی ہدایات کے لئے ان آیات کا مطالعہ کریں: النور ۲۴:۳۰، الاحزاب ۳۳:۳۲، المومن ۴۰:۱۹۔

۱۰۔ عزت و آبرو کے تحفظ کے لئے تمام تر انتظامات کرنے کے بعد اس امر کی گنجائش بہت کم رہتی ہے کہ لوگ جنسی بے راہ روی کا شکار ہوں یا معاشرے میں آوارگی اور بے حیائی کا چلن عام ہو جائے۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی بدکاری کا ارتکاب کرتا ہے تو بدکاری کا ارتکاب کرنے والی عورت اور مرد دونوں کے لئے کوڑوں کی سزا مقرر کی گئی۔

”بدکاری کرنے والی عورت اور بدکاری کرنے والا مرد دونوں میں سے ہر ایک کو سو درے مارو۔ اگر تم خدا اور آخرت پر یقین رکھتے ہو تو تمہیں ان پر ہرگز ترس نہیں آنا چاہئے اور چاہئے کہ ان کی سزا کے وقت مسلمانوں کی ایک جماعت بھی موجود ہو۔“ (النور ۲۴:۲)

۱۱۔ خواتین کا احترام مردوں کی بہ نسبت زیادہ ہے اور ان پر لگایا گیا الزام نہ صرف ان کی زندگی برباد کرنے کا باعث ہوتا ہے بلکہ ان خواتین کی اولاد کی صحت نسبت کے بارے میں بھی شک و شبہ پیدا کرتا ہے اس لئے ایسے الزام عائد کرنے والوں کی الگ سے سزا مقرر کی گئی۔

”جو لوگ پاکباز عورتوں پر بدکاری کا الزام لگائیں اور اس پر چار گواہ نہ لائیں تو ان کو اسی درے مارو اور کبھی ان کی گواہی قبول نہ کرو۔ یہی لوگ بدکردار ہیں“

سو عزت و آبرو ناموس کو لاحق ہونے والے ضرر کے ازالہ کے لئے قرآن حکیم نے مکمل قانون دیا ہے۔

تحفظ دین

اوپر ہم بیان کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق کے ساتھ ہی اس کی ہدایت کا اہتمام فرمایا۔ جو صداقت حضرت آدم علیہ السلام کے دور سے شروع ہوئی اس کی حقیقت کبھی نہیں بدلی۔ اس کے ضروری اجزا (توحید، رسالت اور معاد) ہر دور اور ہر زمانہ میں محفوظ

ان الدین عند اللہ الاسلام

اور اللہ اس میں بہت بھلائی پیدا کر دے
اور اگر تم ایک عورت کو چھوڑ کر دوسری عورت
کرنا چاہو اور پہلی عورت کو بہت سا مال
دے چکے ہو تو اس میں سے کچھ مت لینا۔ کیا
تم بہتان باندھ کر اور کھلے گناہ کا ارتکاب کرتے
ہوئے اس سے مال واپس لینا چاہتے ہو۔ اور
تم دیا ہوا مال کیسے واپس لے سکتے ہو جب کہ
تم ایک دوسرے کے انتہائی قریب رہ چکے
ہو اور وہ تم سے پکا وعدہ لے چکی ہیں۔"
(النساء ۴: ۱۹-۲۱)

۶۔ اگر میاں بیوی میں باہمی اختلافات رونما
ہو جائیں تو انہیں خوش اسلوبی سے طے کرنے
کا طریقہ بتایا گیا ہے اور اس امر کی اجازت نہیں
دی گئی کہ ایک دوسرے پر بے سروپا الزامات
عائد کیے جائیں یا کسی فریق کو ناجائز تنگ
کیا جائے۔

ارشاد ربانی ہے: "جن عورتوں کے بارے
میں تمہیں معلوم ہو کہ سرکشی اور بدخوئی کرنے
لگی ہیں تو پہلے ان کو زبانی سمجھاؤ اگر نہ سمجھیں
تو پھر ان کے ساتھ سونا ترک کر دو۔ اگر اس پر
بھی باز نہ آئیں تو ہلکی بدنی سزا دو اور اگر فرماں
بردار ہو جائیں تو پھر ان کو ایذا دینے کا کوئی
بہانہ نہ ڈھونڈو۔ بے شک اللہ سب سے
اعلیٰ اور جلیل القدر ہے۔ اور اگر تم کو معلوم ہو
کہ میاں بیوی میں ان بن ہے تو ایک منصف
مرد کے خاندان سے اور ایک منصف عورت کے
خاندان سے مقرر کرو۔ اگر وہ صلح کرا دینی چاہیں
گے تو خدا ان میں موافقت پیدا کر دے گا۔
(النساء ۴: ۳۴-۳۵)۔

"اور اگر کسی عورت کو اپنے خاوند کی طرف
سے زیادتی یا بے رغبتی کا اندیشہ ہو تو میاں بیوی
پر کچھ گناہ نہیں کہ آپس میں کسی قرارداد پر صلح
کر لیں اور صلح خوب چیز ہے اور طبیعتیں تو بخل
اور لالچ کی طرف مائل ہوتی ہیں لیکن اگر تم
حسن سلوک کرو اور بخل اور لالچ سے بچو تو
اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں سے باخبر ہے۔"
(النساء ۴: ۱۲۸)

۷۔ نیکو کار مردوں اور عورتوں کے باہمی رشتہ
ازدواج میں منسلک ہونے کی حوصلہ افزائی کی
ہے اور بتایا ہے کہ اچھے، اچھوں سے اور برے

اور دوسروں کے عیبوں کی ٹوہ میں نہ لگے رہو تم ایک دوسرے کی برائی پیٹھ پیچھے بیان نہ کرو کیا تم میں سے کوئی اسے پسند کرتا ہے کہ اپنے بھائی کا مردہ گوشت کھائے، تم اس سے نفرت کرتے ہو۔ (الحجرات ۴۹: ۱۲)

عزت و ناموس کو ضرر پہونچانے والی بدترین چیز بدکاری یا بدکاری کا جھوٹا الزام ہے جس کے نتیجے میں کسی بھی فرد کے، جس کے والدین پر الزام ہو، سلسلہ نسب کی صحت کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اس ضرر کو دور کرنے کے لئے قرآن حکیم نے بہت اہتمام کیا ہے۔

۱۔ قرآن حکیم نے مرد اور عورت کے آزادانہ جنسی تعلقات پر پابندی عائد کر کے اسے نکاح کے ساتھ مقید کر دیا ہے تاکہ جس معاشرے میں وہ افراد رہتے ہوں اسے معلوم ہو کہ اس جوڑے کا اکٹھا رہنا قانونی ہے۔ ان کے ہاں پیدا ہونے والی اولاد جائز ہے اور وہ معاشرے میں عزت کے مقام کی مستحق ہے۔

۲۔ قرآن حکیم نے رشتہ ازدواج کو محض قانونی رشتہ قرار نہیں دیا بلکہ میاں بیوی کو ایک دوسرے کے لئے وجہ سکون اور اسے دو خاندانوں کے درمیان باہمی محبت و مودت کا رشتہ قرار دیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے: "اللہ کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمھی میں سے تمہارے جوڑے بنائے تاکہ تم ان کے پاس راحت حاصل کرو اور اسے تمہارے درمیان مودت و رحمت کا ذریعہ بنایا۔ (الروم ۳۰: ۲۱)

۳۔ میاں بیوی کے باہمی حقوق و فرائض کا اس طرح تعین کیا کہ کسی فریق کو دوسرے سے کوئی شکایت پیدا نہ ہو۔ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ (البقرہ ۲: ۲۲۸)

"بیویوں کے حقوق ہیں اسی طرح جیسے کہ ان کے فرائض ہیں۔"

۴۔ مرد اور عورت فطری اور خلقی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور دونوں اپنی تکمیل کے لئے ایک دوسرے کے محتاج ہیں چونکہ ان دونوں کے وظائف الگ الگ ہیں اس لئے ان میں تقسیم کار کے اصول کے تحت مرد کو انتظام میں اور عورت کو احترام میں برتری دی گئی۔

"مرد عورتوں کے لئے نگہبان ہیں اس لئے خدا نے بعض کو بعض سے افضل بنایا اور اس لئے کہ مرد اپنا مال خرچ کرتے ہیں، پس جو نیک بیبیاں ہیں وہ مردوں کا کہا مانتی ہیں، ان کی غیر حاضری میں ان چیزوں کی حفاظت کرتی ہیں جن کی اللہ نے حفاظت کی ہے۔"

(النساء ۴: ۳۴)

۵۔ خواتین بالعموم فطرتاً کمزور ہوتی ہیں اور مرد تنوع پسند جس کے نتیجے میں تعلقات میں کشیدگی پیدا ہونے کے امکانات ہو سکتے تھے۔ اس لئے خواتین کو بہتر گھریلو ماحول مہیا کرنے کے لئے مردوں کو حکم دیا گیا کہ: "اے ایمان والو! تمہارے لئے جائز نہیں کہ زبردستی عورتوں کے وارث بن جاؤ اور انہیں روکے نہ رکھو اس نیت سے کہ جو تم نے انہیں دیا ہے اس میں سے کچھ واپس لے سکو۔ ہاں اگر وہ کھلے طور پر بدکاری کا ارتکاب کریں تو انہیں گھروں میں روکے رکھنا درست ہے اور ان کے ساتھ اچھی طرح سے رہو، اگر وہ تم کو ناپسند ہوں تو عجب نہیں کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو

بتاتے ہوئے قرآن حکیم نے کہا ہے:

"چوری کرنے والا مرد اور چوری کرنے والی عورت جو بھی ہو ان کے ہاتھ کاٹ دو ان کے عمل کی عبرتناک سزا ہے اللہ کی طرف سے" (المائدہ ۵:۳۸)

ڈاکے کے ذریعے کسی کے مال کو ہتھیانے کی سزا اس سے بھی سنگین ہے۔ ارشاد ربانی ہے: "جو لوگ اور اس کے رسولؐ سے لڑائی کرتے ہیں اور زمین میں فساد کرنے کو دوڑتے ہیں انکی سزا یہ ہے کہ ان کو قتل کر دیا جائے یا سولی دیجائے یا ان کے مقابل ہاتھ اور پاؤں کاٹ دیئے جائیں یا ملک سے نکال دیا جائے، یہ تو ہے انکی دنیا میں رسوائی اور ان کے لئے آخرت میں بڑا عذاب ہے۔ (المائدہ ۵:۳۳)

تحفظ مال کے سلسلے میں قرآن حکیم نے مزید ہدایات دیتے ہوئے کہا ہے کہ جو لوگ اپنا دفاع خود نہیں کر سکتے ان کے مال کو دوسروں کی نسبت زیادہ تحفظ فراہم کیا جائے۔ یتامیٰ کے لئے اپنے مال کا تحفظ مشکل ہوتا ہے اسلئے ان کے مال کے تحفظ کے بارے میں سخت احکام ہیں۔ (النساء ۴: ۲-۱۰، الانعام ۶: ۱۵۲) اور جو شخص اپنے مال کا دفاع کرتے ہوئے مارا جائے وہ شہید ہے (بخاری)

ان احکام سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مال کے سلسلے میں لاحق ہونے والے ضرر کے ازالے کے لئے کس قدر جامع قانون سازی کی گئی ہے۔

تحفظ عزت و ناموس

بالعموم انسانی معاشروں میں عزت و ناموس

کو زندگی اور مال و دولت پر بھی ترجیح حاصل ہوتی ہے اور افراد معاشرہ عزت و آبرو کے تحفظ کیلئے جان کی بازی لگا دیتے ہیں۔ قرآن حکیم نے انسانی مقام و منصب کو بہت احترام دیا ہے اور اس کے ابنائے جنس میں سے بھی کسی کو یہ حق نہیں دیا کہ وہ کوئی ایسا اقدام کرے جس سے کسی دوسرے شخص کی عزت نفس مجروح ہو۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَاۗءٌ مِّنْ نِّسَاۗءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ (الحجرات ۴۹:۱۱) "اے ایمان والو! نہ مرد دوسرے مردوں کا مذاق اڑائیں، ہو سکتا ہے وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کرو اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے یاد کرو۔ نیز فرمایا: "اے ایمان والو! بہت گمان کرنے سے بچو، بعض گمان گناہ ہوتے ہیں

کہ انتہائی ضرورت کے وقت حق ملکیت کا تقدس ختم کرکے مال غیر میں تصرف کو جائز قرار دیا گیا ہے۔

اسلامی قانون ملکیت اراضی میں شفعہ کا جواز اسی اصول پر ہے۔ یحییٰ بن آدم القرشی نے بیان کیا ہے کہ ضحاک بن خلیفہ انصاری کی زمین تھی۔ اس میں پانی پہونچانے کے لئے محمد بن مسلمہ کے باغ سے پانی گزارنا پڑتا تھا اور محمد بن مسلمہ اس کی اجازت نہیں دیتے تھے جس کے نتیجے میں ضحاک کی زمین بنجر ہو رہی تھی۔ معاملہ حضرت عمرؓ کی عدالت میں پیش ہوا۔ آپ نے محمد بن مسلمہ کو بلا کر پوچھا:

کیا اس میں تمہارا کوئی نقصان ہے؟

انھوں نے کہا: نہیں۔

آپ نے فیصلہ سنا دیا: اللہ کی قسم اگر پانی گزارنے کے لئے تمہارے پیٹ کے سوا اور کوئی راستہ نہ ہو تو تمہارے پیٹ پر سے گزار دونگا۔

(کتاب الخراج)

سمرہ بن جندب کی ایک کھجور ایک انصاری کے احاطے میں تھی۔ حضرت سمرہ اور ان کے اہل خانہ کھجوریں توڑنے آتے تو انصاری کو زحمت ہوتی۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی تو آپ نے سمرہ کو بلا کر کہا کہ کھجور فروخت کردو، وہ نہ مانے۔ آپ نے فرمایا کاٹ دو انھوں نے انکار کر دیا۔ آپ نے فرمایا: ہبہ کردو اور اس کا بدلہ جنت میں لے لو، انھوں نے قبول نہ کیا تو آپ نے کہا: تم دانستہ نقصان پہونچا رہے ہو اور انصاری کو حکم دیا کہ جاؤ اور اس کی کھجور کاٹ دو۔ (ابوداؤد، کتاب الاقضیہ ۳:۲۱۵)

تحفظ ملکیت کے اقدامات

انسانی زندگی کی بقا کے لئے مال کی اہمیت کے پیش نظر قرآن حکیم نے تحفظ ملکیت کے قوانین وضع کئے اور ایسے حالات پیدا کرنے کی طرف انسانی معاشرے کی رہنمائی کی جس میں کوئی ایسا طبقہ پیدا نہ ہو جو زبردستی دوسروں کے اسباب معاش اور وسائل رزق پر قبضہ کرکے انہیں بنیادی ضرورتوں یا ضروری آسائشوں سے محروم کردے۔ ارشاد ربانی ہے: "ایکدوسرے کا مال آپس میں ناحق نہ کھاؤ اور اسے حاکموں تک نہ پہونچاؤ تاکہ لوگوں کے مال کا کچھ حصہ گناہ کے ساتھ جان بوجھ کر کھا جاؤ (البقرہ ۲:۱۸۸)

قرآن حکیم نے ربوا کو حرام قرار دیا ہے کیونکہ اس میں دوسرے کی ضرورت یا مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی رضامندی کے بغیر اس سے مال حاصل کیا جاتا ہے۔ ایسے معاشرے کی تشکیل کرنا اور اس طرح کے حالات پیدا کرنا کہ لوگ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے سود پر قرض لینے پر مجبور ہو جائیں، اسلامی نظام سے بغاوت ہے جس کی سنگین سزا سورۃ المائدہ کی آیت حرابہ (المائدہ ۵:۳۳) میں بیان کی گئی ہے۔

اہل کتاب کے علما و مشائخ کو دوسروں کے مال ناجائز طریقے سے کھانے کی پاداش میں دنیوی اور اخروی سزائیں سنائی گئیں۔

(النساء ۴:۱۶۱، التوبہ ۹:۳۴)

کسی دوسرے کا مال ناجائز طریقے پر کھانے کا ایک طریقہ چوری بھی ہے۔ چوری کرنے کی سزا

ہے اور انسان کے پاس بطور امانت ہے۔
انسان کو مال کے بارے میں جو تصرفات کا اختیار حاصل ہے ان کے لئے قرآن حکیم نے وراثت کا لفظ استعمال کیا ہے: اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ یُوْرِثُهَا مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ (الاعراف ۷: ۱۲۸) "زمین اللہ کی ہے کہ وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے۔"
وراثت میں جو سب سے بڑی حقیقت پوشیدہ ہے وہ یہ ہے کہ وراثت انسان کو اپنے آباؤ اجداد سے ملتی ہے گویا وراثت کا لفظ استعمال کر کے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ یہ وسائل تم سے پہلے کسی اور کے تصرف میں تھے اور تمہارے بعد کسی اور کے تصرف میں ہوں گے۔ تھوڑے دنوں کے لئے تمہیں حق تصرف دیا گیا ہے تاکہ تمہاری آزمائش ہو جائے کہ تم اسے کس طرح استعمال کرتے ہو۔

حق ملکیت میں فرد اور اجتماع کی رعایت

اسلامی قانون ملکیت میں فرد اور اجتماع دونوں کی بھلائی، اصلاح اور خیر خواہی پیش نظر رکھی گئی ہے۔ فرد اور اجتماع کے حقوق میں اس قدر توازن ہے کہ فرد کو مکمل تحفظ دیا گیا ہے بشرطیکہ اس کے حق ملکیت سے معاشرے کو نقصان نہ پہنچے اور معاشرے کو مکمل اختیارات دیئے گئے ہیں بشرطیکہ ان کی وجہ سے فرد کے مفادات متاثر نہ ہوں۔ اسلام نے انتہائی جامع الفاظ میں یہ اصول بیان کیا ہے: "اسلام میں نہ اپنا نقصان نہ کسی دوسرے کا"
(مسند احمد عن ابن عباسؓ)

امام احمد بن حنبلؒ نے حضرت عمر فاروقؓ کا یہ فیصلہ نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے ایک گھر والوں سے پانی مانگا۔ انہوں نے پانی نہ دیا اور وہ شخص پیاس سے مر گیا حضرت عمرؓ نے اس شخص کے خون کی ذمہ داری اس گھر پر ڈال کر ان سے اس کی دیت دلائی (ایضاً)۔
اس واقعہ کا دوسرا پہلو دیکھا جائے تو وہ یہ ہے کہ پانی اس گھر کی ملکیت تھا اور مسافر کا پانی میں حق نہیں تھا۔ اہل خانہ کو اپنی ملکیت کے تحفظ اور کسی بھی دوسرے شخص کو اس کے استعمال سے روکنے کا استحقاق تھا لیکن اسلامی قانون: "چھوٹے نقصان کو برداشت کر کے بڑا نقصان دور کیا جائے" اس امر کا متقاضی ہے

تحفظ مال و ملکیّت

قرآن حکیم نے مال کو انسانوں کے لئے وجہ قیام قرار دیا ہے۔ انسان کی جسمانی ضرورتوں کو پورا کرنے اور جسمانی زندگی کو بقا دینے کے لئے اللہ نے مال پیدا کیا اور فرمایا : وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَامًا (النساء ۴ : ۵) "بے وقوفوں کو اپنے وہ مال نہ دو جنہیں اللہ نے تمہارے قیام کا ذریعہ بنایا ہے"

اسی وجہ سے مال کی محبت اللہ نے انسان کی فطرت میں رکھ دی ہے۔ نہ صرف ضروریات زندگی کی حد تک بلکہ آسائش اور زیب و زینت کی چیزوں کی محبت انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ اسی فطرت انسان کی تصویر کشی قرآن حکیم نے ان الفاظ میں کی ہے۔

"لوگوں کے لئے ان کی خواہشات کی محبت خوشنما کر دی گئی ہے یعنی عورتیں، بیٹے، سونے چاندی کے ڈھیر، عمدہ گھوڑے، چوپائے اور کھیتیاں، یہ سب دنیا کی زندگی کا سامان ہے۔" (آل عمران ۳ : ۱۴)

اس آیت میں زین کا صیغہ مجہول (PASSIVE FORM) اس امر کی نشان دہی کرتا ہے کہ ان اشیا کی محبت انسان نے خود اپنے اختیار سے اپنے اندر پیدا نہیں کی بلکہ یہ میلان اور محبت انسان کے خالق نے اس کی طبیعت اور جبلت میں رکھ دی ہے البتہ محبت کے بارے میں عام قاعدہ یہ ہے کہ محبت انسان کی شعوری سوچ کو متاثر کرتی ہے اس لئے یہ انتباہ بھی کر دیا ہے کہ : وَاعْلَمُوا أَنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (الانفال ۸ : ۲۸) "تمہارے مال اور تمہاری اولاد تمہارے لئے وجہ آزمائش ہے"

"اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کے احکام اور اسلام کی سربلندی کے لئے جدو جہد کے تقاضے پورے کرنے کے مقابلے میں اپنے مال کو ترجیح دیتا ہے اس کا انجام کبھی بخیر نہیں ہو سکتا۔" (التوبہ ۹ : ۲۴)

مال اللہ کی نعمت ہے لیکن یہ عزت کا معیار نہیں ہے (الانفال ۸ : ۲۶، بنی اسرائیل ۱۷ : ۶، التوبہ ۹ : ۵۵، آل عمران ۳ : ۱۹۶، الزخرف ۴۳ : ۳۳-۳۴) بلکہ مال کی محبت انسان کو ذلت کی اتھاہ گہرائیوں میں گرا دیتی ہے۔ (الہمزہ ۱۰۴ : ۱-۹)

اسلام میں ملکیت کے تصور کو قرآنی تصریحات کی روشنی دیکھا جائے تو سب سے اہم بات یہ سامنے آتی ہے کہ :

کائنات کی کوئی چیز بھی اصلاً انسان کی ملکیت نہیں ہے۔ ایک حقیر ذرے سے لے کر کائنات کی بڑی سے بڑی چیز تک کسی بھی شے پر انسان کو مالکانہ حقوق حاصل نہیں ہیں حتیٰ کہ انسان اپنی جان، زندگی اور اعضا بدن کا خود مالک نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی شخص کو یہ استحقاق حاصل نہیں کہ اپنی جان تلف کر دے، کسی کو پیشگی اپنا خون معاف کر دے بلکہ اگر کسی شخص کی زمین میں زائد از ضرورت گندم پیدا ہوتی ہے تو اسے یہ حق نہیں کہ اپنی گندم جلا ڈالے، سمندر میں پھینک دے یا کسی اور طریقے سے ضائع کر دے کیونکہ قرآن حکیم کی رو سے انسان کی جان، اعضا و جوارح (LIFE AND LIMBS) قوتیں اور صلاحیتیں، مادی اسباب و وسائل سب کچھ اللہ کی ملکیت

کی ضمانت بنا دیا۔

جس وقت سے رحم مادر میں نئے انسانی وجود کی تشکیل شروع ہوتی ہے اسی وقت سے اس کے تحفظ و بقا کا قانون حرکت میں آجاتا ہے۔ مطلقہ عورت کے بارے میں قرآن حکیم نے کہا ہے کہ: وَإِنْ كُنَّ أُولَاتِ حَمْلٍ فَأَنْفِقُوا عَلَيْهِنَّ حَتَّىٰ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ (الطلاق ۶۵:۶) "اور اگر وہ حاملہ ہوں تو ان پر خرچ کرو تا آنکہ وضع حمل (DELIVERY) ہو جائے۔"

اور ولادت کے بعد اگر: "وہ تمہارے لئے بچے کو دودھ پلائیں تو ان کو ان کی اجرت دو اور آپس میں خوشگوار روابط رکھو اور اگر ناموافقت کرنے لگو تو بچے کو کوئی دوسری عورت دودھ پلائے۔" (الطلاق ۶۵:۶) حمل اور رضاعت کے دوران نہ صرف کھانا پینا بلکہ مطلقہ کے لباس کی ذمہ داری بھی بچے کے باپ پر ہے۔ (البقرہ ۲: ۲۳۳) یہ ذمہ داری اس حد تک ہے کہ مرد کے علم اور اطلاع کے بغیر بچے کی ماں اپنی اور اپنی اولاد کی ضروریات شوہر کے مال سے لے سکتی ہے اور اس پر کوئی مواخذہ نہیں۔

اگر کسی بچے کا باپ وفات پا جائے اور کفالت کا کوئی انتظام نہ ہو تو قریبی رشتے داروں پر فرض عائد ہوگا کہ وہ بچے کی کفالت کریں اور اگر دوسرا کوئی انتظام نہ ہو تو حکومت سرکاری خزانے سے کفالت کا انتظام کرے گی لیکن ایک انسانی جان کو کسی قیمت پر ضائع نہیں ہونے دیا جائے گا۔

انسانی جان کو تحفظ فراہم کرنے کے لئے حلال و حرام کے باب میں قرآن حکیم نے صراحت کی ہے کہ صرف چند اشیا ممنوع کی گئی ہیں اور وہ بھی اس وجہ سے کہ ان کا استعمال انسانی زندگی اور صحت کے لئے نقصان دہ ہے۔ باقی تمام اشیا مباح ہیں تاکہ انسان کو اپنی ضروریات زندگی پوری کرنے میں کسی وقت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

ان قوانین سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ انسانی نسل کے تحفظ کی قرآن حکیم نے کس حد تک ضمانت دی ہے اور اس کے لئے آخری حد اثباتی اقدام کئے ہیں۔

اب رہا سلبی پہلو تو اس کا تعلق اس امر سے ہے کہ اگر کوئی شخص واقعتاً کسی کو ضرر پہونچاتا ہے تو اس کے لئے ایسی سزا رکھی جائے تاکہ معاشرے سے ضرر رسانی کے رجحان کا قلع قمع ہو سکے۔ چنانچہ قرآن حکیم نے نسل انسانی کو تحفظ فراہم کرنے کے لئے قتل ناحق کو بہت بڑا جرم قرار دیا اور اس کے لئے قصاص کا اصول دیا ہے اور یہ بتایا کہ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ (البقرہ ۲: ۱۷۹) "تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے۔" اسی طرح اگر انسانی جان کو نقصان پہونچانے کے لئے قتل سے کم درجے کا جرم کیا جاتا ہے تو قرآن حکیم نے یہ قانون دیا کہ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ (المائدہ ۵: ۴۵) "اور تمام زخموں کے لئے برابر کا بدلہ۔"

انسانی تاریخ میں پہلی مرتبہ اسلام نے جنگ کے قواعد و ضوابط مقرر کئے جس کے تحت دشمن ملک کی عام آبادی، غیر فوجیوں، بوڑھے بچوں، عورتوں، مذہبی رہنماؤں اور عملی طور جنگ میں حصہ نہ لینے والوں کو جان کا تحفظ دیا گیا ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ اسلام عین حالت جنگ میں بھی نسل انسانی کے تحفظ کا ہدف ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔

نکتہ ازالہ ضرر ہے۔ اگرچہ اسے عدم حرج اور قلت
تکلیف کے عنوانات کے تحت لایا جا سکتا ہے
تاہم اس کی اہمیت کے پیش نظر جیسا کہ آئندہ
سطور سے واضح ہوگا اسے مستقل عنوان دیا گیا۔
ضرر کے درجات کا تعین آسان نہیں ہے البتہ
انسانی معاشرہ قدیم ترین عہد سے آج تک اس امر
پر متفق ہے کہ اہم ترین ضرر، جن کا ازالہ ہر دور
میں قانون کے اولین مقاصد میں ہوتا ہے پانچ
ہیں:

۱۔ ضرر نفس ۲۔ ضرر مال ۳۔ ضرر عزت۔
۴۔ ضرر عقل ۵۔ ضرر دین۔

اسلامی شریعت کے مقاصد کا ذکر کرتے ہوئے
انہی اقسام ضرر کے ازالے کے مثبت پہلو کو مقاصد
شریعہ (OBJECTIVES OF LAW) کہتے
ہیں۔ شاطبی نے مقاصد شریعہ پر بحث کرتے ہوئے
پانچ چیزوں کو شریعت کے مقاصد قرار دیا ہے
اور وہ یہ ہیں:

۱۔ تحفظ نفس ۲۔ تحفظ مال ۳۔ تحفظ عزت
۴۔ تحفظ عقل ۵۔ تحفظ دین۔

اگر مقاصد شریعت کو اسلام کی مقرر کردہ
انتہائی سزاؤں کے تناظر میں دیکھا جائے تو سمجھنے
میں مزید آسانی ہوتی ہے۔ اسلام نے صرف چند
ایک جرائم کی انتہائی سزائیں متعین کی ہیں جنہیں
قصاص اور حدود کا نام دیا گیا ہے۔ باقی جرائم
کی سزائیں کتاب وسنت نے خود مقرر کرنے
کے بجائے قانون سازی کا اختیار افرادِ امت
کو دیا ہے۔ انسانی زندگی کے خلاف ہونے والا
انتہائی جرم، قتل نفس ہے اس لئے اس کی
انتہائی سزا قصاص مقرر کی گئی ہے۔ مال کے
خلاف انتہائی جرائم چوری اور ڈاکہ ہیں۔ ان کی
انتہائی سزائیں ہاتھ کاٹنا، قتل، سولی پر لٹکا دینا،
مخالف سمتوں سے ہاتھ پاؤں کاٹ دینا یا قید
کر دینا ہے۔ عزت وآبرو کے خلاف جرائم میں
بدکاری اور قذف شامل ہیں۔ بدکاری کی سزا
۱۰۰ کوڑے اور قذف کی ۸۰ کوڑے ہیں عقل کے
خلاف جرم کی نوعیت یہ ہے: کسی ایسی نشہ آور
چیز کا استعمال جس سے حواس مختل ہو جائیں، عقل
پر پردہ پڑ جائے اور نیک وبد کی تمیز ختم ہو جائے۔
اس کے لئے ۸۰ کوڑے سزا مقرر کی گئی ہے اور
دین کے خلاف جرم، ارتداد (APOSTASY)
ہے جس کی سزا موت ہے۔ گویا انتہائی ضرر کے
ازالے کیلئے انتہائی سزائیں مقرر کی گئی ہیں۔ ذیل
میں مذکورہ بالا پانچ اشیاء سے ضرر کے ازالے کے
لئے قرآن حکیم نے جو ہدایات دی ہیں ان کی
تلخیص پیش کی جاتی ہے:

۱۔ تحفظ جان

انسانی جان کے تحفظ کے لئے دو طرح کے
اہتمام کئے گئے ہیں: ۱۔ اثباتی ۲۔ سلبی۔
اثباتی اہتمام میں اولاً تو نسل انسانی کے
تحفظ وبقا کے لئے یہ اہتمام کیا گیا کہ اس کائنات
کو انسانی زندگی کے لئے ہمہ وجوہ سازگار بنایا
گیا ہے اور وہ تمام اسباب و وسائل مہیا کر دئیے
گئے جو انسانی زندگی کی بقا اور ارتقا کے لئے
ضروری تھے۔ خود انسان کے اندر ایسی قوتیں اور
صلاحیتیں ودیعت کر دی گئیں جو اسکے تحفظ اور
دوام کے لئے ضروری ہیں۔ مرد اور عورت کی
فطری صلاحیتوں میں اختلاف اور ان میں باہمی
کشش اور محبت کو نسل انسانی کو پروان چڑھانے

ضائع نہ کرو، کچھ حدود مقرر کی ہیں ان سے تجاوز نہ کرو، کچھ چیزیں حرام کی ہیں ان کی پردہ دری نہ کرو اور تم پر رحم کرتے ہوئے بغیر بھولے کچھ چیزوں کے بارے میں خاموشی اختیار کی ہے ان کے پیچھے نہ پڑو۔"

قرآن حکیم نے مختلف مقامات پر مختلف اشیا کی حلت و حرمت بیان کرنے کے بعد ایک اصول دیدیا ہے جس کی روشنی میں یہ فیصلہ کرنا آسان ہے کہ حلال کیا ہے اور حرام کیا۔ قرآن حکیم میں ہے :

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا اُحِلَّ لَهُمْ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ (المائدہ ۵ : ۴)

"آپ سے پوچھتے ہیں کہ کون کون سی چیزیں ان کے لئے حلال ہیں، کہہ دو کہ سب پاکیزہ چیزیں تمہارے لئے حلال ہیں"

قرآن حکیم نے نبی اکرم کے منصب نبوت کی ذمہ داریاں بیان کرتے ہوئے کہا: "وہ نبی امی انہیں معروف کا حکم دیتا ہے اور منکر سے روکتا ہے اور ان کے لئے پاکیزہ چیزیں حلال کرتا ہے اور گندی چیزیں حرام کرتا ہے۔ (الاعراف ۷ : ۱۵۷)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے منصب کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے آپ کو شارع قرار دیا ہے۔ قرآنی تصریحات کے مطابق اللہ نے آپ کو تشریعی اختیارات (LEGISTATIVE POWERS) عطا کئے۔ امر و نواہی اور تحلیل و تحریم صرف قرآنی آیات میں منحصر نہیں بلکہ وہ چیزیں جنہیں رسول اللہ نے حلال یا حرام قرار دیا ہے وہ بھی اسی طرح حلال یا حرام ہوں گی جیسے قرآن کی بیان

کردہ چیزیں ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ اختیارات درحقیقت اللہ کے دیئے ہوئے اختیارات ہیں اور آپ کا دیا ہوا قانون قانون خداوندی کا حصہ ہے۔ اسلام کے قانون حلت و حرمت کی مزید وضاحت آپ کے اس ارشاد گرامی کی روشنی میں کی جاسکتی ہے کہ :

"حلال واضح ہے اور حرام بھی واضح، ان دونوں کے درمیان مشتبہ امور ہیں جنہیں اکثر لوگ نہیں جانتے۔ جو مشتبہ چیزوں سے بچتا ہے وہ اپنا دین اور اپنی عزت بچا لیتا ہے اور جو مشتبہ سے احتراز نہیں کرتا حرام کا ارتکاب کر گزرتا ہے، اس چرواہے کی طرح ہے جو اپنا ریوڑ ممنوعہ چراگاہ کے ارد گرد چراتا ہے، کسی بھی وقت جانور اس میں منہ مار سکتے ہیں۔"

گویا لسان نبوت نے واضح کر دیا کہ جن اشیا کا نفع واضح ہے وہ حلال محض ہیں اور جن کا نقصان واضح ہے وہ حرام محض ہیں۔

۷ - ازالہ ضرر

قرآن حکیم کے اصول تشریع میں ایک اہم

قرآن حکیم اور احادیث نبویہ کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ اباحت کا تعلق صرف اشیا سے ہی نہیں ہے بلکہ تمام افعال و تصرفات بھی مباح ہیں بشرطیکہ ان کا تعلق عبادات سے نہ ہو اور ان کے حرام ہونے کے بارے میں تصریح نہ آئی ہو۔ ارشاد ربانی ہے : قَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ (الانعام ۶ : ۱۱۹)

"جو چیزیں اس نے تمہارے لئے حرام کی ہیں وہ ایک ایک کر کے بیان کر دی ہیں"

البتہ عبادت کے بارے میں اصول مختلف ہے اور کسی بھی کام کو اپنے طور پر عبادت قرار نہیں دیا جا سکتا اور نہ اسے مباح کہا جا سکتا ہے تاوقتیکہ شارع کی طرف سے نص صریح موجود نہ ہو۔

انہی آیات و احادیث کی وجہ سے ائمہ فقہ اپنے علم، بصیرت اور اجتہادی صلاحیت کے باوجود فتویٰ دیتے ہوئے گریز کرتے تھے اور ایک دوسرے کی طرف مراجعت کرنے کو کہتے تھے، مبادا حلت و حرمت کے مسائل میں ان سے غلطی سرزد ہو جائے۔

امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام احمد بن حنبل اور امام ابن تیمیہ سے اسی طرح کی روایات ہیں۔ اس سے مجتہدین فقہا کے ورع، تقویٰ، خوف و خشیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

(یوسف القرضاوی ۲۱ - ۲۷)

قرآن حکیم نے حلت و حرمت کے بارے میں جو احکام بیان کئے ہیں ان کی روشنی میں قرآن حکیم کا حلال و حرام کا فلسفہ بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ قرآنی احکام کا خلاصہ یہ ہے : خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا (البقرہ ۲ : ۲۹)

"زمین میں جو کچھ ہے اللہ نے تمہارے نفع کے لئے پیدا کیا"

ایک اور مقام پر قرآن حکیم نے حرام امور گنواتے ہوئے شرک، والدین سے بدسلوکی، قتل اولاد، بے حیائی اور فحاشی، بے گناہ کو قتل کرنا، یتیم کے مال پر دست درازی، ناپ تول میں کمی، بے انصافی، وعدہ خلافی اور فرقہ بندی کو حرام قرار دیا ہے۔

(الانعام ۶ : ۱۵۲-۱۵۴)

قرآن حکیم کا اسلوب یہ بتاتا ہے کہ تمام اشیا اصلاً مباح ہیں بجز ان چند اشیا کے جن کا کسی نہ کسی طرح کا استعمال منع کر دیا گیا ہے۔ قرآن حکیم کی آیت هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا (البقرہ ۲ : ۲۹) "وہی ذات ہے جس نے پیدا کیا وہ سب کچھ جو زمین میں ہے تمہارے نفع کے لئے"۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین کی ہر چیز انسانوں کے نفع کیلئے پیدا کی گئی اور صرف ان اشیا کی نشاندہی کر دی گئی ہے جن سے کسی خاص نوعیت کا انتفاع درست نہیں تھا مثلاً کھانے پینے کی اشیا؛ مردار، خنزیر، شراب، جوا وغیرہ۔

اسی طرح مناکحات کے بارے میں قرآن حکیم نے ان عورتوں سے نکاح حرام قرار دیا ہے جن کے ساتھ نکاح میں دینی ضرر ہے مثلاً وہ مشرکہ ہیں (البقرہ ۲ : ۲۲۱) یا عزت و آبرو کا نقصان ہے مثلاً وہ بدکار ہیں (النور ۲۴ : ۳) وہ بہت قریبی رشتہ دار ہیں (النساء ۴ : ۲۲-۲۴)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اس ضمن میں بہت واضح ہے، آپ نے فرمایا :

"اللہ نے کچھ امور فرض کئے ہیں انہیں

حَلٰلٌ وَّھٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ اِنَّ الَّذِیْنَ یَفْتَرُوْنَ عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ لَا یُفْلِحُوْنَ (النحل ۱۶: ۱۱۶) "اور یونہی جھوٹ جو تمہاری زبان پر آجائے مت کہہ دیا کرو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے کہ اللہ پر جھوٹ بہتان باندھنے لگو۔ جو لوگ اللہ پر جھوٹ بہتان باندھتے ہیں ان کا بھلا نہیں ہوگا۔"

حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ جاہلیت میں لوگ حلت و حرمت کے خود ساختہ قوانین پر عمل کرتے تھے تا آنکہ اللہ نے اپنے رسول کو مبعوث کیا، اپنی کتاب اتاری، انہوں نے کتاب اللہ کے حلال کو حلال اور کتاب اللہ کے حرام کو حرام ٹھہرایا۔ جس چیز کو قرآن نے حلال کیا وہ حلال ہے اور جسے حرام ٹھہرایا وہ حرام ہے۔ جس کے بارے میں خاموشی اختیار کی اس کے بارے میں معافی اور رخصت ہے۔

اپنی طرف سے حلال کو حرام یا حرام کو حلال قرار دینا شرک کے مترادف ہے۔ قرآن حکیم نے اہل کتاب کے بعض افعال پر تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

انہوں نے اپنے علما اور مشائخ اور مسیح بن مریم کو اللہ کے سوا رب (LORDS) بنا لیا حالانکہ انہیں یہ حکم دیا گیا تھا کہ اللہ واحد کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور وہ ان لوگوں کے شریک مقرر کرنے سے پاک ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ عدی بن حاتم نے جو پہلے نصرانی تھے جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ آیت سنی تو کہنے لگے عیسائی اپنے علما کی عبادت تو نہیں کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا، درست ہے لیکن ان علما و مشائخ نے حلال کو حرام اور حرام کو حلال قرار دیا اور عام عیسائیوں نے ان کی پیروی کی، یہی تو ان کی عبادت تھی (ترمذی)

قرآن حکیم نے مشرکین کے اس طرز عمل کو ایک اور مقام پر ہدف تنقید بنایا ہے، ارشاد ربانی ہے: قُلْ اَرَءَیْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰہُ لَکُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْہُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا قُلْ آٰللّٰہُ اَذِنَ لَکُمْ اَمْ عَلَی اللّٰہِ تَفْتَرُوْنَ (یونس ۱۰: ۵۹) "کہہ دیجئے مجھے بتاؤ، جو رزق اللہ نے تمہارے لئے اتارا اس میں سے کچھ کو حرام اور کچھ کو حلال قرار دے دیتے ہو، کہہ دیجئے کیا اللہ نے تمہیں اس کا اختیار دیا ہے یا تم اللہ پر جھوٹا بہتان باندھتے ہو۔"

یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ یہ آیت کسی تاریخی واقعہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

۲۔ کچھ آیات ایسی ہیں کہ ان کا تاریخی پس منظر ہوتا ہے اور اگر وہ پس منظر معلوم ہو جائے تو آیت کی وضاحت ہو جاتی ہے لیکن اگر پس منظر نہ معلوم ہو تو بھی آیت کا اجمالی مفہوم اور قرآن حکیم کی روح سمجھ آجاتی ہے۔ مثلاً وَجَعَلُوا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَأَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيبًا (الانعام ۶: ۱۳۶)۔ اور انھوں نے بنا رکھا ہے اللہ کیلئے اس سے جو وہ پیدا کرتا ہے فصلوں اور مویشیوں سے مقرر حصہ

اس طرح: مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيرَةٍ وَلَا سَائِبَةٍ وَلَا وَصِيلَةٍ وَلَا حَامٍ (المائدہ ۵: ۱۰۳)۔

نہیں مقرر کیا اللہ نے بحیرہ اور نہ سائبہ اور نہ وصیلہ اور نہ حام۔ وغیرہ آیات میں عربوں کی رسوم کا ذکر ہے۔ اگر یہ رسوم ہمیں معلوم ہوں تو آیات کا مفہوم زیادہ واضح ہو جاتا ہے اور اگر نہ معلوم ہو سکیں تب بھی آیات کا مطلب سمجھ میں آجاتا ہے۔

۳۔ بے شمار آیات جن کا تعلق عقائد، عبادات، تاریخی واقعات، موت اور مابعد الموت کے حالات سے ہے، ان کا کوئی متعین سبب نزول نہیں ہوتا۔ ان کا پس منظر بیان کرنا محض تکلف ہے۔ معاشرے کے عمومی حالات ہی ان آیات کے نزول کے متقاضی ہوتے ہیں۔

اسباب نزول کے سلسلے میں ایک اہم بحث یہ ہے کہ جو آیات تاریخی پس منظر کے ساتھ وابستہ ہیں کیا ان میں عموم الفاظ کا اعتبار ہوگا یا خصوصی موارد کا۔ اس سلسلے میں تمام صحابہ اور امت مسلمہ کا اس امر پر اجماع ہے کہ خصوصی سبب کا اعتبار نہیں ہوگا بلکہ عموم اطلاق کا اعتبار ہوگا یعنی قرآن حکیم اگر عرب کے معبودان باطل اور ان کے معاشرے میں رائج مشرکانہ رسوم کی تردید کرتا ہے تو اس سے شرک کی تردید عام مراد ہوگی۔ اس کا مظہر خواہ کچھ بھی ہو کیونکہ خصوصی سبب عموم اطلاق کو مانع نہیں ہے۔

۶۔ اباحت

قرآن حکیم کے اصول تشریع میں ایک اور اصول اباحت کا ہے یعنی کونسی چیزیں حلال ہیں اور کونسی حرام۔ قرآن حکیم نے حلت و حرمت کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے یہ اصول دیا ہے کہ وہ اشیا حلال ہیں جو انسانوں کے لئے مطلقاً نفع بخش ہیں یا ان کا نفع ان کے نقصان سے زیادہ ہے یا ان کا فائدہ انسانیت کے بڑے طبقے کو پہونچتا ہے البتہ حلت و حرمت کا اختیار اللہ نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ اسلئے انسانی قانون سازی میں عقل کی کم مائیگی، خواہشات کی دراندازی کے اثرات اس قدر غالب ہوتے ہیں کہ قانون حلت و حرمت کو اگر انسانی قانون سازی کے سپرد کر دیا جاتا تو یہ بااثر طبقوں کے ہاتھوں میں زیر اثر افراد و طبقات کے استحصال کا ایک بہت بڑا ہتھیار ہوتا۔ اسی کو قرآن نے کہا ہے کہ: وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ (المومنون ۲۳: ۷۱) اگر حق لوگوں کی خواہشات کے تابع ہو جائے تو زمین و آسمان اور ان کے درمیان سب کچھ تباہ ہو جائے۔

اسی لئے قرآن حکیم نے حلت و حرمت کے اختیار کا قطعی فیصلہ کرتے ہوئے کہا ہے: وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا

صورت کی بنیاد پر ہوئی ہے۔

آیات میں تعارض کی صورت میں ہمیشہ نسخ ہی کا قول نہیں کیا جاتا بلکہ تعارض دفع کرنے کے اور حل بھی ہیں مثلاً جہاں قرآن کی کسی آیت سے دوسری آیت کا حکم جزوی طور پر متاثر ہوا ہو اسے نسخ کے بجائے تخصیص، تقیید یا استثنا کہتے ہیں۔

مولانا عبید اللہ سندھی اور مفتی محمد عبدہ سمیت کئی ایک اہل علم کی رائے یہ ہے کہ قرآن حکیم میں امکان نسخ کے باوجود ایسا کوئی تعارض موجود نہیں ہے جس میں تطبیق، توجیہ یا توفیق ممکن نہ ہو۔

اگر ہم مسئلہ نسخ کو درایت کے نقطہ نظر سے دیکھیں تو یہ بات بے معنی سی ہے کہ کوئی حکم موجود ہو اور اس کے بارے میں آیت اٹھالی گئی ہو یا آیت موجود ہو اور اس کا کوئی عملی فائدہ نہ ہو۔ اور اس کے حکم پر کسی حالت میں عمل کرنے کی صورت نہ ہو۔ اس لئے جدید دور کے مفسرین نسخ کو تشریع کے تدریجی اور ارتقائی عمل کے مراحل کے تناظر میں دیکھتے ہیں۔

اس بحث سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ نسخ کا اصول اپنی اہمیت کے باوجود قرآن کے اصول تشریع کا جزو نہیں بن سکتا بلکہ حالات کے تغیر، نئے پیش آمدہ مسائل کی گوناگونی اور مسائل کے نئے گوشوں کے سامنے آنے کے باعث اس نقطہ نظر کو تقویت ملتی ہے کہ قرآن میں کوئی ایسا تعارض نہیں جس کے لئے نسخ کا قول کرنا پڑے۔

ارشاد ربانی: اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْآنَ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا (النساء ۴: ۸۲) کیا وہ لوگ قرآن میں تدبر نہیں کرتے اگر وہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت اختلاف پاتے۔

۵۔ اسباب نزول

قرآن حکیم تقریباً تئیس سال میں تھوڑا تھوڑا کرکے نازل ہوا۔ اس میں مختلف واقعات پر تبصرے مشکلات کے حل میں رہنمائی، سوالات کے جوابات اور اسی نوعیت کی بہت سی ایسی باتیں ہیں جو تاریخی پس منظر رکھتی ہیں۔ درحقیقت وحی انسان کی کسی ذہنی کجی، فکری گمراہی یا عملی خرابی کی نشاندہی کرتی ہے اور جس واقعہ پر تبصرہ ہو رہا ہوتا ہے وہ انسان کی اسی کجی اور کمزوری کا ایک مظہر ہوتا ہے۔

(الفوز الکبیر باب ۲)

بعض مفسرین نے شاید یہ سمجھ لیا کہ قرآن حکیم کی تقریباً ہر آیت کسی واقعہ اور سبب پر نازل ہوئی ہے لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ قرآن کی ہر آیت سبب نزول سے وابستہ نہیں۔ سبب نزول کے نقطہ نظر سے قرآن کا مطالعہ کیا جائے تو تین قسم کی آیات سامنے آتی ہیں۔

۱۔ بعض آیات ایسی ہیں کہ سبب نزول جانے بغیر ان کو سمجھنا ممکن نہیں۔ آیت کے الفاظ بار بار پکار کر کہہ رہے ہوتے ہیں کہ ان کا کوئی تاریخی پس منظر ہے مثلاً وَاِذْ یَعِدُکُمُ اللّٰهُ اِحْدَی الطَّائِفَتَیْنِ اَنَّهَا لَکُمْ (الانفال ۸: ۷) جب اللہ تم سے وعدہ کر رہا تھا کہ دو گروہوں میں سے ایک پر تمہیں غلبہ حاصل ہو جائے گا۔

آیت یہ بتاتی ہے کہ کہیں کوئی دو گروہ تھے ان کے بارے میں کوئی وعدہ تھا جس کی تفصیل قرآن حکیم میں موجود ہے۔ اسی طرح اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْیَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰی (الانفال ۸: ۴۲) جب تم قریب کے ٹیلے پر تھے اور وہ دور کے ٹیلے پر ...

پھوٹ پھوٹ کر نکلے۔ قوانین اوپر سے نہ مسلط کئے جائیں بلکہ جوں جوں فضا تیار ہوتی جائے زندگی کے تمام شعبوں میں شرعی قوانین کا نفاذ کر دیا جائے۔

تدریج کے اصول کو نافذ کرتے ہوئے یہ احتیاط ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ ایسے معاملات جن میں قانون کے نفاذ کے لئے پیشگی تربیت کی ضرورت نہیں بلکہ یکبارگی قانون نافذ کیا جا سکتا ہے وہاں بلاوجہ تدریجی طریق کار اختیار کر کے مثبت نتائج کے حصول میں تاخیر نہ کی جائے۔ نیز تدریجی عمل کا مسلسل مطالعہ اور جانچ پرکھ ضروری ہے تاکہ تدریج کا سلسلہ لامتناہی نہ ہو جائے بلکہ بروقت فیصلہ کیا جا سکے۔ جب بھی یہ محسوس ہو کہ اب تربیت کا پہلا مرحلہ مکمل ہو گیا ہے اور حالات دوسرے مرحلے کے لئے سازگار ہیں تو اسے بلا تاخیر نافذ کر دیا جائے۔ بہرحال تدریج کو تربیت کا ذریعہ بننا چاہئے، نفاذ قوانین سے فرار کا نہیں۔

۴۔ نسخ

نسخ کے اصطلاحی معنیٰ ہیں "کسی شرعی دلیل کی بنا پر کسی دینی حکم کا بالکل اٹھ جانا اور ختم ہو جانا"۔ قرآن حکیم میں نسخ کے وجود کے بارے میں علما کے دو گروہ ہیں: علما کی اکثریت امکان نسخ کی قائل ہے جب کہ ابو مسلم اصفہانی (م ۳۲۲ھ / ۹۳۳م) اور ان کے پیروکار قرآن حکیم میں نسخ کے سرے سے قائل ہی نہیں ہیں۔ دور جدید کے علما کی ایک جماعت بھی قرآن میں امکان نسخ کی قائل نہیں ہے۔ منکرین نسخ کی دلیل یہ ہے کہ اگر نسخ فی القرآن کو تسلیم کیا جائے تو اس سے یہ بات ماننا پڑتی ہے کہ اللہ کو بعد میں کوئی بات سوجھی تو اس نے پہلے حکم کو منسوخ کر کے دوسرا حکم نازل کر دیا لیکن یہ دلیل چنداں وقیع نہیں ہے کیوں کہ جس قوم اور جن افراد کے لئے احکام نازل ہوتے ہیں ان کے حالات تغیر پذیر ہوتے ہیں اس لئے حالات کے بدلنے سے احکام میں تبدیلی آتی ہے۔ سابقہ شریعتوں کے نسخ سے وجود نسخ پر استدلال کیا جاتا ہے لیکن اس سے زیادہ سے زیادہ قرآن میں نسخ کا امکان ثابت ہوتا ہے۔ وقوع نسخ صرف روایت سے ثابت ہو سکتا ہے، درایت سے نہیں۔ اسلئے اس کے ثبوت کی تین صورتیں ممکن ہیں:

۱۔ قرآن حکیم میں اس مضمون کی کوئی آیت موجود ہو کہ فلاں حکم جو پہلے تھا اب منسوخ کر دیا گیا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے "میں نے تمہیں قبروں پر جانے سے روک دیا تھا اب تم جا سکتے ہو" (مسلم، الجنائز ۱۰۶)۔ قرآن میں ایسی کوئی آیت موجود نہیں ہے۔

بعض آیات جن میں نسخ کا شبہ ہوتا ہے ان میں قرآن حکیم نے نسخ کے بجائے تخفیف اور سہولت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ (تفصیل کے لئے: الانفال ۸: ۶۵-۶۶ نیز المزمل ۷۳: ۲۰)۔

گویا ان صورتوں میں قرآن نے حالات کی رعایت کی ہے، مطلقاً حکم منسوخ نہیں کیا بلکہ کسی قدر نرمی پیدا کر دی گئی ہے۔

۲۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی واضح حکم موجود ہو کہ فلاں آیت اب منسوخ کر دی جاتی ہے ایسا بھی کوئی حکم نہیں ہے۔

۳۔ بعض آیات کے احکام باہم متعارض ہوں اور ان میں توفیق (RECONCILIATION) ممکن نہ ہو۔ نسخ فی القرآن کی بحث اسی تیسری

رزق حسن نہیں بلکہ خبیث شے ہے۔ اس کے بعد دوسری آیت (البقرہ ۲: ۲۱۹) میں تحریم خمر کی طرف مزید پیش قدمی کی گئی، پھر تیسری آیت (النساء ۴: ۴۳) میں جزوی طور پر شراب کو ممنوع قرار دیا گیا اور آخر میں (المائدہ ۵: ۹۰) میں اسے رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ قرار دے کر تاکیداً یہ بتایا کہ شراب صرف حرام ہی نہیں بلکہ ناپاک بھی ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن بھیجا تو انہیں ہدایات دیں۔ ان میں تدریج کو ملحوظ رکھنے کی رہنمائی ملتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: "تم اہل کتاب کے پاس جا رہے ہو، وہاں پہنچو تو انہیں شہادت توحید و رسالت کی طرف بلانا۔ جب وہ یہ مان لیں تو انہیں بتانا کہ ان پر دن رات میں پانچ نمازیں فرض ہیں۔ جب اس میں تمہاری اطاعت کریں تو ان سے کہنا کہ اللہ نے ان پر صدقہ فرض کیا ہے جو ان کے اغنیا سے لے کر ان کے فقراء کو دیا جائے گا"

(بخاری، الزکوٰۃ، ۱۴۲۵)

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ۹۹ھ/۷۱۷ء میں عنان حکومت سنبھالی تو ابھی عہد فاروقی کو گزرے ایک صدی بھی پوری نہیں ہوئی تھی۔ بنو امیہ کے حکمرانوں کی پیدا کردہ خرابیوں کے باوجود تمام مسلمانوں کا معیار اخلاق آج کے دور سے کہیں زیادہ بلند تھا لیکن حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے بھی عدل کے تقاضوں کی تکمیل میں تدریجی طریق کار اختیار کرنا ضروری سمجھا۔ اقتدار ملنے کے بعد انکے بیٹے عبدالملک نے کہا: ابا جان! آپ نے بہت سے ایسے کاموں کو مؤخر کر دیا ہے جن کے بارے میں میرا خیال تھا کہ اگر آپ گھڑی بھر کے لئے بھی حکمراں ہو گئے تو پہلے ان کاموں کو نمٹا گزریں گے۔

میں تو چاہتا تھا کہ جو عدل و انصاف آپ نافذ کرنا چاہتے ہیں، اسے بے دریغ کر دیں، چاہے نتائج کچھ بھی رہوں۔" آپ نے جواب دیا: "بیٹے! تیری بعض رائیں ہنوز بچگانہ ہیں۔ میں ان کی اس طرح تربیت کرتا ہوں جیسے سرکش اونٹ کو سدھایا جاتا ہے۔ میں انہیں دین کی جس راہ پر لانا چاہتا ہوں اس کے لئے ضروری ہے کہ ان کے لئے دنیا کا بھی کچھ فائدہ ہو تاکہ اگر دین کی وجہ سے بدکیں تو دنیوی فائدے کے لئے نرم ہو جائیں اور مجھے ایسی مخالفت سے سابقہ نہ پڑے جس کا مقابلہ کرنا میرے لئے ممکن نہ ہو"

(ابن الجوزی ۷۱، ابن عبدالحکم ۵۹)

امر واقعہ یہ ہے کہ قرآن حکیم کے اس انداز تشریع سے یہ اصول اخذ کیا گیا ہے کہ قانون کے اجرا میں تدریجی طریق کار اختیار کرنا چاہیے۔ ابتدائی مرحلے میں قوانین کم ہونے چاہئیں اور زیادہ زور تعلیم و تربیت پر دینا چاہیے تاکہ انسان کے اندر سے قانون کی پابندی کا جذبہ

تکلیف غیر معتاد سے مراد ایسی مشقت ہے جو عادت میں داخل نہیں یا اس کی مقدار اتنی زیادہ ہے کہ انسان کے لئے مہلک یا مضر ثابت ہوتی ہے۔ ایسی مشقت کو احکام شرعیہ میں تخفیف اور سہولت سے تبدیل کر دیا گیا ہے۔ تکلیف غیر معتاد کے بارے میں شاطبی لکھتے ہیں: "اگر کام کی نوعیت ایسی ہو کہ اس پر دائمی عمل سے جان و مال کا نقصان ہوتا ہو یا کام کرنے والے کی حالت میں مضر تغیر واقع ہوتا ہو جس سے اسے لازمی طور پر کام چھوڑنے یا اس میں تخفیف کرنے پر مجبور ہونا پڑے تو اس قسم کی مشقت و تکلیف غیر معتاد ہے اور یہی وہ قسم ہے جس کے بارے میں شریعت نے تخفیف و سہولت کی راہیں نکالی ہیں" (الموافقات ۲: ۱۰۷، ۱۶۷)۔

۳۔ تدریج

قرآن حکیم کا تیسرا اصول تشریع تدریج ہے۔ قرآن حکیم پورے کا پورا یکبارگی نازل نہیں ہوا بلکہ تقریباً تئیس سال کی مدت میں حسب ضرورت نازل ہوتا رہا۔ جس قسم کی ضرورت درپیش ہوئی اور جس نوعیت کے حالات سے سابقہ پڑا اس کی مناسبت سے احکام نازل ہوتے رہے۔ اس طریق نزول میں بہت سی حکمتیں تھیں جن میں سے کسی ایک کا قرآن (الفرقان ۲۵: ۳۲) نے خود ذکر کیا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایت اس ضمن میں غور طلب ہے جس سے اس امر پر روشنی پڑتی ہے کہ تدریجی نزول میں ایک طرف حالات و زمانے کی رعایت ملحوظ رکھنا مقصود تھی اور دوسری طرف زندگی اور قانون میں باہمی ربط پیدا کرنا۔ وہ فرماتی ہیں:

"پہلے پہل قرآن میں مفصل (سورۃ الحجرات، والناس) کی وہ سورتیں نازل ہوئیں جن میں جنت اور دوزخ کا ذکر ہے (گویا ترغیب و ترہیب کے ذریعے پہلے لوگوں کا شعور بیدار کرنا مقصود تھا) پھر جب لوگ اسلام پر قائم ہو گئے تو حلال و حرام کے احکام نازل ہوئے۔ اگر پہلے دن ہی یہ حکم نازل ہوتا کہ شراب نہ پیو تو لوگ کہہ اٹھتے، ہم کبھی شراب نہ چھوڑیں گے اور اگر ابتدا میں ہی زنا سے باز رہنے کا حکم نازل ہوتا تو لوگ کہتے ہم اس سے باز نہیں آ سکتے" (بخاری، فضائل القرآن)۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن حکیم نے معاشرے کی تربیت کا طریق کار اختیار کیا اور اس میں تدریج کو پیش نظر رکھا۔ مکہ معظمہ میں قرآن حکیم کا جو حصہ نازل ہوا اس میں مختلف امور اور معاملات کے اصول موجود ہیں لیکن ان پر متفرع ہونے والے احکام نکاح، طلاق، عدت، حقوق زوجین، ہبہ، وراثت اور وصیت وغیرہ کی تفصیلات مدینہ میں نازل ہوئیں۔

حرمت زنا سے متعلق آیات مکہ میں نازل ہوئیں لیکن اس پر جاری ہونے والی حدود اور اس سے متعلق دیگر مسائل مدنی دور میں نازل ہوئے۔ قتل نفس کی حرمت مکہ میں نازل ہوئی اور اس کے بارے میں تفصیلات مدنی زندگی میں آئیں۔

تشریع میں تدریج کی سب سے واضح مثال حرمت خمر ہے۔ اس سے متعلق سب سے پہلی آیت (النحل ۱۶: ۶۷) مکہ میں نازل ہوئی جس میں کھجور اور انگور سے حاصل ہونے والی شراب کو رزق حسن کے بالمقابل ذکر کر کے اس طرف اشارہ کیا کہ شراب

نہ کرو، جن چیزوں کے بارے میں بغیر بھولے محض تم پر رحمت کرتے ہوئے خاموشی اختیار کی ہے ان کے متعلق کرید نہ کرو (رازی التفسیر کبیر ۱۱: ۱۰۶)۔

اسی نوع کی بکثرت آیات واحادیث ہیں جن سے شریعت کا یہ اصول مستنبط ہوتا ہے کہ احکام وقوانین میں آسانی اور سہولت کو پیش نظر رکھنا چاہئے نہ کہ ایسی مشقت اور تکلیف کو جس سے انسان کا حوصلہ جواب دے جائے۔ چنانچہ سفر کی حالت میں نمازمیں قصر اور روزہ چھوڑنے کی اجازت، پانی نہ ملنے یا استعمال نہ کرسکنے کی صورت میں تیمم اور اضطرار کی حالت میں حرام چیزوں کا حلال ہو جانا اسی اصول پر مبنی ہے۔ (الموافقات ۲: ۱۳۲)

دنیا میں کوئی بھی کام ایسا نہیں جس کی انجام دہی کے لئے کسی قسم کی تکلیف یا کسی درجے میں بھی مشقت برداشت نہ کرنا پڑے۔ قرآنی تصریحات کے مطابق شریعت کے اوامر ونواہی کا مقصد انسانی زندگی میں نظم وضبط پیدا کرنا اور نفس کو خواہشات کی پیروی سے باز رکھ کر خوب وناخوب سے روشناس کرانا اور نیک وبد میں فرق کرکے اخذ وترک کی بصیرت اور عادت پیدا کرنا ہے۔ یہ کام بجائے خود مشقت کا متقاضی ہے۔ اس لئے فقہائے قلت تکلیف کے اصول کی وضاحت کی ہے تاکہ دین سہل پسند اور آوارہ منش لوگوں کے ہاتھوں میں بازیچہ اطفال نہ بنجائے چنانچہ مشقت یا تکلیف کی دو قسمیں بتائی گئی ہیں:

۱۔ تکلیف معتاد، ۲۔ تکلیف غیر معتاد۔

تکلیف معتاد سے مراد ایسی محنت ہے جس سے زندگی میں کسی حالت میں مفر نہیں اور انسان

اندھی چڑیا سے عبرت

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ ایک گاؤں کی جانب جارہے تھے ــــ راستے میں ایک مقام پر سورہے۔ جب بیدار ہوئے توانہوں نے ایک اندھی چڑیا درخت سے گرتی دیکھی۔ اسی وقت زمین شق ہوئی اور اس میں سے دو طشتریاں برآمد ہوئیں۔ ایک سونے کی، دوسری چاندی کی، ایک طشتری میں تل رکھے ہوئے تھے اور دوسری میں گلاب یا خالص پانی تھا۔ چڑیا نے تل کھا کھاکر پانی سے پیاس بجھائی ـــــ شیخ فرماتے ہیں۔

یہ دیکھ کر مجھے عبرت ونصیحت ہوئی۔ اور میں نے اپنے مولا کے در کو مضبوطی سے پکڑ لیا حتیٰ کہ اس نے مجھے قبول فرمالیا۔ ●

کو اتنی طاقت اور ہمت دی گئی ہے کہ وہ محنت کرسکے۔ مشہور مالکی ماہر قانون امام شاطبیؒ لکھتے ہیں:

"جہاں تک نفس مشقت کا تعلق ہے انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جو اس سے خالی ہو حتیٰ کہ انسان کو کھانے پینے اور زندگی کے دوسرے معمولات پورا کرنے کے لئے بھی مشقت اٹھانا پڑتی ہے لیکن یہ اس طرح کی مشقت ہے کہ جسے انجام نہ دینے والے کو لوگ سست اور کاہل کہتے ہیں۔ پس یہ مشقت انسان کی عادت میں داخل ہے اور یہ ممکن نہیں کہ شرعی احکام و قوانین کی پابندی میں اس نوع کی مشقت بھی نہ پائی جائے" (الموافقات ۲: ۱۲۳)۔

۲- قلت تکلیف

قلت تکلیف عدم حرج کا لازمی نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کبھی کسی قوم اور ملت کو تکلیف مالایطاق نہیں دی۔ البتہ امم سابقہ کو گاہے گاہے ایسے امور کا مکلف ضرور کیا جن میں خاصی مشقت اٹھانا پڑتی تھی (الانعام ۶: ۱۴۷) امت محمدیہ پر اللہ کا یہ خصوصی انعام ہے کہ اسے غیر معتاد مشقت سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ ارشاد فرمایا:

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (البقرہ ۲: ۲۸۶) اللہ نے کسی نفس کو اس کی گنجائش سے زیادہ تکلیف نہیں دی۔ اس آیت کی تفسیر میں تمام معروف مفسرین متفق ہیں کہ:

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اتنی ہی تکلیف دی ہے جتنی برداشت کرنے کی وہ طاقت رکھتا ہے اور اسے آسانی سے برداشت کرلیتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ امور شرعیہ کی ادائیگی میں اسے انتہائی طاقت اور پورا زور لگانا پڑے۔ (طبری، تفسیر کبیر، ابن کثیر وغیرہ بذیل آیت ۲: ۲۸۶)۔

نیز فرمایا: يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (البقرہ ۲: ۱۸۵) اللہ تعالیٰ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے، تمہارے لئے دشواری نہیں چاہتا۔

اس سلسلے میں مزید مطالعے کے لئے درج ذیل آیات دیکھئے:

يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا (النساء ۴: ۲۸)۔

اللہ چاہتا ہے کہ تم پر سے (پابندیوں کا بوجھ) ہلکا کرے اور انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔

ہمیں یہ دعا سکھائی گئی ہے:

رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ (البقرہ ۲: ۲۸۶)

اے ہمارے رب! ہم پر بھاری بوجھ نہ ڈال جیسے تو نے ان لوگوں پر ڈالا جو ہم سے پہلے تھے۔ اے ہمارے رب! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جس کے اٹھانے کی ہم میں قوت نہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ اس دعا کے جواب میں اللہ نے فرمایا: قَدْ فَعَلْتُ (میں نے کردیا)۔ (دیکھئے: تفسیر بیضاوی، ابن کثیر بذیل آیت ۲: ۲۸۶)۔

قرآن حکیم نے کرید کرید کر باتیں پوچھنے سے منع کیا۔ مبادا کسی شخص کے سوال کے نتیجے میں کوئی مباح چیز حرام کردی جائے یا کوئی آسانی ختم کردی جائے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ وَاِنْ تَسْئَلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ (المائدہ ۵: ۱۰۱)۔

اے ایمان والو! ایسی باتیں نہ پوچھا کرو کہ اگر ظاہر کی جائیں تو تمہیں بری لگیں اور اگر پوچھو گے ان کے متعلق جب قرآن اتر رہا ہے تو تمہارے لئے ظاہر کردی جائیں گی۔

حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب بھی دو چیزوں کے درمیان اختیار دیا گیا تو آپ نے ان میں سے آسان ترین کو اختیار کیا جب کہ وہ گناہ نہ ہو"۔ (بخاری، کتاب المناقب ۲۳)۔

ایک موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ نے فرائض مقرر کردیے ہیں انہیں ضائع نہ کرو، حدود کا تعین کردیا ہے ان سے تجاوز نہ کرو، جو چیزیں حرام کردی ہیں ان کی پردہ دری

دین میں سختی کرے گا تو دین اس پر غالب آجائیگا لہٰذا سیدھے رہو اور زیادہ بلند پروازی نہ کرو اور خوش ہو جاؤ (کہ تمہیں آسان دین ملا ہے)۔"

(بخاری، کتاب الایمان)

ایک اور موقع پر ایک خوبصورت مثال سے سمجھاتے ہوئے فرمایا: "یہ دین نہایت موزوں اور مضبوط ہے اس کو نرمی کے ساتھ حاصل کرنے کی کوشش کرو اور زیادہ سختیاں اٹھا اٹھا کر اللہ کی عبادت سے اپنے دل میں نفرت پیدا نہ کرو کیونکہ زیادہ تیز رو مسافر اپنی سواری ہلاک کر دیتا ہے اور منزل طے کرنے سے بھی رہ جاتا ہے"

(مسند احمد عن انس بن مالک)

آپ نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور معاذ بن جبلؓ کو بعض دینی اور انتظامی امور سپرد کرتے ہوئے ہدایت فرمائی: "آسانی پیدا کرنا، مشکل میں نہ ڈالنا، لوگوں کو رغبت دلانا، انہیں متنفر نہ کرنا، باہمی تعاون کے جذبے کو ابھارنا، اختلاف نہ ڈالنا" (بخاری، کتاب المغازی، ۳۶۰)۔

ان آیات و احادیث کا یہ مطلب نہیں کہ احکام خداوندی کی بجا آوری میں کسی قسم کی تنگی اور تکلیف اٹھانی پڑے تو ان احکام میں ترمیم و تنسیخ کر دی جائے۔ اگر اس کا یہ مطلب لیا جائے تو انسان کے مکلف ہونے کے کوئی معنی نہیں رہتے۔

فقہائے اسلام نے قرآن و حدیث کی روشنی میں حرج کی درجہ بندی کی ہے۔ چنانچہ امام شافعیؒ لکھتے ہیں:

"حرج درحقیقت تنگی کو کہتے ہیں۔ وہ مشقتیں جو عادتاً روزانہ کے کام کاج میں ہوتی ہیں حرج میں داخل نہ ہوں گی، لغوی اعتبار سے نہ شرعی اعتبار سے، ورنہ مطلقاً حرج سے گلو خلاصی تو ممکن ہی نہیں۔ کسی نہ کسی درجے میں حرج کا ہونا شرعی حکمت میں داخل ہے تاکہ انسان کی آزمائش ممکن ہو۔ اگر کسی حکم پر عمل درآمد کے نتیجے میں اس سے زیادہ اہم بات میں کوتاہی ہوتی ہے مثلاً کوئی کام کرنے سے ترک واجب یا ارتکاب حرام کی نوبت آتی ہے تو اس نوع کے حرج کو ختم کرنا ضروری ہے۔ جہاں تک اصول دین کی حفاظت کا تعلق ہے تو وہ انسانی جان اور جوارح پر مقدم ہیں۔"

(شاطبی ۲: ۱۰۹، ۱۵۳)

اوامر و نواہی میں غور کرنے اور انسانی مزاج اور طبیعت کو مدنظر رکھ کر مختلف احوال و کوائف کے تغیر و تبدل کا مطالعہ کرنے سے مندرجہ ذیل تشریع قرآنی میں جاری و ساری نظر آتے ہیں: یہ اصول درج ذیل ہیں:

۱ - عدم حرج

حرج عربی زبان میں غیر معمولی تنگی کو کہتے ہیں. حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حرج کی تفسیر تضیق (CONFINEMENT) سے کی ہے لیکن اس لفظ کی پوری وضاحت اس بیان سے ہوتی ہے کہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن عباس سے دریافت کیا کہ حرج کے کیا معنی ہیں؟ انہوں نے کہا: "کیا تم عربی نہیں ہو جو اس کے معنی پوچھتے ہو" پھر قبیلہ ہذیل کے ایک آدمی کو بلوایا اور اس سے پوچھا: "ما الحرج؟ حرج کے کیا معنی ہیں؟" اس نے جواب دیا: "حرج اس جھاڑی کو کہتے ہیں جس سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہ ہو" (لسان العرب ۳: ۲۳۴).

عربی لغت کے ماہر عالم، زجاج (م ۳۱۱ھ/ ۹۲۳ء) کہتے ہیں: "حرج کا لفظ غیر معمولی تنگی کے لئے بولا جاتا ہے" (ایضاً).

قرآنی اصول تشریع میں عدم حرج سے مراد یہ ہے کہ قرآن حکیم کے اوامر و نواہی میں یہ امر ملحوظ رکھا گیا ہے کہ قوانین میں انسانوں کے لئے آسانی اور سہولت کا پہلو ہو، ایسے قوانین نہ ہوں جو انسانی استطاعت سے ماورا اور بشری طاقت سے باہر ہوں. قرآن حکیم کی متعدد آیات سے عدم حرج کے اصول کی تائید ہوتی ہے. مثلاً:

مَا يُرِيدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيدُ لِيُطَهِّرَكُمْ (المائدہ ۵: ۶). اللہ یہ نہیں چاہتا کہ تمہیں تنگی میں ڈال دے بلکہ وہ تمہیں پاک صاف کرنا چاہتا ہے.

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (الحج ۲۲: ۷۸) اللہ نے دین کے معاملے میں تمہیں تنگی میں مبتلا نہیں کیا.

قرآن حکیم نے ایک مقام پر رسول اکرمؐ کے فرائض نبوت بیان کرتے ہوئے کہا ہے: وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ (الاعراف ۷: ۱۵۷) جو بوجھ اور بیڑیاں اب تک ان پر تھیں، وہ اتارے دیتا ہے.

بوجھ اور بیڑیوں سے مراد وہ تمام احکام و اعمال ہیں جن میں دشواری ہو اور معمول سے زیادہ مشقت اٹھانی پڑے.

قرآن حکیم نے اس بوجھ اور بیڑیوں کا دوسرے مقامات پر ذکر کیا ہے. اس سے مراد مذہبی زندگی کی ناقابل عمل پابندیاں، ناقابل فہم عقیدوں کا بوجھ، توہم پرستی، علما اور فقہا کی تقلید کی بیڑیاں اور مذہبی علما کی غدائی کی زنجیریں تھیں جنہیں رسول اللہ نے سہل، آسان اور قابل عمل شریعت کے ذریعے ختم کر دیا.

رسول اکرمؐ کی متعدد احادیث مبارکہ سے بھی عدم حرج کے اصول پر استدلال کیا گیا ہے. ایسی تمام روایات کا استقصا ممکن ہے نہ مطلوب. بطور نمونہ چند روایات درج ذیل ہیں:

آپؐ کا ارشاد ہے: "آسان سچا دین ہی اللہ کو محبوب ہے اور میں آسان سچا دین دے کر بھیجا گیا ہوں" (مسند احمد ۶: ۱۱۶).

نیز فرمایا: "دین بہت آسان ہے جو شخص
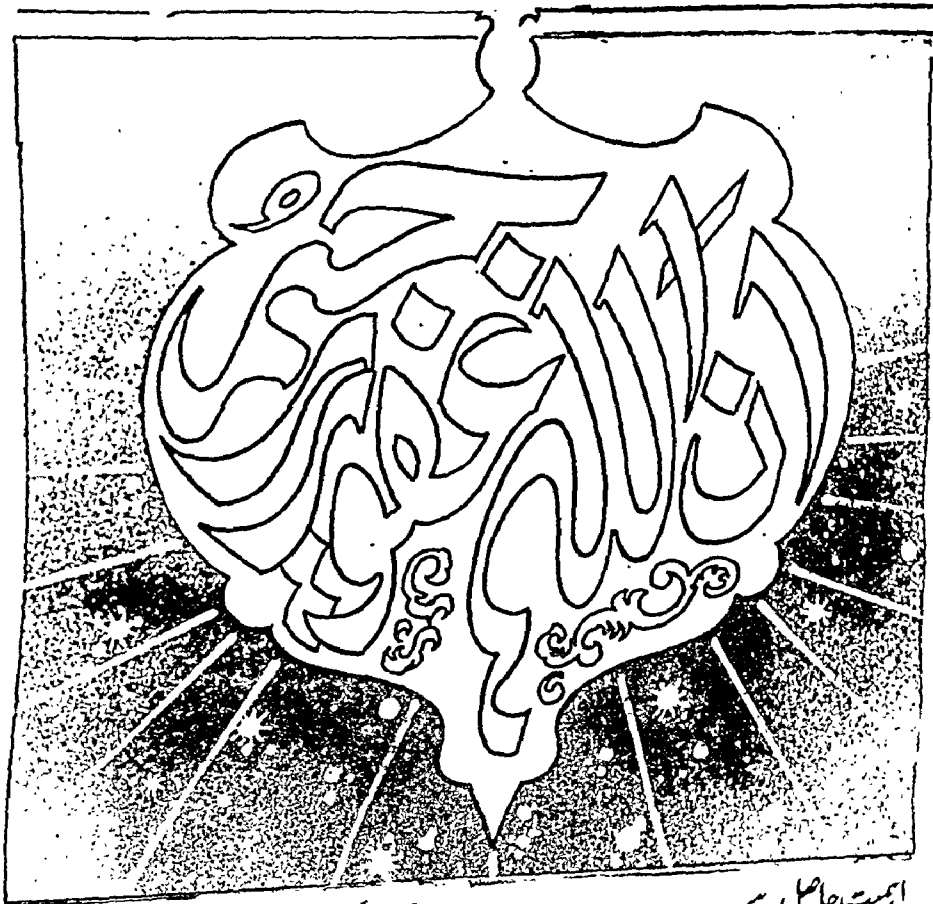
اہمیت حاصل ہے۔

قرآن نے کہیں بھی دستوری دفعات اور قانونی شقوں کی کوئی فہرست نہیں دی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن حکیم خلا میں نہیں، ایک متحرک معاشرے میں ایک زندہ نبی پر نازل ہوا اور اس نبی کا اولین فریضہ یہ تھا کہ وہ قرآن کی عملی تفسیر پیش کرے (البقرہ ۲: ۱۲۹، الاحزاب ۳۳: ۲۱)۔ اس لئے قرآن نے صرف عام ہدایات پر اکتفا کیا اور تفصیلات و توضیحات کی ذمہ داری نبی پر چھوڑ دی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن اپنے آپ کو کتاب قانون نہیں بلکہ کتاب ہدایت (البقرہ ۲: ۲، بنی اسرائیل ۱۷: ۹) کہتا ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کی ضمانت دیتا ہے اور مسلمانوں کو آپ کی سنت کے اتباع کا پابند کرتا ہے۔

قانون سازی کے قرآنی اصول

قرآن حکیم نے قانون سازی کی بنیاد اصولوں پر رکھی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ قرآن نے کسی جگہ ترتیب وار ان اصولوں کو گنوا کر انہیں اساس تشریع قرار دیا ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ قرآن کے

ہر شے فنا ہونے والی ہے، حکومت صرف اسی کی ہے اور اسی کی طرف تم سب لوٹائے جاؤ گے،، (القصص ۲۸ : ۸۸)۔

"جس چیز میں بھی تم اختلاف کرتے ہو اس کا فیصلہ اللہ کے سپرد ہے۔" (الشوریٰ ۴۲ : ۱۰)

" ایمان والوں کا قول تو یہ ہے کہ جب وہ بلائے جاتے ہیں اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف کہ رسول ان کے درمیان فیصلہ کر دیں تو وہ کہہ اٹھتے ہیں، ہم نے سن لیا اور مان لیا " (النور ۲۴ : ۵۱)۔

" جو کوئی اللہ کے نازل کئے ہوئے احکام کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو ایسے لوگ ہی کافر ہیں۔"
(المائدہ ۵ : ۴۴)

" جو کوئی اللہ کے نازل کئے ہوئے احکام کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو ایسے لوگ ہی ظالم ہیں۔"
(المائدہ ۵ : ۴۵)

" جو کوئی اللہ کے نازل کئے ہوئے احکام کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو ایسے لوگ ہی نافرمان ہیں۔" (المائدہ ۵ : ۴۷)

قرآن حکیم اصطلاحی معنوں میں کوئی قانون ضابطہ (LEGAL CODE) نہیں ہے بلکہ یہ اسلامی قانون کا اصل الاصول ہے۔ اسلامی شریعت میں اس کی حیثیت وہی ہے جو ملکی قانون میں دستور کی ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن حکیم میں قانونی نوعیت کے کچھ عام اصول اور قواعد و ضوابط موجود ہیں اور چند ایک مسائل میں قرآن نے بعض جزئیات کے احکام بھی بتائے ہیں لیکن قرآن حکیم کا اصل مقصد بنی نوع انسان کو ایک ایسا طریق حیات دینا ہے جو بندے کے بندے اور بندے کے خالق کائنات سے تعلقات کو استوار کرے۔ چنانچہ میراث، مناکحات، صلح و جنگ، حدود و تعزیرات اور بیع و شرا کے قوانین بندوں کے باہمی تعلقات کو خوشگوار بنا دینے کیلئے مقرر کئے گئے ہیں۔ اسی طرح قرآن حکیم کی اخلاقی تعلیمات بھی ان تعلقات کو مضبوط سے مضبوط تر کرنے کے لئے ہیں۔ جب ہم قرآن کے دستوری احکام کو دیکھتے ہیں تو ان میں بھی ہمیں دستوری اور اخلاقی تعلیمات کا ایک حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ کہیں انسان کے ضمیر کو بیدار کرنے کے لئے غور و فکر کی دعوت دی جاتی ہے تو کہیں ترغیب و ترہیب کا اسلوب اختیار کیا جاتا ہے اور کہیں اللہ کی صفات مثلاً سمیع، علیم اور قدیر وغیرہ کی یاد دہانی کرا کے قوانین کی پابندی کے لئے انسان کو شعوری طور پر آزادانہ رضامندی سے آمادہ کیا جاتا ہے۔

قرآن حکیم نے درحقیقت مستقبل میں قانون سازی کے لئے بنیادیں مہیا کی ہیں جب ہم ان اصولوں کا جائزہ لیتے ہیں جن پر قرآن حکیم نے قانون کی بنیاد رکھی ہے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان سے نہ تو فکر انسانی پر کوئی روک قائم کی گئی ہے اور نہ وضع آئین و قوانین پر، اس کے برعکس ان میں جو وسعت، رواداری اور گنجائش موجود ہے اس سے ہمارے غور و فکر کو تحریک ملی ہے۔

جب ہم قرآن حکیم کی تاریخ تنزیل کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف آیات کے پس منظر میں اسباب نزول کا ایک وافر ذخیرہ موجود ہے۔ قرآن کبھی کسی معاشرتی مسئلہ میں رہنمائی کے لئے نازل ہوتا ہے کبھی کسی سوال کے جواب میں اور کبھی کسی اور مخصوص موقع پر ان مواقع پر جہاں قرآن اس متعین واقعہ میں رہنمائی کرتا تھا وہاں وہ عام اصول اور ضوابط بھی بیان کر دیتا ہے اور اسلامی نظام تشریع میں ان اصولوں کو بے پناہ

دے دیا۔ اس قانونی نظام کو عوام و خواص میں اعتبار حاصل تھا نیز اس میں وہ لچک اور ارتقا کی صلاحیت پیدا ہو گئی جس نے اسے زمان و مکان کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے قابل بنا دیا۔

خدائی قانون اور انسانی قانون

انسانی زندگی کے دو پہلو ہیں: ثبات اور تغیر۔ زندگی کے بہت سے امور و مسائل ایسے ہیں جن میں تاریخی، جغرافیائی، معاشی اور عمرانی عوامل کسی قسم کی تبدیلی نہیں لاتے بلکہ وہ امور ہمیشہ ایک ہی طرح رہتے ہیں مثلاً بندے اور اس کے رب کے درمیان تعلق یا نسل انسانی کی بقا سے متعلق امور ایسے معاملات ہیں جو تمدن کی تبدیلی سے متاثر نہیں ہوتے۔ اس لئے زندگی کے ثباتی پہلو سے متعلق ایسے قوانین ہونے چاہئیں جو تغیر پذیر نہ ہوں بلکہ دائمی اور ابدی ہوں۔ بہت سے امور ایسے ہیں جن میں انسانی تمدن کے ارتقا سے تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں مثلاً حصول معاش کے ذرائع میں تنوع، نظام حکومت کیسا ہونا چاہئے، کسی ملک کے دستور کی ساخت کیسی ہو، عدلیہ، انتظامیہ اور مقننہ کے باہمی روابط کی نوعیت کیا ہو اور قومی یا بین الاقوامی تعلقات کی تفصیلات کیا کیا ہونی چاہئیں۔ یہ تمام ایسے امور ہیں جن میں تغیر و ارتقا ناگزیر ہے۔

قرآن حکیم نے جو قوانین دیئے ہیں ان میں انسانی زندگی کے ان دونوں پہلوؤں کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ ایسے امور جن میں تبدیلی رونما نہیں ہوتی ان کے لئے مفصل اور غیر مبدل قوانین دیئے گئے ہیں اور جن معاملات میں تبدیلی کا عمل جاری رہتا ہے ان میں اصولی ہدایات اور قواعد کلیہ دینے کے بعد تفصیلی قانون سازی علماء و مجتہدین کے سپرد کی گئی ہے (النساء ۴: ۸۳) تاکہ تمدن کے ارتقا کے ساتھ قانون میں ارتقا کا عمل جاری رہے۔ گویا اسلامی ادبیات میں قانون کی دو قسمیں ہیں: ایک الہامی قانون جس میں ترمیم و تنسیخ اور حک و اضافہ کا کسی فرد بشر کو اختیار نہیں اور دوسرا الہامی قانون سے مستنبط قانون جس کی تخریج و استنباط میں انسانی کاوشیں کارفرما ہیں۔ مستنبط قانون میں انسانی عمل دخل کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک طرف اس میں غلطی کا امکان ہمیشہ رہتا ہے جو اس کے بارے میں مزید بحث و تحقیق کا دروازہ کھولتا ہے تو دوسری طرف وہ ایک متعین زمانے، مخصوص تمدن اور خاص حالات سے وابستہ ہونے کی وجہ سے قابل تغیر اور تمدن کے پہلو بہ پہلو ارتقا پذیر رہتا ہے۔ اسلامی قانون کی یہی سب سے بڑی خوبی ہے جو اسے کسی دور اور کسی ماحول میں از کار رفتہ اور سماجی حالات سے الگ نہیں ہونے دیتی بلکہ ہر دور میں اسے زندہ، تازہ اور موجود چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کیلئے مستعد رکھتی ہے۔

اسلامی قانون کی یہی خوبی ہے جس نے اسلام کو دائمی اور عالمگیر حیثیت عطا کی ہے۔ یہاں اس کی تفصیل کا موقع ہے نہ ضرورت البتہ تھوڑی سی مزید وضاحت سے تغیر پذیر اور ناقابل تغیر امور میں قرآن کی قانون سازی کا ایک اجمالی خاکہ ہمارے سامنے آسکتا ہے۔

قرآن حکیم میں تقریباً پانچ سو آیات کا تعلق فقہ و قانون سے ہے جن میں سے نصف سے زائد آیات صرف عبادات (نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج) سے متعلق ہیں۔ چونکہ عبادات تمدنی ارتقا سے متا

۲۔ قانون مستقبل کے لئے بنایا جاتا ہے اس لئے قانون سازی کیلئے جہاں ماضی کے تجربات کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے وہاں مستقبل بینی کی صلاحیت ہونا بھی ضروری ہے۔ انسانوں میں چونکہ مستقبل بینی کی صلاحیت محدود ہے اسلئے انکے بنائے ہوئے قوانین بشری کمزوریوں کے آئینہ دار اور تغیر و تبدل کا شکار رہتے ہیں۔

۳۔ محض عقل کو نیکی اور بدی کا معیار مان لینے سے پیچیدہ مشکلات پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ ایک ہی مسئلے میں مختلف افراد میں اختلاف رائے ہو جاتا ہے۔ بعض پیچیدہ معاملات میں انتہائی خلوص، دیانتداری اور عقل و دانش کے استعمال کے باوجود یہ فیصلہ کرنا ممکن نہیں ہوتا کہ اس میں نفع کا پہلو راجح ہے یا نقصان کا۔ اس نوعیت کا عقلی و استدلالی اختلاف رائے قانون سازی میں رکاوٹ بنتا ہے۔

۴۔ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کو قانونی حیثیت اسی صورت میں حاصل ہوتی ہے جب انہیں کسی با اختیار حاکم یا ادارے کی منظوری حاصل ہو یا کوئی با اختیار عدالت انہیں قانون کا درجہ دے کر نافذ کر دے۔ اگر ایسی کوئی چیز ان قوانین کو حاصل نہ ہو تو ان کی قانونی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔

بنی نوع انسان پر اللہ کا یہ احسان ہے کہ اس نے انسانی غلطیوں کے امکانات کو کم کرنے، انسان کی محدود صلاحیتوں کا دائرہ وسیع کرنے اور انسانی دانش کو جلا بخشنے کے لئے عقلی ہدایت کے ساتھ الہامی ہدایت کا اہتمام بھی فرمایا۔ ایسے برگزیدہ افراد کو ہادی بنا کر بھیجا جو حقیقی حاکم کے احکام انسانوں تک پہنچاتے رہے۔ ان ہی مقدس ہستیوں میں آخری شخصیت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے جن کے ذریعے سے دین کی تکمیل ہوئی اور نیکی اور بدی میں واضح خط امتیاز کھینچ دیا گیا اور بنی نوع انسان کے لئے ہدایت و شفا کی آخری کتاب نازل کی گئی جس کی تعبیر، تفسیر اور توضیح و بیان کا کام نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے کیا۔

دین کی تکمیل سے مراد یہ ہے کہ کتاب الہی نے وہ تمام ضوابط، اصول اور کلیات بتا دیئے جو قیامت تک کے انسانوں کی رہنمائی کیلئے کافی ہیں۔ الہامی ہدایت سے یہ توقع رکھنا کہ وہ قیامت تک کے غیر محدود جزئی واقعات میں براہ راست رہنمائی کرے۔ رہنمائی کے دوسرے ذریعے یعنی عقل و دانش کو کلیتاً مسترد کر دینے کے مترادف ہے۔

قرآن اور حدیث نے اصول و کلیات کے ساتھ کئی ایک معاملات میں جزوی قانون سازی بھی کی اور کئی SUBSTANTIVE LAWS بھی دیئے جو صدر اول کے ساتھ تمدن کی ضروریات کے لئے کافی تھے لیکن تمدن کے ارتقا کے ساتھ انسانی ضروریات اور مسائل میں اضافہ ہوتا گیا اور ایسی نئی نئی صورتیں پیدا ہوتی گئیں جن کے بارے میں کتاب و سنت میں واضح ہدایات موجود نہیں تھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد وحی کا دروازہ تو بند ہو گیا لیکن امت مسلمہ کسی قانونی بحران سے دوچار نہیں ہوئی۔ قرآن و حدیث میں واضح طور پر اس امر کی ہدایات موجود تھیں کہ اہل علم کو قانون الہی کے علل و حکم کا ادراک حاصل کر کے استنباط و استخراج کے ذریعے قانون سازی کرنی چاہئے۔ چنانچہ مسلم فقہا نے بہت قلیل مدت میں ایک مکمل قانونی نظام تشکیل

ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی

انسانی تمدن کی بقا اور ترقی کا دار و مدار قیام عدل پر ہے اور قیام عدل کے لئے ایسے قوانین کی ضرورت ہے جن کو روبعمل لا کر معاشرے سے ظلم و تعدی کا خاتمہ کیا جا سکے۔ ہر فرد کے نہ صرف حقوق و فرائض متعین ہوں بلکہ ہر ایک بلا مطالبہ اپنے حقوق حاصل کر سکے اور بہر طور اپنے فرائض کی بجا آوری کا پابند ہو۔

قانون سازی کا آغاز کیسے ہوا؟ مختلف علمائے عمرانیات نے نظریہ معاہدہ عمرانی کی مختلف تعبیرات کی ہیں۔ نظریہ معاہدہ عمرانی کی کسی بھی تعبیر کو درست مانا جائے ہر صورت میں یہ نتیجہ بدیہی ہے کہ با اختیار قوت حاکمہ کے بغیر جو ظلم اور نا انصافی کی راہیں بند کر کے عدل قائم کر سکے، روئے زمین پر بنی نوع انسان کی بقا اور ارتقا ناممکن ہے۔ مسلم مفکرین کا نقطہ نظر یہ ہے کہ انسان کا فرض ہے کہ وہ اچھے کام کرے اور بدی کے کاموں سے پرہیز کرے۔ سادہ زندگی میں نیکی اور بدی کا امتیاز شاید آسان ہو لیکن متمدن زندگی کے پیچیدہ مسائل میں یہ امتیاز ہرگز آسان نہیں۔ عملی ضروریات کا تقاضا یہ ہے کہ قانون سازی کا اختیار انسانی ہاتھوں میں ہو، خواہ یہ حق فرد کو دیا جائے یا اجتماع کو لیکن اس میں چند مشکلات حائل ہوتی ہیں:

۱۔ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین میں غیر جانبدارانہ رویے کا التزام تقریباً ناممکن ہے۔ قانون ساز ادارے کے افراد اپنے ذاتی یا اپنے طبقے کے مفادات کو ترجیح دے دیتے ہیں جس سے نا انصافی کا آغاز ہوتا ہے۔ ایسا قانون صرف کوئی غیر جانبدار شخصیت ہی بنا سکتی ہے جو تمام افراد معاشرہ اور تمام طبقات کے ساتھ مساویانہ رویہ رکھے۔

اے خدا!

غنچہ و گل سبزۂ رنگین اور خارِ چمن
تیری قدرت کے امیں ہیں سب یہ شہکارِ چمن

صبح کا منظر تری صنعت کا شہکارِ حسیں
جلوۂ روشن کا اک پرتو ہیں انوارِ چمن

سب کی قسمت اور ضرورت تیری نعمت تیرا رزق
تیری رحمت بیکراں ہے اے نگہدارِ چمن

کیسے سمجھے میری بینائی رموزِ کائنات
یوں تو کرتی ہیں یہ آنکھیں روز دیدارِ چمن

اے خدا ہیں بالیقیں تیری بہت اعلا صفات
ہر صفت ہے دم قدم مشغولِ دربارِ چمن

تاب لاؤں گا بھلا کیا میں ترے دیدار کی
میں ہوں اک محدود ذرّہ اے جہاں دارِ چمن

تو جسے تسکین کی توفیق دے، تیرا کرم
قادر مطلق اسے بیشک تو سکوں بارِ چمن

(جل شانہٗ)

ابرار کرتپوری

امام ابو حنیفہؒ کا حلیہ شریف

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:-
لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۝ "ہم نے انسان کو بہترین سانچے میں ڈھالا ہے۔"

اس مشترک خوبی میں انسانوں کے مراتب ہیں، کوئی ان میں سے یوسف ہے تو کوئی نہایت کریہہ المنظر اور زشت رُو۔ بایں تفاوت اللہ تعالیٰ کے یہاں یہ ظاہری زیب و زینت قبولیت کا مدار نہیں ہے۔ بہت سے خوبرو نہایت بدخو ہوتے ہیں اور بہت سے بدرُو خوش خو ہوتے ہیں اور اسی پر قبولیت اور شرافت کا مدار ہے۔ حضرت بلال حبشیؓ، حضرت سعد الاسودؓ اور حضرت عطاء بن رباحؒ (مشہور تابعی) ظاہراً کیسے تھے لیکن باطناً ان کو وہ مقام حاصل ہے جس سے شرمندہ آفتاب و ماہتاب ہے۔

"خاک کے پردے میں ہیرے کی کنی ہوتی ہے"

حضرت امام ابو حنیفہؒ انہیں خوش نصیب انسانوں میں سے ہیں جن کو ظاہری و باطنی ہر قسم کی دل ربائی حاصل ہے آپ کا حلیہ بیان کرنے والے حضرات بیان کرتے ہیں۔

- امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ امام صاحبؒ میانہ قد تھے یعنی نہ بہت پست اور نہ بہت زیادہ دراز، حسین صورت اور شیریں کلام تھے۔
- حماد بن ابی حنیفہؒ کہتے ہیں۔ امام صاحب نہایت خوش لباس تھے اور اس قدر خوشبو استعمال کرتے تھے کہ ہم لوگ محض خوشبو ہی سے پتہ لگا لیتے تھے، کوئی اس راہ سے ہو کر گیا ہے۔
- ابو نعیم کہتے ہیں کہ امام صاحبؒ نہایت خوبصورت اور نہایت خوش لباس تھے۔ آپ کی ریش مبارک نہایت خوبصورت تھی آپ جوتا اور کپڑا بہت عمدہ پہنتے تھے۔
- ابو مطیع بلخی کہتے ہیں کہ میں نے امام صاحبؒ کو نہایت قیمتی چادر پہنے دیکھا جس کی قیمت کم از کم چار سو درہم ہوگی۔
- ایک دن نصر بن محمد امام صاحب سے ملاقات کے لئے گئے امام صاحبؒ کہیں باہر جانے کی تیاری فرما رہے تھے، اُن سے کہا ذرا دیر کے لئے مجھے اپنی چادر دے دیجئے۔ جب امام صاحبؒ واپس آئے تو شکایت کی کہ ناحق تمہاری چادر لے کر مجھے شرمندہ ہونا پڑا۔ نصر کہتے ہیں کہ وہ چادر میں نے پانچ دینار کی خریدی تھی اور مجھ کو اس پر ناز تھا اس لئے امام صاحبؒ کی شکایت پر تعجب ہوا۔ دوسرے موقعہ پر جب میں نے امام صاحبؒ کو دیکھا تو آپ تیس دینار کی چادر اوڑھے تھے تو میرا تعجب جاتا رہا۔
- امام صاحبؒ کو درباریوں سے کوسوں دُور رہتے تھے لیکن خلیفہ منصور نے درباریوں کے لئے جو ٹوپی مقرر کی تھی (جس کا رنگ سیاہ تھا) یہ بھی آپ کے پاس بیک وقت سات سات ہوتی تھیں۔

امام صاحبؒ کی یہ ظاہری نظافت اور طہارت اُن کی نظافتِ طبع پر دلالت کر رہی ہے جس سے انسانی اخلاق و عادات کو معلوم کرنے میں کافی امداد ملتی ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پوتے حضرت قاسم فرماتے تھے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس سے زیادہ فیض رساں اور کوئی مجلس نہیں ہے۔

امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ کا قول مبارک ہے کہ میں نے حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے بڑھ کر حدیث کے معنی اور فقہی نکات جاننے والا کوئی شخص نہیں دیکھا۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے تھے ایک مرتبہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے سوال کیا کہ آپ نے امام ابوحنیفہ کو دیکھا تھا؟ فرمایا ہاں میں نے انہیں ایسا شخص پایا کہ اگر وہ اس ستون کو سونے کا ثابت کرنا چاہتے تو اپنے علم کے زور پر ایسا کر سکتے تھے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تمام لوگ فقہ میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے پروردہ ہیں، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ان لوگوں میں سے تھے جن کو فقہ میں موافقتِ حق عطا کی گئی۔

تلامذہ

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد بھی اعداد و شمار سے باہر ہیں۔ جن میں مشاہیر کے نام یہ ہیں جنھوں نے ساری دنیا میں فقہ حنفی کا سکہ بٹھا دیا (۱) امام ابویوسف (۲) امام محمد بن الحسن شیبانی (۳) امام زُفر (۴) حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہم اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ۔

وفات

جب آپ کی وفات ہوئی تو آپ کو قید خانہ سے نکالا گیا۔ پانچ آدمی وہاں سے نکال کر غسل کی جگہ پر لائے جہاں قاضی بغداد حسن بن عمارہ نے آپ کو غسل دیا۔ اور ابورجا عبداللہ بن واقد ہروی نے پانی ڈالا جب حسن آپ کے غسل سے فارغ ہوئے تو فرمایا کہ خدا آپ پر رحم کرے۔ آپ نے تیس سال سے روزہ نہ چھوڑا اور چالیس سال آپ کا پہلو ٹیک لگا نہ سکا۔ آپ ہم سب سے زیادہ فقیہ، عابد، زاہد اور خصالِ خیر کے سب سے زائد جامع تھے۔ آپ بھلائی اور سنت کو اپنے ہمراہ قبر میں لے گئے۔ اور بغداد والوں کو عاجز کر گئے ابھی غسل سے فارغ بھی نہ ہونے پائے تھے کہ بغداد کے بے شمار لوگ وہاں جمع ہو گئے گویا کہ ان کو اعلان کے ذریعہ بلایا گیا ہو۔ آپ پر نماز پڑھنے والوں کا شمار کیا گیا تو ایک روایت کے مطابق پچاس ہزار اور ایک روایت کے مطابق اس سے بھی زائد تھے۔ چھ مرتبہ آپ پر نماز پڑھی گئی آخر میں آپ کے بیٹے حماد نے پڑھی کثرت ازدہام کے باعث عصر کے بعد دفن نہ کر سکے لوگ کی قبر پر بیس روز تک نماز پڑھتے رہے۔ آپ نے وصیت کی تھی کہ آپ کو خربوزہ والے قبرستان کے مشرقی حصہ میں دفن کیا جائے کہ وہ زمین اچھی ہے اور غیر مغصوبہ ہے جب یہ اطلاع منصور کو پہونچی تو اس نے کہا کہ آپ کا عذر زندگی اور موت دونوں حالت میں قابلِ قبول ہے۔ آپ کی وفات کی خبر مفتی مکہ ابن جریج اور امام شافعی کے شیخ کو پہونچی تو اس نے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا اور فرمایا کہ کوفہ سے علم کی روشنی بجھ گئی۔ اب وہ ان کا نظیر کبھی نہ دیکھ سکیں گے۔ آپ کی وفات ۱۵۰ھ میں ہوئی۔

(از قلم حافظ عبدالرزاق)

امام صاحبؒ کا تحمل

ایک دن حلقہ درس قائم تھا۔ ایک نوعمر نے مسئلہ پوچھا، امام صاحبؒ نے جواب دیا۔ اس نے کہا ابو حنیفہؒ تم نے جواب میں غلطی کی، ابو الخطاب جرجانی بھی حلقہ میں شریک تھے ان کو نہایت غصہ آیا اور حاضرین کو ملامت کی کہ تم لوگ بڑے بے حمیت ہو، امام کی شان میں ایک لونڈا جو جی میں آتا ہے کہہ جاتا ہے تم کو ذرا جوش نہیں آتا، امام صاحبؒ نے ابو الخطاب کی طرف خطاب کیا اور فرمایا کہ ان لوگوں پر کچھ الزام نہیں، میں اس جگہ بیٹھا ہوں تو اسی لئے بیٹھا ہوں کہ لوگ آزادانہ میری رائے کی غلطیاں ثابت کریں اور میں تحمل کے ساتھ سنوں۔"

عہدہ قضا سے انکار

دراصل وہ قضا کی ذمہ داریاں نہیں اٹھا سکتے تھے۔ انہوں نے منصور کے سامنے اپنی ناقابلیت کی جو وجہیں بیان کیں وہ بالکل بجا تھیں۔ یعنی یہ کہ اپنی طبیعت پر اطمینان نہیں، میں عربی النسل نہیں ہوں اس لئے اہل عرب کو میری حکومت ناگوار ہوگی۔ درباریوں کی تعظیم کرنی پڑے گی اور یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا پھر بھی منصور نے نہ مانا اور قسم کھا کر کہا تم کو قبول کرنا ہوگا۔ امام صاحبؒ نے قسم کھائی کہ ہرگز قبول نہیں کروں گا۔ اس جرأت اور بیباکی پر تمام دربار حیرت زدہ تھا، ربیع نے غصہ میں آکر کہا، ابو حنیفہؒ! تم امیر المؤمنین کے مقابلہ میں قسم کھاتے ہو۔ امام صاحبؒ نے فرمایا "ہاں! کیوں امیر المؤمنین کو قسم کا کفارہ ادا کرنا میری نسبت زیادہ آسان ہے"

فقہ کی سماعت بھی کی۔ جن میں حضرت انس بن مالک، عبداللہ بن حارث بن جزء الزبیدی، عبداللہ بن انیس، سہل بن سعد ساعدی، واثلہ بن اسقع، عبداللہ بن ابی اوفی انصاری، جابر بن عبداللہ انصاری اور عائشہ بنت عجرد رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔

آپ کے علمی و عملی کمالات کے متعلق معاصرین و ائمہ کرام کی آراء

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے علمی و عملی کمالات کی آپ کے معاصرین اور بعد کے ائمہ کرام نے تعریف و تحسین کی اور آپ کی دینی خدمات کو انتہائی عزت و توقیر کی نگاہ سے دیکھا۔ خلف بن ایوب بانگ دہل کہا کرتے تھے "اللہ تعالیٰ سے علم حضور سرور عالم صلے اللہ علیہ وسلم تک پہونچا وہ علم آپ نے صحابہ کرام تک پہونچایا صحابہ کرام نے تابعین کو اور تابعین سے وہ علم حضرت امام اعظم ابو حنیفہ اور ان کے صحاب کو ملا۔ حق یہی ہے

کے بغیر ناممکن تھی۔ اس وقت تمام ممالکِ اسلامیہ میں بڑے زور شور سے حدیث کا درس جاری تھا۔ ہر جگہ مسند اور روایت کے درس کھلے ہوئے تھے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تمام ممالکِ اسلامیہ میں پہونچ گئے تھے۔ اسی وجہ سے اسناد و روایت کا ایک عظیم الشان سلسلہ قائم ہو گیا تھا لوگ جہاں کسی صحابی کا نام سن پاتے تھے ہر طرف سے ٹوٹ پڑتے تھے کہ چل کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات سنیں یا مسائلِ شرعیہ کی تحقیق کریں۔ اس طرح تابعین کا جو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے شاگرد کہلاتے تھے ایک گروہ پیدا ہو گیا تھا۔ جن شہروں میں صحابہ یا تابعین کا زیادہ مجمع تھا وہ دار العلم کے لقب سے ممتاز تھے۔ ان میں مکہ معظمہ، مدینہ منورہ یمن، بصرہ اور کوفہ کو خاص امتیاز تھا۔ کیونکہ اسلامی آثار کے لحاظ سے کوئی شہر ان مذکورہ مقامات کا ہمسر نہ تھا۔

صحابہ کرام رضؓ سے سماعِ حدیث

یہ موضوع البتہ غور طلب ہے کہ حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے کسی صحابی سے حدیث سنی ہے یا نہیں۔ جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے کسی صحابی سے حدیث نہیں سنی اُن کا سب سے بڑا استدلال یہ ہے کہ اگر حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے کسی صحابی سے حدیث سنی ہوتی تو اُن کے اخص الخواص تلامذہ حضرت امام ابو یوسف اور حضرت امام محمد اس کو ضرور روایت کرتے۔ لیکن یہ کوئی ضروری نہیں۔ امام مسلم امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے تلمیذ ہیں اور امام بخاری کے انتہائی مداح ہیں مگر اپنی صحیح مسلم میں ان سے ایک بھی حدیث نہیں روایت کی۔ اس کے برخلاف حضرت امام ابو یوسفؒ کے واسطے سے ایسی احادیث کی روایت بھی ثابت ہے علامہ موفق نے اپنے مناقب میں امام ابو یوسف کے واسطے سے یہ حدیث نقل فرمائی کہ حضرت امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا میں نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ الدال علی الخیر کفاعلہ واللہ یحب اغاثۃ اللہفان۔ نیکی کی رہنمائی کرنے والا نیکی کرنے والے کی مثل ہے اور اللہ تعالیٰ مصیبت زدہ کی دستگیری کو پسند فرماتا ہے۔ یہ ایک مثال ہے ورنہ مناقب موفق کا مطالعہ کریں ان میں امام ابو یوسف کی متعدد ایسی روایتیں ہیں جو حضرت امام اعظم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے براہِ راست سنی ہیں۔ اس کے علاوہ مسند حصکفی میں، جامع بیان العلم، فتح المغیث للسخاوی میں متعدد ایسی احادیث کی نشاندہی کی ہیں جنہیں حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے براہِ راست صحابہ سے سنی ہیں۔

جن صحابہ کرام سے آپ نے سماعِ حدیث کی ان کے اسماءِ گرامی یہ ہیں

شیخ الاسلام علامہ مسعود بن شیبہ بن حسین سندی مقدمہ کتاب التعلیم میں رقمطراز ہیں کہ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے فضائل میں یہ بات بھی ہے کہ وہ سابق الاسلام اور زمانہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب تر ہیں کیونکہ آپ ۸۰ ہجری میں پیدا ہوئے۔ صحابہ کرام کی ایک جماعت کو پایا اور ان سے احادیث روایت کیں اور

تجارت و دیانت

امام صاحبؒ کی تجارت نہایت وسیع تھی، لاکھوں کا لین دین تھا۔ اکثر شہروں میں گماشتے مقرر تھے، بڑے بڑے سوداگروں سے معاملہ رہتا تھا۔ ایسے بڑے کارخانہ کے ساتھ دیانت اور احتیاط کا اس قدر خیال رکھتے تھے کہ ناجائز طور پر ایک حبہ بھی ان کے خزانہ میں نہیں داخل ہو سکتا تھا اس احتیاط میں کبھی کبھی نقصان اُٹھانا پڑتا تھا۔ مگر ان کو کچھ پروا نہیں تھی۔ ایک دفعہ حفص بن عبدالرحمٰن کے پاس خز کے تھان بھیجے اور کہلا بھیجا کہ فلاں فلاں تھان میں عیب ہے۔ خریدار کو جتا دینا۔ حفص کو اس ہدایت کا خیال نہ رہا، تھان بیچ ڈالے اور خریداروں کو اس عیب سے اطلاع نہ دی، امام صاحبؒ کو معلوم ہوا تو نہایت افسوس کیا۔ تھانوں کی قیمت جو تیس ہزار درہم تھی، سب خیرات کر دی۔

امام اعظمؒ حضرت حمادؒ کی خدمت میں

حضرت حماد رحمۃ اللہ علیہ کوفہ کے مشہور امام اور استاذِ وقت تھے جس نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ
جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خادمِ خاص اور کفش بردار تھے، سے حدیث کی سماعت کی تھی اور بڑے بڑے تابعین
کے فیضِ صحبت سے مستفید ہوئے تھے۔ اس وقت کوفہ میں انہیں کا مدرسہ مرجع عام تھا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود
رضی اللہ عنہ سے جو فقہ کا سلسلہ چلا آتا تھا اس کا مدار انہیں پر رہ گیا تھا۔ ان باتوں کے ساتھ ساتھ زمانے نے
بھی ان کا ساتھ دیا تھا یعنی دولت مند اور فارغ البال تھے اللہ تعالیٰ نے انہیں فکرِ معاش سے آزاد کر رکھا تھا
اس وجہ سے نہایت اطمینان اور دلجمعی کے ساتھ اپنے کام میں مشغول رہتے تھے ان وجوہ سے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ
علیہ نے علم فقہ پڑھنا چاہا تو استادی کے لئے انہی کو منتخب کیا۔ اس وقت درس کا طریقہ یہ تھا کہ استاد کسی خاص
مسئلہ پر زبانی گفتگو کرتا تھا جس کو شاگرد یاد کر لیتے اور کبھی لکھ لیا کرتے تھے۔ حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ
پہلے دن بائیں صف میں بیٹھے کیونکہ مبتدیوں کے لئے یہ امتیاز عموماً قائم رکھا جاتا تھا لیکن چند روز کے بعد جب
حماد رحمۃ اللہ علیہ کو تجربہ ہو گیا کہ تمام حلقہ میں ایک شخص بھی حافظہ اور ذہانت میں ان کا ہمسر نہیں ہے۔ تو حکم
دیا گیا کہ ابو حنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) سب سے آگے بیٹھا کریں۔

امام اعظمؒ اور علمِ حدیث

علوم فقہ سے فراغت حاصل کرنے کے بعد آپ نے علمِ حدیث کی طرف توجہ فرمائی۔ حضرت حماد رحمۃ اللہ علیہ
کی زندگی ہی میں آپ نے علمِ حدیث کی طرف توجہ کی کیونکہ تفقہ فی الدین علم حدیث سے مکمل آگہی حاصل کرنے

تھی۔ اسّی سال پہلے کوفہ کا کیا حال رہا ہوگا اس کا اندازہ اس سے کریں کہ وہ زمانہ تابعین کا تھا۔ بلکہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا اخیر دور تھا۔ خَیْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِیْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَهُمْ کے آئینہ میں اسے دیکھو تو معلوم ہوگا۔ جب اسّی سال کے بعد یہ حال تھا کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ جیسے حافظ الحدیث اور احادیث کے بحر ناپیدا کنار اپنی تشنگی علم بجھانے کے لئے اتنی بار کوفہ گئے جس کو وہ اپنے محیر العقول حافظے کے باوجود شمار نہیں کر سکتے تو اسّی سال اس سے پہلے دور تابعین میں کوفے کے علم وفضل کا کیا حال رہا ہوگا۔
اس مبارک شہر میں ایک ہزار پچاس صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین جن میں ستّر اصحاب بدر اور تین سو بیعتِ رضوان کے شرکاء آکر آباد ہوئے تھے۔ جس بُرج میں یہ نجومِ ہدایت اکٹھے ہوں اس کی ضو فشانیاں کہاں تک ہوں گی اس کا اندازہ ہر ذی فہم کر سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ کوفہ کا ہر گھر علم کے انوار سے جگمگا رہا تھا۔ ہر ہر گھر دار الحدیث اور دار العلوم بن گیا تھا۔ حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ جس عہد میں پیدا ہوئے اس وقت کوفہ میں حدیث وفقہ کے وہ ائمہ مسندِ تدریس کی زینت تھے جن میں ہر شخص اپنی اپنی جگہ آفتاب و ماہتاب تھا۔ اور کوفہ کی یہ علمی خصوصیت صحاح ستّہ کے مصنفین کے عہد تک باقی رہی اور صحاح ستّہ کے اکثر شیوخ کوفہ کے ہیں۔

تحصیلِ علم

حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ابتدائی اور ضروری تعلیم دین حاصل کرنے کے بعد تجارت کی طرف متوجہ ہوگئے۔ ایک دن اسی سلسلہ میں بازار جارہے تھے راستہ میں امام شعبی رحؒ سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے آپ کے چہرے پر ذہانت اور سعادت کے آثار نمایاں دیکھے تو آپ کو بلایا اور پوچھا کہاں جارہے ہو؟ جواب دیا بازار جارہا ہوں۔ پوچھا علماء کی مجلس میں نہیں بیٹھتے! کہا نہیں فرمایا تم علماء کی مجلس میں بیٹھا کرو کیونکہ میں تمہارے چہرے پر علم وفضل کی درخشندگی کے آثار دیکھ رہا ہوں۔ امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات کے بعد امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے دل میں علوم دینیہ کو علیٰ وجہ الکمال حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ پہلے آپ نے علم کلام کو حاصل کرنا شروع کیا اور اس میں کمال حاصل کر کے گمراہ فرقوں مثلاً جہمیہ اور قدریہ عقائد کے حاملین سے گفتگو اور مناظرہ شروع کیا کچھ عرصہ اسی نہج پر کام کرتے رہے پھر خیال آیا کہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے زیادہ دین کا جاننے والا اور کون ہو سکتا تھا اس کے باوجود انھوں نے ذاتِ باری تعالیٰ اور اس کی صفات کے باریک مسائل اور جبر و قدر کی معرکہ آرا بحثوں میں حصّہ نہیں لیا۔ اس کے برخلاف شرعی اور فقہی مسائل میں ان کا التفات اور اشتغال زیادہ تھا۔ اگر مسائلِ کلامیہ میں غور وخوض کسی اہم اور بڑی خوبی کا حامل ہوتا تو یہ نفوسِ قدسیہ اس موضوع کو نہ چھوڑتے..........

اس خیال کے بعد آپ کی توجہ اس موضوع سے ہٹنے لگی۔ علوم فقہ حاصل کرنے کی طرف آپ کی توجہ یوں ہوئی کہ آپ نے ایک رات خواب دیکھا کہ آپ حضور انور صلے اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کھود رہے ہیں۔ تعبیر رؤیا کے بہت بڑے عالم اور امام محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ سے اس خواب کی تعبیر پوچھی گئی تو انہوں نے اس کی تعبیر یوں بیان کی کہ آپ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور سنن سے ایسے مسائل کا استخراج اور ایسے امور کی عقدہ کشائی کریں گے جو اس سے پہلے کسی نے نہیں کی ہوگی۔ اس تعبیر کو اشارۂ غیبی قرار دے کر امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے پوری توجہ اور استغراق سے علم فقہ کی تحصیل شروع کر دی۔

حضرت امام الائمہ سراج الامۃ نعمان بن ثابت رحمۃ اللہ علیہ تمام فقہاء اور مجتہدین کے رئیس، ماہرین حدیث کے امام اور استاذ، وارفتگان شوق کے قبلہ، عابدوں کے رہنما، زاہدوں کے قافلے کے سالار، صوفیوں کے پیشوا۔ الغرض نبوت و صحابیت کے بعد ایک انسان میں جس قدر محاسن اور فضائل ہو سکتے ہیں۔ وہ ان سب کے جامع بلکہ ان اوصاف میں سب کے لئے ہادی اور مقتدی تھے۔

امام ابو حنیفہؒ نے فقہ اسلامی کے جو اصول اور قوانین وضع کئے اس کو امت محمدیہ کی اکثریت نے قبول کیا اور اعزاز و افتخار کے ساتھ فقہ حنفی کے مقلد ہوئے بے شمار اصفیاء واتقیاء آپ کے مسلک کے مؤید بنے اور بے شمار محدثین اور محققین نے آپ کے اصول اور قواعد کے مطابق فقہی جزئیات کی توضیح اور تشریح کی۔ اور آج دنیا میں دو ثلث سے زیادہ مسلمانوں کی آبادی فقہ حنفی کے مطابق ہی اپنی عبادات اور معاملات پر عمل پیرا ہے۔

نام و نسب

آپ کا نام نعمان کنیت ابو حنیفہ اور لقب امام اعظم ہے شجرۂ نسب یہ ہے نعمان بن ثابت بن زوطی بن ماہ۔ شجرۂ نسب سے صاف ظاہر ہے کہ آپ عجمی النسل تھے۔ تاریخ بغداد میں خطیب بغدادی نے امام کے پوتے اسماعیل کی زبانی یہ روایت نقل کی ہے کہ میں اسماعیل بن حماد بن نعمان بن ثابت بن نعمان بن مرزبان ہوں۔ ہم لوگ فارس نسل سے ہیں اور کبھی کسی کی غلامی میں نہیں آئے۔ ہمارے دادا ابو حنیفہ (۸۰) اسی ہجری میں پیدا ہوئے۔ ثابت بچپن میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ انہوں نے ان کے خاندان کے حق میں دعائے خیر فرمائی تھی۔ ہم کو امید ہے کہ وہ دعا بے اثر نہیں رہی۔

مولد و مسکن

حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اسی ہجری کوفہ میں پیدا ہوئے۔ کوفہ کا نام آتے ہی لوگ چونک جاتے ہیں لیکن کوفہ کے مرکز علم ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے سفر کے بارے میں خود فرمایا ہے کہ دو بار مصر و شام جانے کا اتفاق ہوا۔ چار مرتبہ بصرہ گیا کوفہ اور بغداد اتنی بار گیا کہ ان کو شمار نہیں کر سکتا۔ اگر کوفے میں کچھ نہیں تھا تو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی کوفہ اتنی زیادہ آمد و رفت کیوں ہوئی؟ کیا امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کوفہ صرف غدر و بے وفائی کی تعلیم و تربیت کے لئے جاتے تھے۔ پھر یہ حالت کوفہ کی حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے تقریباً اسی سال بعد

کرنے کے لئے کچھ وقت بچ جائے۔ خبردار! بیوقوفوں اور جو فن مناظرہ سے واقف نہ ہوں اور اہل علم کے دلائل کو نہ سمجھیں طلب جاہ کے لئے کوشاں ہوں اور تمہارے شرمندہ کرنے کے لئے مسائل یاد کریں۔ اُن سے ہرگز بات نہ کرو، اس لئے کہ اگر وہ تمہیں حق بجانب سمجھیں گے تب بھی پرواہ نہ کریں گے۔ جب رؤسا کے پاس جاؤ تو ان سے بُلند اور بالا جگہ نہ بیٹھو، جب تک تم کو وہ اس جگہ نہ بٹھائیں۔ جب کسی قبیلہ میں پہونچو تو جب تک وہ تمہیں امام نہ بنائیں نماز نہ پڑھانا حمام میں صبح اور دوپہر کو داخل نہ ہو، تفریح گاہ میں نہ جاؤ مظالم سلطان پر حاضر نہ ہونا، ہاں جب یہ یقین ہو کہ تمہاری بات سُن لی جائے گی تو مضائقہ نہیں۔ خبردار! مجلس علم میں غضبناک نہ ہونا۔ عوام میں قصہ گوئی نہ کرنا، اس لئے کہ قصہ گو جھوٹ سے نہیں بچ سکتا۔ جب کسی اہل علم کے اعزاز میں کوئی مجلس علم منعقد کرو تو اس کے استقبال کے لئے بہ نفس نفیس خود حاضر ہونا، اور جو کچھ معلوم ہو بیان کرنا ورنہ نہیں تاکہ تمہاری موجودگی کی وجہ سے دھوکے میں مبتلا نہ ہوں اور آنے والے کو تم جیسا عالم تصوّر کریں حالانکہ وہ اس صفت سے موصوف نہ ہو گا جس کے تم مالک ہو کسی آدمی کو مسند درس پر نہ بٹھاؤ تاکہ وہ تمہارے سامنے درس دے بلکہ اپنے شاگردوں کو اس کے پاس چھوڑ دو تاکہ وہ اس کے علم کا امتحان لے سکیں، مجلس وعظ اور اس مجلس میں جسے تیرے اعزاز یا تیرے تزکیہ یا تیرے متعلقین ...... کے لئے منعقد کیا ہو نہ جانا (کیونکہ اس صورت میں صرف وہ آدمی ریا اور نمود کے لئے اور اظہار مشیخت کے لئے ایسا کر رہا ہے اس سے فائدہ نہ ہو گا) نکاح کے معاملات کو اپنے محلّہ کے نکاح خواں، اسی طرح عید اور جنازہ کی نماز کو اس کے مستحق کے لئے چھوڑ دو (کہ وہی نماز پڑھائے) جو آدمی تمہارے لئے دعا کرے اس کو فراموش نہ کرنا میری اس نصیحت کو قبول کرو جس کو میں نے تمہارے اور تمام مسلمانوں کی مصلحت اور فائدے کے لئے کہا ہے۔

دیگر زریں نصیحتیں

(۱) جس وقت اذان کی آواز آئے فوراً نماز کے لئے تیار ہو جاؤ (۲) روزہ اور تلاوت قرآن کی عادت ڈالو (۳) کبھی کبھی قبرستان کی طرف نکل جایا کرو (۴) لہو ولعب سے پرہیز کیا کرو (۵) پڑوسی کی کوئی برائی دیکھو تو پردہ پوشی کرو (۶) تقویٰ اور امانت کو فراموش مت کرو (۷) جس خدمت کے انجام دینے کی قابلیت نہ ہو اسے ہرگز مت قبول کرو (۸) اگر کوئی شخص شریعت میں کسی بدعت کا موجد ہو تو اس کی غلطی کا اعلانیہ اظہار کرو تاکہ عوام کو اس کی تقلید کی جرائت نہ ہو سکے (۹) تحصیل علم کو سب پر مقدم رکھو (۱۰) جو آدمی کچھ پوچھے تو صرف سوال کا جواب دے دو، اپنی طرف سے کچھ اضافہ مت کرو (۱۱) شاگردوں کے ساتھ ایسا برتاؤ کرو کہ دیکھنے والے ان کو تمہاری اولاد خیال کریں (۱۲) جو بات کہو خوب سوچ سمجھ کر کہو اور وہی کہو جس کا کافی ثبوت دے سکو۔

(مقدمہ مسند امام اعظم، مطبوعہ کراچی، از مولانا سعد حسن)

امام صاحبؒ کا حلیہ اور گفتگو

امام صاحبؒ کو خدا نے حسن سیرت کے ساتھ جمال صورت بھی دیا تھا۔ میانہ قد، خوش رو اور موزوں اندام تھے۔ گفتگو نہایت شیریں اور آواز بلند اور صاف تھی، کیسا ہی پیچیدہ مضمون ہو، نہایت صفائی اور فصاحت سے ادا کر سکتے تھے۔ مزاج میں تکلف تھا، اور اکثر خوش لباس رہتے تھے۔ کبھی کبھی سنجاب اور قاقم کے جبے بھی استعمال کرتے تھے۔ ابو مطیع بلخی ان کے شاگرد کا بیان ہے کہ میں نے ایک دن ان کو نہایت قیمتی چادر اوڑھے دیکھا، جن کی قیمت کم از کم چار سو ہوگی۔

ایک دن نصر بن محمد ان سے ملنے گئے، امام صاحبؒ کہیں باہر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ ان سے کہا کہ ذرا دیر کے لئے اپنی چادر مجھے دے دو۔ واپس آئے تو شکایت کی کہ ناحق تمہاری چادر لے کر مجھے شرمندہ ہونا پڑا۔ انہوں نے کہا کیوں؟ کہ فرمایا بہت گندہ ہے۔ نصر کہتے ہیں میں نے وہ چادر پانچ دینار کو خریدی تھی اور مجھ کو اس پر ناز تھا اس لئے امام صاحبؒ کی شکایت سے تعجب ہوا لیکن دوسرے موقع پر جب میں نے ان کو ایک چادر اوڑھے دیکھا جو تیس دینار سے کم قیمت کی نہ تھی تو وہ تعجب جاتا رہا۔

پڑوسی کی عیب پوشی کرنا، لوگوں کی پوشیدہ باتیں ظاہر نہ کرنا، جو تم سے مشورہ طلب کرے تو اپنے علم کے مطابق دینا۔

(حضرت امام اعظمؒ نے) فرمایا، میری وصیت کو قبول کرو اس کے ذریعہ موجودہ اور آنے والوں کو فائدہ پہونچے گا (انشاء اللہ تعالیٰ) فرمایا بخل سے پرہیز کرو، اس کے سبب سے مبغوض ہو جاتا ہے، جھوٹے اور لالچی نہ ہو بلکہ اپنی مروتوں کا تمام امور میں خیال رکھو، سفید لباس پہنو، اپنے کو حریص نہ ہونے کے لئے اپنے آپ کو ہر وقت غنی ظاہر کرو اگرچہ تم فقیر ہی کیوں نہ ہو صاحب ہمت ہو، اس لئے کہ دون ہمت کا مرتبہ کمزور ہوتا ہے جب راستہ میں چلو تو دائیں بائیں نہ دیکھو بلکہ نظر کو زمین پر قائم رکھو۔ جب حمام میں داخل ہو (یا مزدوروں سے کوئی کام کراؤ) تو اجرت میں اور لوگوں کی مساوات نہ کرو بلکہ دستور سے کچھ زیادہ دو تاکہ تمہاری شرافت ظاہر ہو اور وہ تمہاری عزت کریں، کوئی چیز پیشہ ور اور دستکار کے سپرد نہ کرو، بلکہ اس کے پاس رکھو جس پر تمہیں اعتماد ہو، غلہ وغیرہ کی ذخیرہ اندوزی نہ کرو۔ درہم کرو (دنانیر کو نہ تولو) روپیہ پیسہ کو شمار نہ کرو، بلکہ دوسروں پر اعتماد رکھو دنیا کی اہل علم کے لئے تحقیر کرو اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے پاس جو کچھ ہے بہتر ہے اپنے امور میں دوسروں کو شریک کرو، تاکہ علم حاصل

کو پیچھے سے پکارا جاتا ہے جب کلام کرو تو چیخ کر اور بلند آواز سے نہ کرو اور نہ زیادہ حرکت ہی کرو (جیسا کہ عام طور پر واعظین کی حالت ہاتھ پھینکنے کی ہوتی ہے)
لوگوں کے درمیان کثرت سے ذکر اللہ کرو، نماز کے بعد بھی کچھ وظیفہ پڑھا کرو، خصوصاً تلاوت قرآن ہر حال میں اللہ تعالیٰ کو یاد رکھو، اور اس کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہیں صبر اور شکر اور دوسری نعمتیں عنایت فرمائی ہیں۔ ہر مہینہ چند دن روزے بھی رکھا کرو تاکہ لوگ تمہاری اتباع کریں، نفس سے محاسبہ کرتے رہو، دوسروں کی حفاظت کرو تاکہ وہ تمہاری دنیا اور آخرت سے نفع اندوز ہو سکیں، ورنہ اللہ تعالیٰ کے یہاں تم سے سوال ہو جائے گا اپنے آپ کو سلطان کا مقرب ظاہر نہ کرو، کیونکہ اس صورت میں لوگ اپنی ضرورتوں کا تمہارے پاس ڈھیر لگا دیں گے اگر تم ان کے پورا کرنے کی سعی کرو گے تو تمہاری توقیر ہوگی اور اگر نہ پوری کر سکے تو لوگ تمہارا تمسخر کریں گے۔
خطا میں لوگوں کی اتباع مت کرو بلکہ صواب میں کرو، جب یہ معلوم ہو کہ کوئی شخص شریر ہے تو اس کے سامنے شر کا تذکرہ مت کرو، خیر کا تذکرہ ہو، ہاں دین کے معاملہ میں تم لوگوں کو خبردار کر دو تاکہ لوگ اس سے بچنے لگیں اور اس کی اتباع نہ کریں۔ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:
اذکروا الفاجر بما فیہ حتی یحذرہ الناس وان کان ذا جاہ ومنزلۃ۔
"فاجر میں جو عادتیں ہوں اس کو ظاہر کر دو تاکہ لوگ اس سے پرہیز کریں اگرچہ وہ فاجر صاحب اقتدار ہی کیوں نہ ہو"

اس لئے کہ اللہ تعالیٰ تمہارا اور دین کا ناصر و مددگار ہے اگر ایک مرتبہ ایسا کر دیا تو فجار تم سے ڈرنے لگیں گے اور کوئی بھی (اظہار بدعت پر دلیری نہ کر سکے گا۔ جب تم اپنے بادشاہ سے اپنے علم کے خلاف امر دیکھو تو اس کی اطاعت ملحوظ رکھتے ہوئے اس سے بیان کر دو۔ کیونکہ اس کا ہاتھ تمہارے ہاتھ سے قوی ہے۔ یوں بیان کرو کہ آپ حاکم ہیں ہم آپ کے تابع ہیں لیکن میں آپ کی ایک خصلت دیکھتا ہوں کہ جو علم دین کے موافق نہیں معلوم ہوتی ہے۔ پس اگر ایک مرتبہ بھی کہہ دیا ہے تو کافی ہے ورنہ بار بار ٹوکنے کی وجہ سے وہ تم پر غصہ ہو جائے گا جب تم ایک دو مرتبہ روک ٹوک کرنا چاہتے ہو تو تنہائی میں اس کے پاس جا کر نصیحت کرو، اگر اس کا رجحان طبع بدعت کی طرف مائل پاؤ تو کچھ مہلت دو اور کتاب وسنت سے متعلق تمہارے پاس جو علم ہے اس پر پیش کر دو۔ اگر وہ تم سے قبول حق کر لے تو فبہا، اور اگر انکار کر دے تو اللہ سے سوال کرو کہ وہ تمہاری حفاظت کرے۔
موت کو یاد رکھو اپنے اُستاذ کے لئے استغفار کرتے رہو تلاوت قرآن پر مداومت اور مقابر اور متبرک مقامات کی زیارت اکثر کرتے رہو۔ عوام الناس ہیں سے جو رویائے صالحہ دیکھیں یا خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھیں اس کو رد نہ کرو، فساق و فجار کے پاس نہ بیٹھو۔ ہاں تبلیغ دین کے لئے مضائقہ نہیں ہے کھیل کود اور سب وشتم سے پرہیز کرو، جب مؤذن اذان دے تو مسجد کے لئے تیاری کرو تاکہ عوام تم سے اس معاملہ میں سبقت نہ لے جائیں۔ بادشاہ کے پڑوس میں مکان نہ بنانا،

امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ

امام صاحبؒ کو طلبِ علم میں کسی سے عار نہ تھی۔ امام مالکؒ عمر میں ان سے تیرہ برس کم تھے، اُن کے حلقۂ درس
حلقۂ درس میں بھی اکثر حاضر ہوئے اور حدیثیں سُنیں۔ علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ امام مالکؒ
کے سامنے ابو حنیفہؒ اس طرح مؤدب بیٹھتے تھے، جس طرح شاگرد اُستاد کے سامنے بیٹھتا ہے۔ اس کو
بعض کوتاہ بینوں نے امام صاحبؒ کی کسرِ شان پر محمول کیا ہے لیکن ہم اس کو علم کی قدر شناسی اور شرافت کا
تمغہ سمجھتے ہیں۔ امام مالکؒ بھی اُن کا احترام کرتے تھے۔ عبداللہ بن مبارکؒ کی زبانی منقول ہے کہ میں امام
مالکؒ کی خدمت میں حاضر تھا۔ ایک بزرگ آئے، جن کی انھوں نے تعظیم کی اور اپنے برابر بٹھایا اُن کے جانے
کے بعد فرمایا: "جانتے ہو یہ کون شخص تھا۔ یہ ابو حنیفہ عراقیؒ تھے، جو اس ستون کو سونے کا ثابت کرنا چاہیں
تو کر سکتے ہیں۔ ذرا دیر کے بعد ایک اور بزرگ آئے، امام مالکؒ نے ان کی بھی تعظیم کی لیکن نہ اس قدر جتنی
ابو حنیفہؒ کی کی تھی وہ اٹھ گئے تو لوگوں سے کہا، یہ سفیان ثوریؒ تھے۔

کیونکہ اس صورت میں تمہاری زندگی تنگ ہو جائے گی جو طلباء تم سے فقہ حاصل کریں ان سے اولاد کی طرح برتا
کرنا کیونکہ اس سے ان کی رغبت فی العلم زیادہ ہوگی عوام اور بازاری لوگوں سے ہرگز جھگڑا نہ کرو، اس سے
تمہاری عزت ریزی ہوگی۔ حق بات کہنے سے بادشاہ کے سامنے بھی نہ چوکو جب تک تم دوسروں سے زیادہ عبا
نہ کرو، اپنے نفس پر مطمئن نہ ہونا اس لئے کہ عوام تمہیں زیادہ کرتے نہ دیکھیں گے تو خیال کریں گے تمہیں ب
علم سے اتنا فائدہ نہ ہوا جتنا انہیں اپنے جہل سے ہو گیا۔

جب تم اہل علم کی بستی میں جاؤ تو اس بستی کو اپنے لئے مخصوص نہ کر لینا کہ تم ہی تنہا اس میں صاحب ا
ہو بلکہ اور اہل علم کی طرح رہو تا کہ وہ خیال کریں کہ تم کو ان کے مراتب سے کوئی غرض نہیں ہے ورنہ وہ س
مل کر تمہیں نکالنے کی کوشش کریں گے اور تمہارے مسلک میں طعن کر شروع کر دیں گے اور تم بلا وجہ مع
ہو کر رہ جاؤ گے اگر تم سے وہ استفتاء کریں تو جواب بلا دلیل بیان نہ کرو ان کے اساتذہ میں بھی عیب
عوام سے پرہیز اور اللہ تعالیٰ سے ظاہراً و باطناً یکساں معاملہ رکھو، کیونکہ ایسا کرنے سے تمہارے ا
قابلیتِ علم پیدا ہوگی۔

بادشاہ تمہارے سپرد جب کوئی کام کرے تو اس وقت تک اس کو قبول نہ کرو جب تک اس
قابلیت تمہارے اندر نہ ہو جہاں نظر لگنے کا اندیشہ ہو کلام نہ کرو کیونکہ اگر نظر لگ گئی تو کلام میں خلا
ہو جائے گا اور زبان بوجھل ہو جائے گی۔ کثرتِ ضحک سے پرہیز کرو کیونکہ اس سے قلب مر جاتا ہے
میں وقار اور طمانیت سے چلو، امور میں جلد بازی نہ کرو، جو تمہیں پیچھے سے پکارے جواب نہ دو کیونکہ

عوام کے سامنے زیادہ ہنسنے سے بھی پرہیز کرنا چاہیئے۔ بازاروں میں بھی زیادہ نہیں جانا چاہیئے اور امرد لڑکوں سے بھی بات نہ کرو کیونکہ وہ فتنہ ہوتے ہیں ہاں بچوں سے کلام کرنے اور ان کے سروں پر ہاتھ پھیرنے میں مضائقہ نہیں۔

مشائخ اور عوام کے ساتھ سڑکوں پر بھی نہ چلو۔ اگر تم ان سے آگے چلے تو اُن کی تحقیر اور وہ تم سے آگے چلے تو تمہاری تحقیر ہوگی کیونکہ وہ تم سے عمر میں بڑے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

• من لم یرحم صغیرنا ولم یؤقر کبیرنا لیس منا ۔ "جس نے ہمارے چھوٹوں پر شفقت اور بڑوں کی تعظیم نہ کی ہم میں سے نہیں ہے۔"

دیکھو شاہراہ پر ہرگز نہ بیٹھنا ہاں اگر ضرورت ہو تو مسجدوں میں بیٹھو، بازاروں اور مسجدوں میں کھانے پینے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ سقایہ سے سقوں کے ہاتھ سے پانی نہ پینا (کیونکہ معلوم نہیں کہ سقایہ میں کچھ پڑا ہو یا پانی زیادہ دنوں سے ٹھہرا ہو۔)

دیکھو! دکان پر نہ بیٹھو اور زیورات اور ریشمیں کپڑا نہ پہنو، کیونکہ اس سے رعونت پیدا ہوتی ہے۔

وقت فراش اپنی بیوی سے زیادہ بات چیت نہ کرو، ہاں بقدر ضرورت مضائقہ نہیں، اس سے زیادہ بوس وکنار بھی نہ کرو، ہاں اس سے صحبت کرو تو اللہ کا نام لے کر کرو اپنی عورت کے سامنے غیر عورت کا تذکرہ نہ کرو، کیونکہ اگر تم نے ایسا کیا تو وہ غیر مردوں کا تذکرہ تمہارے سامنے شروع کر دے گی۔ بیوہ اور ماں باپ، بال بچے والی عورت سے نکاح مت کرو، کیوں اس کے ساتھ کہ اس کے اقارب تمہاری اجازت سے تمہارے گھر آجا سکیں (کیونکہ عام طور سے ایسی عورت کو دوسرے خاوند سے زیادہ ہمدردی نہیں ہوتی لہٰذا وہ اس کے گھر کا سامان اپنے ماں باپ اور اولاد کو چوری سے دے دے گی) اور حتی الامکان اپنی سسرال میں بھی نہ رہو۔ خبردار اپنی سسرال میں اپنی بیوی سے ہرگز صحبت نہ کرنا، کیونکہ تم اس صورت میں ہیچ جاؤگے اور وہ اس سے فائدہ اٹھا کر تمہارا مال مُفت میں اڑائیں گے، خبردار! اولاد والی عورت سے ہرگز شادی نہ کرنا، کیونکہ وہ تمہارا سب مال ان کو کاٹ کاٹ کر دے دے گی، کیونکہ تم سے زیادہ اُسے اپنی اولاد محبوب ہوگی ایک گھر میں دو سوکنوں کو بھی نہ رکھنا، اس وقت تک نکاح نہ کرنا جب تک تم اس قابل نہ ہو جاؤ کہ اس کی تمام ضروریات زندگی پوری کر سکو۔ پہلے علم طلب کرو، پھر حلال طریقہ سے مال جمع کرو پھر شادی کرو اس لئے کہ اگر تحصیل علم کے وقت تم نے مال فراہم کرنا شروع کر دیا تو تحصیل علم سے رک جاؤگے اپنے مال سے باندیاں غلام نہ خریدو کیونکہ پھر تم ان کی ہی الجھنوں میں پھنس جاؤگے اور تمہارا وقت ضائع ہوگا اور علم سے کورے رہ جاؤگے۔ عنفوان شباب میں فارغ القلب ہوکر علم حاصل کرو۔

اللہ تعالےٰ سے تقویٰ اور ادائے امانت اور ہر خاص وعام کو نصیحت کرنا اپنے اوپر لازم کرلو، کسی انسان کو ذلیل اور اپنے کو باعزت نہ سمجھو، عوام سے زیادہ اختلاط نہ رکھو، البتہ بقدر تعلیم وتعلم کچھ حرج نہیں، اس لئے کہ اگر کوئی ان میں سے اہل ہے تو تحصیل علم میں لگ جائے گا ورنہ تم سے محبت کرنے لگے گا، عوام سے اُمور دینیہ میں مشورہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے جب کبھی تم سے کوئی فتویٰ دریافت کیے تو بقدر سوال جواب دو، ضرورت سے زیادہ نہ بتلانا، اگر تم دس سال بھی غریب اور فاقہ مست رہو تو علم سے ہرگز اعراض نہ کرو،

یہ وصیت امام ابوحنیفہؒ نے امام ابویوسفؒ کو آخری وقت میں فرمائی تھی۔ علامہ ابن نجیم نے اپنی مایۂ ناز کتاب الاشباہ والنظائر میں اس کو ذکر کیا ہے اسی جگہ سے اس پورے وصیت نامہ کا ترجمہ پیش کیا جارہا ہے علامہ شبلیؒ نے بھی اپنی کتاب سیرت النعمان میں اس وصیت کو ذکر کیا ہے لیکن وہ وصیت نامہ مکمل نہیں ہے۔

آپ نے فرمایا اے یعقوب (نام امام ابویوسف) بادشاہ کی عزت کر، اور اس کو بڑا سمجھ اور بادشاہ کے سامنے جھوٹ بولنے اور جابے جا وقت اس کے پاس آنے جانے سے گریز کر، ہاں ضرورت کے وقت کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ کثرت آمد و رفت سے وہ تجھ سے بے پروائی برتے گا اور تجھے حقیر سمجھے گا، تو اس سے اس طرح منتفع ہو جس طرح آگ سے (بقدر ضرورت انتفاع کیا جاتا ہے) اس وجہ سے کہ بادشاہ جیسا اپنے آپ کو سمجھتا ہے دوسرے کو خیال نہیں کرتا، اور بادشاہ کے سامنے کثرت کلام سے بھی گریز کرنا، کیونکہ وہ اس پر گرفت کر سکتا ہے۔ اس صورت میں وہ اپنے حاشیہ نشینوں کے تئیں اپنے کو اعلم اور تجھے مخطی اور کم درجہ ثابت کر دے گا، جس وقت بادشاہ کے پاس ہو تو یہ ملحوظ خاطر رہے کہ وہ تیرے اور غیر کے مرتبہ میں امتیاز کرنے والا ہو ایسے وقت نہ داخل ہونا کہ اس کے پاس ایسے اہل علم ہوں جو تیرے مقام سے نا آشنا ہوں اگر وہ تجھ سے کم درجہ ہیں تو اپنے آپ کو بڑے درجہ کا ثابت کریں گے اور تجھے نقصان پہونچائیں گے اور تجھے بادشاہ کی نظر سے گرانے کی کوشش کریں گے۔

جس وقت بادشاہ اپنے معاملات میں سے کوئی معاملہ تیرے سامنے پیش کرے تو یہ ملحوظ خاطر رہے۔ اس وقت اپنی رائے ظاہر کر تاکہ علم اور حکم میں وہ تیرے مذہب اور فیصلے کو پسند کرے ورنہ حکومت کے معاملہ میں تمہیں غیر کے مسلک پر عمل کرنا پڑ جائے گا بادشاہ کے احباب اور خدام سے دوستی قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہے ہاں وقت ضرورت ان سے ملاقات میں کچھ حرج نہیں ہے لیکن خداموں سے دوری ہی بہتر ہے اس طرح تمہارا وقار باقی رہے گا۔

عوام کے سامنے قطعاً کلام کرنے کی ضرورت نہیں ہے ہاں جتنا وہ تم سے دریافت کریں کیونکہ زیادہ کلام سے وہ یہ محسوس کریں گے کہ کہیں تم ان کے اموال کی طرف تو راغب نہیں ہو اور رشوت تو نہیں لینا چاہتے ہو؟

کی بدولت سے اجتہاد اور استنباط میں وہ درجہ حاصل کیا ہے جس کو دوسرے لوگ سمجھ نہیں سکتے۔ اور اُن کے مجتہدات کو دقت معانی کے باعث کتاب وسنّت کے مخالف جانتے ہیں اور ان کو اور ان کے اصحاب کو "اصحاب الرائے" خیال کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ ان کی حقیقت و درایت تک نہ پہونچنے اور ان کے فہم وفراست پر اطلاع نہ پانے کا نتیجہ ہے۔ امام شافعی علیہ الرحمۃ کہ جنھوں نے اُن کی فقاہت کی باریکی سے تھوڑا سا حصّہ حاصل کیا ہے۔ فرمایا ہے الفقہاء کلّھم عیال ابی حنیفہ' فقہا رسب کے سب ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کے عیال ہیں ان کم ہمتوں کی جرأت پر افسوس ہے کہ اپنا قصور دوسروں کے سر لگاتے ہیں۔

قاہرے گر کنند ایں طائفہ راطعن وقصور

حاش للہ کہ برآرم بزباں ایں گلہ را

ہمہ شیران جہاں بستہ ایں سلسلہ اند

روبہ از حیلہ چساں بگسلد ایں سلسلہ را

" یہ جو خواجہ محمد پارسا علیہ الرحمۃ نے " فصول ستہ " میں لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام نزول کے بعد امام ابو حنیفہ علیہ الرحمۃ کے مذہب کے موافق عمل کریں گے۔

ممکن ہے کہ اسی مناسبت کے باعث جو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے ساتھ ہے لکھا ہو یعنی روح اللہ کا اجتہاد امام اعظم رضی اللہ عنہ کے اجتہاد کے موافق ہوگا۔ نہ یہ کہ ان کے مذہب کی تقلید کریں گے۔ کیونکہ حضرت روح اللہ علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی شان اس سے برتر ہے کہ علمائے اُمّت کی تقلید کریں۔"

○ بلا تکلّف وتعصب کہا جاتا ہے کہ اس مذہب حنفی کی نورانیت کشفی نظر میں دریائے عظیم کی طرح دکھائی دیتی ہے اور دوسرے تمام مذہب حوضوں اور نہروں کی طرح نظر آتے ہیں۔ اور ظاہر میں بھی جب ملاحظہ کیا جاتا ہے تو اہلِ اسلام سے سوادِ اعظم یعنی بہت سے لوگ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے تابعدار ہیں۔ یہ مذہب باوجود بہت سے تابعداروں کے اصول وفروع میں تمام مذہبوں سے الگ ہے اور استنباط میں اس کا طریق علیحدہ ہے اور یہ معنی اس کی حقیقت یعنی حق ہونے کا پتہ بتاتے ہیں۔"

○ بڑے تعجّب کی بات ہے کہ امام ابو حنیفہ علیہ الرحمۃ سنّت کی پیروی میں سب سے آگے ہیں حتیٰ کہ احادیث مرسل کو احادیث مسند کی طرح متابعت کے لائق جانتے اور اپنی رائے پر مقدم سمجھتے ہیں اور ایسے ہی صحابہؓ کے قول کو حضرت خیر البشر علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی شرف صحبت کے باعث اپنی رائے پر مقدم جانتے ہیں۔ دوسروں کا حال ایسا نہیں۔ پھر بھی مخالف ان کو صاحب رائے کہتے ہیں۔ اور بہت بے ادبی کے الفاظ اُن کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ حالانکہ سب لوگ ان کے علم وورع وتقویٰ کا اقرار کرتے ہیں، حق تعالیٰ ان لوگوں کو توفیق دے کہ دین کے سردار اور اہل اسلام کے رئیس کو بیزار نہ کریں اور اسلام کے سوادِ اعظم کو ایذا نہ دیں۔ یریدون ان یطفؤا نور اللہ ...

وہ لوگ جو دین کے ان بزرگواروں کو صاحب رائے جانتے ہیں، اگر یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ یہ بزرگوار صرف اپنی رائے پر ہی حکم کرتے تھے اور کتاب وسنّت کی متابعت چھوڑ دیتے تھے تو ان کے فاسد خیال کے مطابق اسلام کا ایک سوادِ اعظم گمراہ، بدعتی بلکہ گروہِ اسلام سے باہر ہے۔ اس قسم کا اعتقاد وہ بیوقوف

تقلید کے بارے میں

ان علوم سے جو کتاب وسنت سے حاصل ہوتے ہیں وہی معتبر ہیں جو ان بزرگواروں نے کتاب و سنت سے اخذ کئے ہیں اور سمجھے ہیں کیونکہ ہر بدعتی اور گمراہ بھی اپنے خیال فاسد میں کتاب وسنت ہی سے اخذ کرتا ہے پس ان کے مفہومہ معانی میں سے ہر معنی پر اعتبار نہ کرنا چاہیئے۔ (مکتوب ۱۹۳ دفتر اول)

"جس طرح کتاب وسنت کے موافق اعتقاد کا درست کرنا ضروری ہے اسی طرح ان کے موافق جیسے کہ علمائے مجتہدین نے کتاب وسنت سے استنباط فرمایا ہے اور احکام حلال وحرام وفرض وواجب ومستحب ومکروہ ومشتبہ ان سے نکالے ہیں ان کا علم بھی ضروری ہے۔ مقلد کو لائق نہیں کہ مجتہد کی رائے کے برخلاف کتاب وسنت سے احکام اخذ کرے اور ان پر عمل کرے۔ اسے چاہیئے عمل کرنے میں اس مجتہد کے مذہب سے جس کا وہ تابع ہے قول مختار کو اختیار کرے اور رخصت سے اجتناب کرکے عزیمت پر عمل کرے اور جہاں تک ہو سکے مجتہدین کے اقوال جمع کرنے میں کوشش کرے تاکہ متفق علیہ قول پر عمل واقع ہو۔

(مکتوب ۲۸۶ دفتر اوّل)

"احکام شرعیہ کے ثابت کرنے میں معتبر کتاب وسنت ہیں اور مجتہدوں کا قیاس اور اجماع امّت بھی حقیقت میں احکام کے مثبت ہیں۔ ان چار شرعی دلیلوں کے سوا اور کوئی ایسی دلیل نہیں جو احکام شرعیہ کو ثابت کر سکے، الہام حل وحرمت کو ثابت نہیں کرتا اور باطن والوں کا کشف فرض وسُنّت کو ثابت نہیں کرتا۔ ولایت خاصہ والے لوگ اور عام مؤمنین مجتہدوں کی تقلید میں برابر ہیں، اُن کے کشف والہام ان کو زیادتی نہیں بخشتے اور تقلید سے باہر نہیں نکالتے۔ حضرت ذوالنونؒ، حضرت بسطامیؒ اور حضرت جنید وشبلی رحمۃ اللہ علیہم زید وعمرو وخالد کے ساتھ جو عوام مومنین میں سے ہیں، احکام اجتہادیہ میں مجتہدوں کی تقلید کرنے میں مساوی وبرابر ہیں' ہاں ان بزرگوں کی زیادتی اور امور میں ہے۔ کشف ومشاہدات کے صاحب اور تجلیات وظہورات کے مالک یہی لوگ ہیں" (مکتوب ۵۵ دفتر دوم)

○ "اگر کوئی کہے کہ ہم دلیل کے برخلاف علم رکھتے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ حل وحرمت کے اثبات میں مقلد کا علم معتبر نہیں ہے۔ اس بارے میں مجتہدین کا ظن معتبر ہے۔ مجتہدین کے دلائل کو مکڑی کی تار سے زیادہ سُست کہنا بڑی جرأت ودلیری کا کام ہے۔ اور اپنے علم کو ان بزرگوں کے علم پر ترجیح دینا حنفیہ کے ظاہر اصول کو باطل کرنا اور روایت معتبرہ مفتیٰ بہا کو درہم برہم کرنا اور شاذونادر کہنا ہے، یہ بزرگوار عہد کے قریب ہونے اور علم وورع اور تقویٰ کے زیادہ حاصل ہونے کے باعث احادیث کو ہم دورافتادوں کی نسبت بہتر جانتے تھے۔ اور ان کے صحت وسقم نسخ اور عدم نسخ کو ہم سے زیادہ پہچانتے تھے

(مکتوب ۳۱۲ دفتر اوّل)

مقام امام اعظمؒ

"حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کی مثال حضرت امام اعظم کوفی رحمۃ اللہ علیہ کی سی ہے جنھوں نے ورع وتقویٰ کی برکت اور سنت کی متابعت

امام الائمہ کاشف الغمہ، سراج الامہ حضرت ابو حنیفہ نعمان بن ثابت المعروف بہ امام اعظمؒ مشہور روایت کے مطابق ۸۰ھ کو پیدا ہوئے (وفیات الاعیان جلد ۵ ص ۴۱۳) حضرت ابو نعیم سے بھی یہی منقول ہے۔

آپ نسلاً فارسی تھے، حضور نبی اکرم رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پاک میں آپ کی ذات گرامی کی طرف اشارہ موجود ہے: لو کان الایمان عند الثریا لتناولہ رجال من فارس "اگر ایمان ثریا کے قریب بھی ہوا تو فارس کے لوگ اسے حاصل کرلیں گے" (بخاری و مسلم) مسلم کی روایت ہے لو کان الایمان عند الثریا لذھب بہ رجل من ابناء فارس حتی یتناولہٗ "اگر ایمان ثریا کے قریب بھی ہوا تو فارس کے فرزندوں میں سے ایک شخص اسے حاصل کرلے گا۔" امام ابو نعیم نے حلیۃ الاولیاء میں لو کان العلم بالثریا کے الفاظ تحریر کئے ہیں۔ آپ کے والد ماجد حضرت ثابت علیہ الرحمۃ حضرت علی المرتضیٰؓ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو انہوں نے ان کے حق میں دعائے خیر فرمائی۔ (عقود الجمان فی مناقب النعمان)

آپ تابعی ہیں۔ اس حقیقت کو علامہ ذہبی علیہ الرحمہ نے مناقب الامام ابی حنیفہؒ امام سیوطیؒ نے تبییض الصحیفہ میں، امام ابن حجر ہیتمی نے الخیرات الحسان میں صراحت سے نقل کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت امام اعظمؒ کو ایسے کمالات و مقامات سے نوازا کہ آپ کے دور سے لیکر آج تک کوئی بڑے سے بڑا انسان آپ کا ہم پلہ نہیں فما فی المشرقین لہٗ نظروا لا بالمغربین ولا بکوفہ علم و فضل ہو یا زہد و تقویٰ، غرض جس پہلو کو دیکھیں آپ بے مثال نظر آتے ہیں، اس کی دلیل امر سے بھی ظاہر ہے کہ امت مسلمہ کے جلیل القدر علماء اور عظیم المرتبت صوفیہ نے ان کے اجتہاد کی روشنی میں اپنے عقاید و اعمال کے زاویے استوار کئے اور ان کی تقلید کے ڈورے کو اپنے گلوں کا زیور قرار دیا۔ زیر نظر مضمون میں صرف حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہ کے تاثرات قدسیہ کو نقل کرنے کا ہی شرف حاصل کرتے ہیں جو آپ نے اپنے امام ذیشان کی شان میں بیان فرمائے۔ وما توفیقی الا باللہ۔

امام ابو حنیفہ رح کا ہے اور اس پر میں نے تمام انسانوں کا اتفاق پایا ہے۔"

امام مزنی رحمۃ اللہ علیہ

آپ امام شافعی رح کے شاگرد رشید ہیں فرماتے ہیں: "علم کے چار حصوں میں سے تین حصے تو علماء نے امام ابو حنیفہ رح کے لئے خاص کئے ہیں اور ایک حصہ باقی تمام علماء کے لئے رکھا ہے۔"

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ

آج کل تو امام ابن تیمیہ کو عالم اسلام میں جو مقام حاصل ہے وہ محتاج تعارف نہیں ہندوستان اور بیرون ہندوستان میں ان کو شیخ الاسلام کے خطاب سے یاد کیا جاتا ہے ابتداء میں امام احمد بن حنبل کے مقلد تھے لیکن تیزیٔ طبع کی وجہ سے ان کی تقلید کے قلادے کو گردن سے اتار دیا اور آزاد روش اختیار کی۔ اس آزادیٔ طبع کی بنا پر آج کل یہ ہندوستان، پاکستان اور خصوصاً مصر میں بہت مقبول نظر آتے ہیں امام صاحب رح کے بارے میں فرماتے ہیں:-

"امام ابو حنیفہ رح سے اگرچہ بعض لوگوں کو اختلاف رہا ہے لیکن اُن کی فہم اور فقہ میں کوئی شک نہیں کر سکتا کچھ لوگوں نے ان کی تذلیل کے لئے اُن کی طرف ایسی باتیں منسوب کی ہیں جو بالکل جھوٹ ہیں۔"

مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ

شیخ احمد سرہندی رح ہزارہ دوم کے مجدد فرماتے ہیں: "بانی فقہ ابو حنیفہ است و سہ حصہ از فقہ او را مسلم داشتہ اند و در ربع باقی ہمہ شرکت دارند۔ در فقہ خانہ او ست و دیگراں ہمہ عیال وے۔"

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ

حضرت شاہ صاحب رح کی شخصیت محتاج تعارف نہیں آج یورپ اور امریکہ بھی ان کے علوم و معارف کا لوہا مان رہا ہے۔ فرماتے ہیں:

"مجھے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بتلایا کہ مذہب حنفی میں ایک بہترین طریقہ ہے اور وہ بہت موافق ہے اس طریقہ مسنونہ کے جو کہ مدون اور منقح کیا گیا ہے بخاری اور اس کے اصحاب کے زمانے میں۔"

امام صاحبؒ کے عام معمولاتِ یومیہ

معمول تھا کہ صبح کی نماز کے بعد مسجد میں درس دیتے دُور دُور سے استفتے آئے ہوئے ہوتے۔ ان کے جواب لکھتے پھر تدوین فقہ کی مجلس منعقد ہوتی بڑے بڑے نامور شاگردوں کا مجمع ہوتا۔ جو مسائل اتفاق رائے سے طے ہوتے قلم بند کرلئے جاتے، نماز ظہر پڑھ کر گھر آتے، گرمیوں میں ہمیشہ ظہر کے بعد تے۔ نماز عصر کے بعد کچھ دیر تک درس و تعلیم کا مشغلہ رہتا، باقی وقت دوستوں کے ملنے ملانے روں کی عیادت، ماتم پرسی اور غریبوں کی خبر گیری میں صرف ہوتا، مغرب کے بعد پھر درس کا سلسلہ روع ہوتا اور عشاء تک رہتا۔ نماز عشاء پڑھ کر عبادت مشغول ہوتے اور اکثر رات بھر نہ سوسکتے ڑوں میں مغرب کے بعد مسجد ہی میں سو رہتے اور قریباً دس بجے اُٹھ کر نماز عشاء پڑھتے۔ پھر تمام ات تہجد اور درود وظائف میں گذرتی کبھی کبھی دکان پر بیٹھتے اور وہیں یہ تمام مشاغل انجام پاتے۔

امام شافعی رحمۃُ اللہ علیہ

صاحب مسلک ائمہ اربعہ میں سے ہیں اور امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے شاگرد ہیں۔ فرماتے ہیں:۔
(۱) سب کے سب فقہ میں امام ابو حنیفہؒ کی عیال ہیں (۲) جو شخص امام ابو حنیفہؒ کی کتابوں کو نہ دیکھے وہ عالم بتحر نہیں ہوسکتا۔

مسعر بن کدام رحمۃُ اللہ علیہ

محدثین میں نہایت اُونچے مقام کے مالک ہیں۔ صحاح ستہ میں آپ کی سند سے روایات موجود ہیں امام شعبہ او امام سفیان ثوری آپ کو میزان عدل کہا کرتے تھے۔ امام صاحبؒ کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:۔
"جو شخص اپنے اور خدا کے درمیان امام صاحبؒ کو وسیلہ بنائے گا اور ان کے مذہب پر چلے گا میں امید کرتا ہوں اس کو خوف نہ ہوگا۔"

یحییٰ ابن معین رحمۃُ اللہ علیہ

جرح اور تعدیل کے مشہور امام ہیں امام صاحبؒ کے بارے میں فرماتے ہیں: "قراۃ تو امام حمزہ کی ہے اور

سب سے بڑے عالم ہیں۔ فرماتے ہیں۔

(۱) وہ شخص محروم ہے جس کو امام ابو حنیفہؒ کے علم سے حصہ نہیں ملا (۲) خدا اس شخص کا برا کرے جو ہمارے شیخ ابو حنیفہؒ کا ذکر برائی سے کرے۔ اگر امام صاحبؒ تابعین کے ابتدائی دور میں ہوتے تو وہ بھی سب ان کا اتباع کرتے (۳) اگر میں امام صاحبؒ سے ملاقات نہ کرتا تو میں بھی حدیث کے نقالوں کی طرح ہوتا (۴) اگر مجھے افراط کلام کا الزام نہ دیا جائے تو میں امام ابو حنیفہ پر کسی کو ترجیح نہ دوں گا۔

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ

آپ امام ابو حنیفہؒ کے تلمیذ اکبر اور خلافت عباسیہ کے قاضی القضاۃ ہیں فرماتے ہیں:۔ (۱) میری آرزو ہے کہ مجھے جمال ابن ابی لیلیٰ کا اور زہد مسعر بن کدامؒ کا اور فقہ امام ابو حنیفہؒ کا مل جائے (۲) رائے تو امام ابو حنیفہؒ کی ہے ہم تو ان کی عیال ہیں (۳) امام ابو حنیفہؒ کے علم پر سب کو اتفاق ہے اور ہماری مثال تو ان کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسی نہر فرات کے مقابلے میں چھوٹے نالے کی۔

سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ

آپ مشہور محدث، امام بخاریؒ، امام حمیدیؒ کے استاذ ہیں اور امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد ہیں۔ فرماتے ہیں:۔ "دو چیزیں ایسی تھیں کہ ابتدا میں جن کے متعلق یہ خیال تھا کہ وہ کوفہ کے پل سے آگے نہ بڑھ سکیں گی۔ حمزہ کی قرات اور امام ابو حنیفہؒ کا فقہ مگر یہ دونوں آفاق میں پہونچ چکی ہیں"

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ

صاحب مسلک ائمہ اربعہ میں سے ہیں ان کی موطا، بخاری شریف سے پہلے اصح الکتب شمار ہوتی تھی۔ امام ابو حنیفہؒ کے بارے میں فرماتے ہیں:

(۱) امام ابو حنیفہؒ اپنی قوت استدلال سے پتھر کے ستون کو سونے کا ثابت کر سکتے ہیں (۲) ایک دفعہ امام مالک اور امام ابو حنیفہؒ میں علمی مذاکرہ ہوا۔ جب امام مالک مجلس سے اٹھے تو اپنے تلامذہ سے فرمایا امام ابو حنیفہ کو کیا سمجھتے ہو وہ تو بڑے فقیہ ہیں۔

امام مالک صاحبؒ ہر سال جب موسم حج آتا تو امام ابو حنیفہؒ کی مدینہ منورہ میں آمد کا انتظار کیا کرتے تھے جب امام صاحبؒ پہونچتے تو ہمیشہ ان کے پیچھے پیچھے چلا کرتے تھے۔

امام صاحبؒ کی ذکر و عبادت

نہایت مرتاض اور زاہد تھے، ذکر و عبادت میں اُن کو مزہ آتا تھا۔ اور بڑے ذوق و خلوص سے ادا کرتے تھے۔ اس باب میں ان کی شہرت ضرب المثل ہوگئی تھی، علامہ ذہبی نے لکھا ہے کہ اُن کی پرہیزگاری اور عبادت کے واقعات تواتر کی حد تک پہونچ گئے ہیں۔" اکثر نماز میں یا قرآن پڑھنے کے وقت رقت طاری ہوتی اور گھنٹوں رویا کرتے۔ ابراہیم بصری کا بیان ہے کہ ایک دفعہ نماز فجر میں امام ابوحنیفہ کے ساتھ شریک تھا امام نماز نے یہ آیت پڑھی وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ یعنی خدا کو ظالموں کے کردار سے بے خبر نہ سمجھنا، امام ابوحنیفہؒ پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ سارا بدن کانپنے لگا، زائدہ کہتے ہیں کہ مجھ کو ایک ضروری مسئلہ دریافت کرنا تھا۔ امام ابوحنیفہؒ کے ساتھ نماز عشاء میں شریک ہوا۔ اور منتظر رہا کہ نوافل سے فارغ ہوں تو دریافت کروں۔ وہ قرآن پڑھتے پڑھتے اس آیت پر پہونچے، وَوَقٰنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ بار بار اس آیت کو پڑھتے تھے، یہاں تک کہ صبح ہوگئی اور وہ یہی آیت پڑھتے رہے، ایک بار نماز میں آیت پڑھی بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمَرُّ۔ یعنی قیامت گناہگاروں کا وعدہ گاہ اور قیامت سخت مصیبت کی چیز اور ناگوار چیز ہے۔" اسی آیت میں رات ختم ہوگئی۔ بار بار پڑھتے تھے اور روتے جاتے تھے۔

یزید بن کمیت ایک مشہور عابد اور امام صاحبؒ کے ہمعصر تھے ان کا بیان ہے کہ میں ایک دفعہ نماز عشاء میں امام ابوحنیفہؒ کے ساتھ شریک تھا۔ امام نماز نے اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ پڑھی لوگ نماز پڑھ کر چلے گئے۔ میں ٹھہرا رہا، امام ابوحنیفہؒ کو دیکھا کہ ٹھنڈی سانسیں بھر رہے ہیں، یہ دیکھ کر میں اٹھ آیا کہ ان کے اوقات میں خلل نہ ہو۔ صبح کو مسجد میں گیا تو دیکھا کہ غمزدہ بیٹھے ہیں، ڈاڑھی ہاتھ میں ہے اور بڑی رقت سے کہہ رہے ہیں کہ اے وہ جو ذرہ بھر نیکی اور ذرہ بھر بدی دونوں کا بدلہ دے گا۔ اپنے غلام نعمان کو آگ سے بچانا۔"

ایک دن بازار میں چلے جاتے تھے ایک لڑکے کے پاؤں پر پاؤں پڑ گیا چیخ اٹھا اور کہا تو خدا سے نہیں ڈرتا۔ امام کو غش آگیا مسعر بن کدام ساتھ تھے۔ انہوں نے سنبھالا، ہوش میں آئے تو پوچھا کہ ایک لڑکے کی بات پر اس قدر بے قرار ہوجانا کیا تھا۔" فرمایا" کیا عجب کہ اس کی آواز غیبی ہدایت ہو۔"

عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ

آپ امیر المؤمنین فی الحدیث اور امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد ہیں۔ بخاری و مسلم میں آپ کی سند سے سینکڑوں حدیثیں موجود ہیں۔ امام بخاریؒ نے آپ کے متعلق اپنے رسالہ رفع یدین میں فرمایا ہے۔ ابن مبارک اپنے زمانے کے

کے سب سے بڑے عالم تھے۔"

محدّث ابنِ داؤد رحمۃ اللہ علیہ

مشہور محدث ہیں فرماتے ہیں:" اہلِ اسلام پر نماز میں امام ابو حنیفہ رحؒ کے لئے دعا کرنی لازم ہے، کیونکہ انہوں نے دوسروں کے لئے سنن و آثار کو محفوظ کر دیا۔ جب کوئی آثار یا حدیث کا قصد کرے تو اس کے لئے سفیان ہیں اور اگر کوئی ان کی باریکیوں کو معلوم کرنا چاہے تو ابو حنیفہ ہیں۔

مکّی بن ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ

آپ امام بخاری رحؒ کے اُستاذ ہیں۔ فرماتے ہیں امام ابو حنیفہ رحؒ اپنے زمانے کے سب سے بڑے عالم زاہد تھے۔ میں کوفہ کے علماء کی مجلس میں بیٹھا ہوں۔ میں نے ان میں سے کسی کو امام صاحب رحؒ سے زیادہ متورع نہیں پایا۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ

آپ صاحبِ مسلک ائمہ اربعہ میں سے ہیں۔ حدیث میں مقام رفیع کے مالک ہیں۔ آپ کی جرح و تعدیل پر سب کا اتفاق ہے۔ فرماتے ہیں:" امام ابو حنیفہ رحؒ زہد تقویٰ اور علم میں اس جگہ ہیں کہ کوئی اس مقام کو نہیں پہونچ سکا۔"

امام شعرانی رحمۃ اللہ علیہ

ایک بڑے محدّث اور اپنے وقت کے امام ہیں۔ فرماتے ہیں:" ہمارے لئے کسی طرح مناسب نہیں ہے کہ ہم ایسے امام اعظم پر اعتراض کریں کہ جس کی جلالت قدر، علم و ورع پر سب کا اتفاق ہے۔ امام صاحب رحؒ پر کسی طرح بھی اعتراض مناسب نہیں ہے کیونکہ وہ ائمہ متبوعین میں سب سے بڑے مرتبے کے ہیں۔ ان کا مذہب سب سے پہلے مدون ہوا اور ان کی سند حدیث بھی دوسرے ائمہ کے لحاظ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف زیادہ قریب ہے۔"

حفص بن عبد الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ

آپ امام نسائیؒ اور ابو داؤد کے اُستاذ ہیں۔ فرماتے ہیں:" میں ہر قسم کے علماء، فقہاء اور زاہدوں کے پاس بیٹھا، لیکن ان میں سب اوصاف کو جامع امام ابو حنیفہ رحؒ کے علاوہ کسی کو نہیں پایا۔"

باتفاق علمائے اُمّت امام اعظم ابوحنیفہؒ اجلائے تابعین میں سے ہیں اور تابعین کرام کے متعلق حق سبحانہٗ
تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِإِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ
مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا أَبَدًا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ

"جنھوں نے حضرات صحابہؓ کی نیکیوں میں اتباع کی اللہ ان سے راضی ہے اور وہ اللہ سے راضی ہیں اور
اُن کے لئے جنّت تیار کی گئی جس کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے (اور) یہ بہت بڑی
کامیابی ہے۔"

یہ فضیلت امام صاحبؒ کو منجانب اللہ عطا ہوئی۔ اس میں نہ ان کے کسب کو دخل اور نہ کسی دوسرے کا اد
اور اس خصوصیت (تابعیت) میں بھی آپ کو وہ امتیاز حاصل ہے جو دوسروں کو حاصل نہیں ہے۔
اس جگہ ہمیں اپنے موضوع کے تحت چند اکابرِ اُمّت کی امام صاحبؒ کے متعلق رائے یا ان کا خراجِ عقیـ
پیش کرنا ہے۔ میدان یہاں بھی بہت وسیع ہے اس لئے انتخاب اور اختصار سے کام لے رہے ہیں۔

یحییٰ بن سعید القطان رحمۃ اللہ علیہ

آپ فن رجال کے امام ہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ، علی بن المدینی آپ کے درس حدیث کے حلقہ میں عصر تا مغرب
کھڑے ہو کر احادیث کی تحقیق کیا کرتے تھے آپ امام صاحبؒ کے تلمیذ ہیں۔ اس پر آپ فخر کیا کرتے تھے فرماتے ہیں
"واللہ خدا گواہ ہے ہم جھوٹ نہیں بولتے۔ ہم نے امام ابوحنیفہؒ سے زیادہ کسی کو صائب الرائے
نہیں دیکھا۔ ہم نے اکثر اُن کے اقوال اخذ کئے ہیں۔ واللہ ہم امام صاحبؒ کی مجلس میں شریک
رہے ہیں۔ میں نے جب بھی اُن کے چہرے کی طرف دیکھا تو یقین ہو گیا وہ اللہ تعالیٰ کے خوف اور
خشیت سے پوری طرح متصف ہیں۔ خدائے بزرگ کی قسم امام ابوحنیفہؒ اس اُمّت میں قرآن و حدیث

کی گئی حالانکہ یہ بالکل خلافِ واقعہ ہے کیونکہ عقیدت مندوں کا اس قدر ہجوم ہوا اور آپ کے ساتھ زبردستی کی جائے ناممکنات میں سے ہے اسی طرح کوڑوں والی روایت بھی ابن ہبیرہ کے متعلق ہے نہ کہ خلیفہ منصور کے متعلق۔

صلوٰۃ جنازہ اور تدفین

امام صاحبؒ کے انتقال کی خبر تمام شہر میں پھیل گئی اور سارا شہر امنڈ آیا۔ حسن بن عمارہ (جو آپ کے اُستاد بھی ہوتے تھے) قاضی شہر نے آپ کو غسل دیا۔ غسل کے وقت حسن بن عمارہ روتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے:۔

اللہ تعالیٰ آپ پر رحم فرمائے آپ نے تیس سال سے افطار نہیں کیا اور نہ چالیس سال سے رات کو آرام کیا، آپ ہم سب میں سب سے زیادہ فقیہ، سب سے زیادہ عابد، سب سے زیادہ پرہیزگار تھے۔

غسل سے فارغ ہوتے ہوتے لوگوں کی بہت زیادہ کثرت ہو گئی تھی، پہلی نماز (جو حسن بن عمارہ نے پڑھائی تھی) میں پچاس ہزار آدمی شریک تھے آپ کے جنازہ کی نماز چھ مرتبہ ہوئی اور دفن کے بعد ۴۰ دن تک آپ کی قبر پر لوگ نماز جنازہ پڑھتے رہے۔ خلیفہ منصور نے بھی آپ کی صلوٰۃ جنازہ قبر پر ہی جاکر پڑھی۔

امام صاحبؒ کی وصیت کے مطابق آپ کی قبر شریف خیزران کے مقبرے میں بنائی گئی۔ آپ کے خیال میں وہی جگہ ایسی تھی جو مغصوبہ نہیں تھی امام صاحبؒ کے انتقال کے بعد تین دن تک مسلسل جنات کے رونے کی آوازیں سُنائی دیں۔

امام صاحبؒ کا مقبرہ

۴۵۹ھ میں آپ کی قبر پر شرف الملک ابو سعد نے قبہ تعمیر کرایا، اور اسی کے قریب ایک مدرسہ بھی تعمیر کرایا اس وقت ابو جعفر مسعود بن ابی الحسن عباسی بھی موجود تھا جس نے یہ اشعار پڑھے:۔

(۱) دیکھتے نہیں ہو علم مر چکا تھا لیکن اس کو اس قبر میں پوشیدہ ہستی نے زندہ کیا۔

(۲) اسی طرح یہ زمین بھی مر چکی اس کو ابو سعد نے زندہ کیا۔

جب اسماعیل بادشاہ بغداد پر قابض ہوا تو رافضیوں نے اس قبہ اور مدرسہ کو بالکل مسمار کر دیا تھا۔ اور اس جگہ کوڑا کرکٹ ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ یہی معاملہ حضرت عبدالقادر جیلانی کے مقبرے کے ساتھ کیا گیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان اشرار سے بغداد کو بہت جلد پاک و صاف کر دیا۔

۹۷۴ھ میں سلطان سلیم بن سلیم نے از سر نو دونوں مزاروں پر قبے تعمیر کرائے جو کہ اب تک باقی ہیں۔

امام صاحبؒ کی قبر شریف دیکھ کر کسی عربی شاعر نے چند اشعار کہے ہیں جن کا ترجمہ پیش ہے۔

۱۔ امام صاحب کی قبر جنت الخلد کا ایک باغیچہ ہے۔
۲۔ اس جگہ بہت زیادہ شرافتیں ابلتی ہیں۔
۳۔ اللہ تعالیٰ ان پر رحمت نازل فرمائے جب تک ستارے منور ہیں۔

سخاوت و عالی ظرفی

ابراہیم بن عتبہ چار ہزار درہم کے مقروض تھے، اور اس ندامت کی وجہ سے لوگوں سے ملنا چھوڑ دیا تھا۔ ان کے ایک دوست نے چندہ کرکے ان کا قرض ادا کرنا چاہا، لوگوں نے بقدر حیثیت اعانت کی۔ امام صاحبؒ کے پاس گئے تو فرمایا کل کس قدر قرضہ ہے، انہوں نے کہا چار ہزار۔ فرمایا اتنی سی رقم کے لئے لوگوں کو کیوں تکلیف دیتے ہو۔ یہ کہہ کر پورے چار ہزار درہم خود دے دیئے۔ تاریخوں میں اس قسم کے اور بہت سے واقعات اُن کی نسبت منقول ہیں۔

حفظِ لسان

غیبت سے پرہیز رکھتے۔ اس نعمت کا شکر ادا کرتے کہ خدا نے میری زبان کو اس آلودگی سے پاک رکھا ایک شخص نے کہا، حضرت لوگ آپ کی شان میں کیا کچھ نہیں کہتے۔ مگر آپ سے میں نے کسی کی بُرائی نہیں سنی۔ فرمایا: ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ امام سفیان ثوری نے کسی سے کہا ابو حنیفہ کو میں نے کسی کی غیبت کرتے نہیں سُنا۔ انہوں نے کہا کہ ابو حنیفہ ایسے بے وقوف نہیں کہ اپنے اعمالِ صالحہ کو خود برباد کر ڈالیں۔

قسم کھانی بُرا جانتے تھے اور اس سے بہت پرہیز کرتے تھے۔ عہد کر لیا تھا کہ اتفاقاً بھی اس خطا کا مرتکب ہوں گا۔ تو ایک درہم کفارہ دوں گا۔ اتفاق سے بھول کر کسی موقع پر قسم کھالی۔ اس کے بعد عہد کیا کہ اب بجائے درہم کے دینار دوں گا۔

علامہ ابو زہرہ مصری نے تحریر فرمایا ہے کہ جس وقت امام صاحبؒ کی خدمت میں زہر کا پیالہ پیش کیا گیا تو آپ نے فرمایا:۔

لا اشرب لانی اعلم مافیہ ولا اعین علی قتل نفسی فطرحہ وصب فی فیہ "میں نہیں پیوں گا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں اس میں جو کچھ ہے اور میں اپنی ہلاکت پر اعانت نہیں کروں گا لہٰذا آپ کو گرا دیا گیا اور زہر کا پیالہ آپ کے منہ میں انڈیل دیا گیا۔ (الخیرات الحسان)

یہ روایت اپنے سیاق و سباق اور معنی کے اعتبار سے بالکل غلط ہے اسی طرح کوڑے مارنے والی روایت بھی بالکل غلط ہے کیونکہ ان دونوں روایتوں سے تو یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ امام صاحبؒ کی کوئی پوزیشن ہی نہ تھی حالانکہ امام صاحبؒ کے گرد تلامذہ اور عقیدت مندوں کا ہجوم رہتا تھا جو جیل سے باہر تھا آپ صرف نظر بند تھے اور اس روایت سے ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ آپ تنہا تھے اور آپ کے ساتھ دست درازی

امانات عندی للحقت بك فاذا لقیت القوم وظفرت بھم فافعل کما فعل ابوك فی اھل صفین اقتل مدبرھم واجھز جریحھم ولا تفعل کما فعل ابوك فی اھل الجمل فان القوم لھم فیئة۔

"میں آپ کے پاس چار ہزار درہم بھیجتا ہوں اس وقت اسی قدر موجود تھے اگر لوگوں کی امانتیں میرے پاس نہ ہوتیں تو میں ضرور آپ سے ملتا جب آپ دشمنوں پر فتح پائیں تو وہ برتاؤ کریں جو حضرت علیؓ نے اہل صفین کے ساتھ کیا تھا زخمی اور بھاگ جانے والے سب قتل کئے جائیں۔ ایسا نہ کرنا جیسا حضرت علیؓ نے جنگ جمل میں کیا تھا کیونکہ مخالف بڑی جمعیت رکھتا ہے۔"

اس خط اور علامہ شبلیؒ کی تشریح سے معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحبؒ ابراہیم کے طرفدار تھے لیکن میری رائے یہ ہے کہ نامہ دانشوران اور علامہ شبلیؒ کی یہ تحقیق موضوعات شیعہ کے سہارے ہے خط کی عبارت پکار رہی ہے کہ یہ امام صاحبؒ کی عبارت نہیں ہے بلکہ بعد کے لوگوں کی ایجاد ہے کیونکہ امام صاحبؒ جیسے محقق پر اپنے قریبی زمانے کے واقعات پوشیدہ نہیں تھے کون نہیں جانتا کہ نزاعاتِ صحابہؓ میں خارجیوں کی ریشہ دوانیوں کو کافی دخل تھا چنانچہ جنگ جمل محض خارجیوں کے شب خون مارنے کے مغالطہ میں پیش آئی ورنہ اس جنگ کے قائدین حضرت زبیرؓ اور حضرت طلحہؓ بن عبیداللہ میدان جنگ سے علیحدہ ہو گئے اور بات تقریباً طے ہو گئی تھی لیکن رات کو ستر خارجیوں نے (جن کو حضرت علیؓ نے اپنے لشکر سے نکال دیا تھا) حملہ کر دیا جس کی وجہ سے محض دھوکہ میں جنگ ہوئی ایسے ہی جنگِ صفین میں خارجیوں نے معاملہ کو بگاڑ دیا تھا۔

امام صاحبؒ کی طرف جو خط منسوب کیا گیا ہے اس کی عبارت شیعوں کی وضع کردہ ہے ورنہ آپ خیال فرمائیں جو امام ۹۹ وجوہات سے بھی کفر کا حکم نہ دے وہ مسلمانوں کو ایسا حکم دے سکتا ہے کہ گویا ان کا مقابلہ اہل کفر سے ہے

گرفتاری

۱۴۶ھ میں ابراہیم شہید ہو گئے۔ اُن کے قتل کے بعد منصور ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوا جنھوں نے ابراہیم کا ساتھ دیا تھا اس لئے منصور نے بغداد پہونچ کر امام ابوحنیفہؒ کو طلب کیا، اور ان کو قتل کرنے یا قید کرنے کا یہ بہانہ تلاش کیا کہ آپ کے سامنے عہدۂ قضا پیش کیا۔ آپ نے انکار کر دیا۔

منصور نے امام صاحب کو گرفتار تو کر لیا اور جیل خانہ میں بھی ڈال دیا لیکن چونکہ امام صاحبؒ کوئی معمولی شخصیت کے مالک تو نہ تھے اس لئے شہرت ہو گئی اور لوگ اسی حالت میں استفادہ کرنے کے لئے آنا شروع ہو گئے اور جیل خانہ ہی حلقہ درس بن گیا۔ اس حالت میں امام محمدؒ نے بھی امام صاحبؒ سے استفادہ کیا غرض کہ قریباً چار سال امام صاحبؒ کو نظر بند رہنا پڑا یعنی ۱۴۶ھ لغایت ۱۵۰ھ۔

وفات

امام صاحبؒ کی وفات جس دن ہوئی وہ دن جمعہ کا، مہینہ شوال کا اور ۱۵۰ھ تھا۔ خلیفہ کو آپ کی طرف سے اندیشہ تھا کیونکہ آپ کی مقبولیت قید کی حالت میں اور بھی زیادہ ہو گئی تھی اس لئے دھوکہ میں آپ کو زہر دے دیا گیا جس وقت آپ کو علم ہوا تو سجدۂ شکر ادا کیا اور جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

وفات پر اکابر کے تاثرات

اس وقت ان ممالک میں بڑے بڑے ائمہ مذہب موجود تھے، جن میں بعض خود امام صاحبؒ کے اُستاد تھے، سب نے ان کے مرنے کا رنج کیا۔ اور نہایت تأسف آمیز کلمات کہے۔ ابن جریجؒ مکہ میں تھے سُن کر کہا اِنّا للہ بہت بڑا عالم جاتا رہا۔ شعبہ بن الحجاج نے جو کہ امام ابو حنیفہؒ کے شیخ اور بصرہ کے امام تھے نہایت افسوس کیا اور کہا "کوفہ میں اندھیرا ہو گیا" اس واقعہ کے چند روز بعد عبداللہ ابن المبارکؒ کو بغداد جانے کا اتفاق ہوا۔ امام صاحبؒ کی قبر پر گئے اور رو کر کہا "ابو حنیفہؒ خدا تم پر رحم کرے۔ ابراہیم مرے تو اپنا جانشین چھوڑ گئے افسوس تم نے تمام دنیا میں کسی کو اپنا جانشین نہ چھوڑا۔"

مدت سے خلافت کا خیال پکار رہے تھے اور ایک لحاظ سے اُن کا حق بھی تھا تاہم سفاح کی وفات تک ان کی کوئی سازش ظاہر نہ ہوئی تھی صرف بدگمانی پر منصور نے سادات علویین کی بیخ کنی شروع کی جو لوگ ان میں ممتاز تھے اُن کے ساتھ بے رحمیاں کیں محمد بن ابراہیم کہ حسن و جمال میں یگانہ روزگار تھے اور اس وجہ سے دیباج کہلاتے تھے اُن کو زندہ دیوار میں چنوا دیا۔ ان بے رحمیوں کی بڑی داستان ہے جس کے بیان کرنے کو بڑا سخت دل چاہئے آخر تنگ آ کر ۱۴۵ھ میں انہیں مظلوم سادات میں سے محمد نفس ذکیہ نے تھوڑے سے آدمیوں کے ساتھ مدینہ منورہ میں خروج کیا اور چند روز میں ایک بڑی جمعیت پیدا کر لی، بڑے بڑے پیشوایانِ مذہب حتیٰ کہ امام مالکؒ نے فتویٰ دے دیا کہ منصور نے جبراً بیعت لی ہے خلافت نفس ذکیہ کا حق ہے۔ نفس ذکیہ اگرچہ نہایت دلیر، قوی بازو، جنگ سے واقف تھے لیکن تقدیر سے کس کا زور چل سکتا ہے نتیجہ یہ ہوا کہ رمضان ۱۴۵ھ میں نہایت بہادری سے لڑتے ہوئے میدان جنگ میں مارے گئے ان کے بعد ان کے بھائی نے علمِ خلافت بلند کیا اور اس سروسامان سے مقابلہ کو اُٹھے کہ منصور کے حواس جاتے رہے کہتے ہیں کہ اس اضطراب میں منصور نے دو مہینے تک کپڑے نہیں بدلے۔ سرہانے سے تکیہ اٹھا لیتا تھا اور کہتا تھا کہ میں نہیں جانتا کہ یہ تکیہ میرا ہے یا ابراہیم کا۔

ابراہیم چونکہ شجاعت اور دلیری کے ساتھ بہت بڑے عالم اور مقتدائے عام تھے ان کے دعوئے خلافت پر ہر طرف سے لبیک کی صدائیں بلند ہوئیں خاص کوفہ میں کم و بیش بیس لاکھ آدمی ان کے ساتھ جان دینے کو تیار ہو گئے مذہبی گروہ خاص کر علماء و فقہاء نے عموماً اُن کا ساتھ دیا۔ امام صاحبؒ نے بھی اُن کی تائید کی، خود شریک جنگ ہونا چاہتے تھے لیکن بعض مجبوریوں کی وجہ سے شریک نہ ہو سکے جس کا ان کو ہمیشہ افسوس رہا۔ نامہ دانشوراں میں امام صاحبؒ کا ایک خط نقل کیا گیا ہے جو انہوں نے ابراہیم کو لکھا تھا اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

اما بعد فانی قد جهزت الیک اربعۃ الاف درهم ولم یکن عندی غیرها ولولا

دوسرا شخص حضرت عمرؓ کے پاس پہونچا اور اپنی شکایت پیش کی تو آپ نے فرمایا: لَوْ کُنْتُ اَنَا مَکَانَہٗ لَقَضَیْتُ لَکَ "اگر میں اُن کی جگہ ہوتا تو تیرے حق میں فیصلہ کرتا۔" اس شخص نے کہا آپ تو خلیفہ ہیں کیوں نہیں فیصلہ کرتے آپ نے فرمایا یہاں میرے پاس کوئی نص نہیں ہے اور رائے ایک مشترک چیز ہے یعنی اس میں ہم دونوں برابر ہیں۔ لَیْسَ ھُنَالِکَ نَصٌّ وَالرَّاْیُ مُشْتَرَکٌ۔

اس سے ظاہر ہے کہ عدلیہ کے معاملات میں خلیفہ وقت بھی دخل اندازی نہیں کرتا تھا لیکن اس کے برخلاف خلافت بنی امیہ میں اگر درباریوں کے خلاف کوئی فیصلہ کر دیا جاتا تو قاضی کو بے عزتی کے ساتھ معزول کر دیا جاتا تھا۔ خلافتِ عباسیہ میں ہارون رشید کے خلیفہ ہونے سے پہلے تک ایسا ہی رہا چنانچہ خلیفہ منصور کے زمانے میں قاضی شریک کا بہت بُرا حشر ہوا منصور کے بیٹے مہدی کے زمانے میں مہدی کے ایک فوجی کے خلاف قاضی عبید اللہ بن حسن کی عدالت میں ایک تاجر نے اپنا مقدمہ پیش کیا، ادھر پیشی ہوئی ادھر مہدی کا پیغام پہونچا۔ "دیکھو جس زمین کے متعلق فلاں افسر اور فلاں تاجر کے درمیان جھگڑا ہے اس میں فیصلہ افسر کے حق میں دو۔" لیکن قاضی عبید اللہ نے فوجی افسر کے خلاف فیصلہ دیا اس پر مہدی نے ان کو معزول کر دیا۔

بعض دفعہ تو قاضی کی اہلیت کا بھی سوال نہیں تھا خواہ وہ مستحقِ قضا ہو یا نہ ہو لیکن حکومت کا وفادار ہو اسی کو قاضی کر دیا جاتا تھا چنانچہ اُموی دورِ خلافت میں قاضی عابس کے بارے میں مروی ہے کہ وہ پورا قرآن بھی نہیں پڑھا تھا، لکھنا پڑھنا بھی نہیں جانتا تھا، فرائض سے بھی واقف نہیں تھا لیکن پورے مصر کا قاضی تھا کیونکہ اس نے یزید کی بیعت کے سلسلہ میں بڑی خدمات انجام دی تھیں۔

یہ حالات تھے جن کے پیشِ نظر امام صاحبؒ نے عہدۂ قضاء سے انکار کر دیا تھا کیونکہ وہ اپنے فیصلوں کو حکومت سے متاثر نہیں کرنا چاہتے تھے اور یہ اس زمانہ میں ممکن نہیں تھا کہ عدل و انصاف حکومت کی مرضی کے مطابق نہ کیا جائے یہ دیکھتے ہوئے امام صاحبؒ نے انکار کر دیا تھا۔

بغاوت کا الزام

امام صاحبؒ کی گرفتاری کا دوسرا سبب حکومت سے بغاوت بتلایا جاتا ہے جس کو ہم سطور ذیل میں علامہ شبلی کے قلم سے نقل کر رہے ہیں:۔

۱۳۲ھ میں سلطنت اسلام نے دوسرا پہلو بدلا یعنی بنی اُمیّہ کا خاتمہ ہو گیا اور آل عباس تخت و تاج کے مالک ہوئے اس خاندان کا پہلا فرماں روا ابو العباس سفاح تھا اس نے چار برس حکومت کی ۱۳۶ھ کے بعد اس کا بھائی منصور تخت نشین ہوا۔ عباسیوں نے گو اموی خاندان کو بالکل تباہ کر دیا یہاں تک کہ خلفائے بنی اُمیّہ کی قبریں اکھڑوا کر ان کی ہڈیاں تک جلا دی تھیں تاہم چونکہ نئی نئی سلطنت تھی اور انتظام کا سکّہ نہیں بیٹھا تھا جا بجا بغاوتیں اٹھیں ان فتنوں کو فرو کرنے میں سفاح اور منصور اعتدال کی حد سے بہت دُور نکل گئے اور زیادتیاں کیں کہ مروانی حکومت کا نقشہ آنکھوں میں پھر گیا تمام ملک کی آنکھیں اُن کے جانشینوں پر لگی تھیں لیکن ان خونریزیوں نے سب کے دل افسردہ کر دیئے چنانچہ ایک موقع پر منصور نے کہا۔ کیا کروں؟ کام کے آدمی نہیں ملتے۔ عبد الرحمن نے کہا بازار میں جس جنس کی زیادہ مانگ ہوتی ہے قلت بھی اسی کی ہوتی ہے۔

منصور نے یہ ستم بھی کیا کہ سادات کی بھی خانہ بربادی شروع کر دی اس میں شبہ نہیں کہ سادات ایک

امام رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں عام طور سے تاریخ کی کتابوں سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں اوّل یہ کہ آپ کو عہدۂ قضا سے انکار کی وجہ سے گرفتار کیا گیا۔ دوم یہ کہ آپ نے نفس ذکیہ کے خروج میں حکومت کے مخالف گروپ کی موافقت کی تھی۔

عہدۂ قضاء سے انکار

امام صاحبؒ نے ابن ہبیرہ کے زمانے میں بھی قضاء کے عہدے سے انکار کر دیا تھا اور خلیفہ ابو جعفر منصور کو بھی صفائی کے ساتھ جواب دے دیا تھا کہ میں ہرگز یہ عہدہ قبول نہیں کروں گا میں اس کی صلاحیت نہیں رکھتا ہوں اور اس پر قسم بھی کھائی تھی، اس پر امام صاحبؒ کو گرفتار کر لیا گیا۔ علامہ ابو زہرہ مصری لکھتے ہیں:۔

"داؤد بن راشد کہتے ہیں کہ جس وقت امام صاحبؒ کو سزا دی جاتی تھی تو میں موجود تھا آپ کو روزانہ قید سے نکالا جاتا تھا اور دس کوڑے مارے جاتے تھے یہاں تک کہ آپ کے ۱۱۰ کوڑے مارے گئے اور آپ سے قضاء کے قبول کرنے کو کہا جاتا تھا اور آپ یہی فرما دیتے تھے کہ میں اس کی صلاحیت نہیں رکھتا ہوں چنانچہ جب مسلسل یہی سزا دی گئی تو آپ نے خدا سے دعا کی الٰہی! مجھے ان کے شر سے محفوظ رکھ، چنانچہ آپ کو زہر دیا گیا اور آپ کا اسی میں انتقال ہوا۔"

لیکن یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کیا عوامل تھے کہ جن کی بنا پر آپ نے اتنی سختی برداشت کی اور عہدۂ قضاء کو قبول نہ کیا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ آپ نے بربنائے تقویٰ ایسا کیا تھا تاریخی روشنی میں بھی یہ وجہ زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے۔

قضاء سے انکار کا سبب

حضرت عمرؓ کے زمانے میں عدلیہ کے شعبہ کو انتظامیہ سے علیحدہ کر دیا گیا تھا لیکن باوجود اس کے عدلیہ بالکل آزاد تھا، کوئی دباؤ اس پر نہیں ڈالا جاتا تھا۔ چنانچہ علامہ حموی نے حاشیہ الاشباہ میں تحریر فرمایا ہے:۔

"جب حضرت عمرؓ کے ملکی مشاغل بہت زیادہ بڑھ گئے تو انہوں نے عدلیہ کو حضرت ابو درداءؓ کے سپرد کر دیا انہیں ایام میں ان کے پاس دو آدمی جھگڑتے ہوئے آئے حضرت ابو درداءؓ نے ایک کے حق میں فیصلہ کر دیا تو

(۳) اسد بن عمرؒ کا بیان ہے کہ امام ابو حنیفہؒ رات کی نماز میں ایک رکعت میں پورا قرآن مجید ختم فرمادیتے تھے ان کے رات میں رونے پر پڑوس والوں کو رحم آجاتا تھا۔

(۴) انہی اسد بن عمرؒ کا بیان ہے کہ یہ روایت صحیح ہے کہ جس مقام پر امام صاحبؒ نے وفات پائی ہے وہاں سات ہزار قرآن مجید ختم کئے تھے۔

(۵) مشعر بن کدامؒ کا قول ہے کہ ایک رات میں مسجد میں گیا تو کسی کے قرآن مجید پڑھنے کی آواز آئی۔ جس کی حلاوت میرے دل میں گڑ گئی۔ جب ایک منزل تمام ہوگئی تو میں نے سمجھا کہ اب شاید رکوع کریں گے۔ مگر ایک تہائی پڑھا آدھا پڑھا اور پڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ پورا قرآن شریف ایک ہی رکعت میں ختم ہوگیا دیکھا تو امام ابو حنیفہؒ تھے۔

(۶) زاہدہ فرماتے ہیں کہ ایک بار میں نے مسجد میں امام ابو حنیفہؒ کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھی۔ جب سب آدمی نماز پڑھ پڑھ کر چلے گئے۔ میں ان سے تنہائی میں ایک مسئلہ پوچھنا چاہتا تھا۔ میں رہ گیا۔ امام صاحب کو اس کی خبر نہ ہوئی۔ انہوں نے کھڑے ہوکر نماز میں قرآن شریف پڑھنا شروع کر دیا۔ میں انتظار میں کھڑا استتار رہا۔ جب فارغ ہوں گے مسئلہ پوچھوں گا۔ آپ پڑھتے پڑھتے اس آیت پر پہونچے۔ فَمَنَّ اللّٰہُ عَلَیْنَا وَوَقٰنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ (تو اللہ تعالیٰ نے ہم پر احسان فرمایا۔ اور دوزخ کی زہریلی ہوا سے ہم کو بچایا) اس آیت کو بار بار پڑھتے رہے یہاں تک کہ پڑھتے پڑھتے صبح ہوگئی۔ اور موذن نے فجر کی اذان دیدی۔

(۷) ابو الجویریہؒ کا قول ہے کہ میں حماد بن ابی سلیمانؒ، محارب بن وثارؒ، علقمہ بن مرثدؒ، عون بن عبد اللہ کی صحبتوں میں رہا ہوں اور امام ابو حنیفہؒ کی صحبت میں بھی رہا ہوں میں نے ان بزرگوں کی جماعت میں کسی کو ایسا شب بیدار نہیں دیکھا جیسے ابو حنیفہؒ میں ان کی صحبت میں مہینوں رہا ہوں ایک رات بھی ایسی نہیں ہوئی کہ انہوں نے بستر سے پہلو لگایا ہو۔

(۸) القاسم بن معین کا بیان ہے کہ ایک رات امام ابو حنیفہؒ نے نماز میں یہ آیت پڑھی بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ أَدْهَىٰ وَأَمَرُّ (بلکہ ان کے وعدہ کا وقت قیامت ہے اور قیامت بہت بڑی آفت اور بہت کڑوی چیز ہے) امام صاحبؒ تمام رات اسی آیت کو دہراتے رہے اور شکستہ دلی سے روتے رہے۔

(۹) خارجہ بن مصعبؒ کہتے ہیں کہ خانہ کعبہ میں ایک شب میں چار اماموں نے پورا قرآن مجید پڑھا ہے (۱) حضرت عثمان بن عفانؓ (۲) تمیم داریؓ (۳) سعید بن جبیرؒ (۴) امام ابو حنیفہؒ۔

(۱۰) ابو مطیع کا قول ہے کہ مکہ مکرمہ کے قیام کے زمانہ میں رات کو جس وقت بھی میں طواف کے لئے گیا۔ میں نے امام ابو حنیفہؒ اور حضرت سفیان ثوریؒ کو طواف کرتے پایا۔

(۱۱) ابو عاصمؒ کہتے ہیں کہ نماز میں بہت زیادہ پڑھنے کی وجہ سے لوگ امام ابو حنیفہؒ کو وتد (میخ یا کیل) کہنے لگے تھے (کہ وقت سکون کے ساتھ میخ کی طرح کھڑے نظر آتے تھے۔

یہ سب بیان کسی حنفی کے نہیں۔ شاگرد و معتقد کے نہیں۔ امام ابو حنیفہؒ کے معاصرین کے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ اما بعد:
امام اعظمؒ کا دن کن کن مقدس کاموں میں صرف ہوتا تھا۔ اس کا کچھ اندازہ امام صاحبؒ کی فقہ کو دیکھنے سے ہوسکتا ہے، لیکن ان مقدس دنوں کے ساتھ راتیں کیسی گزریں۔ اس کا اندازہ ذیل کے چند واقعات سے کیجیے، جو بطور نمونہ دیئے گئے ہیں۔ اور پوری تفصیل حضرت امام قدس سرّہ کی تاریخوں میں اور خصوصاً تاریخ بغدادی عربی میں ملے گی۔ یہ بھی اسی کا انتخاب ہے۔

(۱) یزید بن الکمیت کہتے ہیں حضرت امام اعظمؒ عشاء کی جماعت میں تھے۔ امام نے سورہ اذا زلزلت الخ تلاوت فرمائی جب نماز ختم ہوگئی اور لوگ چلے گئے تو میں نے دیکھا کہ امام صاحبؒ فکر میں غرق ہیں اور سانس زور زور سے آتا جاتا ہے۔ میں نے سوچا چپکے سے اٹھ چلوں اور ان کے شغل میں خلل نہ ڈالوں۔ میں چراغ جلتا چھوڑ کر چلا آیا۔ اس میں تیل تھوڑا سا تھا۔ صبح کے وقت جب پھر مسجد میں آیا تو میں نے دیکھا کہ حضرت امام اپنی داڑھی کو پکڑے کھڑے ہیں اور یہ دعا کر رہے ہیں:۔

یا من یجزی بمثقال ذرة خیر خیراً ویا من یجزی بمثقال ذرة شر شراً اجر النعمان عبدک من النار وما یقرب منہا من السوء وادخلہ فی سعة رحمتک

"اے ذرہ بھر نیکی کا بدلہ دینے والے اور ذرہ بھر برائی کا اس جیسا بدلہ دینے والے اپنے بندہ نعمانؒ کو آگ سے اور ان برائیوں سے جو اس سے قریب کریں بچا اور اپنی رحمت کی کشائش میں داخل فرما۔"

میں نے اذان دی پھر آکے دیکھا تو چراغ برابر جل رہا تھا۔ اور امام صاحبؒ کھڑے ہوئے تھے مجھے دیکھ کر فرمایا کیا چراغ لینا چاہتے ہو۔ میں نے عرض کی کہ میں تو صبح کی اذان دے چکا ہوں۔
فرمایا "جو دیکھا اس کو چھپانا" پھر فجر کی سنتیں پڑھیں اور بیٹھ گئے اور ہم لوگوں کے ساتھ شروع رات کی وضوء سے صبح کی نماز پڑھی۔

(۲) یحییٰ بن ایوب الزاہدؒ کا بیان ہے کَانَ اَبُوْ حَنِیْفَۃَ لَا یَنَامُ اللَّیْلَ "امام ابوحنیفہؒ رات کو نہیں سوتے تھے۔"

ربِّ ذوالجلال

اے خدائے پاک رب ذوالجلال ذرہ ذرہ سے عیاں تیرا کمال

اپنی قدرت سے ہمیں پیدا کیا اور فرشتوں سے بڑا رتبہ دیا

لائقِ سجدہ ہے بس تیری ہی ذات بے حقیقت لات و عزیٰ اور منات

خلق کی ہے تو نے ساری کائنات ماسوا تیرے ہر اک شے بے ثبات

تیرے آگے ہر کوئی محتاج ہے جو بھی شے ہے اس پہ تیرا راج ہے

عاصیوں پر یہ بڑا احسان کیا مصطفیٰ جیسا جو پیغمبر دیا

صبح روشن اور لیل خوشگوار تیری قدرت کے ہیں ادنیٰ شاہکار

دہر کی ہر شے میں تیرا نور ہے نور سے تیرے جہاں معمور ہے

وہ ہے تیری ذات جو بے عیب ہے قُل ہُوَ اللہُ اَحَد لاریب ہے

تیرے ہی قبضے میں ہیں موت و حیات فہم سے بالا تری ذات و صفات

مالکِ کل حاکمِ روزِ جزا

اپنے عبرت کو گناہوں سے بچا

ڈاکٹر عبرت بہرائچی

امام صاحبؒ کے اوصاف ابو یوسفؒ کی زبان سے

امام صاحبؒ کے محاسنِ اخلاق کی صحیح مگر اجمالی تصویر دیکھنی ہو تو قاضی ابو یوسف کی تقریر سنو جو انہوں نے ہارون الرشید کے سامنے بیان کی تھی۔ ہارون نے ایک موقع پر قاضی صاحب موصوف سے کہا کہ ابو حنیفہؒ کے اوصاف بیان کیجئے۔ انہوں نے کہا جہاں تک میں جانتا ہوں ابو حنیفہؒ کے اخلاق و عادات یہ تھے کہ نہایت پرہیز گار تھے۔ منہیات سے بچتے تھے۔ اکثر چپ رہتے تھے اور سوچا کرتے تھے کوئی شخص مسئلہ پوچھتا اور ان کو معلوم ہوتا تو جواب دیتے ورنہ خاموش رہتے، نہایت سخی اور فیاض تھے کسی کے آگے حاجت نہ لے جاتے، اہل دُنیا سے احتراز تھا۔ دنیاوی جاہ و عزت کو حقیر سمجھتے تھے غیبت سے بہت بچتے تھے جب کسی کا ذکر کرتے تو بھلائی کے ساتھ کرتے، بہت بڑے عالم تھے، اور مال کی طرح علم کے صرف کرنے میں بھی فیاض تھے"۔ ہارون الرشید نے یہ سن کر کہا "صالحین کے یہی اخلاق ہوتے ہیں"۔ عام نگاہوں میں یہ باتیں چنداں وقعت نہیں رکھتیں، لیکن روحانی اوصاف کے نکتہ شناس سمجھ سکتے ہیں کہ یہ طرز زندگی ظاہر میں جس قدر سادہ اور آسان ہے۔ دراصل اسی قدر مشکل اور قدر کے قابل ہے۔

⑦ امام شافعیؒ فرماتے ہیں میں نے جب کبھی بھی امام صاحبؒ کی قبر کے پاس کھڑے ہو کر دعا کی اللہ نے اس کو قبول فرمایا۔

⑧ علامہ ابن حجر مکی نے فرمایا ہے۔ امام صاحبؒ نے خواب میں اللہ تعالیٰ کو یہ ارشاد فرماتے سنا کہ میں ابو حنیفہؒ کے پاس ہوں۔

⑨ علامہ موصوف نے الخیرات الحسان میں فرمایا ہے کہ امام صاحبؒ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اجازت سے آپ کو شربیا اور اپنے اصحاب کو بھی پلایا۔

⑪ صاحب تذکرۃ الاولیاء نے اپنی کتاب تذکرۃ الاولیاء میں لکھا ہے :-

"شیخ بو علی کہتے ہیں کہ میں شام میں حضرت بلالؓ کی قبر شریف کے قریب سو رہا تھا کہ میں نے اپنے آ مکہ معظمہ میں دیکھا اور دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم باب بنی شیبہ سے داخل ہوئے اور ایک بوڑھے کو ا گود میں اٹھائے ہوئے ہیں۔ میں حضورؐ کے پاس گیا اور ان کے پیروں کو بوسہ دیا اور دریافت کیا کہ یہ بوڑ کون ہیں؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ مسلمانوں کے امام اور تیرے ہم وطن ابو حنیفہؒ ہیں۔

نے ابن سیرین سے ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا یہ خواب ابوحنیفہؒ نے دیکھا ہوگا ؟ امام صاحبؒ نے فرمایا میں ا
ہی ہوں تب ابن سیرین نے کہا اچھا اپنی پشت اور پہلو سے چپ دکھلاؤ امام صاحبؒ نے اپنا پہلو اور کر کھ
دی ۔ امام ابن سیرین نے آپ کے بازو اور پشت پر ایک تل دیکھ کر فرمایا آپ ابوحنیفہؒ ہی ہیں اور اس کے بعد خو
کی تعبیر بیان فرمائی کہ اس سے مراد علم کا زندہ کرنا اور جمع کرنا ہے ۔

③ ایک دفعہ امام صاحبؒ امام باقرؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو انہوں نے فرمایا: اَنْتَ تُحْیِیْ سُنَّ
جَدِّیْ " آپ میرے جد محترم کی سنت کو زندہ کریں گے ۔"

امام باقرؒ نے اگرچہ یہ اپنی فراست سے فرمایا تھا، لیکن یہ بات حرفاً حرفاً، صحیح ثابت ہوئی ۔

امام صاحبؒ کے مناقب میں اسی قسم کی روایات بکثرت موجود ہیں جن کو ہم نے طوالت کی وجہ سے تر
کر دیا ہے اس کے ساتھ ہمیں یہ بھی افسوس ہے کہ امام صاحبؒ کے مادحین اور عقیدت مندوں نے نہا یہ
مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے اور باطل و موضوع روایات تک سے گریز نہیں کیا غالباً اسی میں انہوں نے ا
صاحبؒ کی فضیلت کو منحصر سمجھا ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے امام صاحبؒ کو فوقیت اور فضیلت اُن کے ع
اور عملی کمالات کی وجہ سے حاصل ہے ۔ اگر اس قسم کے سب ہی اقوال آپ کی سیرت اور سوانح سے جدا ک
جائیں تب بھی آپ کے مقام میں کوئی فرق نہیں آتا ۔

امام صاحبؒ کے انتقال کے بعد رویائے صالحہ مختلف حضرات نے دیکھیں ان کو اس جگہ ذکر کیا جا رہا ۔

① قاضی ابورجا رکہتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ امام محمد کو خواب میں دیکھا تو ان سے دریافت کیا ۔ اللہ تعا
نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ فرمایا ؟ جواب دیا مغفرت فرمادی ۔ امام ابویوسفؒ کے بارے میں دریافت کیا
فرمایا وہ تو اعلیٰ علیین میں ہیں ۔

② حفص بن غیاث کہتے ہیں ۔ میں نے ایک مرتبہ امام صاحبؒ کو خواب میں دیکھا تو دریافت کیا، اللہ
نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا ؟ فرمایا بخش دیا ۔

③ امام ابویوسفؒ فرماتے ہیں، ایک دفعہ میں نے امام صاحبؒ کو خواب میں دیکھا کہ آپ جنت میں
حضرات صحابہؓ کے بیچ میں ہیں مجھے دیکھ کر فرمایا، کاغذ اور دوات لاؤ میں اپنے جنتی اصحاب کے نام لکھ لوں
میں نے عرض کیا میرا نام بھی لکھ لیجئے تو امام صاحبؒ نے میرا نام بھی لکھ لیا ۔

④ ابومعاذ فضل بن خالد کہتے ہیں کہ میں نے ایک دفعہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب
میں دیکھا تو دریافت کیا ۔ امام ابوحنیفہؒ کے علم کے بارے میں آپ کیا ارشاد فرماتے ہیں ؟ فرمایا وہ ایسا علم
کہ لوگوں کو اس کی ضرورت رہے گی ۔

⑤ مقاتل بن سلیمان (مشہور مفسر) فرماتے ہیں کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک آدمی سفید لباس
پہنے آسمان سے اترا اور بغداد کے منارے پر کھڑا ہوا، دو مرتبہ باآواز بلند کہا فقد الناس یعنی لوگ تبا
ہوگئے ۔ اسی صبح کو امام صاحبؒ کا انتقال ہوگیا ۔

⑥ ابن بسطام کہتے ہیں کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ قیامت قائم ہے اور امام صاحبؒ جھنڈ
لئے کھڑے ہیں ۔ میں نے دریافت کیا حضرت کس کا انتظار ہے ؟ فرمایا اپنے اصحاب کا انتظار کر رہا ہوں

(۱) حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے "اگر دین ثریا ستارے کے قریب بھی ہوگا تو اس کو وہاں سے فارسیوں کا ایک آدمی حاصل کرلے گا"

یہ حدیث مختلف الفاظ کے ساتھ مروی ہے بعض میں دین، بعض میں ایمان، بعض میں علم کا لفظ ہے اور اس کو بخاری، مسلم، شیرازی، طبرانی نے اپنی اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے قدر مشترک حدیث کی صحت سے کسی کو انکار نہیں ہے بخاری و مسلم کی تخریج کے بعد تو تنقید کی بھی گنجائش باقی نہیں رہتی ہے۔

علامہ جلال الدین سیوطی نے اس حدیث کے متعلق فرمایا ہے کہ یہ حدیث امام ابوحنیفہؒ کی فضیلت اور بشارت میں اصل صحیح ہے۔ چنانچہ علامہ موصوف کے تلمیذ جناب حافظ محمد یوسف دمشقی نے مواہب کے حاشیہ میں تحریر فرمایا ہے :۔

وما جزم به شيخنا من ان ابا حنيفة هو المراد من هذا الحديث ۔

"ہمارے شیخ نے یقین کے ساتھ کہا ہے کہ اس حدیث میں امام ابوحنیفہ مراد ہیں"

علامہ ابن العابدین الشامی نے رد المحتار میں یہ قول نقل کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ "اس میں شک نہیں ہے کہ ابنائے فارس میں امام ابوحنیفہؒ کے مبلغ علم کو کوئی نہیں پہونچا، لہٰذا یہ حدیث قطعاً امام صاحبؒ پر محمول ہے" اسی قسم کے الفاظ ملا علی قاری نے مرقاۃ کے مقدمہ میں ذکر فرمائے ہیں، مولانا خرم علی صاحب نے نیل الاوطار میں بھی اسی قسم کے الفاظ ذکر کئے ہیں، ممکن ہے بعض کو یہ خیال ہو کہ اس سے تو امام ابوحنیفہؒ کی حضرت سلمان فارسیؓ پر فوقیت اور فضیلت ثابت ہوگئی لیکن گذارش یہ ہے کہ حضرت سلمان فارسیؓ کو فضیلتِ صحبت حاصل ہے اور یہ ایسی فضیلت ہے جس کو قیامت تک امت کا کوئی فرد نہیں پاسکتا، تمام فضیلتیں اس فضیلت کی گرد کو بھی نہیں پہونچ سکتیں، لیکن علم و اجتہاد میں امام صاحب ہی فوقیت رکھتے ہیں اور جزوی فضیلت حاصل ہونا کوئی امر غیر مشروع بھی نہیں ہے کہ جس کی بنا پر اعتراض قائم کیا جائے۔

(۲) عبداللہ بن مبارک فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت امام ابوحنیفہؒ نے خواب دیکھا کہ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرقد شریف کو کھود ڈالا ہے اور میں آپ کے عظام مطاہرہ کو جمع کر رہا ہوں۔ یہ خواب آپ

اشراق کی نماز پڑھ کر آپ نے مجھے ایک حدیث پڑھ کر سنائی وہ یہ ہے :۔

ومن صلے الفجر ولم یتکلم الابذکر اللہ تعالیٰ حتی تطلع الشمس کان کالمجاھد فی سبیل اللہ۔

"جس نے صبح کی نماز پڑھی اور سورج نکلنے تک سوائے ذکرِ خدا کے اور کچھ زبان سے نہ کہا وہ مثل مجاہد فی سبیل اللہ کے ہے"

ان واقعات سے امام صاحبؒ کے عالمانہ تحمل اور وقار کا پتہ لگایا جا سکتا ہے ۔

امام رحمۃ اللہ علیہ اور والدین کا احترام

آپ کے والد محترم کا انتقال تو پہلے ہی ہو چکا تھا البتہ آپ کی والدہ حیات تھیں آپ نے ان کی بے حد خدمت کی اور ان کی مرضی کا ہمیشہ احترام کیا، چنانچہ محمد بن بشر اسلمی کہتے ہیں کہ کوفہ میں دو ہی شخص سب سے زیادہ والدین کی خدمت کرنے والے تھے، ایک منصور کہ وہ اپنی ماں کے سر کی جوئیں چنتے اور سر دھلاتے اور دوسرے امام صاحبؒ ۔

جن دنوں کوفہ کا گورنر ابن ہبیرہ آپ کو قضا قبول کرنے کے لئے کوڑوں کی سزا دیا کرتا تھا ان دنوں کا ذکر ہے کہ ایک دن کوڑا آپ کے سر پر لگا جس کی وجہ سے آپ کا چہرہ متورم ہو گیا۔ یہ دیکھ کر آپ رو دیئے۔ جلاد نے کہا قضا قبول کر لو، روتے کیوں ہو؟ امام صاحبؒ نے فرمایا، میں مار کی وجہ سے نہیں رو رہا بلکہ اس وجہ سے روتا ہوں جب میری والدہ محترمہ اس چوٹ کا نشان دیکھیں گی تو ان کو صدمہ ہو گا ۔

کوفہ میں ذرعہ نامی ایک واعظ رہتا تھا، امام صاحبؒ کی والدہ ان کی بہت معتقد تھیں، ایک دن امام صاحبؒ کی والدہ کو ایک مسئلہ کی ضرورت پیش آئی انہوں نے امام صاحبؒ سے فرمایا، جاؤ ذرعہ سے یہ معلوم کر آؤ۔ امام صاحبؒ نے کہا اس کا جواب یہ ہے۔ والدہ نے کہا میں تیرا جواب نہیں مانوں گی۔ ذرعہ ہی سے پوچھ کر آ۔ آپ گئے ذرعہ نے کہا حضرت! میں آپ کے سامنے کیا مسئلہ بیان کروں آپ خود ہی بتلا دیتے۔ امام صاحبؒ نے فرمایا والدہ کا حکم ہے۔

دوسری روایت یہ ہے کہ امام صاحبؒ کی والدہ سواری پر بیٹھ کر اور امام صاحبؒ کو ساتھ لے کر ذرعہ کے پاس گئیں تب ذرعہ نے کہا حضرت! آپ نے کیا جواب دیا تھا۔ امام صاحبؒ نے فرمایا کہ میں نے تو یہ جواب دیا تھا تو ذرعہ نے کہا آپ نے صحیح فرمایا۔ تب کہیں امام صاحبؒ کی والدہ کو اطمینان ہوا۔

کوفہ میں ایک واعظ اور تھا جس کا نام عمرو بن ذر تھا۔ امام صاحبؒ کی والدہ ان کی بھی بہت معتقد تھیں ان کے پاس بھی آپ کو اپنی والدہ کے مسائل پوچھنے کے لئے آنا پڑتا تھا۔ اتفاق سے ان کا مکان بہت فاصلہ پر تھا ایک دفعہ امام صاحبؒ کی والدہ نے کہا عمرو بن ذر سے یہ مسئلہ پوچھ کر آ۔ امام صاحبؒ تشریف لے گئے تو عمرو بن ذر نے کہا۔ مجھے تو یہ مسئلہ معلوم نہیں ہے۔ البتہ آپ بتلا دیں۔ میں وہی آپ سے نقل کر دوں گا پھر آپ اپنی والدہ کو جا کر بتلا دیں۔ امام صاحبؒ نے ایسا ہی کیا۔

امام صاحبؒ کی فیاضی

تجارت اور اکتساب دولت سے ان کا مقصود زیادہ تر عوام کو فائدہ پہونچانا تھا جتنے احباب اور ملنے والے تھے سب کے روزینے ... مقرر کر رکھے تھے۔ شیوخ اور محدثین کے لئے تجارت کا ایک حصہ مخصوص کر دیا تھا اس سے جو نفع ہوتا تھا سال کے سال ان لوگوں کو پہونچا دیا جاتا تھا۔ عام معمول تھا کہ گھر والوں کے لئے کوئی چیز خریدتے تو اسی قدر محدثین اور علماء کے پاس بھجواتے اتفاقیہ کوئی شخص ملنے آتا تو اس کا حال پوچھتے اور حاجت مند ہوتا تو حاجت روائی کرتے۔

وقار اور حلم

ان تمام خصوصیات کے ساتھ آپ عالمانہ وقار و حلم کا اعلیٰ ترین نمونہ تھے امام مالکؒ فرماتے ہیں: "ابو حنیفہؒ حلیم الطبع انسان تھے۔" آپ کے بعض معاصرین آپ کے ساتھ نہایت سخت برتاؤ کرتے تھے لیکن آپ حلم و وقار کی تصویر بن جاتے تھے۔ ابو معاذ کہتے ہیں کہ میرا آنا جانا امام سفیان ثوریؒ کی خدمت میں بھی ہوتا تھا اور میں امام صاحبؒ کے حلقہ میں شرکت کرتا تھا۔ سفیان ثوریؒ کو یہ بات ناگوار تھی، لیکن امام صاحبؒ کو اس کا احساس کبھی نہ ہوتا تھا۔ امام صاحبؒ کی یہی ادائیں تو تھیں کہ جن کی بناء پر مشائخ وقت ان سے محبت کرتے تھے مسعر بن کدام فرماتے ہیں:

قد جمع اللہ فیہ خصال شریفۃ "اللہ تعالیٰ نے ان میں بہترین خصلتیں جمع کر دی تھیں"

ایک دفعہ مسجد کی چھت سے ایک سانپ گرا اور عین آپ کے برابر میں گرا سب لوگ تو اٹھ اٹھ کر بھاگ گئے لیکن آپ بدستور بیٹھے رہے۔ راوی کہتا ہے:

فعرفت انہ صاحب یقین "میں جان گیا کہ آپ صاحب یقین ہیں۔"

عمرو بن الہیثم کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میں شعبہ کا رقعہ لے کر امام صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس وقت عصر کا وقت تھا، آپ نے مسجد ہی میں عصر، مغرب، عشاء کی نمازیں ادا فرمائیں اور بعد عشاء مجھے ہمراہ لے کر دولت پر تشریف لائے کھانا کھلایا اور ایک بستر پر مجھے لٹا دیا اور خود ایک گوشہ میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنا شروع کر دی اور تمام رات پڑھتے رہے، جب صبح ہوئی تو مجھے اٹھایا اور وضو کا پانی لاکر دیا اور مسجد میں تشریف لائے صبح کی نماز پڑھ کر آپ اپنی جگہ بیٹھے رہے، اسی اثنا میں ایک سانپ مسجد کی چھت سے آپ کے اوپر گرا اور آپ نے اس کے سر پر پیر رکھ اور بیٹھ گئے جب سورج طلوع ہوا تو آپ نے یہ دعا پڑھی۔

الحمد للہ الذی اطلعہا من مطلعہا اللھم ارزقنا خیرہا وخیر ما طلعت علیہ۔

"اس خدا کی تعریف جس نے سورج کو اس کے مطلع سے نکالا۔ اے اللہ! اس سے جس پر اس نے طلوع ہے بہترین رزق عطا فرما۔"

اس کے بعد آپ نے سانپ مارنے کا حکم فرمایا، اتنی دیر آپ نہایت سکون و وقار سے اپنی جگہ بیٹھے رہے۔

کرتے تھے۔

ایک دفعہ آپ کے ایک دوست آپ سے ملاقات کے لئے حاضر ہوئے مگر شکستہ حال معلوم ہوتے تھے جب جانے لگے تو آپ نے پانچ ہزار درہم پیش کئے، اس نے کہا حضرت میرے یہاں بہت کچھ موجود ہے میں غریب نہیں ہوں تب آپ نے فرمایا۔

ان اللہ یحب ان یریٰ اثر نعمتہ علیٰ عبدہٖ "اللہ تعالیٰ اپنے بندے پر اپنی نعمتوں کا اثر دیکھنا پسند کرتا ہے"

ایک دفعہ آپ کے پاس بطور ہدیہ ایک ہزار جوڑے جوتے آئے آپ نے سب اپنے دوستوں، پڑوسیوں اور طلباء میں تقسیم فرما دیئے۔ اتفاق سے شام کو اپنے بیٹے حماد کے لئے ضرورت پیش آئی تو آپ نے اس کو بازار منگا دیا۔ لوگوں نے دریافت کیا حضرت یہ کیا؟ تب آپ نے فرمایا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

اذا اھدی الرجل فجلساءہٗ شرکاءہٗ "جب کسی آدمی کے پاس کوئی ہدیہ آئے تو اس کے ہمنشین اس کے شریک ہوتے ہیں"

امام صاحبؒ کی عادتِ شریفہ تھی کہ عیدین کے موقع پر اپنے دوستوں اور ملنے والوں کے یہاں تحائف بھیجا کرتے تھے ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتے، غریب بچیوں کی شادیاں اپنے پاس سے کیا کرتے تھے جب اپنے بچوں کے لئے کوئی چیز لاتے تو علماء، مشائخ اور پڑوسیوں کے لئے بھی اسی قدر لاتے تھے، بضاعت کے ذریعہ جو نفع آپ کو حاصل ہوا کرتا تھا وہ سب طلباء اور علماء پر صرف کر دیتے تھے اگر کوئی آپ کا شکریہ ادا کرتا تو آپ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد پڑھ کر سنا دیتے۔

انما انا خازن اضع حیث امرت: "میں تو خازن ہوں جہاں کا حکم ہوتا وہیں رکھ دیتا ہوں"

آپ نے فرمایا میں چار ہزار درہم سے زیادہ کا کبھی مالک نہیں ہوا، جو آیا خرچ کر دیا کیونکہ حضرت علیؓ نے فرمایا ہے:۔ اربعۃ الاف ومادونہا صدقۃ: "چار ہزار اور اس سے زیادہ خرچ ہونا چاہیئے" یعنی کسی آدمی کو چار ہزار سے زیادہ کی پونجی، رکھنا اچھا نہیں معلوم ہوتا ہے۔

سخاوت و مروّت

سخاوت کے ساتھ مروّت بھی آپ کا خصوصی وصف ہے چنانچہ ایک دفعہ ایک شخص آپ کے پاس آیا اور کہا کہ ایک مرتبہ مجھے ایک ضرورت لاحق ہوئی میں نے آپ کی طرف سے فلاں تاجر کے نام ایک رقعہ لکھا کہ وہ مجھے بیس اشرفیاں دے دے، چنانچہ میں اس تدبیر میں کامیاب ہو گیا۔ امام صاحبؒ نے یہ سنا اور مسکرا دیئے۔

ایک دفعہ ایک شخص کی بیوی نے اس کو بہت تنگ کیا اور کہا: جاؤ لڑکی جوان ہے شادی کر لو، فاقوں نے گھر بھر کو پریشان کر دیا ہے امام صاحبؒ سے جا کر کہو وہ ضرور آپ کی مدد کریں گے یہ شخص امام صاحبؒ کی مجلس میں گیا اور واپس آ گیا۔ امام صاحبؒ نے قیافہ سے اس کو تاڑ لیا جب یہ شخص چلا گیا تو اس کا گھر معلوم کر کے رات کو دروازہ میں سے پانچ ہزار درہم کی ایک تھیلی اس کے گھر میں ڈال آئے آپ نے اس تھیلی میں ایک پرچہ بھی لکھ کر رکھ دیا تھا کہ اس کو بلا دریغ خرچ کریں، جب ختم ہو جائے پھر خبر کر دیں۔

وظیفہ خوری سے اجتناب

امام ابو حنیفہؒ اس اصول کے سرے سے مخالف تھے۔ اور اس لحاظ سے اُن کی مخالفت بجا بھی تھی۔ اس بے تعلقی سے ایک بڑا فائدہ یہ تھا کہ امر حق کے اظہار میں امام صاحبؒ کو کسی سے باک نہیں ہوتا تھا۔ انسان کتنا ہی آزاد مزاج اور صاف گو ہو، لیکن احسان وہ چھپا ہوا جادو ہے کہ اس کے اثر سے بچنا ناممکن نہیں۔ تو قریباً ناممکن ہے۔ امام صاحبؒ تمام عمر کسی کے احسان مند نہ ہوئے اور اس وجہ سے ان کی آزادی کو کوئی چیز دبا نہ سکتی تھی۔ اکثر موقعوں پر وہ اس بات کا اظہار بھی کر دیا کرتے تھے۔

امام اعظمؒ کی سخاوت

امام صاحبؒ بہت بڑے سخی انسان تھے اور ہمیشہ ضرورت مندوں کا خیال رکھا کرتے تھے۔ علماء صوفیا فقہا طلباء، جلساء اور اہلِ جوار سب ہی آپ کی سخاوت سے فیضیاب ہوا کرتے تھے آپ نے کبھی کسی سائل کو خالی ہاتھ واپس نہیں کیا۔ جلیسوں کا خاص طور سے خیال رکھتے تھے اسی وجہ سے آپ کے معاصرین کا قول ہے: کان اکرم الناس مجالسۃ "ہمنشینی میں وہ نہایت بہترین اور کریم انسان تھے۔"

حسین بن سلیمان کہتے ہیں: ما رایت احداً اسخی من ابی حنیفۃ "میں نے کسی کو امام ابو حنیفہ سے زیادہ سخی نہیں دیکھا۔"

آپ نے اپنے بیٹے حماد کو حکم دے رکھا تھا کہ روزانہ دس درہم کی روٹیاں خرید کر پڑوسیوں کے یہاں بھیج دیا کرو۔ امام ابو یوسفؒ کو دس سال تک اپنے پاس سے خرچہ دے کر پڑھایا آپ کو علم اور اہلِ علم کی خدمت کرنے میں بڑی خوشی ہوتی تھی چنانچہ جس دن آپ کے صاحبزادے نے بسم اللہ شروع کی تو آپ نے پانچ درہم معلم کی نذر کئے اور جس دن سورۂ فاتحہ ختم کی اس دن بھی پانچ ہزار درہم نذر کئے اور معذرت پیش کرتے ہوئے فرمایا واللہ لو کان عندی اکثر من ذلک لدفعناہ تعظیماً للقرآن "قسم خدا کی اگر اس سے زیادہ میرے پاس ہوتا تو قرآن کے احترام میں وہ بھی پیش کر دیتا۔"

ایک آدمی نے آپ سے آکر عرض کیا۔ میرے ذمہ پانچ ہزار درہم قرض ہیں اور دائن تقاضہ کر رہا ہے آپ اس سے فرما دیجئے کہ وہ مجھے کچھ مہلت دے دے آپ نے دائن سے کہا، اس نے جواب دیا، حضرت آپ کی وجہ سے اپنا مطالبہ معاف کرتا ہوں۔ امام صاحبؒ نے فرمایا نہیں لیجئے یہ آپ کا مطالبہ ہے اسی وجہ سے امام ابو یوسف فرماتے ہیں۔

لا یکاد لیسئل حاجۃ الا قضاھا "آپ سے جس ضرورت کے متعلق سوال کیا جاتا آپ اس کو پورا

جن ایام میں امام صاحبؒ نظر بند تھے خلیفہ کے یہاں کا کھانا نہیں کھاتے تھے بلکہ اپنے مکان سے ستّو منگا کر کھایا کرتے تھے۔

ایک دفعہ شہر میں کسی کی بکری گم ہوگئی جب آپ کو اس کی اطلاع ملی تو آپ نے تحقیق فرمائی کہ بکری کتنے دن زندہ رہتی ہے۔ معلوم ہوا سات سال، چنانچہ آپ نے سات سال بکری کا گوشت نہیں کھایا۔

امانتداری

امام صاحبؒ نہایت امانتدار تھے عبدالرحمٰن بن مسعودی کہتے ہیں کہ میں نے ان سے اچھا امین نہیں دیکھا ان کا جس وقت انتقال ہوا تو ۵۵ ہزار کی امانتیں ان کے گھر میں موجود تھیں جن میں سے ایک درہم بھی ضائع نہیں ہوا تھا۔

ابوبکر زرنجری کہتے ہیں کہ ایک آدمی امام صاحبؒ کے پاس ستر ہزار یا ایک لاکھ درہم رکھ کر مر گیا، اس کے ایک لڑکی تھی جب وہ بالغ ہوئی تو امام صاحبؒ نے وہ رقم اس لڑکی کے سپرد کردی۔

حق ہمسائیگی

امام صاحبؒ کا ایک پڑوسی تھا۔ دن بھر کی مزدوری سے جو حاصل ہوتا اس کی شراب اور کباب خرید لاتا تھا اور اپنے دوستوں کو بھی ساتھ لاتا اور رات بھر اودھم مچاتا اور خوب گاتا۔ راوی کا بیان ہے ہم نے اس کے اشعار یاد کر لئے تھے ان اشعار میں ایک شعر یہ ہے

اضاعونی وای فتی اضاعوا لیوم کریھة وسداد ثغر

"یعنی لوگوں نے مجھے کھو دیا اور کتنے بڑے شخص کو کھویا جو لڑائیوں اور رخنہ بندیوں میں کام آتا تھا۔ امام صاحبؒ نے اس کو چند مرتبہ سمجھایا لیکن باز نہ آیا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن حکومت کی پولیس اس کو گرفتار کر کے لے گئی اور جیل خانہ میں ڈال دیا۔ امام صاحبؒ کو جب خلافِ معمول اس کے اودھم کی آواز نہ سنائی دی تو دریافت فرمایا۔ لوگوں نے واقعہ بیان کر دیا۔ امام صاحبؒ یہ سن کر بیچین ہوگئے اور امیر کے پاس گئے آپ کے ساتھ اہلِ مجلس بھی ہو لئے۔ جب دارالامارت کے قریب پہونچے تو امیر کو معلوم ہوا۔ وہ دوڑا ہوا استقبال کے لئے حاضر ہوا امام صاحبؒ نے آنے کی غرض بیان کی۔ امیر نے کہا حضرت کسی خادم کو بھیج دیتے تب بھی تعمیل حکم ہوتی۔ بہر حال امیر نے جوان اور اس کے ساتھیوں کو آزاد کر دیا۔ امام صاحبؒ نے اس جوان سے فرمایا "دیکھا! ہم نے تجھے ضائع نہیں کیا" اس شخص نے امام صاحبؒ کے سر کو بوسہ دیا اور تائب ہوگیا پھر تو اس کی یہ حالت ہوگئی کہ اکثر حلقہ درس میں شریک رہتا راوی کا بیان ہے کہ یہ بھی علمائے کوفہ میں شمار ہونے لگا تھا۔ اس شخص کے بارے میں ایک روایت ہے کہ ایک دفعہ یہ قاضی ابن ابی لیلےٰ کی عدالت میں ایک شخص کے باغ کے متعلق شہادت دینے گیا۔ قاضی صاحبؒ نے دریافت کیا بتلاؤ اس میں کتنے درخت ہیں؟ جب یہ نہ بتلا سکے تو قاضی صاحبؒ نے ان کی گواہی کو رد کر دیا جب انہوں نے امام صاحبؒ سے واقعہ بیان کیا تو امام صاحبؒ نے فرمایا یہ جا کر کہو کہ آپ ۲۰ سال سے کوفہ کی جامع مسجد میں بیٹھ کر فیصلہ کیا کرتے ہیں بتلائیے اس میں کتنے ستون ہیں؟ اس نے یوں ہی جا کر کہہ دیا تو ابن ابی لیلےٰ کو حیرت ہوئی اور اس کی شہادت قبول کرلی۔

ایک دفعہ امام صاحبؒ کے ایک پڑوسی نے خواب دیکھا اور وہ اس کی تعبیر دریافت کرنے کے لئے بصرہ امام ابن سیرین کے پاس گیا۔ جب واپس آیا تو امام صاحبؒ نے دریافت کیا۔ بھائی کہاں رہے ہمیں تو آپ کی طرف سے بہت فکر تھا۔ اس نے واقعہ بیان کیا۔ امام صاحبؒ نے فرمایا۔ سبحان اللہ! بھائی اطلاع تو کرتے جاتے۔

امام صاحبؒ اور رقت قلب

ایک دفعہ حسب معمول دکان پر گئے، نوکر نے کپڑوں کے تھان نکال کر رکھے اور تفاؤل کے طور پر کہا۔ خدا ہم کو جنت دے۔ امام صاحبؒ پر رقت طاری ہوئی اور اس قدر روئے کہ شانے تر ہوگئے نوکر سے کہا کہ دکان بند کر دو۔ آپ چہرے پر رومال ڈال کر کسی طرف نکل گئے، دوسرے دن دکان پر گئے تو نوکر سے کہا کہ بھائی! ہم اس قابل کہاں ہیں کہ جنت کی آرزو کریں یہی بہت ہے کہ عذاب الٰہی میں گرفتار نہ ہوں، حضرت عمر فاروقؓ بھی اکثر فرمایا کرتے تھے کہ قیامت کے دن اگر مجھ سے نہ مواخذہ ہو نہ انعام ملے تو میں بالکل راضی ہوں۔"

۵۵ ہزار روپیہ امانتوں کے نکلے۔ تب خلیفہ منصور نے کہا کہ یہ شخص ہمیشہ ہم سے عذر ہی کرتا رہا لیکن بات صحیح تھی۔ اگر امام صاحبؒ کا گھر امانتوں سے خالی ہوتا تب اس رقم کو رکھتے۔

ایک دفعہ منصور اور اس کی بیوی میں کچھ رنجش ہوگئی۔ بیوی کو شکایت تھی کہ آپ عدل سے کام نہیں لیتے منصور نے کہا کہ میں عدل سے کام لیتا ہوں بالآخر اس قضیہ کا حکم امام صاحبؒ کو مقرر کیا گیا۔ امام صاحبؒ تشریف لائے۔ بیگم پس پردہ ہو بیٹھیں۔ منصور نے دریافت کیا ایک آزاد مرد کو کتنے نکاح کرنے جائز ہیں، امام صاحبؒ نے فرمایا۔ بیک وقت چار، خلیفہ نے خاتون سے کہا آپ نے سُنا! خاتون نے کہا جی ہاں! امام صاحبؒ نے فرمایا یہ اس وقت ہو سکتا ہے جب خاوند عدل سے کام لے ورنہ صرف ایک ہی پر اکتفا کرنا ہوگا۔ اس کے بعد امام صاحبؒ گھر تشریف لائے تو پیچھے سے ایک غلام نے حاضر ہو کر چار ہزار درہم کی تھیلی بیگم کی طرف سے پیش کی اور بیگم کی طرف سے سلام بھی پیش کیا۔ امام صاحبؒ نے لینے سے انکار کر دیا اور فرمایا، جاؤ بیگم سے کہہ دینا میں نے اپنا فرض منصبی انجام دیا ہے۔

ایک دفعہ کوفہ کے گورنر ابن ہبیرہ نے امام صاحبؒ سے عرض کیا۔ حضرت! کبھی تشریف لایا کیجیے۔ امام صاحبؒ نے فرمایا تم سے مل کر کیا کروں گا، آؤں گا تو احسان کروگے تو میں تمہارے دام میں آجاؤں گا اور ناراض ہوئے تو اس میں میری ذلت ہے جو تمہارے پاس ہے اس کی مجھے حاجت نہیں اور جو میرے پاس (علم) ہے اس کو کوئی چھین سکتا نہیں۔

امام ابو حنیفہؒ کا مشتبہات سے اجتناب

امام صاحبؒ اکل حلال کے نہایت سختی سے پابند تھے اس پر اگرچہ مندرجہ واقعات سے کافی روشنی پڑ چکی ہے مگر یہاں بھی کچھ ذکر کیے جاتے ہیں۔

ایک دن ہارون رشید نے امام ابویوسفؒ سے امام ابوحنیفہؒ کے متعلق سوال کیا تو جواب دیا۔ میں جہاں تک جانتا ہوں امام صاحبؒ کے اخلاق یہ تھے کہ وہ نہایت پرہیز گار تھے۔ ممنوعات سے بچتے تھے۔ اکثر چپ رہتے تھے کوئی شخص اُن سے سوال کرتا تو جواب دیتے ورنہ اکثر سوچا کرتے تھے نہایت فیاض تھے کسی کے پاس حاجت لے کر نہیں جاتے تھے اہل دنیا سے احتراز کرتے اور دنیوی عزّت وجاہ کو حقیر سمجھتے تھے غیبت سے پرہیز کرتے اور ہمیشہ دوسروں کا ذکر بھلائی کے ساتھ کرتے تھے بڑے عالم تھے مال خرچ کرنے میں دریغ نہ کرتے تھے ہارون رشید نے سُن کر یہ کہا صلحاء کے یہی اوصاف ہوتے ہیں۔

چند واقعات

یحییٰ بن زائدہ کہتے ہیں کہ ایک دن میں نے امام صاحبؒ کو ایک مکان کے قریب دھوپ میں کھڑے دیکھا میں نے قسم دیکر دریافت کیا حضرت! آپ اس دیوار کے سایہ میں کیوں نہیں کھڑے ہو جاتے۔ فرمایا اہل خانہ پر میرا کچھ قرض چاہتا ہے اس لئے اس کی دیوار کے سایہ سے منفعت حاصل کرنا مناسب نہیں سمجھتا اور فرمایا میں دوسروں کو اس عمل کا مکلف قرار نہیں دیتا ہوں، ہاں عالم کو محتاط رہنا چاہیئے۔

ایک دفعہ امام صاحبؒ نے اپنے شریک حفص بن غیاث کو تجارت کی غرض سے باہر بھیجا اور ایک چیز کے بارے میں فرمایا اس میں یہ عیب ہے جب فروخت کرو تو اس کا عیب بتلا دینا اتفاق سے حفص بن غیاث خریدار کو یہ بتلانا بھول گئے اور یہ بھی یاد نہ رکھا کہ وہ کس کے ہاتھ فروخت کی ہے، جب قیمت امام صاحبؒ کو لاکر دی تو امام صاحبؒ نے اسی چیز کے بارے میں دریافت فرمایا تو حفص بن غیاث نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا امام صاحبؒ نے فوراً ہی ان کو شرکت سے علیحدہ کر دیا اور کل سامان کی قیمت جو مبلغ تیس ہزار دینار ہوتی تھی صدقہ کر دی۔

ایک دفعہ ایک بوڑھی عورت امام صاحب کی دکان پر ایک ریشمی کپڑا خریدنے آئی اور کہا یہ کپڑا آپ کو جتنے میں پڑا ہو اتنے کو دے دیجئے! امام صاحبؒ نے فرمایا اچھا تو آپ اس کے چار درہم دے دیجئے! بوڑھیا نے کہا آپ مجھیوں مذاق کرتے ہیں۔ امام صاحبؒ نے فرمایا مذاق نہیں کر رہا ہوں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ دو کپڑے تھے دونوں کی قیمت اس قدر تھی ایک میں نے فروخت کر دیا اب اس کپڑے کی قیمت چار درہم باقی رہ گئی تھی۔

ایک دفعہ امام صاحبؒ کو کسی کپڑے کی ضرورت تھی آپ ایک دوکاندار کے پاس گئے، اس نے امام صاحبؒ کو رعایتاً کپڑے کی قیمت ایک ہزار درہم بتلائی امام صاحبؒ نے فرمایا، یہ کپڑا ایک ہزار درہم کا نہیں بلکہ زیادہ کا ہے، اس طرح آپ اس کو آٹھ ہزار درہم میں خرید کر لائے۔

ایک دفعہ خلیفہ منصور نے امام صاحبؒ کو تیس ہزار درہم نذر کرنا چاہے۔ امام صاحبؒ نے انکار کر دیا اور فرمایا میرے گھر میں اتنی جگہ نہیں ہے جو اس کثیر رقم کو اپنے گھر رکھ سکوں۔ جب امام صاحبؒ کا انتقال ہوا تو تقریباً

امام صاحبؒ کے سلسلہ درس کی وسعت

اسپین کے سوا اسلامی دُنیا کا کوئی حصہ نہ تھا جو اُن کی شاگردی کے تعلق سے آزاد رہا ہو، جن جن مقامات کے رہنے والے اُن کی خدمت میں پہونچے ان سب کا شمار نہیں ہو سکتا لیکن جن اضلاع یا ممالک کا نام خصوصیت کے ساتھ لیا گیا ہے۔ وہ یہ ہیں، مکہ، مدینہ، دمشق، بصرہ، واسطہ، موصل، جزیرہ، رقہ، نصیبین، رملہ، مصر، یمن، یمامہ، بحرین، بغداد، اہواز، کرمان، اصفہان، حلوان، سنزآباد، ہمدان نہاوند، رے، قومس، دامغان طبرستان، جرجان، نیشاپور، سرخس، نسا، بخارا، سمرقند، کس، مشعان ترمذ، ہرات نہتار، الزم، خوارزم، سیستان، مدائن، مصیصۃ، حمص مختصر یہ کہ ان کی استادی کے حدود خلیفۂ وقت کے حدودِ مملکت کے برابر تھے۔

سب سے بڑا زاہد، سب سے بڑا فقیہ کون ہے؟ تو سب باتوں میں سب نے امام ابو حنیفہؒ کا نام لیا۔

- قیس بن ربیع کہتے ہیں امام صاحبؒ بہت بڑے متقی ہیں وہ لوگوں کے ساتھ بہت زیادہ احسان کرتے تھے لیکن اُن کے ہمعصر اُن سے حسد رکھتے تھے۔
- یزید بن ہارون کہتے ہیں کہ میں نے ایک ہزار شیوخ سے علم سیکھا لیکن امام صاحبؒ سے زیادہ متقی اور کم گو میں نے کسی کو نہیں پایا۔
- ابن عیینہ کہتے ہیں کہ میں نے امام صاحبؒ سے زیادہ کسی کو متقی نہیں دیکھا۔
- ابراہیم بن عکرمہ کہتے ہیں کہ میں نے امام صاحب سے زیادہ متقی اور فقیہ کسی کو نہیں دیکھا۔
- امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ اپنے علم، تقویٰ اور فقہ کی وجہ سے ہم سب پر غالب رہتے تھے۔
- عبدالرحمٰن بن عابس کہتے ہیں کہ ہم نے امام صاحبؒ جیسا متقی نہیں دیکھا۔
- وکیع کہتے ہیں کہ حدیث میں جس قدر تقویٰ امام صاحبؒ اختیار کرتے تھے ہمیں میسّر نہیں ہوا۔
- احمد بن بدیل کہتے ہیں کہ میں نے عبشر کو کہتے سُنا ہے کہ میں نے امام صاحبؒ جیسا قائم اللّیل اور صائم النّہار نہیں دیکھا۔
- معروف بن بکیر کہتے ہیں کہ جو امام صاحبؒ کو دیکھ لیتا تھا وہ یقین کر لیتا تھا کہ یہ خیر ہی کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔
- امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ امام صاحبؒ اتنے بڑے انسان تھے کہ اُن سے علم، تقویٰ، سخاوت وغیرہ کے پیمانے بنائے جا سکتے ہیں۔
- ابن ابی لیلےٰ کہتے ہیں کہ دُنیا کے دروازے ہمارے لئے بھی کھلے اور امام صاحبؒ کے لئے بھی لیکن امام صاحبؒ نے آخرت کو اختیار کیا اور ہم نے دنیا کو۔

امام صاحبؒ اپنی جگہ بیٹھے ہوئے ٹھنڈی سانسیں لیتے رہے۔ میں آپ کی توجہ بٹ جانے کے خیال سے اُٹھ کر چلا گیا اور روشنی کا قندیل (لالٹین) وہیں چھوڑ آیا لیکن چونکہ اس میں تیل کم تھا اس لئے اس کی روشنی دھیمی کر دی تھی جب میں صبح ہوتے ہی پہونچا تو آپ اپنی ریش مبارک پکڑے ہوئے رو رہے تھے اور فرما رہے تھے۔

"اے وہ ذات! جو لوگوں کو ذرہ ذرہ نیکیوں کا بدلہ دے گی۔ نعمان اپنے بندے کو آگ سے محفوظ رکھ! اور اپنی رحمت میں چھپا لے"۔

(۱۲) امام صاحبؒ تہجد کی نماز کے لئے بہترین کپڑا پہنا کرتے تھے اور اس کو خوشبو میں خوب بسا لیتے تھے۔

(۱۳) آپ ہمیشہ باوضو رہا کرتے تھے فرماتے ہیں نماز کا کوئی وقت ایسا نہیں آیا جس میں میں باوضو نہ ہوں۔

(۱۴) امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ ایک دن میں امام صاحبؒ کے ساتھ جا رہا تھا کہ ایک آدمی نے آپ کو دیکھ کر فرمایا یہ ابو حنیفہؒ ہیں رات بھر بیدار رہتے ہیں اس کے بعد امام صاحبؒ پوری رات نماز اور دعا میں گذار دیتے تھے۔

(۱۵) مسعر بن کدام کہتے ہیں کہ ایک رات میں نے ایک قاری کو قرآن پڑھتے سُنا تو مجھے بہت اچھا معلوم ہوا اور میں بیٹھ کر سُننے لگا۔ میرا خیال تھا کہ یہ قاری ایک منزل پڑھ کر ختم کر دے گا مگر اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ ایک ہی رکعت میں پورا ختم کر دیا میں نے قریب جا کر دیکھا تو وہ ابو حنیفہؒ تھے۔

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نظام اوقات

امام صاحبؒ کا معمول تھا کہ صبح کی نماز پڑھ کر مسجد میں بیٹھ جاتے تھے (ارد گرد شاگردوں کا مجمع ہوتا تھا) اور درس کا سلسلہ شروع فرما دیتے تھے۔ درمیان میں اگر باہر سے آنے والا کوئی سوال کرتا تو آپ جواب دے دیتے تھے۔ اس کے بعد مجلس تدوین فقہ منعقد ہوتی، جس میں بڑے بڑے علماء شریک ہوتے، ظہر کی نماز پڑھ کر آپ گھر تشریف لاتے اور ظہر سے لے کر عصر کے قریب تک آرام فرماتے۔ تھوڑی دیر کے لئے آپ اپنی دکان پر بھی تشریف لے جاتے اسی وقت آپ مریضوں کی عیادت بھی کرتے اور دوستوں سے ملاقات بھی، مغرب کی نماز کے بعد پھر پڑھانے کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ جاڑوں میں عشاء کی نماز سے پہلے سو جاتے تھے اور پھر عشاء کی نماز پڑھتے اس کے بعد پھر نہ سوتے تھے۔

محمد بن فرات کہتے ہیں امام صاحبؒ جمعہ کے دن نماز جمعہ سے قبل ۲۰ رکعات نفل پڑھا کرتے تھے ابو اسماعیل کہتے ہیں آپ جمعہ کی نماز کے بعد ۶ رکعات پڑھا کرتے تھے۔

● یحییٰ بن سعید القطان کہتے ہیں کہ ہم بہت سے حضرات کے پاس بیٹھے اور بہت سے حضرات کو دیکھا لیکن ہم نے امام ابو حنیفہؒ جیسا آدمی نہ دیکھا اور نہ سنا۔ میں نے ان کو دیکھتے ہی جان لیا تھا کہ وہ متقی ہیں۔

● عبد اللہ بن مبارکؒ کہتے ہیں کہ میں کوفہ میں داخل ہوا اور لوگوں سے پوچھا کہ یہاں سب سے بڑا عالم

امام صاحبؒ کا مقام

حقیقت یہ ہے کہ علمائے دین وفقہائے شرع متین میں وہ تمام خصوصیات ہوتی ہیں جو ایک ولی میں ہونا ضروری ہیں۔ امام صاحبؒ فرماتے ہیں:۔

ان لم تکن فی الدنیا والآخرۃ العلماء والفقہاء اولیاء اللہ تعالیٰ فلیس للہ ولی قال اللہ تعالیٰ اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا والعلماء والفقہاء اشد معرفۃ باللہ تعالیٰ۔

"اگر دنیا و آخرت میں علماء و فقہاء اولیاء اللہ نہیں ہیں تو اللہ کا کوئی ولی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا۔ اور علماء و فقہاء کو اللہ تعالیٰ کی سب سے زیادہ معرفت حاصل ہوتی ہے۔"

اس نقطۂ نظر کے تحت امام صاحبؒ کا مقام ظاہر ہے۔

(۱) امام صاحبؒ رمضان میں ۶۰ قرآن پاک ختم کیا کرتے تھے ایک دن میں اور ایک رات میں۔

(۲) امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے امام صاحبؒ کو دیکھا کہ انھوں نے نماز میں صرف اسی ایک آیت پر پوری رات گزار دی۔ آیت یہ ہے: بَلِ السَّاعَۃُ مَوْعِدُھُمْ وَالسَّاعَۃُ اَدْھٰی وَاَمَرُّ۔

(۳) حضرت محاربؒ بن دثار کہتے ہیں کہ میں نے امام ابوحنیفہ سے زیادہ اچھا شب بیدار نہیں دیکھا۔

(۴) ابو عاصم نبیلؒ کہتے ہیں کہ امام صاحبؒ کو قیام صلوٰۃ اور کثرت عبادت کی وجہ سے میخ کہا جاتا تھا

(۵) سفیان بن عیینہؒ کہتے ہیں کہ ایام حج میں مکہ معظمہ میں امام ابوحنیفہؒ سے زیادہ نماز پڑھنے والا نہیں آیا

(۶) یحییٰ بن ایوب زاہد کہتے ہیں کہ امام صاحبؒ رات کو نہیں سوتے تھے۔

(۷) اسد بن عمر کہتے ہیں کہ امام صاحبؒ نے چالیس سال تک عشاء کی وضو سے فجر کی نماز ادا کی ہے آپ اکثر ایک ہی رکعت میں قرآن مجید ختم کرتے تھے، ابن مبارک نے بھی اس روایت کی تائید کی ہے۔

(۸) امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ امام صاحبؒ نے پورا قرآن شریف وتر میں ختم کیا ہے۔

(۹) حسن بن عمارہ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ امام صاحبؒ پر رحم فرمائے کہ انہوں نے تیس سال تک نہ افطار کیا اور نہ چالیس سال تک رات کو بستر سے کمر لگائی۔

(۱۰) ابوزایدہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے امام صاحبؒ کے ساتھ ان کی مسجد میں عشاء کی نماز پڑھی جب سب لوگ چلے گئے تو میں ایک طرف کو ہو کر بیٹھ گیا تو امام صاحبؒ نماز کی نیت باندھ کر کھڑے ہو گئے جب آپ اس آیت پر پہونچے فَمَنَّ اللّٰہُ عَلَیْنَا وَوَقٰنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ تو اسی کی تکرار فرماتے رہے یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔

(۱۱) یزید بن کمیت کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے اور امام صاحبؒ نے عشاء کی نماز علی حسن موذن کے پیچھے پڑھی۔ اس نے سورۂ اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ کی قرأۃ کی نماز کے بعد سب لوگ تو چلے گئے لیکن

اس کی روح اور حقیقت سب میں موجود تھی، کیونکہ تصوف مومن کی عملی زندگی کا نام ہے یعنی شریعت حقہ پر کامل طور سے محض رضائے باری کے عمل کرنے کو تصوف کہتے ہیں۔ لیکن اس لفظ کو اختیار کرنے کے دواعی کیا تھے۔

"جب بدعات کا ظہور ہوا اور مختلف فرقے پیدا ہوگئے تو ہر فریق نے یہ دعویٰ کیا کہ ان ہی میں زہاد.... پائے جاتے ہیں اس لئے خواص اہلِ سنت تصوف کے نام سے ممتاز ہوئے اور دوسری صدی ہجری... میں ان بزرگوں نے اس نام سے شہرت پائی۔" (کشف المحجوب)

اس عبارت میں تقریباً وہی چیز موجود ہے جو علامہ ابن تیمیہ وغیرہ حضرات نے اس کی ابتدا کے بارے میں فرمائی ہے۔ مزید برآں یہ کہ سببِ ایجاد بھی معلوم ہوگیا۔ نیز یہ کہ اہلِ سنت ہی حقیقی معنی میں صوفی ہوتے ہیں نہ کہ اہلِ بدع، بہرحال اس کی ابتدا ۱۵۰ھ یا ۱۶۰ھ ہے اس زمانے میں ابو ہاشم کو صوفی کہا جاتا تھا اور امام صاحبؒ کا انتقال ۱۵۰ھ میں ہو چکا تھا۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ نے تحریر فرمایا ہے۔

"متعارف سلوک تو صحابہ اور تابعین کے دور میں نہ تھا، البتہ اصل ہر چیز کی وہاں ملتی ہے اس لئے امام صاحبؒ کا سلوک بھی اسی نوع کا تھا جو نوع اس زمانے میں متعارف تھی۔ سلوک کے اہم اجزاء ورع، خشوع، انابۃ الی اللہ، تجرد عن الخلق، تبتل الی اللہ، کثرت عبادت، کثرت ریاضت یہ سب اجزاء امام صاحبؒ کے سوانح میں بکثرت ملیں گے۔"

شریعت اور تصوف کے شہسوار اور ان دونوں چیزوں کے مسلم رہنما ہزارہ دوم کے مجدد حضرت شیخ احمد سرہندی تحریر فرماتے ہیں:۔

"شریعت کے تین جزو ہیں علم و عمل، اخلاص، جب تک یہ تینوں جزو متحقق نہ ہوں شریعت متحقق نہیں ہوتی اور جب شریعت حاصل ہوگئی تو رضائے باری تعالیٰ حاصل ہوگئی اور یہی دنیا و آخرت کی تمام سعادتوں سے افضل ہے۔"

بیعت یا صحبت

تصوف کے باب میں صحبت کو بڑا دخل ہے اگر یہ حاصل نہ ہو تو شاید کچھ بھی حاصل نہ ہو اسی صحبت کی وجہ سے حضرات صحابہ اس اعزاز کے مستحق ہوئے ہیں: رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ "اللہ ان سے راضی ہوگیا اور وہ اللہ سے راضی ہوگئے۔"

یہی اعزاز حضرات تابعین کو ملا:۔ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ

"اور جنھوں نے صحابہ کی نیکیوں میں اتباع کی اللہ ان سے راضی ہوگیا اور وہ اللہ سے راضی ہوگئے۔"

اسی صحبت کی وجہ سے حضرت ابوبکر صدیق مقام صدیقیت پر فائز ہوئے اور اسی کی وجہ سے حضرت ابوذرؓ کو مقام جذب و فنا حاصل ہوا غرضکہ صحبت کو تبدیلِ احوال اور تربیتِ اخلاق میں بڑا دخل ہے۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ اسی مبارک زمانہ (خیر القرون) ۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور اسی میں پلے بڑھے اور اسی دور میں وفات پاگئے، لہٰذا حضرات صحابہ کی صحبت ان سے ملاقات، اسی طرح جلیل القدر تابعین کی صحبت اور ان سے ملاقات جس قدر امام صاحبؒ کو حاصل ہوئیں کسی دوسرے کو شاذ ہی حاصل ہوئی ہوں گی۔

امام صاحبؒ کے تذکرے ایسے واقعات سے بھرے ہوئے ہیں کہ جن کی وجہ سے آج بھی قلوب کو نورانیت حاصل ہوتی ہے ان میں سے چند روایتوں کو اس جگہ پیش کیا جارہا ہے۔

علامہ ابن تیمیہ فرماتے ہیں: " ان هذا التعبير من الزاهد بالصوفي حدث في اثناء المائة الثانية لان لباس الصوف كان يكثر في الزهاد ومن قال انه نسبه الى الصُفّة التي نسب اليها كثير من الصحابة ويقال فيهم اهل الصفة او نسبة الصفا او الصف الاول او صوفه بن مروان بن اد بن طانجه او صوفة القفا فهي اقوال ضعيفة "

" زاہد کو صوفی کہنا یہ دوسری صدی کے درمیان سے ہے اس لئے کہ موٹے کپڑے زاہدوں میں زیادہ مستعمل ہوتے تھے اور جس نے یہ کہا کہ یہ صُفّہ کی طرف منسوب ہے جس کی طرف بہت سے صحابہ منسوب ہیں اور ان کو اہل صفہ کہا جاتا ہے یا یہ صفا یا صف اول یا صوفہ بن مروان بن اد بن طانجہ یا صوفۃ القفا کی طرف منسوب ہے تو یہ سب کے سب اقوال ضعیف ہیں "

مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ تحریر فرماتے ہیں:

ترجمہ: " وہ سب سے پہلا شخص جس کو صوفی کہا گیا ہے ابو ہاشم ہیں ان سے پہلے کسی کو اس نام سے نہیں پکارا گیا "

حضرت ابو ہاشم صوفی کا انتقال ۱۵۰ھ میں ہوا ہے ان ہی کو امام سفیان ثوری نے صوفی کے نام سے یاد کیا ہے۔ فرمایا ہے اگر وہ نہ ہوتے تو ہم ریا کے دقائق سے واقف نہ ہوتے اسی طرح امام حسن بصری نے بھی پہلے پہل اس لفظ کا استعمال کیا ہے۔

رائیت صوفیا فی الطواف " میں نے ایک صوفی کو طواف میں دیکھا "

بہر حال یہ لفظ دوسری صدی ہجری کی پیداوار ہے اس سے قبل اس کی حقیقت ضرور تھی اگرچہ اس وقت اس کا یہ نام نہ تھا۔ شیخ ہجویری نے کشف المحجوب میں شیخ ابوالحسن فوشنجہ کا قول تحریر فرمایا ہے۔

التصوف اليوم اسم ولا حقيقة وقد كان حقيقة ولا اسم " تصوف آج کل ایک بے حقیقت شے ہے اس سے قبل حقیقت تھا جس کا نام نہ تھا "

شیخ ہجویریؒ نے اس مقولہ کی شرح میں لکھا ہے صحابہ و سلف کے زمانے میں یہ نام (تصوف) نہ تھا لیکن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ البقرہ

اور جب ان سے کہا جاتا ہے ایمان لے آؤ اس پر جسے اللہ نے اتارا ہے تو کہتے ہیں ہم تو (صرف) ان پر ایمان لائے ہیں جو نازل کی گئی ہم پر اور کفر کرتے ہیں اس کے علاوہ (دوسری کتابوں) کے ساتھ۔ حالانکہ وہ بھی حق ہے تصدیق کرتا ہے اس کتاب کی جو ان کے پاس ہے۔ آپ فرمایئے پھر تم کیوں قتل کرتے رہے اللہ کے پیغمبروں کو۔ اس سے پہلے اگر تم (اپنی کتاب پر ہی) ایمان رکھتے تھے اور بے شک آئے تمہارے پاس موسیٰؑ روشن دلیلیں لے کر پھر تم نے بنا لیا بچھڑے کو (اپنا معبود) اس کے بعد اور تم (تو عادی) جفاکار ہو اور یاد کرو جب ہم نے لیا تم سے پختہ وعدہ اور بلند کیا تمہارے سروں پر کوہ طور (اور تمہیں حکم دیا) کہ پکڑ لو جو ہم نے تمہیں دیا مضبوطی سے اور (خوب غور سے) سنو۔ انہوں نے (زبان سے) کہا ہم نے سن لیا اور (دل میں کہا) نہیں مانا۔ سراب ہو چکے تھے ان کے دل بچھڑے (کے عشق) سے یہ ان کے پیہم انکار کی نحوست تھی۔ فرمایئے بہت برا ہے جس کا حکم کرتا ہے تمہیں (یہ) تمہارا (عجیب و غریب) ایمان اگر تم ایمان دار ہو۔ آپ فرمایئے اگر تمہارے لئے ہی دار آخرت (کی راحتیں) اللہ کے ہاں مخصوص ہیں تمام لوگوں کو چھوڑ کر تو بھلا آرزو تو کرو موت کی اگر تم سچ کہتے ہو۔ اور وہ ہرگز کبھی بھی اس کی تمنا نہ کریں گے اپنی کارستانیوں کے خوف سے۔ اور اللہ خوب جانتا ہے ظالموں کو۔

(ترجمہ بحوالہ ضیاء القرآن)

(آیت 91 تا 95)

نعت شریف

طور نورانی

وہ آشنائے حقیقت وہ کُن کا نکتہ شناس
شفیع ختم رسل رہنما و خیرالناس
جب آپ آئے زمانے کا جاگ اٹھا احساس
بدل گیا ہے یقین میں ہر اک گمان و قیاس
سحر کی اوس ہے پھولوں میں تازگی کی اساس
چمک ہے قطرۂ شبنم میں صورتِ الماس
حضور آپ کے آنے سے چھٹ گئی ظلمت
پہن لیا شبِ تیرہ نے چاندنی کا لباس
بتا رہے ہیں یہ انداز نغمہ سنجی کے
چمن میں خوش ہیں عنادل شگفتہ پھول کے پاس
تمہارے نام کی عظمت کو بیان کروں
تمہارے نام کی برکت سے ہے شہد میں مٹھاس
کوئی بتائے غلامانِ مصطفٰی کے سوا
کسی کو آج تک دنیا بھی آسکی ہے راس
وہ خوش نصیب ہے جس کو بلا لیا طیبہ
اور ایک میں کہ ترے شہر کے لیے ہوں اداس
خدا نے آپ کو رحمت بنا کے بھیجا ہے
ہر اک کو طور ہے لازم خدا کا شکر و سپاس

صلی اللہ علیہ وسلم

امام ابو حنیفہؒ کے جوابات

برگزیدہ ہستیوں سے متعلق میں ایک ایسی کتاب پڑھ رہا تھا جس میں کئی پر اثر اور خوب صورت واقعات تھے۔ ان میں مجھے ایک واقعہ نے بے حد متأثر کیا جو کہ اس طرح تھا۔ "مخالفین اسلام میں ایک شخص اپنی قوم کا انتہائی عالم فاضل مقرر تھا، وہ ایک مذہبی جماعت لے کر بغداد پہنچا اور وہاں کے مسلمانوں کو چیلنج کیا کہ اگر تم ہمارے چار سوالوں کے جواب دے دو تو ہم مسلمان ہو جائیں گے ورنہ تمہیں ہمارا مذہب قبول کرنا ہوگا۔ چنانچہ شہر کے چوک میں عظیم الشان منبر لگایا گیا وہاں لوگوں کا ایک مجمع لگ گیا۔ اس نے اپنا چیلنج دہرایا کوئی ہے جو میرے چار سوالوں کا جواب دینے کے لیے آگے آئے۔ پورے مجمع پر خاموشی چھا گئی۔ اچانک ایک گوشے سے ایک نوجوان طالب علم آیا اور بولا "میں تمہارے سوالات کے جوابات دینے کے لیے تیار ہوں مگر اس شرط پر کہ تم منبر سے اتر کر میرے سامنے آؤ اور مجھے منبر پر بیٹھنے دو اس لیے کہ تم سائل ہو اور میں مجیب (یعنی جواب دینے والا)۔ عالم یہ سن کر نیچے اتر آیا۔ طالب علم منبر پر بیٹھ گیا اور بولا اب تم اپنا سوال پیش کرو۔ عالم نے پہلا سوال کیا "اس وقت خدا کیا کر رہا ہے؟" طالب علم نے جواب دیا "اس وقت خدا نے یہ کیا ہے کہ تم جیسے عالم کو منبر سے اتار کر مجھ جیسے طالب علم کو منبر پر بٹھا دیا تعالیٰ یعنی اللہ جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلت دیتا ہے۔" عالم جواب سن کر دم رہ گیا پھر اس نے سوال کیا "تمہارے رب کا منہ کس طرف ہے؟" طالب علم نے جواب دیا کہ "اگر تم مجھے یہ بتا دو کہ جلتی ہوئی شمع کا منہ کس طرف ہوتا ہے تو یہی تمہارے سوال کا جواب ہے پس سمجھ لو کہ خدا چاروں طرف اپنے نور سے عالم کو منور کر رہا ہے۔" عالم نادم ہوا اور تیسرا سوال کیا "خدا کہاں ہے؟" طالب علم نے کہا "آپ مجھے بتائیں کہ روح کہاں ہے حالانکہ وہ خود تمہارے جسم میں موجود ہے اس کے متعلق تم نہیں بتا سکتے تو پھر کس کی مجال ہے کہ وہ خالق کی روح کے متعلق بتا سکے۔" عالم نے چوتھا سوال کیا "خدا سے پہلے کیا تھا؟" طالب علم نے جواب دیا کہ "آپ مجھے گنتی سنائیں۔" عالم نے ایک سے دس تک کی گنتی گنی اور خاموش ہو گیا۔ طالب علم نے کہا "پھر سناؤ" عالم نے ایک سے پانچ تک گنتی گنی اور خاموش ہو گیا۔ طالب علم نے کہا "پھر سناؤ" عالم نے ایک دو تین کہنا شروع کیا، طالب علم نے کہا "میں گنتی سننا نہیں چاہتا مجھے ایک سے پہلے کی گنتی سناؤ۔"

عالم بڑا پریشان ہوا اور بولا "ایک سے پہلے گنتی ہوتی نہیں۔" طالب علم نے جواب دیا "اے نادان جب مجازی گنتی میں ایک سے پہلے کچھ نہیں تو پھر ایک حقیقی وحدہ لاشریک اس سے پہلے کیا ہو سکتا ہے، وہ ہمیشہ سے ایک ہے اس سے پہلے کچھ نہیں۔" عالم یہ دلائل سن کر زار و قطار رونے لگا اور اپنے ساتھیوں سمیت کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا۔ وہ جواب دینے والے طالب علم امام اعظمؒ تھے۔

(مرسلہ عبداللطیف صابر۔ احمد آباد) ☆☆☆

امام اعظم کا ایک خارجی کو جواب

انقلابات زمانہ سے ایک مرتبہ ایک خارجی شخص جس کا نام ضحاک تھا کوفہ کا گورنر بن گیا۔ یہ شخص بڑا ظالم تھا اور ہمارے امام اعظمؒ کو بھی ضحاک سے ایک دفعہ واسطہ پڑا تھا۔ ضحاک نے گورنری سنبھالتے ہی حضرت امام ابو حنیفہؒ کو گرفتار کر لیا۔ اور کہا تب یا شیخ من الکفر (اے شیخ کفر سے توبہ کر)۔ امام صاحبؒ نے فرمایا انا تائب من کل کفر (میں ہر کفر سے توبہ کرتا ہوں)۔ ضحاک سمجھا کہ ابو حنیفہ نے تمام غیر خارجی عقائد سے توبہ کر لی۔ امام ابو حنیفہ رہا ہو گئے لیکن کسی شریر نے اسے متوجہ کیا کہ ابو حنیفہ نے غیر خارجی عقائد سے توبہ نہیں کی ہے۔ الٹا خارجی عقائد کو کفت بتایا ہے۔ امام ابو حنیفہ پھر بلائے گئے اور پوچھا کہ تم نے کیا خود ہمارے عقائد سے توبہ کی تھی۔ کفر سے کیا ہمارے عقائد تھے؟ امام ابو حنیفہؒ بولے آپ کو یقین ہے کہ میرے پیش نظر کفت کا لفظ استعمال کرتے وقت آپ کے عقائد تھے۔ ضحاک نے جواب دیا یقین کیسے ہو سکتا ہے ظن اور گمان ہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا ان بعض الظن اثم (بعض گمان گناہ ہوتے ہیں)۔ خارجیوں کے نزدیک ہر چھوٹے بڑے گناہ کا مرتکب کافر ہو جاتا ہے۔ امام ابو حنیفہ نے فرمایا اب آپ کفر سے توبہ کیجیے۔ آپ نے گمان کر کے کفر کیا ہے۔ ضحاک ڈر گیا اور بولا بیشک مجھ سے غلطی ہو گئی میں توبہ کرتا ہوں لیکن ابو حنیفہ! تم بھی توبہ کے الفاظ دوبارہ کہو امام ابو حنیفہؒ نے وہی فقرہ دہرایا کہ میں ہر کفر سے توبہ کرتا ہوں اور رہائی پا کر گھر تشریف لے آئے۔

تھا جو نہایت متعصب شیعہ تھا۔ اس کے پاس دو خچر تھے۔ تعصب سے ایک کا ابو بکر اور دوسرے کا عمر نام رکھا تھا۔ اتفاق سے ایک خچر نے لات ماری کہ اس کا سر پھٹ گیا اور اسی صدمے سے مر گیا۔ محلہ میں اس کا چرچا ہوا، امام صاحب نے سنا تو کہا "دیکھنا اسی خچر نے مارا ہو گا جس کا نام عمر رکھا تھا۔" لوگوں نے دریافت کیا تو واقعی ایسا ہی ہوا تھا۔

کوفہ میں ایک غالی شیعہ تھا جو حضرت عثمانؓ کی نسبت کہا کرتا تھا کہ یہودی تھے۔" امام صاحب ایک دن اس کے پاس گئے اور کہا کہ تم اپنی بیٹی ڈھونڈتے تھے ایک شخص موجود ہے جو شریف بھی ہے اور دولت مند بھی ہے۔ اس کے ساتھ پرہیزگار، قائم اللیل حافظ قرآن ہے۔ اس نے کہا تو اس سے بڑھ کر کون ملے گا۔ ضر آپ شادی ٹھہرا دیجیے۔ امام صاحب نے صرف اتنی بات ہے کہ مذہبا یہودی ہے۔" نہایت برہم ہوا اور کہا سبحان اللہ آپ یہودی۔ رشتہ داری کرنے کی رائے دیتے ہیں۔ ا صاحب نے فرمایا "کیا ہوا، جو پیغمبر خدا نے ج یہودی کو (تمہارے اعتقاد کے موافق) داماد تو تم کو کیا عذر ہے۔" خدا کی قدرت اتنی سی با سے اس کو تنبیہ ہو گئی اور اپنے عقیدے سے ت کی۔

☆☆☆☆

خلافت کی نسبت ناجائز ہونے کا احتمال ظاہر کر سکتا ابو العباس کو مجبوراً کہنا پڑا کہ "حق ہوتے ہیں۔" امام صاحب نے فرمایا "پھر حق کی تعمیل میں پوچھنا کیا؟"

ایک شخص نے قسم کھائی کہ آج اگر میں غسل جنابت کروں تو میری بیوی کو تین طلاق ہے۔ تھوڑی دیر میں کہا کہ آج میں بیوی کے ساتھ صحبت نہ کروں تو اس کو طلاق ہے۔ لوگوں نے آکر امام صاحب سے مسئلہ آکر پوچھا۔ امام صاحب نے فرمایا کہ نماز عصر پڑھ کر بیوی سے ہم صحبت ہو اور غروب کے بعد غسل کر کے فوراً مغرب کی نماز پڑھ لے اس صورت میں سب شرطیں پوری ہو گئیں۔ بیوی سے ہم صحبت بھی ہوا، نماز بھی قضا نہیں کی، غسل کیا تو اس وقت کہ دن گزر چکا تھا۔

ایک دفعہ ایک شخص امام صاحب کے پاس آیا اور کہا کہ میں نے روپے ایک جگہ احتیاط سے رکھ دیے، اب یاد نہیں آتا کہ کہاں رکھے تھے۔ مجھ کو سخت ضرورت در پیش ہے۔ کوئی تدبیر بتائیے۔ امام صاحب نے فرمایا "بھائی یہ مسئلہ تو فقہ میں مذکور نہیں مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟ اس نے زیادہ لجاجت کی تو کہا کہ "آج ساری رات نماز پڑھو۔" اس نے جاکر نماز پڑھنی شروع کی، اتفاق سے تھوڑی ہی دیر کے بعد اس کو یاد آیا کہ روپے فلاں جگہ رکھے تھے۔ دوڑا ہوا امام صاحب کے پاس آیا اور عرض کی کہ آپ کی تدبیر راست آئی۔ فرمایا کہ "ہاں شیطان کب گوارا کرتا ہے کہ تم رات بھر نماز پڑھتے رہو۔ اس لیے اس نے جلد یاد دلا دیا تاہم تم کو مناسب تھا کہ اس کے شکریے میں شب بیداری کرتے اور نمازیں پڑھتے۔

امام صاحب کی رحم دلی

ایک دن ایک شخص نے آکر کہا کہ میں نے اسباب گھر کے کسی کونے میں گاڑ دیا تھا۔ اب یاد نہیں آتا کہ کہاں گاڑا تھا کیا کروں۔ امام صاحب نے کہا تم کو یاد نہیں تو مجھ کو اور بھی یاد نہ ہونا چاہیے۔ وہ رونے لگا، امام صاحب کو رحم آیا چند شاگرد ساتھ لیے اور اس کے گھر پر گئے شاگردوں سے کہا اگر یہ تمہارا گھر ہوتا اور تم حفاظت کے لیے کوئی چیز چھپا کر رکھتے تو کہاں رکھتے۔ سب نے اپنے اپنے قیاس سے مختلف موقعے بتلائے۔ امام صاحب نے فرمایا کہ "انہی تین چار جگہوں میں سے کہیں نہ کہیں گاڑا ہوگا۔" ان کے کھدوانے کا حکم دیا۔ خدا کی شان تیسری جگہ کھودی تو اسباب بجنسہ مدفون ملا۔

امام صاحب اگرچہ نہایت ثقہ، متین اور باوقار تھے تاہم ذہانت کی شوخیاں کبھی کبھی ظرافت کا رنگ دکھاتی تھیں۔ ایک دن اصلاح بنوا رہے تھے۔ حجام سے کہا کہ "سفید بالوں کو چن لینا۔" اس نے عرض کیا کہ "جو بال چنے جاتے ہیں اور زیادہ نکلتے ہیں۔" امام صاحب نے کہا "یہ قاعدہ ہے تو سیاہ بالوں کو چن لو کہ وہ اور زیادہ نکلیں۔" قاضی شریک نے یہ حکایت سنی تو کہا کہ ابو حنیفہ نے حجام کے ساتھ بھی قیاس کو نہ چھوڑا۔ امام صاحب کے محلے میں ایک [illegible]

سے نکلے تو ربیع نے کہا "آج تو آپ نے میری ہی جان لے چکے تھے۔" امام صاحب نے فرمایا "یہ تمہارا ارادہ تھا، میں نے صرف مدافعت کی تھی۔"

امام صاحب اور خارجی

ایک دفعہ بہت سے خارجی امام صاحب کے گھر پر چڑھ دوڑے اور کہا کہ کفر سے توبہ کرو۔ امام صاحب نے کہا "ہاں میں تمہارے کفر سے توبہ کرتا ہوں۔" خارجیوں کا اعتقاد ہے کہ گناہ کرنے سے انسان کافر ہو جاتا ہے۔ یعنی گناہ اور کفر ایک چیز ہے۔ امام صاح کا مطلب یہ تھا کہ جس چیز کو تم کفر سمجھتے ہو میں اس سے توبہ کرتا ہوں۔ کسی نے ان خارجیوں سے لگایا کہ ابو حنیفہ نے تم لوگوں کو دھوکہ دیا، ان کا مطلب اور تھا، خارجیوں نے امام صاحب کو پکڑا کہ تم نے تاویل کیوں کی۔ امام صاحب نے کہا تم کو یقین ہے یا محض گمان کی بنا پر میری نسبت ایسا خیال کرتے ہو؟ بولے کہ نہیں گمان ہی گمان ہے۔ امام صاحب نے کہا تو تم کو خود توبہ کرنی چاہیے کیوں کہ خدا فرماتا ہے: انّ بعض الظنّ اثم۔

ایک دن مسجد میں تشریف رکھتے تھے، شاگردوں کا مجمع تھا، دفعتہً خارجیوں کا ایک گروہ مسجد میں گھس آیا۔ لوگ بھاگ چلے۔ امام صاحب نے روکا اور تسلی دی کہ ڈرو نہیں اطمینان سے بیٹھ جاؤ۔ ایک خارجی جو سب کا سردار تھا۔ امام صاحب کے پاس آیا۔

امام صاحب نے کہا "خدا نے فرمایا کہ وانّ احد من المشرکین استجارك فاجرۃ حتیٰ یسمع کلام اللّٰہ ثم ابلغه مامنه یعنی مشرکین میں سے کوئی شخص اگر پناہ مانگے تو اسے پناہ دو تاکہ وہ خدا کا کلام سنے۔ پھر اس کو اس کے مامن تک پہنچا دو۔" خارجی اپنے سوا مسلمانوں کے تمام فرقوں کو مشرک اور کافر سمجھتے ہیں اور واجب القتل جانتے ہیں۔ اس موقع پر وہ اس نیت سے آئے تھے کہ امام ابو حنیفہ اپنا عقیدہ بیان کریں تو کفر کا الزام لگا کر ان کو قتل کر دیں لیکن امام صاحب کے الزامی جواب نے ان کو بالکل مجبور کر دیا۔ چنانچہ ان کے سردار نے ساتھیوں سے کہا کہ "ان کو قرآن پڑھ کر سناؤ اور ان کو ان کے گھر پہنچا دو۔

ایک اور واقعہ

ابو العباس جو منصور کے دربار میں ایک معزز درجہ رکھتا تھا امام صاحب کا دشمن تھا اور ہمیشہ ان کو ضرر پہنچانے کی فکر میں رہتا تھا۔ ایک دن امام صاحب کسی ضرورت سے دربار میں گئے، اتفاق سے ابو العباس بھی حاضر تھا۔ اس نے کہا آج ابو حنیفہ میرے ہاتھ سے بچ کر نہیں جا سکتے۔

امام صاحب کی طرف مخاطب ہوا اور کہا کہ "ابو حنیفہ! امیر المومنین کبھی کبھی ہم لوگوں کو بلا کر حکم دیتے ہیں کہ اس شخص کی گردن مار دو، ہم کو مطلق معلوم نہیں ہوتا کہ وہ شخص واقعی مجرم ہے یا نہیں۔ ایسی حالت میں ہم کو اس حکم کی تعمیل کرنی چاہیے؟" امام صاحب نے کہا "تمہارے نزدیک خلیفہ کے احکام حق ہوتے ہیں یا باطل؟" منصور کے سامنے کس کی تاب تھی کہ احکام

تم کو پسند ہے۔ دونوں نے کہا "ہاں" امام صاحب نے کہا کہ تم اپنی بیویوں کو جن سے تمہارا نکاح بندھا تھا طلاق دے دو اور ہر شخص اس عورت سے نکاح پڑھا لے جو اس کے ساتھ ہم بستر رہ چکی۔ سفیان نے جو جواب دیا اگرچہ فقہ کی رو سے یہ بھی صحیح تھا کیونکہ یہ صورت وطی بالشبہہ کی ہے جس سے نکاح نہیں ٹوٹتا لیکن امام صاحب نے مصلحت کو پیش نظر رکھا، وہ جانتے تھے کہ موجودہ صورت میں نکاح کا قائم رہنا غیرت وحمیت کے خلاف ہوگا۔ کسی مجبوری سے زوجین نے بھی تسلیم کر لیا تو دونوں میں وہ خلوتِ صحیحہ سے پہلے طلاق دی جائے تو صرف آدھا مہر لازم آتا ہے۔

ایک دلچسپ فتویٰ

لیث بن سعد جو مصر کے مشہور امام تھے ان کا بیان ہے کہ میں ابو حنیفہ کا ذکر اکثر سنا کرتا تھا اور ان کے دیکھنے کا نہایت مشتاق تھا۔ حج کی تقریب سے مکہ معظمہ جانا ہوا، اتفاق سے ایک مجلس میں پہنچا، دیکھا تو بڑا ہجوم ہے، ایک شخص صدر کی جانب بیٹھا ہے اور لوگ اس سے مسئلے پوچھ رہے ہیں۔ ایک شخص نے بڑھ کر کہا "یا ابو حنیفہ" یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے ان کو پہچانا، امام ابو حنیفہ اس طرف متوجہ ہوئے۔ اس نے کہا "میرا ایک بدمزاج بیٹا ہے، اس کی شادی کر دیتا ہوں تو بیوی کو طلاق دے دیتا ہے، لونڈی خرید تا ہوں تو آزاد کر دیتا ہے۔ فرمایئے کیا تدبیر کروں؟" امام ابو حنیفہ نے برجستہ کہا "تم اس کو ساتھ لے کر بازار جاؤ اور جو لونڈی پسند آئے خرید کر اس کا نکاح پڑھا دو اب اگر وہ آزاد کر دے گا تو نہیں کر سکتا کیونکہ لونڈی اس کی ملک نہیں، طلاق دے گا تو تمہارا کوئی نقصان نہیں، تمہاری لونڈی کہیں نہیں گئی۔؟" سعد کہتے ہیں کہ مجھ کو جواب پر تو کم لیکن حاضر جوابی پر بہت تعجب ہوا۔

خلیفہ منصور اور امام صاحب

ربیع جو خلیفہ منصور کا عرض بیگی تھا امام ابو حنیفہ سے عداوت رکھتا تھا۔ ایک دن امام صاحب حسب الطلب دربار میں گئے۔ ربیع بھی حاضر تھا۔ منصور سے کہا کہ حضور! یہ شخص امیر المومنین کے جد بزرگوار (عبد اللہ بن عباس) کی مخالفت کرتا ہے، ان کا قول ہے کہ "اگر کوئی شخص کسی بات پر قسم کھائے اور دو ایک روز کے بعد انشاء اللہ کہہ لے تو وہ قسم میں داخل سمجھا جائے گا اور قسم کا پورا کرنا کچھ ضرور نہ ہوگا۔ ابو حنیفہ اس کے خلاف فتویٰ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انشاء اللہ کا لفظ قسم کے ساتھ ہو تو البتہ جزو قسم سمجھا جائے گا ورنہ لغو اور بے اثر ہے۔" امام صاحب نے کہا "امیر المومنین! ربیع کا خیال ہے کہ لوگوں پر آپ کی بیعت کا کچھ اثر نہیں۔" منصور نے کہا "یہ کیونکر؟" امام صاحب نے کہا "ان کا گمان ہے کہ جو لوگ دربار میں آپ کے ہاتھ پر بیعت خلافت کیا کرتے ہیں اور قسم کھاتے ہیں گھر جا کر انشاء اللہ کہہ لیا کرتے ہیں جس سے قسم بے اثر ہو جاتی ہے اور ان پر شرعاً کچھ مواخذہ نہیں رہتا۔" منصور ہنس پڑا اور ربیع سے کہا کہ تم ابو حنیفہ کو نہ چھیڑو، ان پر تمہارا داؤ نہیں چل سکتا۔ امام صاحب دربار

ایک شخص کسی بات پر اپنی بیوی سے ناراض ہوا اور قسم کھائی کہ "جب تک تو مجھ سے نہ بولے گی میں تجھ سے کبھی نہ بولوں گا۔" عورت تند مزاج تھی، اس نے بھی قسم کھالی اور وہی الفاظ دہرائے جو شوہر نے کہے تھے۔ اس وقت غصے میں کچھ نہ سوجھا پھر خیال آیا تو دونوں کو نہایت افسوس ہوا۔ شوہر امام ابو سفیان ثوری کے پاس گیا اور صورت حال بیان کی، سفیان نے کہا قسم کا کفارہ دینا ہوگا، اس کے سوا چارہ نہیں۔ وہ مایوس ہو کر اٹھا اور امام ابو حنیفہ کی خدمت میں حاضر ہوا کہ لللہ آپ ہی کوئی تدبیر بتائیے، امام صاحب نے فرمایا جاؤ شوق سے باتیں کرو، کسی پر کفارہ نہیں ہے۔ امام سفیان ثوری کو معلوم ہوا تو نہایت برہم ہوئے اور امام ابو حنیفہ سے جاکر کہا کہ آپ لوگوں کو غلط مسئلے بتایا کرتے ہیں، امام صاحب نے اس شخص کو بلا بھیجا اور کہا کہ تم دونوں دوبارہ واقعہ کی صورت حال بیان کر جاؤ۔ اس نے اعادہ کیا۔ امام سفیان کی طرف مخاطب ہوئے اور کہا میں نے جو کہا تھا اب بھی کہتا ہوں، سفیان نے کہا وہ کیوں؟ فرمایا جب عورت نے شوہر کو مخاطب کر کے وہ الفاظ کہے تو عورت کی طرف سے بولنے کی ابتدا ہو چکی، پھر قسم کہاں باقی رہی۔ سفیان نے کہا، حقیقت میں آپ کو جو بات وقت پر سوجھ جاتی ہے ہم لوگوں کا وہاں تک خیال بھی نہیں جاتا۔

ایک معرکہ آرا فیصلہ

کوفہ میں ایک شخص نے بڑی دھوم دھام سے ایک ساتھ ہی اپنی دو بیٹیوں کی شادی کی، دلیمہ کی دعوت میں شہر کے تمام اعیان و اکابر کو مدعو کیا، مسعر بن کدام، حسن بن صالح، سفیان ثوری، امام ابو حنیفہ شریک تھے، لوگ بیٹھے کھا رہے تھے کہ دفعتہً صاحب خانہ بد حواس گھر سے نکلا اور کہا غضب ہو گیا، لوگوں نے کہا خیر ہے، بولا کہ زفاف کی رات عورتوں کی غلطی سے شوہر اور بیبیاں بدل گئیں، جو لڑکی جس کے پاس رہی وہ اس کا شوہر نہ تھا، اب کیا کیا جائے۔ سفیان ثوری نے کہا معاویہ کے زمانے میں بھی ایسا ہی اتفاق ہوا تھا، اس سے نکاح میں کچھ فرق نہیں آتا، البتہ دونوں کو مہر دینا لازم ہوگا، مسعر بن کدام امام ابو حنیفہ کی طرف مخاطب ہوئے کہ آپ کی کیا رائے ہے؟ امام صاحب نے کہا شوہر خود میرے سامنے آئیں تو جواب دوں۔ لوگ جاکر بلا لائے۔ امام صاحب نے دونوں سے الگ الگ پوچھا کہ رات کو جو عورت تمہارے ساتھ رہی وہی تمہارے نکاح میں رہے تو

پابند اور بد ترین معاصی سے محترز رہے اس کی مغفرت کی بہر حال امید کی جا سکتی ہے۔ جو شخص حدیث سیکھتا ہے اور اس سے استنباط مسائل نہیں کرتا وہ ایک عطار ہے جس کے پاس دوائیں ہیں لیکن یہ نہیں جانتا کہ کون کس مرض کے لیے ہے۔ جو شخص علم کا مذاق نہیں رکھتا اس کے آگے علمی گفتگو کرنی اس کو اذیت دینی ہے۔ اپنے دوست (نفس) کے لیے گناہ جمع کرنے اور دشمن (ورثا) کے لیے مال فراہم کرنا کیسی غلطی ہے۔

ایک شخص نے پوچھا فقہ کے حاصل ہونے میں کیا چیز معین ہو سکتی ہے؟ امام صاحبؒ نے فرمایا "دلجمعی"۔ اس نے عرض کی کہ دلجمعی کیونکر حاصل ہو؟ ارشاد ہوا کہ تعلقات کم کئے جائیں۔ پوچھا کہ تعلقات کیونکر کم ہو؟ جواب دیا کہ انسان ضروری چیزیں لے لے اور غیر ضروری چیزیں چھوڑ دے۔

ایک بار کسی نے سوال کیا کہ حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کی لڑائیوں کی نسبت آپ کیا کہتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ قیامت میں جن باتوں کی پرشس ہوگی مجھ کو ان کا ڈر لگا رہتا ہے۔ ان واقعات کو خدا مجھ سے نہ پوچھے گا اس لیے اس پر توجہ کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔

اس سے یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ وہ اس بحث کے متعلق اپنی ذاتی رائے نہیں رکھتے خود ان کا قول ہے کہ حضرت علیؓ کی نظیر اگر ہمارے سامنے موجود نہ ہوتی تو ہم نہ بتا سکتے کہ باغیوں کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے۔ امام شافعیؒ کا بھی یہی قول ہے، البتہ ان باتوں کو اسلام کا ایک ضروری مسئلہ قرار دینا اور اس پر نکتوں کا دفتر تیار کرنا ایک فضول کام ہے اور اسی کی طرف امام صاحبؒ نے اشارہ کیا ہے۔

ایک دفعہ ایک شخص تحصیل علم کی غرض سے امام صاحبؒ کے پاس حاضر ہوا اور سفارشی خط پیش کیا۔ امام صاحبؒ نے فرمایا علم میں سعی و سفارش کا کام نہیں۔ علماء کا خود فرض ہے کہ ان کو جو کچھ آتا ہو دوسروں کو بھی بتائیں۔ علم کے دربار میں خاص و عام کی کوئی تفریق نہیں۔

ایک دفعہ گورنر کوفہ نے کہا آپ ہم سے الگ کیوں رہتے ہیں؟ فرمایا روٹی کا ایک ٹکڑا اور معمولی کپڑا اس عافیت سے مل جائے تو اس عیش سے بہتر ہے جس کے بعد ندامت اٹھانی پڑے۔ اسی مضمون کو ایک شاعر نے نہایت خوبی اور سادگی سے ادا کیا ہے وہ کہتا ہے ؎

دو قرص نان اگر از گندم است یا از جو ــ دو تائے جامہ اگر کہنہ است یا از نو
چہار گوشہ دیوار خود بخاطر جمع ــ کہ کس نگوید ازیں جا بخیز و آں جا رو
ہزار بار نکوتر بہ نزد ابن یمین ــ ز فر مملکت کیقباد و کیخسرو

امام صاحب کے بعض اشعار

امام صاحب کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے لیکن تشبیب و غزل کی حیثیت سے نہیں بلکہ وعظ و پند کے طور پر چنانچہ فرماتے ہیں:

ومن المروۃ للفتیٰ ما عاش دار فاخرۃ
فاشکر اذا اوتیتھا واعمل لدار الآخرۃ

یعنی انسان جب تک زندہ ہے عزت و آبرو کے لیے اس کو ایک اچھا مکان چاہیے، ایسا مکان نصیب ہو تو شکر کرنا چاہیے اور عاقبت کے مکان کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔☆☆☆☆

اور علوم کی مجلس ہو تو خود نہ جاؤ بلکہ اپنے معتمد دوستوں یا شاگردوں کو بھیج دو کہ وہ آکر تم سے پورے حالات بیان کریں۔

ہر بات میں تقویٰ اور امانت کو پیش نظر رکھو۔ خدا کے ساتھ دل سے وہی معاملہ رکھو جو لوگوں کے سامنے ظاہر کرتے ہو جس وقت اذان کی آواز آئے فوراً نماز کے لیے تیار ہو جاؤ۔ ہر مہینے میں دو چار دن روزہ کے لیے مقرر کر لو۔ نماز کے بعد ہر روز کسی قدر وظیفہ پڑھا کرو۔ قرآن کی تلاوت قضا نہ ہونے پائے۔ دنیا پر بہت مائل نہ ہو، اکثر قبرستان میں نکل جایا کرو، لہو و لعب سے پرہیز رکھو، ہمسایہ کی کوئی برائی دیکھو تو پردہ پوشی کرو۔ اہلِ بدعت سے بچتے رہو۔ نماز میں جب تک تم کو لوگ خود امام نہ بنائیں امام نہ بنو۔ جو تم سے ملنے آئیں ان کے سامنے علمی تذکرہ کرو، اگر وہ اہلِ علم ہوں گے تو فائدہ اٹھائیں گے ورنہ کم از کم ان کو تم سے محبت ہوگی۔

عبدالعزیز بن رزاد کو خلیفہ نے دربار میں بلایا وہ امام صاحبؒ کے شاگرد تھے۔ مشورہ کے لیے ان کے پاس آئے اور کہا خلیفہ نے طلب کیا ہے میں چاہتا ہوں کہ اس کے سامنے وعظ کہوں مگر کیا کہوں اور کس طریقہ سے کہوں؟ اس میں آپ کی ہدایت چاہتا ہوں۔ امام صاحبؒ نے فرمایا یہ کہنا کہ اے امیر المومنین! دنیا کے طلب کرنے کی تین غرضیں ہو سکتی ہیں: عزت، ملک، مال۔ یہ سب آپ کو حاصل ہیں، اب تقویٰ اور عمل صالح بھی اختیار کیجئے کہ دنیا و آخرت دونوں کی دولتیں حاصل ہوں۔

اس موقع پر امام صاحبؒ کے حکیمانہ مقولے بھی سننے اور یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ فرمایا کرتے تھے کہ جس شخص کو علم نے بھی معاصی اور فواحش سے باز نہ رکھا اس سے زیادہ زیاں کار کون ہوگا۔ جو شخص علم دین میں گفتگو کرے اور اس کو یہ خیال نہ ہو کہ ان باتوں کی باز پرس ہوگی وہ مذہب اور خود اپنے نفس کی قدر نہیں جانتا۔ اگر علماء خدا کے دوست نہیں ہیں تو عالم میں خدا کا کوئی دوست نہیں۔ جو شخص قبل از وقت ریاست کی تمنا کرتا ہے ذلیل ہوتا ہے۔ جو شخص دنیا کے لیے علم سیکھتا ہے علم اس کے دل میں جگہ نہیں پکڑتا۔ سب سے بڑی عبادت ایمان اور سب سے بڑا گناہ کفر ہے، پس جو شخص افضل ترین عبادت کو

امام ابو حنیفہؒ کی خصوصیات

☆ تابعی تھے۔

☆ عالم، محدث، فقیہ، عابد اور زاہد تھے۔

☆ محبِ اہل بیت تھے اور اس سلسلہ میں بڑی تکلیفیں وقت کی حکومت کے ہاتھوں اٹھائیں۔

☆ امام مالکؒ سے عمر میں بڑے تھے لیکن ان کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے۔

☆ دولت مند تھے لیکن دریا دل، معزز تھے لیکن منکسر المزاج، طاقتور تھے لیکن متحمل۔

☆ حق کے مقابلے میں حکومت کی ناخوشی مول لی جیل بھیجے گئے، وہاں جب روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی تب رہائی ملی۔

☆ تقریباً تمام اسلامی حکومتوں میں مذہب حنفی رہا عالم اسلام کی غیر معمولی اکثریت حنفی ہے۔

☆ امام جعفرؒ کے اجل تلامذہ میں تھے۔

تاہم آپ کی غلطی پر مطلع کرنا میرا فرض ہے پھر بھی نہ مانے تو تنہائی میں سمجھانا کہ آپ کا یہ فعل قرآن مجید اور احادیث نبوی کے خلاف ہے۔ اگر سمجھ گیا تو خیر ورنہ خدا سے دعا کرنا کہ اس کے شر سے تم کو محفوظ رکھے۔"

زندگی کے معمولی کاروبار کے متعلق بھی نہایت عمدہ ہدایتیں کی ہیں۔ چنانچہ تحریر فرماتے ہیں کہ تحصیل علم کو سب پر مقدم رکھنا۔ اس سے فراغت ہو چکے تو جائز ذریعوں سے دولت حاصل کرنا۔ کیوں کہ ایک وقت میں علم و دولت دونوں کی تحصیل نہیں ہو سکتی۔ پھر نکاح کرنا لیکن اس وقت جب یہ یقین ہو کہ اہل و عیال کی تمام ذمہ داریاں اٹھا سکو گے ایسی عورت سے شادی نہ کرنا جو دوسرے شوہر سے اولاد رکھتی ہو۔ عام آدمیوں اور خصوصاً دولت مندوں سے کم میل جول رکھنا ورنہ ان کو گمان ہوگا کہ تم ان سے کچھ توقع رکھتے ہو اور اس خیال سے وہ رشوت دینے پر آمادہ ہوں گے۔ بازار نہ جانا۔ دکان پر بیٹھنا، راستہ یا مسجد میں کوئی چیز کھا لینا، سقایات یا سقاؤں کے ہاتھ سے پانی پی لینا ان باتوں سے نہایت احتراز رہے۔ کوئی شخص مسئلہ پوچھے تو صرف سوال کا جواب دو، اپنی طرف سے کچھ نہ بڑھاؤ، عقائد کے متعلق عوام سے گفتگو نہیں کرنی چاہیے۔ شاگردوں کے ساتھ ایسے خلوص اور محبت سے پیش آؤ کہ کوئی غیر دیکھے تو سمجھے تمہاری اولاد ہیں عام اور معمولی رتبہ کے لوگ مناظرہ کرنا چاہیں تو احتراز کرو۔ کسی شہر میں جانا ہو تو وہاں کے علماء و فضلاء سے اس طرح ملو کہ ان کو رقابت کا خیال نہ ہو۔ علمی تذکرہ آئے تو جوبات کہو خوب سوچ سمجھ کر کہو اور وہی کہو جس کا کافی ثبوت دے سکتے ہو۔ مناظرہ کے وقت نہایت جرأت و استقلال سے کام لو ورنہ دل میں ذرہ بھی خوف ہوگا تو خیالات مجتمع نہ رہ سکیں گے اور زبان میں لغزش ہوگی۔ جو لوگ آدابِ مناظرہ سے واقف نہیں یا مناظرہ کرنا چاہتے ہیں ان سے ہرگز گفتگو نہیں کرنی چاہیے۔ مناظرہ کے وقت غصہ نہ کرنا چاہیے ہنسنا کم چاہیے۔ زیادہ ہنسی سے دل افسردہ ہوتا ہے۔ جو کام کرو اطمینان اور وقار کے ساتھ کرو۔ کوئی شخص جب تک سامنے سے نہ پکارے کبھی جواب نہ دو کیونکہ پیچھے سے پکارنا جانوروں کے لیے مخصوص ہے۔ راستہ چلو تو دائیں بائیں نہ دیکھو۔ حمام میں جاؤ تو عام آدمیوں کی نسبت زیادہ اجرت دو، صبح اور دوپہر کے وقت حمام میں نہ جاؤ بلکہ نوکر کو بھیج کر منگوالو، خانگی کاروبار دیانتدار نوکروں کے ہاتھ میں چھوڑ دینا چاہیے کہ تم کو اپنے مشاغل کے لیے کافی وقت اور فرصت ہاتھ آئے۔ بادشاہ کے قریب سکونت اختیار نہ کرو۔ ہر بات سے بے پروائی اور بے نیازی ظاہر ہو اور فقر کی حالت میں بھی وہی استغنا قائم رہے۔ عام آدمیوں میں بیٹھ کر وعظ نہ کہو کیونکہ ایسے موقع پر واعظ اکثر جھوٹ بولنے پر مجبور ہوتا ہے۔ شاگردوں میں کسی کو فقہ کے درس کی اجازت دو تو خود بھی اس کی درس گاہ میں شریک ہو کہ اس کے متعلق رائے قائم کر سکو۔ وہ اگر کبھی غلطی کر جائے تو بتا دو ورنہ تمہارے چپ رہنے سے لوگوں کو گمان ہوگا کہ اس نے جو کہا صحیح کہا نقہ کے سوا

گئے۔ ہارون الرشید کو پہلے سے خبر ہو چکی تھی۔ اس نے قدر دانی کے لحاظ سے شہزادوں کو بھیجا کہ خود جا کر امام محمدؒ سے اس کی سند لیں۔

ان کتابوں کے علاوہ امام محمدؒ کی اور تصانیف بھی فقہ میں موجود ہیں، مثلاً کیانیات، جرجانیات، رقیات، ہارونیات۔ لیکن یہ کتابیں فقہا کی اصطلاح میں ظاہر الروایۃ میں داخل نہیں، بلکہ کتاب الحج جس کا ذکر اوپر ہو چکا وہ بھی اس سلسلہ سے خارج ہے۔

امام زفرؒ

فقہ میں اگرچہ ان کا رتبہ امام محمدؒ سے زیادہ مانا جاتا ہے لیکن چونکہ ان کی کوئی تصنیف موجود نہیں ہے اور ان کے حالات بھی بہت کم ملتے ہیں اس لیے صاحبین سے ان کو مؤخر رکھنا پڑا۔

یہ عربی النسل تھے۔ شروع زمانہ میں ان کو حدیث کا شغل رہا اور اسی وجہ سے جیسا کہ علامہ نووی نے تہذیب اللغات میں تصریح کی ہے۔ صاحب الحدیث کہلاتے تھے، پھر فقہ کی طرف توجہ کی اور اخیر عمر تک یہی مشغلہ رہا۔

یحیٰ بن معینؒ جو فن جرح و تعدیل کے امام ہیں ان کا قول ہے کہ زفر صاحب الرائی ثقہ مامون۔ بعض لوگوں نے ان کی تصنیف بھی بتائی ہے لیکن وہ مبہم ہے اور قابلِ اعتبار نہیں۔

ان کو خاص کر قیاس احکام میں نہایت کمال تھا، امام ابو حنیفہؒ ان کی نسبت فرمایا کرتے تھے کہ قیس اصحابی وکیع بن الجراح جن کا ذکر اوپر گزر چکا ان سے استفادہ کرتے تھے۔ عہدہ بھی ان کو ملا تھا۔

سنہ ۱۱۰ھ میں پیدا ہوئے اور سنہ ۱۵۸ھ میں
کی۔

☆☆☆☆

حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ ہر رات تین سو رکعت نفل پڑھا کرتے تھے۔ ایک بار آپ کہیں جا رہے تھے کہ راستے میں ایک شخص نے دوسرے سے کہا یہ وہ امام ہے جو ہر رات پانچ سو رکعات نفل پڑھتا ہے۔ حضرت امامؒ نے یہ سنا تو اسی وقت یہ نیت کر لی کہ آج سے پانچ سو رکعات ہی نفل پڑھا کروں گا تاکہ اس کا گمان درست ہو جائے۔ ایک دن آپ کے شاگردوں نے آپ سے کہا کہ لوگ کہتے ہیں کہ امام صاحب رات بھر عبادت کرتے رہتے ہیں اور نہیں سوتے فرمایا آج سے میں ایسا ہی کیا کروں گا اور ساری رات جاگا کروں گا کیوں کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو بندے اس چیز کی تعریف کو پسند کرتے ہیں جو ان میں نہیں ہے پس وہ ہرگز عذاب سے نہ چھوٹیں گے۔ لہٰذا آئندہ میں ساری رات جاگا کروں تاکہ اس آیت کی زد میں نہ آجاؤں اس کے ب
آپ نے چالیس برس تک عشا کے وضو سے
کی نماز پڑھی اور آپ نے جس جگہ وفات
وہاں آپ نے سات ہزار بار قرآن شریف
فرمایا تھا۔ (تذکرۃ الاولیاء اور جواہر البیان ترجمۃ الخیرات الحسان)

ہم ذیل میں ان کتابوں کی فہرست لکھتے ہیں جن میں امام ابو حنیفہؒ کے مسائل روایۃً مذکور ہیں اور اس لیے وہ فقہ حنفی کے اصل خیال کیے جاتے ہیں۔

مبسوط: اصل میں یہ کتاب قاضی ابو یوسفؒ کی تصنیف ہے ان ہی مسائل کو امام محمدؒ نے زیادہ توضیح اور خوبی سے لکھا، یہ امام محمدؒ کی پہلی تصنیف ہے۔

جامع صغیر: مبسوط کے بعد تصنیف ہوئی۔ اس کتاب میں امام محمدؒ نے قاضی ابو یوسفؒ کی روایت سے امام ابو حنیفہؒ کے تمام اقوال لکھے ہیں۔ کل ۵۳۲ مسئلے ہیں جن میں سے ایک سو ستر مسئلوں کے متعلق اختلاف رائے بھی لکھا ہے۔ اس کتاب میں تین قسم کے مسائل ہیں۔

۱۔ جن کا ذکر بجز اس کتاب کے اور کہیں نہیں پایا جاتا۔

۲۔ اور کتابوں میں بھی مذکور ہیں لیکن ان کتابوں میں امام محمدؒ نے تصریح نہیں کی تھی کہ یہ خیال ابو حنیفہؒ کے مسائل ہیں، اس کتاب میں تصریح کردی ہے۔

۳۔ اور کتابوں میں مذکور تھے، لیکن اس کتاب میں جن الفاظ سے لکھا ہے اس سے بعض نئے فائدے مستنبط ہوتے ہیں اس کتاب کی تیس چالیس شرحیں لکھی گئیں، جن کے نام اور مختصر حالات کشف الظنون وغیرہ میں ملتے ہیں۔

جامع کبیر: جامع صغیر کے بعد لکھی گئی ضخیم کتاب ہے۔ اس میں امام ابو حنیفہؒ کے اقوال بھی لکھے ہیں۔ ہر مسئلہ کے ساتھ دلیل بھی لکھی ہے۔ متأخرین خلیفہ نے اصول فقہ کے جو مسائل قائم کئے ہیں زیادہ تر اسی کتاب کے طرز استدلال اور طریق استنباط سے کئے ہیں۔ بڑے بڑے نامور فقہا نے اس کی شرحیں لکھیں جن میں سے ۴۲ شرحوں کا ذکر کشف الظنون میں ہے۔

زیادات: جامع کبیر کی تصنیف کے بعد جو فروع یاد آئے وہ اس میں درج کئے اور اسی لیے زیادات نام رکھا۔

کتاب الحج: امام محمدؒ امام ابو حنیفہؒ کی وفات کے بعد مدینہ منورہ گئے اور تین برس وہاں رہ کر امام مالکؒ سے مؤطا پڑھی، اہلِ مدینہ کا طریقہ جدا تھا۔ بہت سے مسائل میں وہ لوگ امام ابو حنیفہؒ سے اختلاف رکھتے تھے۔ امام محمدؒ نے مدینہ سے آکر یہ کتاب لکھی، اس میں اوّل وہ ابو حنیفہؒ کا قول نقل کرتے ہیں، پھر مدینہ والوں کا اختلاف بیان کر کے حدیث، اثر، قیاس سے ثابت کرتے ہیں کہ ابو حنیفہؒ کا مذہب صحیح ہے اور دوسروں کا غلط۔ امام رازیؒ نے مناقب الشافعی میں اس کتاب کا ذکر کیا ہے، یہ کتاب چھپ گئی ہے اور ہر جگہ ملتی ہے، میں نے اس کا ایک قلمی نسخہ بھی دیکھا ہے۔

سیر صغیر و کبیر: یہ سب سے اخیر کی تصنیف ہے، سب سے پہلے صغیر لکھی اس کا ایک نسخہ امام اوزاعیؒ کی نظر سے گزرا انہوں نے طعن سے کہا کہ اہلِ عراق کو فن سیر سے کیا نسبت۔ امام محمدؒ نے سنا تو سیر لکھنا شروع کی، تیار ہو چکی تو ساٹھ جزوں میں آئی۔ امام محمدؒ اس ضخیم کتاب کو

تھے اور شاگردوں کی نسبت ان کے ساتھ خاص مراعات کے ساتھ پیش آتے تھے ایک دن ہارون الرشید کے دربار میں جارہے تھے راہ میں امام شافعیؒ ملے جو ان کی ملاقات کو آرہے تھے۔ اسی وقت گھوڑے سے اترے اور نوکر سے کہا کہ خلیفہ کے پاس جا اور عذر بیان کر کہ میں اس وقت حاضر نہیں ہو سکتا۔ امام شافعی نے کہا میں کسی وقت حاضر ہوں گا آپ دربار تشریف لے جائیں۔ امام محمدؒ نے کہا نہیں وہاں جانا کچھ ضروری نہیں۔ امام محمد و امام شافعیؒ میں اکثر مناظرات بھی رہتے تھے اور اسی بنا پر بعضوں کو ان کی شاگردی سے انکار ہے لیکن اس زمانہ کی استادی و شاگردی میں یہ امر معیوب نہ تھے اور در اصل آج بھی معیوب نہیں۔

امام محمد کی شہرت زیادہ تر فقہ میں ہے ان کی تصنیفات عموماً اسی فن کے متعلق پائی جاتی ہیں لیکن وہ تفسیر، حدیث اور ادب میں بھی اجتہاد کا درجہ رکھتے تھے۔

امام شافعیؒ کا قول ہے کہ میں نے قرآن مجید کا عالم امام محمدؒ سے بڑھ کر نہیں دیکھا۔ ادب و عربیت میں اگرچہ ان کی کوئی تصنیف موجود نہیں لیکن فقہ کے جو مسائل نحو کی جزئیات پر مبنی ہیں اکثر جامع کبیر میں مذکور ہیں اور ان سے ثابت ہوتا ہے کہ اس فن میں ان کا کیا پایہ تھا چنانچہ ابن خلکان وغیرہ نے خصوصیت کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے۔

حدیث میں ان کی کتاب مؤطا مشہور ہے۔ اس کے علاوہ کتاب الحج جو امام مالکؒ کے رد میں لکھی ہے اس میں اکثر حدیثیں روایت کی ہیں اور متعدد مسائل میں جوش ادعا کے ساتھ کہا ہے کہ مدینہ والوں کو دعویٰ ہے کہ وہ حدیث کے پیرو ہیں حالانکہ ان مسائل میں صریح ان کے خلاف حدیث موجود ہے۔

امام محمدؒ کی تصنیفات تعداد میں بہت زیادہ

احسنتنّ

حضرت امام ابو حنیفہؒ ایک مرتبہ ایک باغ میں تشریف لے گئے اور وہاں سے واپسی پر آپ نے ابن ابی لیلیٰ کو دیکھا جو خچر پر سوار عدالت کی طرف جا رہے تھے۔ ابن ابی لیلیٰ کو ایک مقدمہ میں حضرت امام صاحبؒ کی گواہی درکار تھی۔ اس لیے انہوں نے امام اعظمؒ کو ساتھ لے لیا رستہ میں چند عورتیں گارہی تھیں۔ ان عورتوں نے جب حضرت امام اعظمؒ اور ابن ابی لیلیٰ کو دیکھا تو خاموش ہو گئیں۔ امام اعظمؒ نے فرمایا "احسنتنّ" یعنی اچھا کیا تم نے۔ عدالت میں امام اعظمؒ نے جب گواہی دی تو ابن ابی لیلیٰ نے ان کی گواہی ساقط کر دی اور کہا یاد کیجئے آپ نے گانے والی عورتوں کو کہا تھا "احسنتنّ"۔ حضرت امام صاحبؒ نے فرمایا آپ بھی یاد کیجئے کہ میں نے یہ کلمہ کس وقت کہا تھا گانے کے وقت یا سکوت کے وقت؟ ابن ابی لیلیٰ نے جواب دیا سکوت کے وقت۔ تو آپ نے فرمایا کہ میں نے تو انہیں "احسنتنّ" اسی سکوت پر کہا تھا کہ تم نے گانا چھوڑ کے جو سکوت اختیار کر لیا ہے بہت اچھا کیا ہے۔ ابن ابی لیلیٰ نے یہ بات سنی تو آپ کی گواہی قبول کر لی۔

(غرائب البیان)

اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ ۱۸۹ھ میں رے گیا تو ان کو بھی ساتھ لے گیا۔ رے کے قریب رنبویہ ایک گاؤں ہے وہاں پہنچ کر قضا کی۔ اتفاق یہ کہ کسائی جو مشہور نحوی گزرا ہے وہ بھی اس سفر میں ساتھ تھا اور اس نے بھی یہیں انتقال کیا۔ ہارون رشید کو نہایت صدمہ ہوا اور کہا آج فقہ اور نحو م دونوں کو ہم دفن کر آئے۔ علامہ یزیدی نے جو ایک مشہور ادیب اور ہارون الرشید کے درباریوں میں تھے نہایت جانگداز مرثیہ لکھا جس کا ایک شعر یہ ہے:

فقلت اذا ما اشکل الخطیب من لنا
با بضاحه لو ما و انت فقید!

ہم نے کہا کہ جب تو نہ رہا تو ہمارے لیے مشکلات کو حل کرنے والا کہاں سے آئے گا۔

امام محمد نے اگرچہ زندگی کا بڑا حصہ دربار ہی کے تعلق سے بسر کیا لیکن آزادی اور حق گوئی کا سررشتہ کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ ۱۷۵ھ میں یحیٰی علوی نے جب علم بغاوت بلند کیا تو ہارون رشید ان کا سروسامان دیکھ کر حواس باختہ ہو گیا اور دب کر صلح اختیار کی۔ معاہدہ قلم بند ہوا اور یحیٰی کے اطمینان کے لیے بڑے بڑے علماء، فضلا، فقہاء اور محدثین نے اس پر دستخط کیے یحیٰی صلح پر راضی ہو کر بغداد میں آئے تو چند روز کے بعد ہارون الرشید نے نقضِ عہد کرنا چاہا۔ تمام علما نے ہارون الرشید کے خوف سے فتویٰ دے دیا کہ صورتِ موجودہ میں نقضِ عہد جائز ہے لیکن امام محمدؒ نے علانیہ مخالفت کی اور اخیر تک اپنے اصرار پر قائم رہے۔

امام محمد [illegible] اندازہ ائمہ مجتہدین کے اقوال سے ہو سکتا ہے۔ امام شافعیؒ کا قول ہے کہ امام محمد جب کوئی مسئلہ بیان کرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ وحی اتر رہی ہے۔ انہی کا قول ہے کہ میں نے امام محمد سے ایک بارِ شتر کے برابر علم حاصل کیا۔ امام احمد بن حنبل سے کسی نے پوچھا کہ دقیق مسائل آپ کو کہاں سے حاصل ہوئے؟ فرمایا محمد بن الحسن کی کتابوں سے۔

امام محمد کے حلقۂ درس سے اگرچہ بہت سے علماء تعلیم پا کر نکلے لیکن ان سب میں امام شافعیؒ کا نام خصوصیت کے ساتھ لیا جا سکتا ہے۔ ہمارے زمانہ کے کم نظروں کو اس سے تعجب ہوگا۔ اگلے زمانے میں بھی ابن تیمیہ نے امام شافعی کی شاگردی سے انکار کیا تھا لیکن حق کو کون دبا سکتا ہے۔ تاریخ و رجال کی آج سیکڑوں کتابیں موجود ہیں وہ کیا شہادت دے رہی ہیں۔ بے شبہ امام شافعی کو امام محمد کے فیضِ صحبت نے بڑے بڑے کمالات کے رستے دکھائے اور اس کا خود ان کو اعتراف تھا۔ حافظ ابن حجر امام شافعی کا قول نقل کرتے ہیں کان محمد بن الحسن جید المنزلة عند الخلیفه فاختلفت الیه و قلت هو اولیٰ من جهة الفقه فلزمته و کتبت عنه یعنی محمد بن الحسن خلیفہ کے ہاں بہت معزز تھے اس لیے میں ان کے پاس آنا جاتا تھا میں نے اپنے جی میں کہا کہ وہ فقہ کے لحاظ سے بھی عالی رتبہ ہیں اس لیے میں نے ان کی صحبت لازم پکڑی اور ان کی درس قلم بند کرتا تھا۔ امام محمد خود بھی شافعیؒ کی نہایت ادب کرتے

نہیں چاہتے۔ ہارون الرشید نے خراج و جزیہ وغیرہ کے متعلق قاضی صاحبؒ سے یاد داشتیں طلب کی تھیں، قاضی صاحبؒ نے اس کے جواب میں چند تحریریں بھیجیں، یہ کتاب انہی تحریروں کا مجموعہ ہے، اگرچہ اس میں بہت سے مضامین ہیں لیکن زیادہ تر خراج کے مسائل ہیں اور اس لئے اس کو اس زمانہ کا قانون مالگزاری کہہ سکتے ہیں اس کتاب میں زمین کے اقسام، حیثیت اور تنوع، لگان کی مختلف شرحیں، کاشت کاروں کی حیثیتوں کا اختلاف، پیداوار کی قسمیں، اس قسم کی اور مراتب کو اس خوبی سے اور دقتِ نظر کے ساتھ منفبط کیا ہے اور ان کے متعلق قواعد قرار دیئے ہیں کہ اس زمانہ کے لحاظ سے تعجب ہوتا ہے۔ طرز تحریر میں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ نہایت آزادانہ ہے قواعد اور ہدایتوں کے ساتھ جا بجا ان ابتریوں کا ذکر ہے جو انتظاماتِ سلطنت میں موجود تھیں اور ان پر نہایت بے باکی کے ساتھ خلیفۂ وقت کو متوجہ کیا ہے۔

قاضی صاحب کی تاریخ زندگی میں جو چیز سب سے زیادہ قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ ہارون الرشید جیسے جبار اور خود پرست بادشاہ کے دربار میں وہ اپنے فرائض اس جرأت اور آزادی سے ادا کرتے تھے جس کی مثال ایشیائی سلطنتوں میں بہت کم مل سکتی ہے۔ کتاب الخراج میں ایک جگہ وہ ہارون الرشید کو لکھتے ہیں کہ اے امیر المومنین! اگر تو اپنی رعایا کے انصاف کے لیے مہینہ میں ایکبار بھی دربار کرتا اور مظلوموں کی فریاد سنتا تو میں امید کرتا ہوں کہ تیرا دشمن ان لوگوں میں نہ ہوتا جو رعیت سے پردہ کرتے ہیں اور اگر تو دو ایک دربار بھی کرتا تو یہ خبر تمام اطراف میں پھیل جاتی اور ظالم اپنے ظلم سے باز آتے بلکہ اگر عمال صوبہ داروں کو یہ خبر پہنچے کہ تو برس میں ایک دفعہ انصاف کے لیے بیٹھتا ہے تو ظالموں کو کبھی ظلم کی جرأت نہ ہونے پائے۔"

قاضی صاحبؒ کے سوا کس کی جرأت تھی کہ ہارون الرشید کو یہ الفاظ لکھتا۔

امام محمدؒ

یہ فقہ حنفی کے دوسرے بازو ہیں۔ ان کا اصلی وطن دمشق کے متصل ایک گاؤں تھا جس کو حرستا کہتے ہیں۔ ان کے والد وطن چھوڑ کر واسط چلے آئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ امام محمد ۱۳۵ھ میں یہیں پیدا ہوئے۔

سن رشد کا آغاز تھا کہ کوفہ جانا ہوا، یہاں علوم کی تحصیل شروع کی اور بڑے بڑے محدثین و فقہاء کی صحبت اٹھائی، مسعر بن کدامؒ، امام سفیان ثوریؒ، مالک بن دینارؒ، امام اوزاعیؒ وغیرہ سے حدیثیں روایت کیں۔ کم و بیش دو برس تک امام ابو حنیفہؒ کی خدمت میں رہے امام صاحبؒ کی وفات کے بعد قاضی ابو یوسف سے بقیہ تحصیل کی، پھر مدینہ گئے اور تین سال تک امام مالک سے حدیث پڑھتے رہے۔ آغاز شباب ہی میں ان کے فضل و کمال کے چرچے پھیل گئے تھے۔ بیس برس کے سن میں مسند درس پر بیٹھے اور لوگوں نے ان سے استفادہ شروع کیا۔ ہارون رشید نے ان کے فضل و کمال سے واقف ہو کر قضا کی خدمت دی اور اکثر

میں لکھی جائے تو لکھی جا سکتی ہے۔

جمعرات کے دن ظہر کے وقت ربیع الاول کی پانچویں تاریخ ۱۸۲ھ میں وفات پائی۔ محمد بن سماعہ کا بیان ہے کہ مرتے وقت یہ الفاظ ان کی زبان پر تھے "اے خدا تو جانتا ہے کہ میں نے کوئی فیصلہ عمداً خلاف واقع نہیں کیا، میری ہمیشہ کوشش رہی کہ جو فیصلہ ہو تیری کتاب اور تیرے پیغمبر کے طریقے کے موافق ہو۔ جب کوئی مشکل مسئلہ آتا تھا تو میں امام ابو حنیفہ کو واسطہ بناتا تھا اور جہاں تک مجھ کو معلوم ہے ابو حنیفہؒ تیرے احکام کو خوب سمجھتے تھے اور عمداً حق کے راستے سے باہر نہ جاتے تھے۔ قاضی صاحبؒ بہت بڑے دولت مند تھے، لیکن دولت کا استعمال اچھی طرح کیا، مرتے وقت وصیت کی کہ چار لاکھ روپیہ مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، کوفہ، بغداد کے محتاجوں کو دیئے جائیں۔

قاضی صاحبؒ متعدد علوم میں کمال رکھتے تھے، اگرچہ ان کی شہرت زیادہ تر ترتیب فقہ میں ہوئی لیکن اور علوم میں بھی وہ اپنے آپ ہی نظیر تھے۔ مؤرخ ابن خلکان نے ہلال ابن یحییٰ کا قول نقل کیا ہے کہ ابو یوسف تفسیر، مغازی، ایام العرب کے حافظ تھے اور فقہ ان کا ادنیٰ سا علم تھا۔ حدیث میں ان کا یہ پایہ تھا کہ حفاظ حدیث میں شمار کئے جاتے تھے چنانچہ علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کا ترجمہ لکھا ہے۔ یحییٰ بن معین کہا کرتے تھے کہ اہل الرائے میں ابو یوسف سے بڑھ کر کوئی شخص کثیر الحدیث نہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ کا قول ہے کہ کان منصفاً فی الحدیث۔ خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں علی ابن المدینی کا قول نقل کیا ہے کہ اول جب مجھ کو علم حدیث کا شوق پیدا ہوا تو ابو یوسف کی خدمت میں حاضر ہوا۔ یحییٰ بن معین و امام احمد بن حنبل اور بہت سے ائمہ حدیث نے قاضی صاحبؒ سے حدیثیں روایت کیں۔ اس سے زیادہ عظمت و شان کی کیا دلیل ہو گی۔

فقہ میں جو ان کا پایہ ہے ان سے کون انکار کر سکتا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کو خود ان کے کمال کا اعتراف تھا۔ ایک دفعہ وہ بیمار ہوئے، امام صاحب عیادت کو گئے واپس آئے تو ساتھیوں سے کہا کہ اگر خدانخواستہ یہ شخص ہلاک ہوا تو دنیا کا عالم ہلاک ہوا۔ اور ائمہ بھی ان کے جدتِ ذہن اور قوت فہم کے معترف تھے، امام اعمش اس زمانہ کے ایک مشہور محدث تھے انہوں نے قاضی صاحبؒ سے ایک مسئلہ پوچھا انہوں نے جواب بتایا، امام اعمش نے کہا کہ اس پر کوئی سند بھی ہے۔ قاضی صاحب نے فرمایا ہاں وہ حدیث جو فلاں موقع پر آپ نے مجھ سے بیان کی تھی۔ امام اعمش نے کہا کہ یعقوب یہ حدیث مجھ کو اس وقت سے یاد ہے جب تمہارے والد کا عقد بھی نہیں ہوا تھا لیکن اس کا صحیح مطلب آج ہی سمجھ میں آیا۔

قاضی صاحب پہلے شخص ہیں جس نے فقہ حنفی میں تصنیفیں کیں، مختلف علوم میں ان کی تصنیفات بہت ہیں اور ابن الندیم نے کتاب الفہرست میں ان کی مفصل فہرست بھی نقل کی ہے لیکن ہماری نگاہ سے صرف کتاب الخراج گزری ہے اس لیے ہم اس کے متعلق کچھ لکھنا

تھی کہ ان کا مستقل تذکرہ لکھا جاتا اور جب ہی ان کے علمی کمالات کا اندازہ بھی ہو سکتا تھا لیکن یہ فرصت کے کام ہیں، خدا کسی کو توفیق دے تو یہ کام پورا ہو سکتا ہے۔ اس کتاب کے موضوع کے لحاظ سے میرا اسی قدر فرض ہے کہ ان کی مختصر تاریخ لکھ دوں جس سے ان کی زندگی اور علمی کمالات پر ایک اجمالی رائے قائم ہو سکے۔

نسب اور ولادت: ان کا نسب انصار سے ملتا ہے۔ ان کے مورثِ اعلیٰ سعد بن عتبہ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب میں سے تھے۔ ان کے باپ ایک غریب آدمی تھے اور مزدوری محنت کر کے زندگی بسر کرتے تھے۔ یہ ۱۱۳ھ یا ۱۱۷ھ میں بمقام کوفہ پیدا ہوئے، ان کو اگرچہ بچپن سے لکھنے پڑھنے کا ذوق تھا لیکن باپ کی مرضی نہ تھی، وہ چاہتے تھے کہ کوئی پیشہ سیکھیں اور گھر میں چار پیسے کما کر لائیں، تاہم جب قاضی صاحب موقع اور فرصت پاتے علماء کی صحبت میں جا بیٹھتے۔ ایک دن امام ابو حنیفہؒ کے حلقہ درس میں حاضر تھے کہ باپ پہنچے اور وہاں سے زبردستی اٹھا لائے، گھر پر آکر سمجھایا کہ بیٹا ابو حنیفہ کو خدا نے رزق کی طرف سے اطمینان دیا ہے تم ان کی ریس کیوں کرتے ہو۔ قاضی صاحب نے مجبوراً لکھنا پڑھنا چھوڑ دیا اور باپ کے ساتھ رہنے لگے۔ امام ابو حنیفہؒ نے دو چار دن کے بعد لوگوں سے پوچھا کہ یعقوب اب نہیں آتے۔ ان کو امام صاحب کی جستجو کا حال معلوم ہوا تو حاضر ہوئے اور ساری کیفیت بیان کی، امام صاحب نے چپکے سے ایک تھیلی حوالہ کی، گھر پر آکر دیکھا تو اس میں سو درہم تھے۔ امام صاحبؒ نے ان سے یہ بھی کہہ دیا کہ جب خرچ ہو چلے تو مجھ سے کہنا۔ اس طرح برابر ان کو مدد دیتے رہے۔ یہاں تک کہ قاضی صاحبؒ نے تمام علوم میں کمال حاصل کیا اور استادِ وقت بن گئے۔

قاضی صاحبؒ نے امام ابو حنیفہؒ کے علاوہ اور بہت سے ائمہ وقت کی خدمت میں علم کی تحصیل کی، اعمش، ہشام بن عروہ، سلیمان تیمی، ابو اسحٰق شیبانی، یحییٰ بن سعید الانصاری وغیرہ سے حدیثیں روایت کیں، محمد بن اسحٰق سے مغازی و سیر پڑھی۔ محمد بن ابی لیلیٰ سے مسائل سیکھے۔ خدا نے ذہن و حافظہ ایسا قوی دیا تھا کہ ایک ہی زمانہ میں ان تمام علوم کی تحصیل کرتے تھے، حافظ ابن عبد البر نے جو ایک مشہور محدث ہیں لکھا ہے کہ ابو یوسف محدثین کے پاس حاضر ہوتے اور ایک جلسہ میں پچاس ساٹھ حدیثیں سن کر یاد کر لیتے۔

امام صاحبؒ جب تک زندہ رہے قاضی صاحب ان کے حلقہ درس میں ہمیشہ حاضر ہوتے رہے۔ ان کی وفات کے بعد دربار سے تعلق پیدا کرنا چاہا، چنانچہ خلیفہ مہدی عباسی نے ۱۶۶ھ میں ان کو قاضی کی خدمت دی۔ مہدی کے بعد اس کے جانشین ہادی نے بھی ان کو اسی عہدہ پر بحال رکھا، لیکن ہارون الرشید نے ان کی لیاقتوں سے واقف ہو کر تمام ممالک اسلامیہ کا قاضی القضاۃ مقرر کیا اور یہ وہ عہدہ تھا جو اس وقت تک اسلام کی تاریخ میں کسی کو نصیب نہیں ہوا تھا، بلکہ زمانہ مابعد میں بھی بجز احمد بن ابی داؤد کے اور کسی کو نصیب نہیں ہوا۔ قاضی صاحبؒ نے سررشتہ قضا میں جو ترقیاں کیں ان کی تفصیل خود ان کی لائف

پھر دیکھو یہ ہوا کہ جب بچے کی پیدائش کا
ت آیا اور اسے درد زہ شروع ہوا تو بے قراری
س وہ ایک کھجور کے درخت کے نیچے چلی گئی اور
نے کا سہارا لے کر بیٹھ گئی پھر اپنی حالت پر غور کر
کے بولی، اے کاش! اس سے پہلے کہ میری یہ
لت ہو، میں نیست و نابود ہو گئی ہوتی اور بھولی
ی بن جاتی (۲۳) بچہ پیدا ہوا، اس پر نخلستان
، نچلے حصے سے ایک فرشتے نے مبارکباد دی اور
خوش خبری سنائی کہ مریم رنج و فکر کی بجائے
ں ہو کہ تیرے پروردگار کے فضل سے تیرا یہ
ود دنیا کی بڑی ہستی ہوگا (۲۴) تیرے لیے
نے پینے کا سروسامان بھی یہیں ہوا جاتا ہے ایسا
ہ تو کھجور کے درخت کی شاخ کو اپنی طرف ہلا
ے لیے تروتازہ کھجوریں گریں گی (۲۵) پاس
نی کا چشمہ موجود ہے، کھا پی اور بیٹے کو دیکھ دیکھ
پنی آنکھوں کی ٹھنڈک بنا اور جب کوئی آدمی
آئے اور تجھ سے اس بارے میں پوچھے کچھ
ے تو اشارے سے یہ کہہ دے کہ میں نے
شی کا روزہ رکھا ہے جو رحمٰن و رحیم خدا کی نذر
دہ ہے اس لیے اس کا احترام لازمی ہے اور میں
سے بات کرنے سے معذور ہوں (۲۶) اس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورہ مریم۔ آیت ۳۲۲۲۳

لڑکے سے جو پوچھنا ہے پوچھو، قوم کے لوگوں
نے کہا یہ ایک اور عجیب بات ہے ہم بچے سے کیا
پوچھیں، یہ تو ابھی بچہ ہے اور اپنے گہوارہ میں پڑا
ہے (۲۹) لیکن گہوارے سے آواز آئی "میں اللہ کا
بندہ ہوں مجھے پیغمبری ملنے والی ہے مجھے آسمانی
کتاب سے نوازا جائے گا (۳۰) مجھے میرے
پروردگار نے بابرکت بنایا ہے میں جہاں کہیں بھی

سے ہیں اور امام صاحب کے ساتھ ان کو خاص خلوص تھا۔ ان کو اعتراف تھا کہ جو کچھ مجھ کو حاصل ہوا امام ابو حنیفہؒ اور سفیان ثوریؒ کے فیض سے حاصل ہوا، ان کا مشہور قول ہے کہ لو لا ان اللّٰہ تعالیٰ اغاثنی بابی حنیفة و سفیان کنت کسائر الناس یعنی "اگر اللہ تعالیٰ نے ابو حنیفہؒ و سفیان ثوریؒ کے ذریعہ سے میری دستگیری نہ کی ہوتی تو میں ایک عام آدمی سے بڑھ کر نہ ہوتا۔" امام ابو حنیفہؒ کی شان میں ان کے اشعار اکثر منقول ہیں خطیب بغدادیؒ نے اپنی تاریخ میں چند اشعار نقل کئے ہیں جن میں سے ایک شعر یہ ہے ؎

رأیت ا با حنیف حین تولی ویطلب علمه بحراً عزیزاً

مرو کے رہنے والے تھے، ۱۱۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۸۱ھ میں مقام ہیت میں وفات پائی۔

یحییٰ بن زکریا بن ابی مائدہؒ

مشہور محدث تھے علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں صرف ان لوگوں کا تذکرہ لکھا ہے جو حافظ الحدیث کہلاتے تھے چنانچہ یحییٰ کو بھی انہیں لوگوں میں داخل کیا ہے اور ان کے طبقہ میں سب سے پہلے انہی کا نام لکھا ہے۔ علی بن المدینی جو امام بخاری کے مشہور استاد ہیں کہا کرتے تھے کہ یحییٰ کے زمانے میں یحییٰ پر علم کا خاتمہ ہو گیا۔ صحاح ستہ میں ان کی روایت سے بہت سی حدیثیں ہیں، وہ محدث اور فقیہ دونوں تھے اور ان دونوں فنون میں بہت بڑا کمال رکھتے تھے چنانچہ علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں ان کا ترجمہ ان لفظوں سے شروع کیا ہے احد الفقهاء الکبار والمحدثین الاثبات۔

یہ امام ابو حنیفہؒ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور مدت تک ان کے ساتھ رہے تھے، یہاں تک کہ علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کو صاحب ابو حنیفہؒ کا لقب دیا ہے۔ یہ تدوین فقہ میں امام صاحبؒ کے شریک اعظم تھے۔ امام طحاوی نے لکھا ہے کہ وہ تیس برس تک شریک رہے۔ اگرچہ یہ مدت صحیح نہیں ہے، لیکن کچھ شبہ نہیں کہ بہت دنوں تک امام صاحب کے ساتھ تدوین کا کام کرتے رہے اور خاص کر تصنیف و تحریر کی خدمت انہی سے متعلق تھی۔ میزان الاعتدال میں لکھا ہے کہ کوفہ میں اول جس شخص نے تصنیف کی وہ یحییٰ ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ تحریر کا کام یحییٰ سے متعلق تھا اس لیے لوگوں نے انہی کو مستقل مصنف سمجھ لیا۔

مدائن کے منصب قضا پر ممتاز تھا اور وہاں ۱۸۳ھ میں ۶۳ برس کی عمر میں وفات پائی۔

وکیع بن الجراحؒ

فن حدیث کے ارکان میں شمار کئے جاتے ہیں، امام احمد بن حنبلؒ کو ان کی شاگردی پر فخر تھا، چنانچہ وہ ان کی روایت سے کوئی حدیث بیان کرتے تھے تو ان لفظوں سے شروع کرتے تھے "یہ حدیث مجھ سے اس شخص نے روایت کی ہے کہ تیری آنکھوں نے اس کا مثل نہ دیکھا ہوگا۔" یحییٰ بن معینؒ جو فن رجال کے ایک رکن خیال کیے جاتے ہیں ان کا قول تھا کہ "میں نے کسی ایسے شخص کو نہیں دیکھا جس کو وکیع پر ترجیح دوں"۔ اکثر ائمہ حدیث نے ان کی شان میں اس قسم کے الفاظ لکھے ہیں۔ بخاری و مسلم میں اکثر ان کی روایت سے حدیثیں

دیں گے۔ امام احمد بن حنبل کا مشہور قول ہے کہ ما رأیت بعینی مثل یحییٰ بن سعید القطان یعنی میں نے اپنی آنکھوں سے یحییٰ بن القطان کا مثل نہیں دیکھا۔" اس فضل و کمال کے ساتھ امام ابو حنیفہ کے حلقہ درس میں اکثر شریک ہوتے اور ان کی شاگردی پر فخر کرتے، اس زمانہ تک تقلید معین کا رواج نہیں ہوا تھا۔ تاہم اکثر مسائل میں وہ امام صاحب ہی کی تقلید کرتے تھے۔ خود ان کا قول ہے "قد اخذنا باکثر اقواله یعنی ہم نے ابو حنیفہ کے اکثر اقوال اخذ کئے ہیں۔" علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں جہاں وکیع بن الجراح کا ذکر کیا ہے لکھا ہے "یفتی بقول ابی حنیفة و کان یحییٰ القطان یفتی بقوله ایضا یعنی وکیع امام ابو حنیفہؒ کے قول پر فتویٰ دیتے تھے۔

۱۳۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۸ھ میں مقام بصرہ میں وفات پائی۔

عبداللہ بن المبارکؒ

محدث نووی نے تہذیب الاسماء و اللغات میں ان کا ذکر ان لفظوں سے کیا ہے "وہ امام جس کی امامت و جلالت پر ہر باب میں عموماً اجماع کیا گیا ہے اس کے ذکر سے خدا کی رحمت نازل ہوتی ہے جس کی محبت سے مغفرت کی امید کی جاسکتی ہے۔"

حدیث میں جو ان کا پایہ تھا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ محدثین ان کو "امیر المومنین فی الحدیث" کے لقب سے پکارتے تھے، ایک موقع پر ان کے شاگردوں میں سے ایک شخص نے ان سے خطاب کیا کہ "یا عالم المشرق"۔ سفیان ثوری جو مشہور محدث ہیں اس موقع پر موجود تھے بولے کہ "کیا غضب ہے، عالم مشرق کہتے ہو، وہ عالم المشرق والمغرب ہے۔" امام احمد حنبل کا قول ہے کہ "عبداللہ بن المبارک کے زمانہ میں ان سے بڑھ کر کسی نے حدیث کی تحصیل میں کوشش نہیں کی۔" خود عبداللہ بن مبارک کا بیان ہے کہ "میں نے چار ہزار شیوخ سے حدیث سیکھی جن میں سے ہزار سے روایت کی۔" صحیح بخاری و مسلم میں ان کی روایت سے سیکڑوں حدیثیں مروی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ وہ فن روایت کے بڑے ارکان میں سے ہیں حدیث و فقہ میں ان کی بہت سی تصنیفات ہیں لیکن افسوس کہ آج ان کا پتہ نہیں۔

ان کے فضل و کمال اور زہد و تقویٰ نے اس قدر لوگوں کو مسخر کر لیا تھا کہ بڑے بڑے امرا اور سلاطین کو وہ رتبہ حاصل نہ تھا، ایک دفعہ خلیفہ ہارون الرشید رقہ گیا اسی زمانہ میں عبد اللہ بن المبارک بھی رقہ پہنچے ان کے آنے کی خبر مشہور ہوئی تو ہر طرف سے لوگ دوڑے اور اس قدر کشمکش ہوئی کہ لوگوں کی جوتیاں ٹوٹ گئیں۔ ہزاروں آدمی ساتھ ہوئے اور ہر طرف گرد چھاگئی۔ ہارون رشید کی ایک حرم نے جو برج کے غرفہ سے یہ تماشا دیکھ رہی تھی، حیرت زدہ ہو کر پوچھا یہ کیا حال ہے، لوگوں نے بتایا خراسان کا عالم آیا ہے جس کا نام عبد اللہ بن المبارک ہے، بولی کہ حقیقت میں سلطنت اس کا نام ہے ہارون الرشید کی حکومت بھی کوئی حکومت ہے کہ پولیس اور سپاہیوں کے بغیر ایک آدمی بھی حاضر نہیں ہو سکتا۔"

یہ امام ابو حنیفہؒ کے مشہور شاگردوں میں

[illegible] مختصر تذکرہ لکھنا چاہتے تھے جو امام صاحبؒ کے ساتھ تدوین فقہ میں شریک تھے لیکن افسوس ہے کہ ہم ان میں سے صرف چند شخصوں کا نام معلوم کر سکے یعنی (۱) قاضی ابو یوسف (۲) زفر (۳) اسد بن عمر (۴) عافیۃ الازدی (۵) داؤد الطائی (۶) قاسم بن معن (۷) علی بن مسہر (۸) یحیٰ بن زکریا (۹) حبان (۱۰) مندل (۱۱) امام محمد

چنانچہ ان لوگوں کے مختصر حالات ہم ذیل میں لکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ ان شاگردوں کا بھی ذکر ضرور ہے جو حدیث و رجال کے فن میں امام وقت تھے چنانچہ ہم انہی سے شروع کرتے ہیں۔

امام صاحب کے وہ شاگرد جو محدث وقت تھے

یحیٰ بن سعید القطانؒ

فن رجال کا سلسلہ ان ہی سے شروع ہوا علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ فن رجال میں اول جس شخص نے لکھا وہ یحیٰ بن سعید القطان ہیں پھر ان کے بعد ان کے شاگردوں میں یحیٰ بن معین، علی بن المدینی، امام احمد بن حنبل، عمرو بن علی الفلاس، ابو خیثمہ نے اس فن میں گفتگو کی اور ان کے بعد شاگردوں یعنی امام بخاری و مسلم وغیرہ نے۔

حدیث میں ان کا یہ پایہ تھا کہ جب حلقہ درس میں بیٹھتے تو امام احمد بن حنبل، علی ابن المدینی وغیرہ مؤدب کھڑے ہو کر ان سے حدیث کی تحقیق کرتے اور نماز عصر سے جو ان کے درس کا وقت تھا مغرب تک برابر کھڑے رہتے۔ راویوں کی تحقیق و تنقید میں یہ کمال پیدا کیا تھا کہ ائمہ حدیث عموماً کہا کرتے تھے کہ یحیٰ جس کو چھوڑ دیں گے، ہم بھی اس کو چھوڑ

پھر انہوں نے پوچھا کہ فرمائیے پیشاب نجس ہے یا منی؟ انہوں نے فرمایا پیشاب۔ آپ نے فرمایا اگر میں قیاس کو مقدم کرتا تو پیشاب نکلنے سے غسل واجب بتاتا، نہ کہ منی نکلنے سے۔

حضرت امام محمد بن حسنؒ نے آپ کی پیشانی چوم لی اور فرمایا معلوم ہو گیا کہ آپ کے متعلق غلط خیال پھیلایا گیا ہے۔

(جواہر البیان ص ۱۰۶)

☆☆☆

حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ اپنے اصحاب کے ساتھ مسجد میں بیٹھے تھے کہ ایک عورت مسجد میں داخل ہوئی اور اس کے ہاتھ میں ایک سیب تھا جس کا ایک حصہ سرخ اور ایک حصہ زرد تھا۔ اس عورت نے وہ سیب حضرت امام صاحب کے آگے رکھ دیا اور منہ سے کچھ نہ بولی۔ حضرت امام صاحبؒ نے اس سیب کو چیر کر اس کے دو ٹکڑے کر دیے اور عورت کو دے دیئے۔ عورت لے کر چلی گئی۔

حاضرین اس عقدہ کو نہ سمجھے اور انہوں نے حضرت امام صاحب سے پوچھا کہ یہ سیب کا راز کیا ہے؟ آپ نے فرمایا اس عورت نے مجھ سے ایک مسئلہ پوچھا تھا اور میں نے اسے جواب دے دیا۔ حاضرین اور بھی متعجب ہوئے اور وہ مسئلہ دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ اس نے سیب میرے سامنے رکھ کر مجھ سے پوچھا کہ اسے جو خون آتا ہے اس کا رنگ کبھی سیب کے ایک حصہ کی طرح سرخ اور کبھی دوسرے حصہ کی طرح زرد ہوتا ہے تو کیا یہ خون حیض ہی ہے میں نے سیب چیر کر اسے یہ جواب دیا کہ جب تک سیب کے اندرونی حصہ کی طرح اس کا رنگ بالکل سفید نہ ہو وہ خون حیض ہی ہے۔ (روض الفائق ۱۱۹)

☆☆☆

حضرت نوفل بن حیانؒ فرماتے ہیں کہ جب حضرت امام اعظمؒ کا وصال ہو گیا تو میں نے خواب دیکھا کہ میدانِ قیامت ہے اور ساری مخلوق حساب گاہ میں کھڑی ہے اور میں نے دیکھا کہ حضور سرورِ عالم ﷺ حوض کوثر پر تشریف فرما ہیں اور آپ کے دائیں بائیں بڑے بڑے نورانی لوگ کھڑے ہیں اور میں نے ایک بوڑھے شخص کو دیکھا جو بہت بڑے صاحب جمال تھے اور ان کی داڑھی اور سر سفید تھی اور حضور ﷺ کی دائیں طرف کھڑے تھے اور میں نے حضرت امام ابو حنیفہؒ کو بھی دیکھا جو حضور ﷺ کے قریب ہی کھڑے تھے میں نے حضرت امام صاحب کی خدمت میں سلام عرض کیا اور عرض کیا کہ مجھے پانی عطا فرمائیے۔ حضرت امام صاحب نے فرمایا جب تک حضور ﷺ اجازت نہ دیں گے میں نہ دوں گا۔ پھر حضور ﷺ نے فرمایا اسے پانی دے دو۔ حضرت امام صاحب نے ایک پیالہ میں مجھے پانی دیا میں نے پانی پیا اور پھر حضرت امام صاحب سے پوچھا کہ یہ جو حضور ﷺ کی دائیں طرف پیر مرد صاحب جمال ہیں یہ کون بزرگ ہیں؟ امام صاحب نے فرمایا یہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ ہیں اور بائیں طرف حضرت ابو بکر صدیقؓ ہیں۔ اسی طرح میں پوچھتا رہا اور امام صاحب بتاتے رہے۔

(تذکرۃ الاولیاء ص ۲۵۳)

کہ ہم آپ کی اطاعت کریں گے اور گھر جاکر انشاء اللہ کہہ دیں گے اور آپ کی اطاعت سے آزاد ہو جائیں گے۔ منصور ہنس کر ہنسنے لگا اور ربیع سے کہا اے ربیع! ابو حنیفہ کو کبھی نہ چھیڑنا۔ پھر جب امام صاحبؒ باہر نکلے تو ربیع نے آپ سے کہا آج تو آپ نے مجھے مروانے ہی لگے تھے۔ آپ نے فرمایا ابتدا تو تم ہی نے کی تھی۔

(لطائف علمیہ کتاب الاذکیاء ص ۱۴۰)

☆☆☆

ایک دفعہ حضرت امام صاحبؒ مدینہ منورہ حاضر ہوئے تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے پوتے حضرت محمد بن حسنؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت محمد بن حسنؒ نے فرمایا آپ ہی وہ امام ہیں جن کے متعلق میں نے سنا ہے کہ وہ میرے جد امجد حضور ﷺ کی حدیث کی اپنے قیاس کے ساتھ مخالفت کرتے ہیں۔ امام اعظمؒ نے فرمایا معاذ اللہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ تشریف رکھیں اس لیے کہ آپ کے لیے عظمت و توقیر ہے جس طرح آپ کے جد امجد حضور ﷺ کے لیے عظمت و توقیر ہے۔ حضرت محمد بن حسنؒ تشریف فرما ہوئے۔ امام اعظمؒ نے فرمایا: فرمایئے! مرد ضعیف ہے یا عورت؟ انہوں نے فرمایا عورت۔ عورت کا حصہ کس قدر ہے؟ انہوں نے فرمایا: مرد کے حصے کا آدھا۔ امام صاحب نے فرمایا: اگر اس میں قیاس کو ترجیح دیتا تو اس کے برعکس حکم دیتا اور یوں کہتا کہ مرد چونکہ قوی ہے اس لیے اس کا حصہ کم ہو اور جو ضعیف ہے اس کا حصہ زیادہ ہو۔

پھر پوچھا نماز افضل ہے یا روزہ؟ انہوں نے فرمایا نماز۔ فرمایا اور حائضہ عورت جب پاک ہو جائے تو وہ نمازیں قضا پڑھے گی یا قضا روزہ رکھے گی؟ انہوں نے فرمایا روزوں کی قضا کرے گی۔ آپ نے فرمایا اگر میں قیاس سے کام لیتا تو حائضہ عورت کو نماز کی قضا کا حکم دیتا نہ کہ روزے کا۔

سکتے ہو۔ (جواہر البیان ص ۹۵)

☆☆☆

ایک شخص کے گھر میں چور گھس آئے۔ گھر والے کی آنکھ کھل گئی اور اس نے چوروں کو دیکھ لیا۔ چوروں نے اس ڈر سے کہ کہیں صبح ہمیں پکڑوا نہ دے۔ اسے دبوچ لیا اور اس سے قسم دی کہ تم یوں کہو کہ اگر میں نے کسی کو بتایا کہ یہ لوگ چور ہیں تو میری بیوی کو تین طلاق۔ گھر والا بیچارہ مجبور تھا۔ اس نے یہ حلف اٹھالیا اور کہہ دیا کہ اگر میں کسی کو بتاؤں کہ یہ لوگ میرے چور ہیں تو میری بیوی پر تین طلاق۔ چور یہ کہلوا کر اس کا مال و اسباب لے گئے۔ اب صبح ہوئی تو وہ شخص چوروں کو دیکھتا رہا مگر حلف بالطلاق کی وجہ سے بول نہ سکتا تھا۔ آخر وہ حضرت امام صاحب کے پاس آیا اور پورا واقعہ عرض کر کے کہنے لگا کہ حضور! چوروں کو میں اچھی طرح پہچانتا ہوں مگر وہ ظالم مجھ سے یہ قسم لے چکے ہیں کہ اگر میں کسی کو بتاؤں کہ یہ لوگ میرے چور ہیں تو میری بیوی پر تین طلاق۔ آپ نے محلے کے معزز اور ذی جاہ لوگوں کو جمع کیا اور ان سے فرمایا کہ اس بیچارے کے معاملہ میں مدد کرو۔ اور شہر کے جتنے بد چلن اور متہم لوگ ہیں ان کو ایک حویلی میں جمع کرو۔ چنانچہ ان لوگوں نے شہر کے جس قدر بد چلن لوگ تھے ان سب کو ایک حویلی میں جمع کیا اور پھر حضرت امام نے اس شخص سے جس کے گھر چوری ہوئی تھی فرمایا کہ تم ہمارے ساتھ دروازے پر کھڑے ہو جاؤ ہم ایک ایک شخص کو باہر کرتے جائیں گے اور تم سے پوچھتے جائیں گے کہ کیا یہ ہے تمہارا چور؟ اگر وہ چور نہ ہو تو تم "نہیں" کہتے رہنا۔ اور اگر چور ہو تو چپ ہو جانا کچھ مت بتانا کیونکہ تمہاری قسم یہ ہے کہ اگر میں بتاؤں کہ یہ لوگ میرے چور ہیں تو میری بیوی پر تین طلاق۔ اس شخص نے کہا بہت اچھا۔ چنانچہ حویلی میں سے ایک ایک شخص کو نکالا جانے لگا اور ہر شخص کے متعلق اس سے پوچھا جانے لگا کہ کیا یہ ہے تمہارا چور؟ تو وہ سب کے متعلق "نہیں" کہتا رہا اور جب اس کا چور آجاتا تو وہ چپ کر جاتا اور لوگ اسے پکڑ لیتے اس طرح سارے چور پکڑے گئے اور وہ شخص طلاق کی مشکل سے بھی بچ گیا۔

(لطائف علمیہ کتاب الاذکیا امام ابن جوزی ص ۱۳۸)

☆☆☆

خلیفہ منصور کا حاجب ربیع امام اعظمؒ کا بڑا دشمن تھا۔ ایک روز حضرت امام اعظمؒ کو خلیفہ نے بلایا اور آپ تشریف لے گئے تو ربیع نے خلیفہ سے کہا کہ اے امیر المومنین! یہ ابو حنیفہ آپ کے دادا حضرت ابن عباسؓ کی مخالفت کرتے ہیں۔ حضرت ابن عباس کا یہ قول تھا کہ "کسی معاملہ میں حلف کرنیوالا اگر اس حلف سے ایک یا دو دن بعد بھی انشاء اللہ کہہ دے تو وہ حلف قائم نہیں رہتا" اور امام اعظم کا یہ قول ہے کہ "حلف کے ساتھ متصلا ہی انشاء اللہ کہے تو حلف پر اثر انداز ہوگا بعد میں معتبر نہ ہوگا۔" امام اعظمؒ نے فرمایا: "اے امیر المومنین ربیع چاہتا ہے کہ آپ کے لشکر کی گردن کو آپ کی اطاعت و بیعت سے آزاد کر دے۔ منصور نے پوچھا وہ کیسے؟ : آپ نے فرمایا کہ لوگ آپ کے سامنے تو حلف اٹھا جائیں گے

امام صاحب: کس عورت کے ساتھ؟
خلیفہ: یہ جو سامنے بیٹھی ہے۔
امام اعظم: ام حماد کے والد کو بلایا جائے
(چنانچہ امام صاحب کے خسر کو بلایا گیا۔)
امام اعظم: (والدِ ام حماد کی طرف مخاطب ہو کر) جناب ذرا اس عورت کا گھونگھٹ اٹھا کر پہچانئے کہ یہ عورت کون ہے؟
والدِ ام حماد: (گھونگھٹ اٹھا کر دیکھتے ہیں) اے خلیفہ! یہ تو میری بیٹی ہے جس کا نکاح ابو حنیفہ سے ہو چکا ہے۔ پھر یہ ہنگامہ کیسا؟
یہ بات سنتے ہی حاسدین امام دھر لئے گئے اور سخت ذلیل ہوئے اور حضرت امام اعظمؓ کی عزت وعظمت کے نعرے بلند ہوئے۔
(نزہۃ المجالس ص ۸۳)

☆☆☆

قاضی ابن ابی یعلی کی عدالت میں ایک شخص نے درخواست دی کہ اپنی دیوار میں ایک روشن دان بنانا چاہتا ہوں لیکن میرا پڑوسی روکتا ہے۔ پڑوسی کو بلاکر قاضی صاحب نے جب اس کی وجہ دریافت کی تو اس نے کچھ ایسی وجوہات پیش کیں جن کی بناء پر قاضی صاحب نے روشن دان بنانے کی اجازت نہ دی۔ اور فیصلہ مدعا علیہ کے حق میں دے دیا۔
حضرت امام کو جب یہ خبر ہوئی تو آپ نے اس آدمی سے فرمایا کہ اب تم اپنی دیوار گرانے کی درخواست کرو۔ اور جس دیوار میں روشندان بنانا چاہتے ہو اسی کو گرا دو۔ اس شخص نے یہی درخواست دی چونکہ ہر شخص کو اپنی دیوار گرانے کا حق ہے اس لیے قاضی صاحب نے دیوار گرانے کی اجازت دے دی۔ اس شخص نے اجازت کے بعد دیوار گرانے کا اعلان کر دیا۔
اس اعلان کو سن کر پڑوسی گھبرایا ہوا قاضی صاحب کے آیا اور کہا کہ جناب اب تو وہ دیوار گرا رہا ہے۔ اس لیے اسے روشندان بنانے کی اجازت دے دیجئے کہ میرے لیے یہ اس سے زیادہ آسان ہے۔ قاضی صاحب سمجھ گئے اور خوشی سے روشندان بنانے کی اجازت دے دی۔
(جواہر البیان ص ۸۸)

☆☆☆

حضرت امام اعظمؓ کے زمانے میں ایک میاں بیوی میں کسی بات پر رنجش پیدا ہوئی تو میاں نے غصہ میں کہہ دیا کہ میں تم سے کلام نہ کروں گا جب تک تو مجھ سے پہلے کلام نہ کرے۔ بیوی نے بھی قسم کھائی اور کہا کہ خدا کی قسم میں بھی تم سے کبھی کلام نہ کروں گی جب تک تو مجھ سے پہلے کلام نہ کرے۔ اس کے بعد دونوں نے ایک دوسرے کو بلانا چھوڑ دیا۔ اور بڑی مشکل میں پڑ گئے۔ آخر میاں حضرت امام صاحب کے پاس حاضر ہوا اور سارا واقعہ سنایا۔ امام صاحب نے واقعہ سن کر فرمایا کہ جاؤ ایک دوسرے کو راضی خوشی بلاؤ۔ تم میں سے کوئی حانث نہ ہوگا۔ اس لیے کہ جب تم نے یہ کہا تھا کہ میں تم سے کلام نہ کروں گا جب تک تو مجھ سے کلام نہ کرے مگر جب اس نے یہ کہا کہ خدا کی قسم میں بھی تم سے کلام نہ کروں گی جب تک تم مجھ سے کلام نہ کرتے۔ تو اس نے تمہاری قسم کے بعد تو تم سے کلام کر لیا لہٰذا اب تم اسے بلا

سے فرمایا ایسے شخص کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟ ان لوگوں نے جواب دیا، ایسا شخص بہت ہی برا ہے۔ یہ صفات تو کافر کی ہیں۔ آپ نے تبسم فرمایا اور ارشاد فرمایا: نہیں بلکہ ایسا شخص تو اللہ کا دوست اور مومن کامل ہے پھر آپ نے اس شخص سے کہا کہ اگر میں اس کا جواب دوں تو تو میری بد گوئی سے باز رہے گا؟ اس نے وعدہ کیا کہ ہاں۔ آپ نے فرمایا کہ وہ رب جنت کی امید رکھتا ہے اور رب نار سے ڈرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے اس بات کا خوف نہیں کرتا کہ وہ اس پر ظلم کرے گا۔ مردہ مچھلی کھاتا ہے، جنازے کی نماز پڑھتا ہے، نبی کریم ﷺ پر درود پڑھتا ہے اور ان دیکھی بات پر گواہی دینے کا مطلب یہ ہیں کہ وہ اللہ کو بن دیکھے اس کی گواہی دیتا ہے اور وہ موت کو ناپسند کرتا ہے جو حق ہے تاکہ زندہ رہ کر اللہ کی فرماں برداری کرے اور مال و اولاد فتنہ ہے جس کو دوست رکھتا ہے اور وہ رحمت جس سے بھاگتا ہے۔ بارش ہے اور یہود کی اس بات کی تصدیق کرتا ہے لیست النصاریٰ علیٰ شیء اور نصاریٰ کی اس بات کی تصدیق کرتا ہے لیست الیہود علیٰ شیء جب اس شخص نے یہ پر مغز اور مسکت جواب سنا تو کھڑا ہو گیا اور حضرت امام صاحبؒ کے سر مبارک کا بوسہ دیا اور کہا کہ میں قسم کھا کر گواہی دیتا ہوں کہ آپ حق پر ہیں۔ (جواہر البیان فی ترجمۃ الخیرات الحسان ص ۴۸)

☆☆☆

حضرت امام اعظمؒ کے بعض حاسدوں نے ایک عورت کو پھسلا کر اس بات کے لیے آمادہ کر لیا کہ وہ کسی طریقہ سے حضرت امام صاحبؒ پر تہمت لگائے۔ چنانچہ وہ عورت ایک رات امام صاحب کے پاس آئی اور کہنے لگی کہ میرا خاوند سخت بیمار ہے اور وہ آپ کے روبرو کچھ وصیت کرنا چاہتا ہے آپ میرے ساتھ میرے گھر چلیے۔ امام صاحب چل پڑے آپ جب اس کے گھر پہنچے تو اس نے سب دروازے بند کر لئے اور شور مچانا شروع کر دیا کہ ابو حنیفہ نے تنہائی میں مجھے ستایا ہے (معاذ اللہ) یہ سن کر حاسدین امام فوراً وہاں پہنچ گئے اور امام صاحب اور اس عورت کو خلیفہ کے پاس لے گئے۔ خلیفہ نے امام صاحب اور اس عورت کو جیل میں بند کر دیا اور کہا کہ صبح فیصلہ کیا جائے گا۔ امام اعظمؒ ساری رات جیل میں نفل پڑھتے رہے۔ وہ عورت یہ دیکھ کر بڑی شرمندہ ہوئی اور امام صاحب کے قدموں میں گر گئی اور اصل واقعہ عرض کر کے معافی مانگنے لگی۔ امام صاحب نے فرمایا اب تم یوں کرو کہ داروغہ جیل سے کسی بہانے اجازت لے کر باہر نکلو اور سیدھی میرے گھر جاؤ اور ام حماد (زوجۂ امام) کو سارا قصہ سناؤ اور اپنی جگہ اسے یہاں بھیج دو۔ چنانچہ وہ عورت اٹھی اور داروغۂ جیل سے کسی بہانے اجازت لے کر باہر نکلی اور دن چڑھنے سے پہلے ہی حضرت امام کی زوجہ کو جیل میں بھیج دیا۔ صبح ہوئی تو امام صاحب کے جملہ حاسد عدالت میں پہنچ گئے۔ خلیفہ کے حکم سے امام صاحب اور عورت کو بلایا گیا اور خلیفہ نے امام صاحب سے کہا

خلیفہ: اے ابو حنیفہ! کیا آپ کو ایک اجنبیہ عورت سے بند مکان میں خلوت جائز ہے؟

جزائے شر دے گا۔ نعمان کو تو اپنے فضل سے آگ سے بچالے کہ آگ کے قریب بھی نہ جائے اور اس کو اپنی وسیع رحمت میں داخل کر لے۔" جب میں اندر گیا تو امام صاحب نے پوچھا کیا چراغ لینا چاہتے ہو؟ میں نے کہا کہ میں تو صبح کی اذان بھی دے چکا۔ فرمایا جو کچھ تم نے دیکھا ہے اسے چھپانا، ظاہر نہ کرنا۔ (جواہر البیان فی ترجمۃ الخیرات الحسان ص ٦٨)

☆☆☆

ایکبار حضرت امام اعظمؒ کا بے خبری میں ایک لڑکے کے پاؤں پر پاؤں پڑ گیا۔ لڑکے نے کہا اے شیخ! قیامت کے دن کے بدلے سے نہیں ڈرتے؟ حضرت امام نے یہ سنا تو آپ پر غشی طاری ہو گئی۔ جب افاقہ ہوا تو فرمایا کہ میرا یہ خیال ہے کہ یہ کلمہ اسے تلقین ہوا ہے۔ (جواہر البیان ص ٦٩)

☆☆☆

حضرت شفیق فرماتے ہیں کہ میں حضرت امام اعظمؒ کے ساتھ جا رہا تھا کہ ایک شخص نے آپ کو دیکھا اور چھپ گیا اور دوسرا راستہ اختیار کیا۔ آپ کو معلوم ہوا تو آپ نے اسے پکارا، وہ آیا تو آپ نے اس سے پوچھا کہ تم کیوں اپنی راہ سے بے راہ ہو کر چلے۔ اس نے کہا کہ میں آپ کا مقروض ہوں، دس ہزار درہم میں نے آپ کو دینے ہیں جس کے کافی عرصہ گزر چکا ہے اور میں تنگ دست ہوں، آپ سے شرماتا ہوں۔" آپ نے فرمایا، سبحان اللہ! میری وجہ سے تمہاری یہ حالت ہے، جاؤ میں نے سب روپیہ تم کو بخش دیا اور میں نے اپنے آپ کو اپنے نفس پر گواہ کیا، اب آئندہ مجھ سے نہ چھپنا اور جو خوف تمہارے دل میں میری وجہ سے پیدا ہوا مجھے معاف کر دو۔

(جواہر البیان ص ٧٤)

☆☆☆

چند لڑکے گیند کھیل رہے تھے، اتفاق سے ایک بار ان کی گیند حضرت امام اعظمؒ کے آگے مجمع میں آکر گری۔ کسی لڑکے کی یہ ہمت نہ پڑی کہ گیند وہاں سے اٹھا لائے۔ ایک لڑکے نے ان لڑکوں میں سے کہا کہ اگر کہو تو گیند میں اٹھا لاؤں۔ پھر انتہائی گستاخی کے ساتھ گیا اور وہ گیند جا کر اٹھا لایا۔ حضرت امام اعظمؒ نے فرمایا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لڑکا حلالی نہیں ہے۔ لوگوں نے دریافت کیا تو واقعی وہ لڑکا ویسا ہی نکلا جیسا کہ حضرت امام نے فرمایا تھا۔ لوگوں نے پوچھا حضور! آپ نے کیسے جان لیا کہ وہ لڑکا حلالی نہیں ہے۔ فرمایا اگر وہ حلالی ہوتا تو حیا اسے مانع ہوتی۔

(تذکرۃ الاولیاء ص ٢٤٨)

☆☆☆

حضرت امام اعظمؒ کے مخالفوں میں سے ایک شخص نے آپ سے پوچھا کہ آپ کا فتویٰ ایسے شخص کے بارے میں کیا ہے جو جنت کا امیدوار نہ ہو، اور نہ دوزخ سے ڈرتا ہو نہ خدا سے۔ اور مردار کھاتا ہے اور بے رکوع سجود کے نماز پڑھتا ہے اور بن دیکھے گواہی دیتا ہے۔ سچی بات کو ناپسند کرتا ہے فتنہ کو دوست رکھتا ہے، رحمت سے بھاگتا ہے، یہود و نصاریٰ کی تصدیق کرتا ہے۔ امام اعظم علیہ الرحمہ نے اپنے شاگردوں

سکا تو میں ہی کروں گا مگر آپ تو مسلمانوں کے پیشوا ہیں آپ کو اس کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے کہ آپ کا پاؤں نہ پھسلے کیونکہ اگر آپ کا پاؤں پھسل گیا تو سارے مسلمانوں کا جو آپ کے پیچھے چل رہے ہیں۔ پاؤں پھسل جائے گا اور اس وقت سب کا سنبھلنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ حضرت امام اس لڑکے کی یہ بات سن کر رونے لگے۔

(تذکرۃ الاولیاء ص ۲۵۰)

☆☆☆

حضرت امام اعظمؒ ہر رات تین سو رکعت نفل پڑھا کرتے تھے۔ ایک بار آپ کہیں جا رہے تھے کہ راستے میں ایک شخص نے دوسرے سے کہا یہ وہ امام ہیں جو ہر رات پانچ سو رکعات نفل پڑھتا ہے۔ حضرت امامؒ نے یہ سنا تو اسی وقت یہ نیت کر لی کہ آج سے پانچ سو رکعات ہی نفل پڑھوں گا تاکہ اس کا گمان درست ہو جائے۔ ایک دن آپ کے شاگردوں نے آپ سے کہا کہ لوگ کہتے ہیں کہ امام صاحب رات بھر عبادت کرتے رہتے ہیں اور نہیں سوتے۔ فرمایا آج سے میں ایسا ہی کیا کروں گا اور ساری ساری رات جاگا کروں کیونکہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو بندے اس چیز کی تعریف کو پسند کرتے ہیں جو ان میں نہیں ہے پس وہ ہرگز عذاب سے نہ چھوٹیں گے لہٰذا آئندہ میں ساری رات جاگا کروں گا تاکہ اس آیت کی زد میں نہ آجاؤں۔ اس کے بعد آپ نے چالیس برس تک عشاء کے وضو سے صبح کی نماز پڑھی اور آپ نے جس جگہ وفات پائی وہاں آپ نے سات ہزار بار قرآن شریف ختم فرمایا تھا۔ (تذکرۃ الاولیاء ص ۲۴۹)

اور جواہر البیان فی ترجمۃ الخیرات الحسان ص ۶۳)

☆☆☆

حضرت امام اعظمؒ ایک جنازہ پڑھنے تشریف لے گئے۔ دھوپ کی بڑی شدت تھی اور وہاں کوئی سایہ نہ تھا۔ ساتھ ہی ایک شخص کا مکان تھا۔ اس مکان کی دیوار کا سایہ دیکھ کر لوگوں نے حضرت امام سے عرض کیا کہ حضور! آپ اس سایہ میں کھڑے ہو جائیے۔ حضرت نے فرمایا کہ اس مکان کا جو مالک ہے وہ میرا مقروض ہے اور اگر میں نے اس کی دیوار سے کچھ نفع حاصل کیا تو میں ڈرتا ہوں کہ عنداللہ میں کہیں سود لینے والوں میں شمار نہ ہو جاؤں کیونکہ سرور عالم ﷺ نے فرمایا ہے کہ جس قرض سے کچھ نفع لیا جائے وہ سود ہے چنانچہ آپ دھوپ میں ہی کھڑے رہے۔

(تذکرۃ الاولیاء ص ۲۴۸)

☆☆☆

حضرت یزید بن لیث جو اخیار میں سے تھے، فرماتے ہیں کہ میں نے ایک بار عشاء کی نماز میں دیکھا کہ امام نے سورۃ اذا زلزلت الارض پڑھی اور امام اعظم مقتدی تھے۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو میں نے دیکھا کہ امام صاحب متفکر بیٹھے ہیں اور ٹھنڈی سانس لے رہے ہیں۔ میں وہاں سے اٹھ گیا تاکہ آپ کا دل مشغول نہ ہو اور چراغ کو روشن چھوڑ دیا اور اس میں تھوڑا سا تیل تھا۔ پھر طلوع فجر کے بعد میں نے دیکھا کہ چراغ روشن ہے اور امام صاحب اپنی ریش مبارک پکڑے ہوئے کہہ رہے ہیں اے وہ ذات! کہ ہمقدار ذرہ خیر کے جزائے خیر دے گا اور ہمقدار ذرہ شر کے

حضرت امام اعظمؒ حضور ﷺ کی زیارت کے لیے جب مدینہ منورہ پہنچے اور روضۂ انور پر حاضر ہوئے تو آپؒ نے عرض کیا "السلام علیك یا سید المرسلین" تو روضۂ انور سے جواب آیا "وعلیك السلام یا امام المسلمین"۔

(تذکرۃ الاولیاء ص ۲۴۶)

☆☆☆

حضرت شیخ بو علی بن عثمان جلالیؒ فرماتے ہیں کہ میں ملک شام میں تھا کہ ایک روز میں حضرت بلالؓ کے مزار شریف پر سو گیا۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں مکہ میں ہوں اور حضور ﷺ باب بنی شیبہ سے داخل ہوئے اور آپؐ ایک بوڑھے شخص کو بڑی شفقت سے اپنی مبارک گود میں لئے ہوئے اور اپنے سہارے چلا رہے ہیں۔ میں نے دوڑ کر حضور ﷺ کے مبارک قدموں کو بوسہ دیا اور میرے دل میں یہ سوال اٹھ رہا تھا کہ یہ بوڑھے کون ہیں جنہیں حضور ﷺ اتنی شفقت سے اپنی گود میں سنبھالے اور اپنے سہارے چلا رہے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے اس سوال کو جان لیا اور فرمایا یہ مسلمانوں کے امام ابو حنیفہ ہیں۔ (تذکرۃ الاولیاء ص ۲۵۶)

☆☆☆

ایک دن امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کہیں تشریف لے جا رہے تھے کہ ایک لڑکے کو آپ نے دیکھا کہ کیچڑ میں چل رہا ہے۔ آپؒ نے اس لڑکے سے فرمایا: بیٹا! ہوش سے چلو، ایسا نہ ہو کہ تمہارا پاؤں پھسل جائے اور گر پڑو۔" لڑکے نے جواب دیا: اے امیر المسلمین! میں تو اکیلا ہوں، اگر پھسلوں گا بھی تو پھر سنبھل جاؤں گا اور نہ بھی سنبھ

تعدیل کے اصول، اجماع کے حدود و ضوابط، قیاس کے احکام شرائط، احکام کی تشریح، عموم و خصوص کی تحدید، رفع تعارض کے قواعد، فہم مراد کے طرق، یہ ایسے مسائل ہیں جو اصول فقہ کے ارکان ہیں۔ ان تمام مسائل کے متعلق امام صاحبؒ نے ضروری اصول و قواعد منضبط کر دیئے تھے۔

حدیث کے متعلق امام صاحبؒ نے جو اصول قرار دیئے ان کو ہم حدیث کی بحث میں لکھ آئے ہیں، ان کے علاوہ اور ابواب کے متعلق امام صاحبؒ نے تمام ضروری اصول منضبط کر دیئے تھے، مثلاً: مالم یثبت بالتواتر لیس بقرآن الزیادة نسخ لا یحرز الزیادة علی الکتاب بخبر واحد حمل المطلق علی المقید زیادة علی النص عموم القرآن لا یتخصص بالآحاذ العام قطعی کالخاص ان کان متأخرا خصص العام و ان کان متقدما فلا بل کان العام ناسخا للخاص و ان کان جهل التاریخ تساقطهم یطلب دلیل آخر مفهوم لا یحتج به لا تدل علی البطلان۔

امام صاحب کے یہ اقوال ان شاگردوں کی تصنیفات یا اصول کی کتابوں میں جو شافعیہ و حنفیہ وغیرہ نے لکھے ہیں جستہ جستہ مذکور ہیں جن کو اگر ایک جگہ جمع کر دیا جائے تو ایک مختصر رسالہ تیار ہو سکتا ہے (لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اصول فقہ کی کتابوں میں جو بہت سے اصول مذکور ہیں ان سب کی نسبت یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ امام ابو حنیفہؒ کے اقوال ہیں...... شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس پر ایک نہایت عمدہ تقریر لکھی ہے لیکن شاہ صاحبؒ نے بعض ان اقوال سے بھی انکار کیا ہے جو بروایت صحیحہ امام صاحبؒ سے ثابت ہیں)۔ یہی اصول ہیں جن کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ ایک خاص طریقہ اجتہاد کے بانی ہیں، انہی اصول کی بنا پر امام محمدؒ و قاضی ابو یوسفؒ کا طریقہ امام صاحب کے طریقہ سے الگ نہیں سمجھا جاتا، حالانکہ جزئیات مسائل میں لوگوں نے سیکڑوں ہزاروں جگہ ان سے اختلاف کیا ہے۔

ان اصولی مسائل پر بوجہ اس کے کہ امام شافعیؒ وغیرہ نے ان سے مخالفت کی ہے، نہایت وسیع اور دقیق بحثیں قائم ہو گئی ہیں۔ افسوس ہے کہ ہماری مختصر بحث میں ان کی گنجائش نہیں، اصول کی کتابوں میں یہ مباحث نہایت تفصیل سے مذکور ہیں جس شخص کا جی چاہے ان کتابوں کی طرف رجوع کر سکتا ہے۔ جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں فقہ کے اس حصہ میں امام صاحبؒ کی حیثیت ایک مفسر اور مستنبط کی حیثیت ہے اور کچھ شبہ نہیں کہ اس باب میں امامؒ نے جو کام کیا وہ نہ صرف تاریخ اسلام میں بلکہ کل دنیا کی تاریخ میں بے نظیر ہے۔ دنیا میں اور بھی قومیں ہیں جن کے پاس آسمانی کتابیں ہیں اور وہ لوگ ان کتابوں سے اخذ احکام کرتے ہیں لیکن کوئی قوم یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ اس نے استنباطِ مسائل کے اصول اور قواعد منضبط کئے اور اس کو ایک مستقل فن کے رتبہ تک پہنچا دیا۔

(ماخوذ از سیرتِ ائمہ اربعہ)

حالت میں تھے یہاں تک کہ نقل کا بھی رواج نہ تھا۔ ایسے دقیق فن کی بنیاد ڈالنی درحقیقت امام ابو حنیفہ ہی کا کام تھا۔

عام خیال یہ ہے کہ یہ قواعد جن کو اب اصول فقہ سے تعبیر کیا جاتا ہے سب سے پہلے شافعی نے مرتب کیے یہ دعویٰ اس لحاظ سے تو صحیح ہے کہ امام شافعی سے پہلے یہ مسائل مستقل طور سے حیز تحریر میں نہیں آئے تھے، لیکن اصل فن کی بنیاد امام شافعیؒ سے بہت پہلے پڑ چکی تھی، اور اگر تحریر اٹھا دی جائے تو امام ابو حنیفہ اس کے موجد کہے جاسکتے ہیں۔

استنباط احکام کی ابتدا

اصل یہ ہے کہ مسائل کا استنباط اور احکام کی تفریع تابعین بلکہ صحابہ ہی کے زمانہ میں شروع ہو چکی تھی۔ لیکن استنباط اور استخراج کا جو طریقہ تھا وہ کوئی علمی صورت نہیں رکھتا تھا۔ جس طرح عام لوگ کسی عبارت سے کسی نتیجہ کا استنباط یا اور کسی قسم کی تفریع کس قاعدہ کلیہ کے تحت میں داخل ہے اور اس کے کیا شرائط اور قیود ہیں، اسی طرح فقہی مسائل بھی استنباط کیے جاتے نہ علمی اصطلاحیں قائم ہوئی تھیں۔ نہ کچھ اصول منضبط ہوئے تھے۔

واصل بن عطاء نے [illegible] بعض [illegible] کیے

بنی امیہ کے اخیر دور میں کچھ علمی اصطلاحیں پیدا ہوئیں، چنانچہ واصل بن عطا نے جو علم کلام کا موجد تھا، احکام شرعیہ کی تقسیم کی اور کہا کہ حق کے ثبوت کے چار طریقے ہیں۔ قرآن ناطق، حدیث متفق علیہ، اجماع امت، عقل و حجت (یعنی قیاس)۔ واصل نے اور بھی چند مسائل اور اصطلاحیں قائم کیں مثلاً یہ کہ عموم و خصوص دو جداگانہ مفہوم ہیں۔ نسخ صرف اوامر و نواہی میں ہو سکتا ہے اخبار و واقعات میں نسخ کا احتمال نہیں۔

ان مسائل کے لحاظ سے اصولِ فقہ میں اولیت کا فخر واصل کی طرف منسوب کیا جاسکتا لیکن یہ اسی قسم کی اولیت ہوگی جس طرح نحو کے دو تین قاعدوں کے بیان کرنے سے کہا جاتا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ فنِ نحو کے موجد ہیں۔ بہر حال امام ابو حنیفہؒ کے زمانہ تک جو کچھ ہوا تھا اس سے زیادہ نہیں ہوا تھا لیکن چونکہ امام صاحبؒ نے فقہ کو مجتہدانہ اور مستقل فن کی حیثیت سے ترتیب دینا چاہا اس لیے استنباط اور استخراجِ مسائل کے اصول قرار دینے پڑے۔

اصول فقہ کی کلیات

اگرچہ زمانہ مابعد میں اصول فقہ ایک نہایت وسیع فن بن گیا اور سیکڑوں مسائل ایسے ایجاد ہو گئے ہیں جن کا امام ابو حنیفہؒ کے زمانہ میں اثر بھی نہ تھا۔ لیکن کچھ شبہ نہیں کہ اس فن کے مہمات مسائل جن پر فن کی بنیاد قائم ہے امام صاحب ہی کے زمانہ میں منضبط ہو چکے تھے اصول اربعہ کی توضیح، حدیث کے مراتب اور ان کا احکام، جرح و

ایران میں ۸ ، ۴۸، ۱۲، ۶ کے حساب سے شرحیں مقرر کیں۔ آنحضرت ﷺ مال غنیمت جب تقسیم کرتے تھے تو اپنے عزیز واقارب کا بھی حصہ لگاتے تھے، خلفائے راشدین میں سے کسی نے حتیٰ کہ حضرت علیؓ نے بھی ہاشمیوں کو کبھی حصہ نہیں دیا۔ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں بلکہ حضرت ابو بکرؓ کے عہد تک تین طلاقیں ایک سمجھی جاتی تھیں، حضرت عمرؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں منادی کرادی کہ تین طلاق بائن سمجھی جائے گی۔ آنحضرت ﷺ کے عہد میں شراب پینے کی سزا میں کوئی خاص حد مقرر نہیں ہوئی تھی۔ حضرت عمرؓ نے اس کی حد چالیس درے قرار دئے اور حضرت عمرؓ نے بسبب اس کے کہ ان کے زمانے میں مے نوشی کا زیادہ رواج ہو چلا تھا چالیس سے اسی درّے کر دیئے، یہ واقعات ہیں جو حدیث کی کتابوں میں مذکور ہیں اور جن کے ثبوت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا لیکن کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ خلفائے راشدین کسی حکم کو آنحضرت ﷺ کا تشریعی حکم سمجھ کر اس کی مخالفت کرتے تھے اگر نعوذ باللہ ایسا کرتے تھے تو وہ خلفائے راشدین نہ تھے بلکہ عیاذاً باللہ رسول اللہ ﷺ کے حریف اور مقابل تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ صحابہ رات دن آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر رہتے تھے اور فیضِ صحبت کی وجہ سے شریعت کے اداشناس ہو گئے تھے ان کو یہ تمیز کرنا نہایت آسان کام تھا کہ کون سے احکام تشریعی حیثیت رکھتے ہیں اور کون سے اس حد میں داخل ہیں جن کی نسبت آنحضرت ﷺ نے فرمایا تھا کہ انتم علم بامور دینا کم حضرت عائشہؓ نے آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد ایک موقع پر کہا کہ آج اگر رسول اللہ موجود ہوتے تو عورتوں کو مسجد میں جانے کی اجازت نہ دیتے۔ یہ صریح اس بات کی شہادت ہے کہ حضرت عائشہؓ نے رسول اللہ کی اس اجازت کو تشریعی اور لازمی قرار نہیں دیا ورنہ زمانہ اور حالات کے اختلاف سے اس پر کیا اثر پڑ سکتا تھا۔

امام ابو حنیفہؒ نے اس مرحلہ میں صحابہ ہی کو دلیل راہ بنایا اور اس قسم کے مسائل میں ان کی رائے عموماً خلفائے راشدین کے طرز عمل کے موافق ہے لیکن جن لوگوں کی نگاہ اس نکتہ تک نہیں پہنچی وہ امام ابو حنیفہؒ بلکہ صحابہؓ کو بھی مورد الزام ٹھہراتے ہیں، طلاق کے مسئلہ میں قاضی شوکانی نے حضرت عمرؓ کا قول نقل کر کے لکھا ہے کہ رسول اللہ کے مقابلے میں بے چارے عمرؓ کی کیا حقیقت ہے۔ لیکن قاضی شوکانی یہ نہ سمجھے کہ حضرت عمرؓ قاضی صاحب سے زیادہ اس بات کو سمجھتے تھے، کہ رسول ﷺ کے مقابلہ میں ان کی کوئی حقیقت نہیں۔

فقہ کی پہلی قسم کے متعلق امام ابو حنیفہ نے جو بڑا کام کیا وہ قواعدہ استنباط کا انضباط تھا، جس کی وجہ سے فقہ (جو اب تک جزئیات مسائل کا نام تھا۔) ایک مستقل فن بن گیا، امام ابو حنیفہؒ کی علمی تاریخ میں جو چیز سب سے زیادہ قابل قدر اور تعجب انگیز ہے۔ وہ ان قواعد کی تجدید اور انضباط ہے۔ ایسے زمانہ میں جبکہ علوم نہایت ابتدائی

النساء الی العیدین، نفاذ طلاق، تعین جزیہ، تشخیص خراج، تقسیم غنائم وغیرہ میں جو حدیثیں وارد ہیں ان کو امام ابو حنیفہؒ نے دوسری قسم میں داخل کیا ہے لیکن امام شافعیؒ وغیرہ ان حدیثوں کو بھی تشریعی حدیثیں سمجھتے ہیں۔

حنفی فقہ کو بمقابلہ اور فقہوں کے بہت بڑی خصوصیت جو حاصل ہے وہ یہی ہے کہ اس کے مسائل عموماً اسی قاعدے پر مبنی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس میں وہ وسعت اور آزادی پائی جاتی ہے جو اور ائمہ کے مسائل میں نہیں پائی جاتی۔ یہ قاعدہ اگر چہ نہایت صاف اور صریح ہے لیکن افسوس ہے کہ اور ائمہ نے اس پر لحاظ نہیں کیا اور اگر خلفائے راشدین کی نظیریں موجود نہ ہوتیں تو شاید امام ابو حنیفہؒ کو بھی اس کے اختیار کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔ اگر چہ امام صاحب کے بعد بھی بعض ائمہ نے جن کو ان کے مقابلے میں اجتہاد کا دعویٰ تھا اس عمدہ اصول کی پیروی نہ کی اور اسی غلط خیال پر قائم رہے لیکن اس میں کون شبہ کر سکتا ہے امام صاحب کی رائے نہایت صحیح اور دقیقہ سنجی پر مبنی تھی۔

جو مسائل تشریعی مسائل نہیں ہیں

خلفائے راشدین سے بڑھ کر کون احکام شریعت کا نکتہ شناس ہو سکتا ہے انہوں نے کیا کیا۔ حضرت عمرؓ کے آغازِ خلافت تک، امہات اولاد یعنی وہ لونڈیاں جن سے اولاد ہو چکی ہو عموماً خریدی اور بیچی جاتی تھیں حضرت عمرؓ نے اس رواج کو بالکل روک دیا۔ آنحضرت ﷺ نے تبوک کے سفر میں غیر مذہب والوں پر جو جزیہ مقرر کیا وہ فی کس ایک دینار تھا۔ حضرت عمرؓ نے

ہماری واقفیت ہے اسلام کے اس وسیع دور میں قدرت نے یہ دونوں قابلیتیں جس اعلیٰ درجہ پر امام ابو حنیفہؒ میں جمع کردی تھیں، کسی مجتہد یا امام میں جمع نہیں ہوئیں۔

علم فقہ کے متعلق سب سے بڑا کام امام صاحبؒ نے جو کیا وہ تشریعی اور غیر تشریعی احکام میں امتیاز قائم کرنا تھا۔

تشریعی اور غیر تشریعی احادیث کا فرق

شارع علیہ السلام کے اقوال و افعال جو مسئلۂ روایت سے منضبط کئے گئے ان میں بہت سے ایسے امور تھے جن کو منصب رسالت سے کچھ تعلق نہ تھا لیکن بطور ایک اصطلاح کے ان سب پر حدیث کا لفظ اطلاق کیا جاتا تھا۔ فقہ کی توضیح میں ایک عام اور سخت غلطی یہ ہوئی کہ لوگوں نے ان تمام امور کو شرعی حیثیت پر محمول کیا اور اس خیال سے ان پر مسائل اور احکام کی بنیاد قائم کی حالانکہ وہ حدیثیں منصب شریعت سے علاقہ نہیں رکھتی تھیں۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ سے جو کچھ روایت کیا گیا ہے اور کتب حدیث میں اس کی تدوین ہوئی اس کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ جو تبلیغ رسالت سے تعلق رکھتا ہے اور اسی بارے میں یہ آیت اتری ہے ما آتا کم الرسول فخذوہ وما نہا کم عنه فانتہوا یعنی پیغمبر جو تم کو دے اس کو اختیار کرو اور جس چیز سے منع کرے اس سے باز آؤ۔

۲۔ جو تبلیغ رسالت سے متعلق نہیں، چنانچہ ان کی نسبت آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے انما انا بشر اذا امرتکم بشئ من دینکم فخذوہ و اذا امرتکم بشئ من رائی فانما انا بشر یعنی میں ایک آدمی ہوں جب میں کوئی مذہبی حکم دوں تو تم لوگ اس کے پابند رہو اور جب میں اپنی رائے سے کسی بات کا حکم دوں تو میں صرف ایک آدمی ہوں۔"

اس دوسری قسم میں وہ افعال داخل ہیں جو آنحضرت ﷺ سے عادتاً صادر ہوئے نہ عبادۃً اور اتفاقاً واقع ہوئے نہ قصداً اور اسی قسم میں وہ حدیثیں داخل ہیں جو آنحضرت ﷺ نے اپنی قوم کے گمان کے موافق بیان کیں مثلاً ام زرع کی حدیث اور خرافہ کی حدیث اور اسی قسم میں وہ امور داخل ہیں جو اس وقت آنحضرت ﷺ نے اس وقت مصلحت جزئی کے موافق اختیار فرمائے اور وہ سب لوگوں پر واجب العمل نہیں ہیں۔ مثلاً فوجوں کی تیاری اور شعار کی تعیین، اسی بنا پر حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ اب رمل کرنے کی ضرورت ہے جس قوم کو دکھانے کے لئے ہم رمل کرتے تھے اس کو خدا نے ہلاک کر دیا۔ اور آنحضرت ﷺ کے بہت سے احکام اسی قسم میں داخل ہیں۔ مثلاً یہ حکم کہ جہاد میں جو شخص کافر کو قتل کرے تو اس کے ہتھیار کا مالک بھی وہی ہوگا۔

شاہ ولی اللہؒ نے حدیث کی قسموں میں جو دقیق فرق بیان کیا یہ وہی نکتہ ہے جس کی طرف سب سے پہلے امام ابو حنیفہؒ کا ذہن منتقل ہوا۔ اسی بنا پر بہت سے مسائل مثلاً غسل جمعہ، خروج

النساء الی العیدین، نفاذ طلاق، تعین جزیہ، تشخیص خراج، تقسیم غنائم وغیرہ میں جو حدیثیں وارد ہیں ان کو امام ابو حنیفہؒ نے دوسری قسم میں داخل کیا ہے لیکن امام شافعیؒ وغیرہ ان حدیثوں کو بھی تشریعی حدیثیں سمجھتے ہیں۔

حنفی فقہ کو بمقابلہ اور فقہوں کے بہت بڑی خصوصیت جو حاصل ہے وہ یہی ہے کہ اس کے مسائل عموماً اسی قاعدے پر مبنی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس میں وہ وسعت اور آزادی پائی جاتی ہے جو اور ائمہ کے مسائل میں نہیں پائی جاتی۔ یہ قاعدہ اگرچہ نہایت صاف اور صریح ہے لیکن افسوس ہے کہ اور ائمہ نے اس پر لحاظ نہیں کیا اور اگر خلفائے راشدین کی نظیریں موجود نہ ہوتیں تو شاید امام ابو حنیفہؒ کو بھی اس کے اختیار کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔ اگرچہ امام صاحب کے بعد بھی بعض ائمہ نے جن کو ان کے مقابلے میں اجتہاد کا دعویٰ تھا اس عمدہ اصول کی پیروی نہ کی اور اسی غلط خیال پر قائم رہے لیکن اس میں کون شبہ کر سکتا ہے امام صاحب کی رائے نہایت صحیح اور دقیقہ سنجی پر مبنی تھی۔

جو مسائل تشریعی مسائل نہیں ہیں

خلفائے راشدین سے بڑھ کر کون احکام شریعت کا نکتہ شناس ہو سکتا ہے انہوں نے کیا کیا۔ حضرت عمرؓ کے آغازِ خلافت تک، امہات اولاد یعنی وہ لونڈیاں جن سے اولاد ہو چکی ہو عموماً خریدی اور بیچی جاتی تھیں حضرت عمرؓ نے اس رواج کو بالکل روک دیا۔ آنحضرت ﷺ نے تبوک کے سفر میں غیر مذہب والوں پر جو جزیہ مقرر کیا وہ فی کس ایک دینار تھا۔ حضرت عمرؓ نے

ہماری واقفیت ہے اسلام کے اس وسیع دور میں قدرت نے یہ دونوں قابلیتیں جس اعلیٰ درجہ پر امام ابو حنیفہؒ میں جمع کر دی تھیں، کسی مجتہد یا امام میں جمع نہیں ہوئیں۔

علم فقہ کے متعلق سب سے بڑا کام امام صاحبؒ نے جو کیا وہ تشریعی اور غیر تشریعی احکام میں امتیاز قائم کرنا تھا۔

تشریعی اور غیر تشریعی احادیث کا فرق

شارع علیہ السلام کے اقوال و افعال جو مسلۂ روایت سے منضبط کئے گئے ان میں بہت سے ایسے امور تھے جن کو منصب رسالت سے کچھ تعلق نہ تھا لیکن بطور ایک اصطلاح کے ان سب پر حدیث کا لفظ اطلاق کیا جاتا تھا۔ فقہ کی توضیح میں ایک عام اور سخت غلطی یہ ہوئی کہ لوگوں نے ان تمام امور کو شرعی حیثیت پر محمول کیا اور اس خیال سے ان پر مسائل اور احکام کی بنیاد قائم کی حالانکہ وہ حدیثیں منصب شریعت سے علاقہ نہیں رکھتی تھیں۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ سے جو کچھ روایت کیا گیا ہے اور کتب حدیث میں اس کی تدوین ہوئی اس کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ جو تبلیغ رسالت سے تعلق رکھتا ہے اور اسی بارے میں یہ آیت اتری ہے ما آتا کم الرسول فخذوه وما نہا کم عنه فانتهوا یعنی پیغمبر جو تم کو دے اس کو اختیار کرو اور جس چیز سے منع کرے اس سے باز آؤ۔

۲۔ جو تبلیغ رسالت سے متعلق نہیں، چنانچہ ان کی نسبت آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے انما انا بشر اذا امرتكم بشيئ من دينكم فخذوه و اذا امرتكم بشيئ من رائي فانما انا بشر یعنی میں ایک آدمی ہوں جب میں کوئی مذہبی حکم دوں تو تم لوگ اس کے پابند رہو اور جب میں اپنی رائے سے کسی بات کا حکم دوں تو میں صرف ایک آدمی ہوں۔"

اس دوسری قسم میں وہ افعال داخل ہیں جو آنحضرت ﷺ سے عادتاً صادر ہوئے نہ عبادۃً اور اتفاقاً واقع ہوئے نہ قصداً اور اسی قسم میں وہ حدیثیں داخل ہیں جو آنحضرت ﷺ نے اپنی قوم کے گمان کے موافق بیان کیں مثلاً ام زرع کی حدیث اور خرافہ کی حدیث اور اسی قسم میں وہ امور داخل ہیں جو اس وقت آنحضرت ﷺ نے اس وقت مصلحت جزئی کے موافق اختیار فرمائے اور وہ سب لوگوں پر واجب العمل نہیں ہیں۔ مثلاً فوجوں کی تیاری اور شعار کی تعیین، اسی بنا پر حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ اب رمل کرنے کی ضرورت ہے جس قوم کو دکھانے کے لئے ہم رمل کرتے تھے اس کو خدا نے ہلاک کر دیا۔ اور آنحضرت ﷺ کے بہت سے احکام اسی قسم میں داخل ہیں۔ مثلاً یہ حکم کہ جہاد میں جو شخص کافر کو قتل کرے تو اس کے ہتھیار کا مالک بھی وہی ہوگا۔

شاہ ولی اللہؒ نے حدیث کی قسموں میں جو دقیق فرق بیان کیا یہ وہی نکتہ ہے جس کی طرف سب سے پہلے امام ابو حنیفہؒ کا ذہن منتقل ہوا۔ اسی بنا پر بہت سے مسائل مثلاً غسل جمعہ، خروج

بات کی دلیل ہے کہ ان کا طریقہ فقہ انسانی ضرورتوں کے لیے نہایت مناسب اور موزوں واقع ہوا تھا اور بالخصوص تمدن کے ساتھ جس قدر ان کی فقہ کو مناسبت تھی کسی کی فقہ کو نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اور ائمہ کے مذہب کو زیادہ تر انہی ملکوں میں رواج ہوا جہاں تہذیب و تمدن نے زیادہ ترقی نہیں کی تھی۔ علامہ ابن خلدون اس بات کی وجہ بتاتے ہیں کہ مغرب واندلس میں امام مالک کا مذہب کیوں زیادہ رائج ہوا وہ دیکھتے ہیں کہ مغرب واندلس میں بدویت غالب تھی اور وہاں کے لوگوں نے وہ ترقی نہیں حاصل کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان ممالک میں امام مالک کی فقہ کے سوا اور کسی مذہب کا رواج نہ ہو سکا۔

فقہ حنفی جس میں امام ابو حنیفہؒ کے علاوہ ان کے نامور شاگردوں کے مسائل بھی شامل ہیں اس زمانہ کا بہت بڑا قانون بلکہ بہت بڑا مجموعہ قوانین تھا زمانہ مابعد میں گو علمائے حنفیہ نے اس پر بہت کچھ اضافہ کیا اور جزئیات کی تفریع کی جو حالت ہو سکتی ہے وہ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی جو امام ابو حنیفہ کے عہد میں فقہ کو حاصل ہو چکی تھی۔ اس مجموعہ میں عبادات کے علاوہ دیوانی، فوجداری، تعزیرات، لگان، مال گزاری، شہادت، معاہدہ، وراثت، وصیت اور بہت سے قوانین شامل تھے اس کی وسعت اور خوبی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ہارون الرشید اعظم کی وسیع سلطنت جو سندھ سے ایشیائے کوچک تک پھیلی ہوئی تھی انہی اصول پر قائم تھی اور اس کے عہد کے تمام واقعات اور معاملات انہی قواعد کی بنا پر فیصل ہوتے تھے۔

مسائلِ فقہ

یہ قانون جس کو فقہ کہتے ہیں دو قسم کے مسائل پر مشتمل ہے اور اس لحاظ سے اس کی دو مختلف حیثیتیں ہیں:

۱۔ وہ مسائل جو شریعت سے ماخوذ ہیں اور تشریعی احکام کہے جاسکتے ہیں۔

۲۔ وہ احکام جن سے شریعت نے سکوت کیا ہے اور جو تمدن اور معاشرت کی ضرورتوں سے پیدا ہوتے ہیں یا جن کا ذکر شریعت میں ہے لیکن تشریعی طور پر نہیں۔

پہلی قسم کے مسائل کے لحاظ سے فقیہ کی حیثیت شارح اور مفسر کی حیثیت ہے اس اعتبار سے اس کے لیے جس قسم کی قابلیت درکار ہے وہ مہارت زبان، واقفیت نصوص، قوتِ استنباط، توفیق متعارضات، ترجیح دلائل ہے۔ لیکن تشریعی طور پر نہیں۔

دوسری قسم کے احکام کے لحاظ سے واضع فقہ ایک مقنن کی حیثیت رکھتا ہے اور اس لحاظ سے اس کی قابلیت اس رتبہ کی ہونی چاہیے جیسی کہ دنیا کے اور مشہور مقننوں کی تھی۔ یہ دونوں حیثیتیں ایک دوسری سے ممتاز ہیں۔ اسلام میں بہت سے نامور گزرے ہیں جو قرآن و حدیث کے عمدہ مفسر یا شارح تھے لیکن مقننانہ قابلیت سے معرا تھے۔ اسی طرح ایسے لوگ بھی گزرے ہیں جو مقنن اور واضع قانون تھے لیکن نصوص شرعی کے مفسر نہیں کہے جاسکتے تھے۔ جہاں تک کہ

دونوں مجتمع ہو گئے۔"

اس کے علاوہ قاضی ابو یوسف کا اثر ہارون
ید کے زمانہ تک محدود تھا، دیرپا اور غیر منقطع
میابی کس نے پیدا کی؟ یوں تو بعض اور ائمہ نے
ن اپنے عہد میں نہایت عروج حاصل کیا تھا۔
م اوزاعی اپنی زندگی میں بلکہ زمانہ بعد تک بھی
ام شام کے امام مطلق تسلیم کیے گئے اور ان
الک میں لوگ عموماً ان ہی کی تقلید کرتے تھے
ن وہ ایک محدود اثر تھا جو بہت جلد جاتا رہا۔ ان
قعات سے صاف نتیجہ نکلتا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ
کے مذہب میں ایسی خاص خوبیاں ہیں جو اور
ہبوں میں نہیں۔

وسرے مجتہدین کے رواج مذہب کے اسباب

تمام ممالک اسلامی میں جن ائمہ کی فقہوں
نے رواج پایا وہ صرف چار ہیں۔ ابو حنیفہؒ، مالکؒ،
نافعیؒ، احمد بن حنبلؒ۔ لیکن کچھ شبہ نہیں کہ اس
مر میں واضع فقہ کے ذاتی رسوخ اور عظمت کو بھی
ہت کچھ دخل ہے۔ ہمارے نزدیک امام ابو حنیفہ
کے سوا اور مجتہدین فقہ کی ترویج واشاعت زیادہ تر
ان کی ذاتی خصوصیتیں تھی مثلاً امام مالک مدینہ
کے رہنے والے تھے جو نبوت کا مرکز اور خلفائے
اشدین کا دار الخلافہ رہ چکا تھا۔ اس تعلق سے
گوں کو عموماً مدینہ اور ارباب مدینہ کے ساتھ
خلوص و عقیدت تھی، ان کا خاندان ایک علمی
خاندان تھا ان کے دادا مالک بن ابی عامر نے بڑے
بڑے صحابہ سے حدیثیں سیکھی تھیں، ان کے چچا
شیخ الحدیث تھے۔ امام مالک نے جب حدیث وفقہ
میں کمال پیدا کیا تو یہ عارضی اوصاف ان کی ذاتی
قابلیت کا طرہ بن کر نمایاں ہوئے اور تمام اطراف
ودیار میں ان کی شہرت کا سکہ جم گیا۔

امام شافعیؒ کو اور بھی زیادہ خصوصیتیں حاصل
تھیں، مکہ معظمہ وطن تھا، باپ کی طرف سے
قریشی اور مطلبی اور ماں کی طرف سے ہاشمی تھے ان
کا تمام خاندان ہمیشہ سے معزز وممتاز چلا آتا تھا، ان
کے پردادا سائب جنگِ بدر میں ہاشمیوں کے علم
بردار تھا اور گرفتار ہو کر اسلام لائے تھے، مکہ
معظمہ کی ولایت، خاندان کا اعزاز، رسول اللہ
ﷺ کی ہم نسبی، ایسی چیزیں تھیں جن سے بڑھ
کر حسن قبول اور مرجعیت کے لیے کوئی کارگر آلہ
نہیں ہو سکتا تھا۔

امام ابو حنیفہؒ میں ایسی کوئی خصوصیت نہ
تھی، قریشی اور ہاشمی ہونا تو ایک طرف وہ عربی
النسل بھی نہ تھے، خاندان میں کوئی شخص ایسا
نہیں گزرا تھا جو اسلامی گروہ کا مرجع اور مقتدر
ہوتا، آبائی پیشہ تجارت تھا اور خود بھی تمام عمر اسی
ذریعے سے زندگی بسر کی۔ کوفہ جو ان کا مقام
ولادت تھا گو دار العلم تھا لیکن مکہ معظمہ اور مدینہ
منورہ کا ہمسر کیونکر ہو سکتا تھا۔ بعض اتفاقی اور
ناگزیر اسباب سے اربابِ روایات کا ایک گروہ ان
کی مخالفت پر کمربستہ تھا، غرض حسن قبول اور عام
اثر کے لیے جو اسباب درکار ہیں وہ بالکل نہ تھے
باوجود اس کے ان کی فقہ کا تمام ممالک اسلامیہ میں
اس وسعت اور ترقی کے ساتھ رواج پانا یقیناً اس

تھا دنیا میں پہلا دار الحدیث اسی نے قائم کیا اگرچہ خود شافعی و مالکی فقہ کی عزت کرتا تھا لیکن وہ خود اور اس کا تمام خاندان مذہباً حنفی تھا، صلاح الدین خود شافعی تھا لیکن اس کے خاندان میں بھی حنفی المذہب موجود تھے۔ الملک المعظم عیسیٰ بن الملک العادل جو ایک وسیع ملک کا بادشاہ تھا علامہ ابن خلکان اس کے حالات میں لکھتے ہیں کہ وہ نہایت عالی ہمت، فاضل، ہوشمند، دلیر، پر رعب تھا اور حنفی مذہب میں غلو رکھتا تھا۔ چراکسہ مصر نویں صدی کے آغاز میں مصر کی حکومت پر پہنچے اور ۱۳۸ برس تک فرمانروا رہے اور بہت سی فتوحات حاصل کیں خود حنفی تھے اور ان کے دربار میں اسی مذہب کو زیادہ فروغ تھا، سلاطین ترک جو کہ کم و بیش چھ سو برس سے روم کے فرمانروا رہے اور صدیوں انہی کی سلطنت اسلام کی عزت و وقار کی امید گاہ رہی عموماً حنفی تھے۔ خود ہمارے ہندوستان کے فرمانروا خوانین اور آل تیمور اسی مذہب کے پابند رہے اور ان کی وسیع سلطنت میں اس طریقہ کے سوا اور کسی طریقہ کو رواج نہ ہو سکا۔

مذہب کے حسن قبولیت کا سبب

بعضوں کا خیال ہے کہ حنفی مذہب کو جو قبول عام حاصل ہوا وہ حکومت کے صدقہ سے ہوا۔ ابن حزم جو ارباب ظاہر کے مشہور امام ہیں ان کا قول ہے کہ "دو مذہبوں نے سلطنت کے زور سے ابتدا ہی میں رواج عام حاصل کیا ایک ابو حنیفہ کا مذہب کیونکہ جب قاضی ابو یوسف کو قاضی القضاۃ کا منصب ملا تو انہوں نے حنفی لوگوں کو عہدۂ قضا پر مقرر کیا، دوسرا امام مالک کا مذہب اندلس میں کیوں کہ امام مالک کے شاگرد یحییٰ اصمودی خلیفہ اندلس کے نہایت مقرب تھے اور کوئی شخص ان کے مشورے کے بغیر عہدۂ قضا پر مقرر نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ صرف اپنے ہم مذہبوں کو مقرر کراتے تھے۔"

لیکن یہ ابن حزم کی ظاہر بینی ہے، امام ابو حنیفہؒ ۱۲۰ھ میں مسند اجتہاد پر بیٹھے۔ قاضی ابو یوسف نے ۱۷۰ھ کے بعد قاضی القضاۃ کا منصب حاصل کیا کیونکہ ان کے تقرر اور عروج کا زمانہ ہارون الرشید کے عہد سے شروع ہوتا ہے جو ۱۷۰ھ میں تخت نشین ہوا تھا، قاضی ابو یوسفؒ کے فروغ سے پچاس برس کا زمانہ گزر چکا تھا جس میں امام ابو حنیفہ کے مذہب نے قبولِ عام حاصل کر لیا تھا اور ان کے سیکڑوں شاگرد قضا کے عہدوں پر مامور ہو چکے تھے۔ اس کامیابی کو کس طرف منسوب کیا جائے۔ یہ ضرور ہے کہ قاضی ابو یوسفؒ کی وجہ سے امام صاحبؒ کے مسائل کو اور زیادہ عروج ہوا لیکن مذہب حنفی کا اصلی عروج قاضی صاحب کی کوششوں کا محتاج نہ تھا۔ امام رازی نے باجود مخالفت کے تسلیم کیا ہے کہ ثم انہ لنا قوی مذہب اصحاب الرای و اشتہر وعظم وقعتہ فی القلوب ثم اتفق اتصال ابی یوسف و محمد بخدمۃ ہارون الرشید عظمت ملك القوۃ جد الان العلم ولسلطنۃ خصلاً معاً یعنی اصحاب الرائے کا مذہب قوی ہو گیا اور شہرت پکڑ گیا اور اس کی وقعت دلوں میں بہت ہی زیادہ بڑھ گئی کیوں کہ علم اور حکومت

حنیفہ کے ہی اقوال ہیں کیوں کہ بعض مسئلوں میں امام ابو حنیفہ نے متعدد اور مختلف رائیں ظاہر کی تھیں۔ یہ ان فقہا کا حسن ظن ہے۔ قاضی ابو یوسف اور امام محمد اجتہاد مطلق کا منصب رکھتے تھے اور ان کو اختلاف کا پورا حق حاصل تھا۔ اسلام کی ترقیاں اسی وقت تک رہیں کہ لوگ باوجود حسن عقیدت کے بزرگوں اور استادوں کی رائے سے علانیہ مخالفت کرتے تھے اور خیالات کی ترقی محدود نہ تھی۔

یہ مسائل جو فقہ حنفی کے نام سے موسوم ہیں نہایت تیزی سے تمام ملک میں پھیل گئے، عرب میں تو چنداں ان مسائل کو رواج نہ ہوا کیوں کہ مدینہ میں امام مالکؒ اور مکہ میں اور ائمہ ان کے حریف مقابل موجود تھے لیکن عرب کے سوا تمام ممالک اسلامی میں جن کی وسعت سندھ سے ایشیائے کوچک تک تھی، عموماً ان ہی کا طریقہ جاری ہو گیا، ہندوستان، سندھ، کابل، بخارا وغیرہ میں تو ان کے اجتہاد کے سوا کسی کا اجتہاد تسلیم ہی نہیں کیا جاتا۔ دوسرے ممالک میں گو شافعی و حنبلی فقہ کا رواج ہوا لیکن فقہ حنفی کو دبا نہیں سکا البتہ بعض ملکوں میں وہ بالکل کالعدم ہو گیا اور اس کے خاص اسباب تھے افریقہ میں ۴۰۵ھ تک امام ابو حنیفہ کا طریقہ تمام طریقوں پر غالب تھا لیکن معزبن بادیس نے ۴۰۶ھ میں جب وہاں کی مستقل حکومت قائم کی تو حکومت کے زور سے تمام ملک میں مالکی فقہ کو رواج دے دیا کہ آج تک قائم ہے۔

سلاطین اکثر حنفی تھے

ایک خاص بات یہ ہے کہ عنانِ حکومت جن لوگوں کے ہاتھ میں رہی وہ اکثر حنفی ہی فقہ کے پابند تھے۔ خلفائے عباسیہ اس بحث سے خارج ہیں کیوں کہ یہ خاندان جب تک اوج پر رہا یہ لوگ تلوار کے ساتھ قلم کے بھی مالک رہے یعنی ان کا دعویٰ اجتہاد تھا اور کبھی کسی کی تقلید نہیں کی۔ تنزل کے بعد وہ اس قابل ہی نہیں رہے کہ ان کے حالات سے کسی ملکی اثر کا اندازہ کیا جائے تاہم ان میں اگر کسی نے تقلید کی تو ابو حنیفہ ہی کی کی۔ عبد اللہ بن المعتز جو فن بدیع کا موجد تھا اور خلفائے عباسیہ میں سب سے بڑا شاعر اور ادیب تھا حنفی المذہب تھا۔ عباسیہ کے تنزل کے ساتھ جن خاندانوں کو عروج ہوا اکثر حنفی تھے۔ خاندان سلجوقی جس نے ایک وسیع مدت تک حکومت کی اور جن کے دائرہ حکومت کی وسعت طول میں کاشغر سے بیت المقدس تک اور عرض میں قسطنطنیہ سے بلاد خرز تک پہنچی تھی حنفی تھا۔ محمود غزنوی جس کے نام سے ہندوستان کا بچہ بچہ واقف ہے فقہ حنفی کا بہت بڑا عالم تھا، فن فقہ میں اس کی ایک نہایت عمدہ تصنیف موجود ہے جس کا نام التفرید ہے اور جس میں کم و بیش ساٹھ ہزار مسئلے ہیں۔

نور الدین زنگی کا نام چھپا ہوا نہیں ہے وہ ہمارے ہیروز میں داخل ہے، بیت المقدس کی لڑائیوں میں اول اسی نے نام حاصل کیا۔ صلاح الدین ایوبی فاتح بیت المقدس اسی دربار میں ملازم

ہے کیوں کہ بیہقی نے تصریح کی ہے کہ امام اوزاعی نے ابو حنیفہؒ کی کتاب السیر کا رد لکھا تھا، جس کا جواب قاضی ابو یوسفؒ نے لکھا۔

غالباً یہ مجموعہ بہت بڑا مجموعہ تھا اور ہزاروں مسائل پر مشتمل تھا۔ قلائد عقود القیان کے مصنف نے کتاب الصیافہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ نے جس قدر مسائل مدون کیے ان کی تعداد بارہ لاکھ نوے ہزار سے کچھ زیادہ ہے۔ شمس الائمہ کردری نے لکھا ہے کہ "یہ مسائل چھ لاکھ تھے۔" یہ خاص تعداد شاید صحیح نہ ہو لیکن کچھ شبہ نہیں کہ ان کی تعداد لاکھوں سے کم نہ تھی۔ امام محمد کی جو کتابیں آج موجود ہیں ان سے اس کی تصدیق ہو سکتی ہے۔

امام صاحب کے زمانے میں جو مجموعہ فقہ مرتب ہوا تھا وہ معدوم ہو گیا

اگرچہ اس میں کسی طرح شبہ نہیں ہو سکتا کہ امام ابو حنیفہؒ کی زندگی ہی میں فقہ کے تمام ابواب مرتب ہو گئے تھے، رجال و تاریخ کی کتابوں میں اس کا ثبوت ملتا ہے جس کا انکار گویا تواتر کا انکار ہے لیکن افسوس ہے کہ وہ مجموعہ ایک مدت سے ضائع ہو گیا ہے اور دنیا کے کسی کتب خانہ میں اس کا پتہ نہیں چلتا، امام رازی مناقب الشافعی میں لکھتے ہیں کہ ابو حنیفہ کی کوئی تصنیف باقی نہیں رہی۔ امام رازی نے ۶۰۶ھ میں انتقال کیا اس لحاظ سے کم از کم چھ سو برس ہو گئے کہ امام ابو حنیفہؒ کی تصنیفات ناپید ہو چکیں۔ امام صاحب کی تصنیفات کا ضائع ہو جانا اگرچہ کچھ محلِ تعجب نہیں، اس عہد کی ہزاروں کتابوں میں سے آج ایک کا بھی وجود نہیں، امام اوزاعی، ابن جریج، ابن عروبہ، حماد بن ابی معمر ان کی تالیفات عین اسی زمانہ میں شائع ہوئی جب امام ابو حنیفہ کا دفترِ فقہ مرتب ہو رہا تھا تاہم ان کتابوں کا نام بھی کوئی نہیں جانتا لیکن امام ابو حنیفہؒ کی تصنیفات کی گمشدگی کی ایک خاص وجہ ہے امام صاحبؒ کا مجموعہ فقہ اگرچہ بجائے خود مرتب اور خوش اسلوب تھی لیکن قاضی ابو یوسف و امام محمد نے انہی مسائل کو اس توضیح و تفصیل سے لکھا اور ہر مسئلہ پر استدلال و براہان کے ایسے حاشیے اضافہ کیے کہ انہی کا رواج عام ہو گیا اور اصل ماخذ سے لوگ بے پرواہ ہو گئے، ٹھیک اسی طرح کہ متأخرین نحویوں کی تصنیفات کے بعد فرا، کسائی، خلیل، اخفش، ابو عبیدہ کی کتابیں دنیا سے بالکل ناپید ہو گئیں۔ حالانکہ یہ لوگ فنِ نحو کے بانی اور مدون اول تھے۔

امام صاحبؒ کے مسائل کا جو ذخیرہ آج دنیا میں موجود ہے وہ امام محمد اور قاضی ابو یوسف کی تالیفات ہیں۔

یہ فقہ اگرچہ عام طور سے فقہ حنفی کہلاتی ہے لیکن در حقیقت وہ چار شخصوں یعنی امام ابو حنیفہ، زفر، قاضی ابو یوسف، امام محمد کی رایوں کا مجموعہ ہے، قاضی ابو یوسف و امام محمد نے بہت سے مسائل میں امام ابو حنیفہ کی رائے سے اختلاف کیا ہے۔ فقہائے حنفیہ نے روایتیں نقل کی ہیں کہ ان صاحبوں کو اعتراف تھا کہ ہم نے جو اقوال امام ابو حنیفہ کے خلاف کہے وہ بھی امام ابو

اقوال قلم بند کر لیے جاتے، اس کا التزام تھا کہ جب تک تمام شرکائے جلسہ جمع نہ ہو لیں کسی مسئلہ کو طے نہ کیا جائے۔

عافیہ

جواہر مضیہ کے مصنف نے عافیہ بن یزید کے تذکرہ میں اسحٰق سے روایت کی ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کے اصحاب کسی مسئلہ میں بحث کرتے ہوتے اور عافیہ موجود نہ ہوتے تو امام صاحب فرماتے کہ عافیہ کو آلینے دو، جب وہ آلیتے اور اتفاق کرتے تب وہ مسئلہ درج تحریر کیا جاتا۔ اس طرح تیس برس کی مدت میں یہ عظیم الشان کام انجام کو پہنچا۔ امام صاحبؒ کی اخیر عمر قید خانہ میں گزری، وہاں بھی یہ کام برابر جاری رہا۔

اس مجموعہ کا رواج

اس مجموعہ کی ترتیب جیسا کہ ابو المحاسن نے بیان کی ہے یہ تھی: اول باب الطہارۃ، باب الصلوٰۃ، باب الصوم پھر عبادات کے اور ابواب، اس کے بعد معاملات، سب سے اخیر میں باب المیراث۔

امام صاحبؒ کی زندگی ہی میں اس مجموعہ نے وہ حسن قبول حاصل کیا کہ اس وقت کے حالات کے لحاظ سے مشکل سے قیاس میں آسکتا ہے۔ جس قدر اس کے اجزاء تیار ہوتے جاتے تھے ساتھ ہی ساتھ تمام ملک میں اس کی اشاعت ہوتی جاتی تھی، امام صاحبؒ کی درسگاہ ایک قانونی مدرسہ تھا جس کے طلبہ نہایت کثرت سے ملکی عہدوں پر مامور ہوئے اور ان کے آئین حکومت کا یہی مجموعہ تھا تعجب ہے کہ جن لوگوں کو امام صاحبؒ سے ہمسری کا دعویٰ تھا وہ بھی ان کتاب سے بے نیاز نہ تھے۔ امام سفیان ثوریؒ نے بڑے لطائف الحیل سے کتاب الرہن کی نقل حاصل کی اور اس کو اکثر پیش نظر رکھتے تھے، زائدہ کا بیان ہے کہ میں نے ایک دن سفیان کے سرہانے ایک کتاب دیکھی جس کا وہ مطالعہ کر رہے تھے ان سے اجازت مانگ کر میں اس کو دیکھنے لگا تو ابو حنیفہؒ کی کتاب الرہن نکلی، میں نے تعجب سے پوچھا کہ "آپ ابو حنیفہؒ کی کتابیں دیکھتے ہیں؟" بولے "کاش ان کی سب کتابیں میرے پاس ہوتیں۔"

یہ بھی کچھ تعجب کی بات نہیں کہ باوجودیکہ اس وقت بڑے بڑے مدعیانِ فن موجود تھے اور ان میں بعض امام ابو حنیفہؒ سے مخالفت بھی رکھتے تھے تاہم کسی کو اس کتاب کی رد و قدح کی جرأت نہیں ہوئی، امام رازی مناقب الشافعی میں لکھتے ہیں:

ان اصحاب الرای اظهر و مذهبهم وكانت الدنيا مملوة من المحدثين ورواة الاخبار ولم يقدر احدعنهم الطعن فى اقاويل اصحان الرائے۔

یعنی اصحاب الرائے ابو حنیفہؒ اور ان کے تلامذہ نے اپنے مسائل جس زمانہ میں ظاہر کئے، محدثین اور اویانِ اخبار سے بھری ہوئی تھی تاہم کسی کو یہ قدرت نہ ہوئی کہ ان کے اقوال پر اعتراض کرتا۔"

امام رازی نے تو عام نفی کی ہے لیکن ہم کو زیادہ استقصا سے معلوم ہوا کہ اس عموم میں استثنا

استفتاء آتے تھے، ان سے ان کو اندازہ ہوتا تھا کہ ملک کو اس فن کی کس قدر حاجت ہے، قضاۃ اور حکام، فصل قضایا میں جو غلطیاں کرتے تھے وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے۔

غرض یہ اسباب اور وجوہ تھے جنہوں نے ان کو اس فن کی تدوین اور ترتیب پر آمادہ کیا، ممکن ہے کہ کسی خاص واقعہ سے جیسا کہ اوپر مذکور ہوا اس آمادگی کو اور تحریک ہوئی ہو جس کے ساتھ عملی کوشش کا ظہور ہوا۔

تلامذہ فقہ کی تدوین میں شریک تھے

امام صاحبؒ نے جس طریقہ سے فقہ کی تدوین کا ارادہ کیا وہ نہایت وسیع اور پر خطر کام تھا، اس لیے انہوں نے اتنے بڑے کام کو اپنی ذاتی رائے اور معلومات پر منحصر کرنا نہیں چاہا، اس غرض سے انہوں نے اپنے شاگردوں میں سے چند نامور شخص منتخب کیے۔ جن میں سے اکثر خاص خاص فنون میں جو تکمیل فقہ کے لیے ضروری تھے، استادِ زمانہ تسلیم کیے جاتے تھے۔ مثلاً یحیٰ بن ابی زائدہ، حفص بن غیاث، قاضی ابو یوسف، داؤد الطائی، حبان، مندل۔ حدیث و آثار میں نہایت کمال رکھتے تھے۔ امام زفر قوتِ استنباط میں مشہور تھے، قاسم بن معن اور امام محمد کو ادب اور عربیت میں کمال تھا، امام صاحب نے ان لوگوں کی شرکت سے ایک مجلس مرتب کی اور باقاعدہ طور سے فقہ کی تدوین شروع ہوئی، امام طحاوی نے بسند متصل اسد بن فرات سے روایت کی ہے کہ ابو حنیفہؒ کے تلامذہ جنہوں نے فقہ کی تدوین کی چالیس تھے۔ جن میں یہ لوگ زیادہ ممتاز تھے ابو یوسف، زفر، داؤد الطائی، اسد بن عمر، عمر بن خالد التیمی، یحیٰ بن ابی زائدہ، امام طحاوی نے یہ بھی روایت کی لکھی ہے کہ: لکھنے کی خدمت یحیٰ سے متعلق تھی اور وہ تیس برس تک اس خدمت کو انجام دیتے رہے، اگرچہ یہ صحیح ہے کہ اس کام میں کم و بیش تیس برس کا زمانہ صرف ہوا یعنی ۱۲۱ھ سے ۱۵۰ھ تک جو امام ابو حنیفہؒ کی وفات کا سال ہے۔ لیکن یہ غلط ہے کہ یحیٰ شروع سے اس کام سے شریک تھے۔ یحیٰ ۱۲۰ھ میں پیدا ہوئے تھے اس لیے وہ شروع سے کیوں کر شریک ہو سکتے تھے۔ طحاوی نے جن لوگوں کے نام گنائے ہیں ان کے سوا عافیہ ازدی، ابو علی، عزی، علی مسہر، قاسم بن معن، حبان مندل بھی اس مجلس کے ممبر رہے تھے۔

طریقۂ تدوین

تدوین کا طریقہ یہ تھا کہ کسی خاص باب کا مسئلہ پیش کیا جاتا تھا۔ اگر اس کے جواب میں سب لوگ متفق الرائے ہوتے تو اسی وقت قلم بند کر لیا جاتا اور نہایت آزادی سے بحثیں شروع ہوتیں، کبھی کبھی بہت دیر تک بحث قائم رہتی، امام صاحبؒ بہت غور و تحمل کے ساتھ سب کی تقریریں سنتے اور بالآخر ایسا جچا تلا فیصلہ کرتے کہ سب کو تسلیم کرنا پڑتا، کبھی ایسا بھی ہوتا کہ امام صاحبؒ کے فیصلہ کے بعد بھی لوگ اپنی اپنی رایوں پر قائم رہتے، اس وقت وہ سب مختلف

کی جگہ امام ابو حنیفہؒ کو فقہ کی مسند پر بٹھایا۔

امام صاحبؒ کے زمانے تک اگرچہ فقہ کے معتدبہ مسائل مدون ہو چکے تھے لیکن اولاً تو یہ تدوین صرف زبانی روایت تھی، دوسرے جو کچھ تھا فن کی حیثیت سے نہ تھا۔ نہ استنباط و استدلال کے قواعد قرار پائے تھے، نہ احکام کی تفریع کے اصول منضبط تھے۔ نہ حدیثوں میں امتیاز مراتب تھا، نہ قیاس اور شبیہ النظیر کے قاعدے مقرر تھے، مختصر یہ کہ فقہ جزئیات کے مسائل کا نام اور اس کو تدوین کے رتبہ تک پہنچانے کے لیے بہت سے زینے باقی تھے۔

امام ابو حنیفہؒ کو فقہ کی تدوین کا خیال کیونکر پیدا ہوا؟

تاریخ سے اس بات کا پتہ لگانا مشکل ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کو خاص کس وجہ سے فقہ کی تدوین کا خیال پیدا ہوا، قلائد عقود القیان کے مصنف نے انموذج القتال سے اس کا ایک قصہ نقل کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "دو شخص حمام میں نہانے گئے اور حمامی کے پاس کچھ امانت رکھتے گئے۔ ایک ان میں سے نہا کر نکلا اور حمامی سے امانت طلب کی، اس نے دے دی، یہ لے کر چلتا ہوا۔ دوسرا حمام سے باہر آیا اور امانت مانگی تو اس نے عذر کیا کہ میں نے تمہارے شریک کو حوالہ کر دی۔ اس نے عدالت میں استغاثہ کیا۔ قاضی صاحب نے حمامی کو ملزم ٹھہرایا کہ جب دونوں نے مل کر تیرے پاس امانت رکھی تھی تو تجھ کو ضروری تھا کہ دونوں کی موجودگی میں واپس کرتا۔ حمامی گھبرایا ہوا امام صاحبؒ کے پاس آیا۔ امام صاحبؒ نے کہا کہ تم اس شخص سے کہو میں تمہاری امانت ادا کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن قاعدے کے موافق تنہا تم کو نہیں دے سکتا، شریک کو لاؤ تو لے جاؤ۔ اس واقعے کے بعد امام صاحبؒ کو فقہ کی تدوین کا خیال پیدا ہوا اور اس کی ترتیب شروع کی۔

ممکن ہے یہ واقعہ صحیح ہو لیکن اس خیال کے پیدا ہونے کے اصلی اسباب دوسرے تھے، یہ امر تاریخوں سے ثابت ہے کہ امام صاحبؒ کو تدوین فقہ کا خیال قریباً ۱۲۰ھ میں پیدا ہوا یعنی جب ان کے استاد حماد نے وفات پائی یہ وہ زمانہ ہے کہ اسلام میں تمدن نہایت وسعت پکڑ گیا تھا، عبادات اور معاملات کے متعلق اس کثرت سے واقعات پیدا ہو گئے تھے اور ہو جاتے تھے کہ ایک مرتب مجموعۂ قانون کے بغیر کسی طرح کام نہیں چل سکتا تھا، نیز سلطنت کی وسعت اور دوسری قوموں کے میل جول سے تعلیم و تعلم نے اس قدر وسعت حاصل کر لی تھی کہ زبانی سند و روایت اس کا تحمل نہیں کر سکتی تھی، ایسے وقت پر قدرتی طور پر لوگوں کے دل میں خیال آیا ہوگا کہ ان جزئیات کو اصول کے ساتھ ترتیب دے کر ایک فن بنا دیا جائے۔

امام ابو حنیفہؒ کی طبیعت مجتہدانہ اور غیر معمولی مقننانہ واقع ہوئی تھی، اس کے ساتھ تجارت کی وسعت اور ملکی تعلقات نے ان کو معاملات کی ضرورتوں سے خبردار کر دیا تھا۔ اطراف و بلاد سے ہر روز جو سینکڑوں ضروری

کچھ دنوں تک مدینہ میں رہے۔ ہم نے عبداللہ بن مسعودؓ کو رسول اللہ ﷺ کے پاس اس کثرت سے آتے جاتے دیکھا کہ ہم ان کو رسول اللہ ﷺ کے اہل بیت سے گمان کرتے رہے۔" عبداللہ بن مسعودؓ کو دعویٰ تھا کہ قرآن مجید میں کوئی آیت ایسی نہیں ہے جس کی نسبت میں یہ نہ جانتا ہوں کہ کس باب میں اتری ہے۔" وہ کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص قرآن مجید کا مجھ سے زیادہ عالم ہوتا تو میں اس کے پاس سفر کر کے جاتا۔" صحیح مسلم میں ہے کہ انہوں نے ایک مجمع میں دعویٰ کیا کہ تمام صحابہ جانتے ہیں کہ میں قرآن کا سب سے زیادہ عالم ہوں، شفیق اس جلسے میں موجود تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد میں اکثر صحابہ کے حلقوں میں شریک ہوا، مگر کسی کو عبداللہ بن مسعودؓ کے دعویٰ کا منکر نہیں پایا۔

عبداللہ بن مسعودؓ باقاعدہ طور پر حدیث وفقہ کی تعلیم دیتے تھے، اور ان کی درسگاہ میں بہت سے تلامذہ کا مجمع رہتا تھا۔ جن میں سے چند یعنی اسود، عبیدہ، حارث، علقمہ نہایت نام آور ہوئے۔ علقمہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں پیدا ہوئے تھے اور حضرت عمرؓ عثمانؓ علیؓ عائشہؓ سعدؓ حذیفہؓ خالد بن مسعودؓ کی صحبت میں اس التزام سے رہے اور ان کے طور وطریقہ کے اس قدر دم بقدم چلتے تھے کہ لوگوں کا قول تھا کہ جس نے علقمہ کو دیکھ لیا اس نے عبداللہ بن مسعودؓ کو دیکھ لیا۔" خود عبداللہ بن مسعودؓ کا قول تھا کہ جس قدر علقمہ کی معلومات ہیں، میری معلومات اس سے زیادہ نہیں ہیں۔" اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ صحابہ ان سے مسائل دریافت کرنے آتے تھے عبداللہ بن مسعود کے شاگردوں میں اگر کوئی شخص علقمہ کا ہمسر تھا تو اسود تھے۔

ابراہیمؒ

علقمہ اور اسود کے انتقال کے بعد ابراہیم نخعیؒ مسند نشین ہوئے اور فقہ کو بہت کچھ وسعت دی، یہاں تک کہ ان کو فقیہ العراق کا لقب ملا، علم حدیث میں ان کا یہ پایہ تھا کہ امیر فی الحدیث کہلاتے تھے۔ امام شعبیؒ نے جو علامۃ التابعین کے لقب سے ممتاز ہیں ان کی وفات کے وقت کہا" ابراہیم نخعیؒ نے کسی کو نہیں چھوڑا، جو ان سے زیادہ عالم اور فقیہ ہو۔" اس پر ایک شخص نے تعجب سے پوچھا کہ کیا حسن بصریؒ اور ابن سیرینؒ بھی۔ شعبیؒ نے کہا حسن بصریؒ اور ابن سیرینؒ پر کیا ختم ہے بصرہ، کوفہ، شام، حجاز میں کوئی ان سے زیادہ عالم نہیں رہا۔

ابراہیم نخعیؒ کے عہد میں مسائل فقہ کا ایک مختصر مجموعہ تیار ہو گیا تھا جس کا ماخذ حدیث نبوی اور حضرت علی اور عبداللہ بن مسعود کے فتاویٰ تھے۔ یہ مجموعہ گو مرتب طور پر قلم بند نہیں کیا گیا، لیکن ان کے شاگردوں کو اس کے مسائل زبانی یاد تھے۔ سب سے زیادہ یہ مجموعہ حماد کے پاس جمع تھا جو ابراہیم کے تلامذہ میں نہایت ممتاز تھے۔ چنانچہ ان کے مرنے کے بعد فقہ کی مسند خلافت بھی انہی کو ملی، حماد نے گو فقہ کو چنداں ترقی نہیں دی لیکن ابراہیم کے مجموعہ فقہ کے بڑے حافظ تھے۔ حماد نے ۱۲۰ھ قضا کی اور لوگوں نے ان

تھے اور لوگ آنحضرت ﷺ کے اقوال کو محفوظ رکھتے تھے۔

آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد فتوحات کو نہایت وسعت ہوئی اور تمدن کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ واقعات اس کثرت سے پیش آئے کہ اجتہاد و استنباط کی ضرورت پڑی اور اجمالی احکام کی تفصیل پر متوجہ ہونا پڑا مثلاً کسی شخص نے غلطی سے نماز میں کوئی عمل ترک کر دیا۔ اب بحث یہ پیش آئی کہ "نماز ہوئی یا نہیں؟" اس بحث کے پیدا ہونے کے ساتھ یہ تو ممکن نہ تھا کہ نماز میں جس قدر اعمال تھے سب کو فرض کہہ دیا جاتا۔ صحابہ کو تفریق کرنی پڑی کہ نماز میں کتنے ارکان فرض و واجب ہیں، کتنے مسنون اور مستحب۔ اس تفریق کے لیے جو اصول قرار دیئے جا سکتے تھے ان پر تمام صحابہ کی رایوں کا متفق ہونا ممکن نہ تھا۔ اس لیے مسائل میں اختلاف آرا ہوا۔ اور اکثر مسئلوں میں صحابہ کی مختلف رائیں قائم ہوئیں۔ بہت سے ایسے واقعات پیش آئے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ان کا عین واثر بھی پایا نہیں گیا تھا۔ صحابہ کو ان صورتوں میں استنباط، تفریع حمل، نظیر، قیاس سے کام لینا پڑا۔ ان اصولوں کے طریقے یکساں نہیں تھے۔ اس لیے ضروری اختلاف پیدا ہوئے۔ غرض صحابہ ہی کے زمانے میں احکام اور مسائل کا ایک دفتر بن گیا اور جدا جدا طریقے قائم ہوئے۔

صحابہ میں جن لوگوں نے استنباط و اجتہاد سے کام لیا اور مجتہد یا فقیہ کہلائے ان میں سے چار بزرگ نہایت ممتاز تھے: عمرؓ، علیؓ عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس۔ حضرت علی و عبداللہ بن مسعودؓ زیادہ تر کوفہ میں رہے اور وہیں ان کے مسائل واحکام کی زیادہ ترویج ہوئی۔ اس تعلق سے کوفہ فقہ کا دارالعلوم بن گیا جس طرح کہ حضرت عمرؓ و عبداللہ بن عباسؓ کے تعلق سے حرمین کو دارالعلوم کا لقب حاصل ہوا تھا۔

حضرت علیؓ بچپن سے رسول اللہ ﷺ کی آغوش تربیت میں پلے تھے اور جس قدر ان کو آنحضرت ﷺ کے اقوال و افعال سے مطلع ہونے کا موقع ملا تھا کسی کو نہیں ملا تھا۔ ایک شخص نے ان سے پوچھا کہ آپ اور صحابہ کی نسبت کثیر الروایہ کیوں ہیں؟ فرمایا کہ میں آنحضرت ﷺ سے کچھ دریافت کرتا تھا تو بتاتے تھے اور چپ رہتا تھا تو خود ابتدا کرتے تھے۔" اس کے ساتھ ذہانت، قوتِ استنباط، ملکۂ استخراج ایسا بڑھا ہوا تھا کہ عموماً صحابہ اعتراف کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ کا عام قول تھا کہ خدا نہ کرے کہ کوئی مشکل مسئلہ آن پڑے اور علیؓ موجود نہ ہوں۔" عبداللہ بن عباس خود مجتہد تھے، مگر کہا کرتے تھے کہ جب ہم کو علیؓ کا فتویٰ مل جائے تو کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔

عبداللہ بن مسعود

عبداللہ بن مسعودؓ بھی حدیث وفقہ دونوں میں کامل تھے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جس قدر جلوت اور خلوت میں ہمدم وہمراز رہے تھے، بہت کم لوگ رہے ہوں گے۔ صحیح مسلم میں ابو موسیٰ سے روایت ہے کہ ہم یمن سے آئے اور

اسلامی علوم مثلاً تفسیر، حدیث، مغازی۔
ان کی ابتداء اگرچہ اسلام کے ساتھ ساتھ ہوئی لیکن اس وقت تک ان کو فن کی حیثیت نہیں حاصل ہوئی وہ کسی خاص شخص کی طرف منسوب نہیں ہوئے۔ دوسری صدی کے اوائل میں تدوین و ترتیب شروع ہوئی اور جن لوگوں نے تدوین و ترتیب کی وہ ان علوم کے بانی کہلائے۔ چنانچہ بانیٔ فقہ کا لقب امام ابو حنیفہؒ کو ملا جو در حقیقت اس لقب کے سزاوار تھے۔ اگر ارسطو علم منطق کا موجد ہے تو بے شبہ امام ابو حنیفہؒ بھی علم فقہ کے موجد ہیں۔ امام صاحبؒ کی علمی زندگی کا بڑا کارنامہ فقہ ہی ہے۔ اس لیے ہم اس پر تفصیلی بحث کرنا چاہتے ہیں لیکن اصل مقصد سے پہلے ضروری ہے کہ مختصر طور پر ہم علم فقہ کی تاریخ لکھیں جس سے ظاہر ہو کہ یہ علم کب شروع ہوا اور خاص کر یہ کہ امام ابو حنیفہؒ نے جب اس کو پایا تو اس کی کیا حالت تھی۔

فقہ کی مختصر تاریخ

فقہ کی تاریخ پر شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے ایک نہایت عمدہ مضمون لکھا ہے جس کا التقاط ہمارے لیے کافی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں احکام کی قسمیں پیدا نہیں ہوئی تھیں۔ آنحضرت ﷺ صحابہ کے سامنے وضو فرماتے تھے اور کچھ نہ بتاتے تھے کہ یہ رکن ہے، یہ واجب ہے، یہ مستحب ہے۔ صحابہ آپ کو دیکھ کر اسی طرح وضو کرتے تھے۔ نماز کا بھی یہی حال تھا۔ یعنی صحابہ فرض و واجب وغیرہ کی تفصیل و تدقیق نہیں کرتے تھے جس طرح رسول اللہ ﷺ کو نماز پڑھتے دیکھا خود بھی پڑھ لی۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ میں نے کسی قوم کو رسول اللہ ﷺ کے اصحاب سے بہتر نہیں دیکھا لیکن انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں تیرہ مسئلوں سے زیادہ نہیں پوچھے۔ جو سب کے سب قرآن میں موجود ہیں۔ البتہ جو واقعات غیر معمولی طور سے پیش آتے تھے ان میں لوگ آنحضرت ﷺ سے استفتاء کرتے اور آنحضرت ﷺ جواب دیتے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ لوگوں نے کوئی کام کیا اور آپ نے اس پر تحسین کی یا اس سے ناراضامندی ظاہر کی اس قسم کے فتوے اکثر عام مجمعوں میں ہوتے

نعت شریف

چشمِ خیر الوریٰ ہم پہ کیا ہوگئی
کلفتِ زندگی سب فنا ہوگئی

لاکھوں در چھوڑ کر اُن کا در پالیا
وصلِ مولا سے رب کی عطا ہوگئی

آئینہ سنّتوں کا نکھرنے لگا
ذاتِ آقاؐ جو جلوہ نما ہوگئی

تو کسی کا نہ بن پیارے آقاؐ کا بن
تجھ پہ پھر رحمتِ کبریا ہوگئی

اُنؐ کے گیسو کی جب سرسرائی ہوئی
یہ فضائے جہاں کیف زا ہوگئی

ایک لمحہ ولیوں کو آئی قضا
پھر قضا ہی ہمیشہ فنا ہوگئی

عین ممکن ہے ہوگی زیارت نجیبؔ
چشم نمناک تو آئینہ ہوگئی

صلی اللہ علیہ وسلم

سید نجیب اشرف اشرفی

ہماری زندگی کا بالیقین ہے رہنما قرآں

قاسم ھنرؔ اعظمی

کلامِ حق سے جس کے خانہ دل میں اُجالا ہے قسم اللہ کی اس کا جہاں میں بول بالا ہے

ہے اپنی زندگی پُرنور تو قرآن کے دم سے دھڑکتا ہے دلِ مومن تو بس ایمان کے دم سے

یہی مومن کی عزت ہے یہی شانِ مسلماں ہے یہی ہے رُوح مومن کی یہی جانِ مسلماں ہے

ہماری زندگی کا بالیقیں ہے رہنما قرآن ہر اک اہلِ نظر کے واسطے ہے آئینہ قرآں

اسی قرآں سے سیکھا سبق ہم نے اُخوت کا اسی قرآن سے ہم کو ملا پیغام اُلفت کا

اسی قرآں سے سیکھا حق کی خاطر سر بکف رہنا اسی قرآں سے سیکھا "ہو اللہ احد" کہنا

اسی قرآں نے مردہ دلوں کو زندگی بخشی یہی وہ نور ہے جس نے جہاں کو روشنی بخشی

سکھاتا ہے ادب تہذیب اور شائستگی قرآں ہمیں دیتا ہے درسِ اتحادِ باہمی قرآں

ہم اک بھٹکے ہوئے راہی تھے مگر قرآں نے بتلایا کہ ہم کو امتیازِ خیر و شر قرآں نے بتلایا

یہ ساری کائنات اللہ کے محبوب پر قرباں کہ جن پر خالقِ کونین نے نازل کیا قرآں

خدا وندا ہنرؔ کی یہ دعا کچھ کام کر جائے

ہر اک پیمانہ دل بادہ وحدت سے بھر جائے

صلی اللہ علیہ وسلم

چوتھا اختلاف یہ ہے کہ امام شافعیؒ کیفیت قتل میں مساوات کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ یعنی اگر قاتل نے پتھر سے سر پھوڑ کر کسی کو مارا ہو تو وہ بھی پتھر سے سر توڑ کر مارا جائے۔ یا کسی نے آگ سے جلا کر مارا ہو تو وہ بھی آگ سے جلا کر مارا جائے لیکن اس قسم کی مساوات پر قرآن کا کوئی لفظ دلالت نہیں کرتا۔

پانچواں اختلاف یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک قتلِ عمد کی حالت میں کفارہ لازم نہیں آتا، امام شافعیؒ قصاص وکفارہ دونوں لازمی قرار دیتے ہیں حالانکہ قرآن مجید میں کفارہ کا حکم قتلِ خطا کے ساتھ مخصوص ہے۔ قتلِ عمد میں کفارہ کا کچھ ذکر نہیں۔

وراثت

وراثت کے بعض احکام میں جو نہایت مہتم بالشان ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ میں اختلاف ہے، ان مسائل میں امام ابوحنیفہؒ نے جو پہلو اختیار کیا وہ نہایت صریح طور سے قرآن سے ثابت ہے، وراثت کے قاعدے جو اسلام نے مقرر کئے ہیں وہ تمام دنیا کے قواعد وراثت سے الگ ہیں، اور ایسے دقیق اور نازک اصول پر مبنی ہیں جو علانیہ اس بات کی دلیل ہیں کہ خدا کے سوا اور کوئی ان احکام کا واضع نہیں ہو سکتا۔ وراثت کا اصلی اصول یہ ہے کہ متوفی اگر اپنی جائداد کسی خاص شخص کو دے جاتا تو اسی کو ملتی لیکن جب اس نے کوئی ہدایت نہیں کی تو اس پر لحاظ ہو گا کہ اس کے فطری تعلقات کن کن لوگوں کے ساتھ کس کس تفاوت کے ساتھ تھے۔ جو لوگ یہ تعلقات رکھتے ہیں وہ اسی تفاوت درجات کے ساتھ اس کی جائداد کے مالک ہوں گے، گویا متوفی کی یہ معنوی ہدایت ہے کہ لوگوں کو اسی مناسبت سے دیا جائے۔ جس نسبت سے میرے تعلقات ان کے ساتھ تھے۔ دوسرا اصول جو پولیٹیکل اکانومی کا عام اصول ہے یہ کہ دولت کا بہت سے اشخاص میں تقسیم اس سے اچھا ہے کہ وہ ایک شخص تک محدود رہے۔ یہ عمدہ اصول تمام اور قوموں کی نگاہ سے رہ گئے اور اس وجہ سے ان کا قانون وراثت بھی ناتمام اور محدود رہ گیا، عیسائیوں کے قانون میں بڑے بیٹے کو جائداد پہونچتی ہے۔ دوسرے بھائیوں کو کچھ دست بردا شتہ ملتا ہے، ہندوؤں کے ہاں صرف اولاد ذکور جائداد کی مالک ہے۔ باپ بھائی وغیرہ محروم مطلق ہیں، لیکن اسلام نے نہایت دقت نظر سے ان تعلقات پر نگاہ کی جو ورثہ کے ساتھ ہیں اور اسی نسبت سے تین درجے قرار دیئے ہیں۔ ذوی الفروض، عصبات، ذوی الارحام، ان تینوں درجوں کی تعداد قرآن مجید میں موجود ہے اور خاص کر ذوی الارحام کا ذکر ان آیتوں میں ہے۔

لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِیَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ۔

امام ابوحنیفہؒ نے توریث کے احکام میں یہ تینوں مراتب قائم رکھے لیکن امام شافعیؒ و امام مالکؒ نے ذوی الارحام کو سرے سے خارج کر دیا۔ چنانچہ ان کے نزدیک نانا بھتیجا، بھانجے وغیرہ کسی حال میں ورثہ نہیں پا سکتے، ان بزرگوں نے ذوی الارحام عام سمجھا ہے اور ذوی الفروض وعصبات اس کے افراد قرار دیئے ہیں، جیسا کہ امام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں ذکر کیا ہے لیکن یہ ایک صریح تکلف ہے۔

(سیرت امام ابوحنیفۃ از رئیس احمد جعفری) ●

نعت رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم

وجہِ تسکینِ دل و جان ذکرِ ختم المرسلینؐ
نازشِ رحمت ہے ذاتِ رحمۃ للعٰلمین

ختم ہے اُن پر نبوّت اور نبوّت کا کمال
اس کے حق میں قولِ فیصل آیتِ تکمیلِ دیں

ہے سزاوارِ ستائش آپؐ کی ذاتِ کریم
حاملِ خلقِ عظیم و صاحبِ فتحِ مبیں

چشمۂ نورِ ہدایت ہے کلامِ دل پذیر
منبعِ تذکیر و حکمت ہے بیانِ دل نشیں

آپؐ کیا آئے دبستانِ محبت کھل گیا
رنجشیں صدیوں کی لوگوں کے دلوں سے مٹ گئیں

اس کریمی کے تصدّق اس مروت کے نثار
لطف و رافت کی قبائیں خون کے پیاسوں کو دیں

اللہ اللہ یہ جمالِ حسن و خوبی مرحبا
پیشِ چشمِ شوق احسنؔ کون سا عالم نہیں

حفیظ الرحمٰن احسنؔ

دوسرا اختلاف یہ ہے کہ امام شافعیؒ ذمی کی دیت مسلمان کی دیت سے کم قرار دیتے ہیں حالانکہ دیت کے
جو الفاظ خدا نے مومن کے حق میں استعمال کئے وہی ان لوگوں کے حق میں بھی ارشاد کئے۔ جو مسلمانوں سے میثاق
و معاہدہ رکھتے ہیں بے شبہ یہ اسلام کی نہایت فیاض دلی ہے کہ اس نے مسلمان و ذمی کا حق برابر رکھا لیکن افسوس
ہے کہ ایسے فیاضانہ حکم کی لوگوں نے غلط تاویل کی۔

تیسرا اختلاف یہ ہے کہ امام شافعیؒ قتلِ عمد کی حالت میں بھی مالی معاوضہ ادا کرنا کافی سمجھتے ہیں حالانکہ قرآن
مجید میں قتلِ عمد کی حالت میں قصاص کا حکم ہے۔ دیت کی کہیں اجازت نہیں، اور یہی اقتضائے عقل ہے، جاہلیت
میں قتل، مقدمات دیوانی کی حیثیت رکھتا تھا اور اس وجہ سے مالی معاوضہ اس کا بدل ہوسکتا تھا لیکن اسلام
ایسی غلطی کا مرتکب نہیں ہوسکتا تھا۔

کی کسی دوسرے مجتہد نے نہیں کی۔ زمانہ جاہلیت میں قصاص کے جو قاعدے رائج تھے نہایت ناانصافی اور جہالت پر مبنی تھے۔ اسلام نے نہایت خوبی سے اس کی اصلاح کی اور ایسے احکام مقرر کئے جن سے بڑھ کر نہ کبھی ہوئے نہ ہو سکتے ہیں۔

جاہلیت میں قصاص کا اعتبار مقتول و قاتل کی حیثیت سے کیا جاتا تھا، جو معزز قبیلے تھے وہ دوسرے قبیلوں سے اس طرح قصاص لیتے تھے کہ اپنے غلام کے بدلے دوسرے قبیلہ کے آزاد کو اپنی عورت کے بدلے ان کے مرد کو اور اپنے مرد کے بدلے دوسرے قبیلہ کے دو مردوں کو قتل کرتے تھے۔ خدا نے قصاص کا عام حکم صادر فرمایا جس کا یہ مطلب ہے کہ:۔

قصاص کا حکم کسی قید کے ساتھ مقید نہیں ہے۔ قاتل ہر حالت میں مقتول کے بدلے مارا جائے گا خواہ شریف ہو یا رذیل، مرد ہو یا عورت، غلام ہو یا آزاد، مسلم ہو یا ذمی۔ زیادہ توضیح کے لئے ان صورتوں کی خاص طور پر بھی نفی کی جو عرب میں اسلام سے پہلے جاری تھیں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا کہ۔ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنْثَى بِالْأُنْثَى "تم پر مقتول کے بارے میں قصاص فرض کیا گیا۔ آزاد کے بدلے آزاد، غلام کے بدلے غلام۔ عورت عورت کے بدلے"

زمانہ جاہلیت میں یہ بھی دستور تھا کہ قتل عمد کے بدلے میں مالی معاوضہ دیدینا کافی سمجھا جاتا تھا۔ اور اس کو دیت کہتے تھے۔ اسلام نے اس کو باطل کیا اور دیت کو جو ایک قسم کا جرمانہ ہے۔ صرف شبہ عمد اور قتلِ خطا کی حالت میں جائز رکھا اور اس کی مقدار مسلمان و ذمی کے لئے یکساں مقرر کی۔ چنانچہ خدا نے ارشاد فرمایا۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَنْ يَقْتُلَ مُؤْمِنًا إِلَّا خَطَأً وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ وَدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ إِلَى أَهْلِهِ إِلَّا أَنْ يَصَّدَّقُوا فَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ وَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِيثَاقٌ فَدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ إِلَى أَهْلِهِ وَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ۔ "اور مسلمان کی شان نہیں ہے کہ کسی مسلمان کو قتل کرے مگر غلطی سے قتل کرے تو اس کو ایک مسلمان غلام آزاد کرنا ہو گا اور مقتول کے اہل کو دیت دینی ہو گی مگر یہ کہ معاف کر دیں، پھر اگر مقتول ان لوگوں میں سے ہو جو تم مسلمانوں کے دشمن ہیں اور وہ خود مسلمان ہو تو ایک مسلمان بردہ آزاد کرنا ہو گا۔ اور اگر مقتول اس قوم سے ہو کہ تمہارے اور ان کے درمیان میثاق ہے تو مقتول کے اہل کو دیت دینی ہو گی اور ایک مسلمان غلام آزاد کرنا ہو گا۔ (سورہ نساء ۱۳)

یہ احکام نہایت صاف اور صریح طور پر قرآن سے ثابت ہوتے ہیں اور امام ابوحنیفہؒ انہی احکام کے قائل ہیں لیکن امام شافعیؒ وغیرہ نے بعض مسائل میں اختلاف کیا ہے جس کی نسبت ہم افسوس کے ساتھ کہتے ہیں کہ یقیناً ان کی غلطی ہے۔

پہلا اختلاف یہ ہے کہ امام شافعیؒ اور امام مالکؒ و امام احمد بن حنبلؒ قائل ہیں کہ غلام کے بدلے آزاد قتل نہیں کیا جا سکتا۔ غلام اور آزاد میں ایسا بے رحمانہ تفرقہ کرنا ہرگز قرآن سے ثابت نہیں ہوتا۔ اگر الْحُرُّ بِالْحُرِّ کی تخصیص سے استدلال ہے تو الْأُنْثَى بِالْأُنْثَى کی تخصیص سے لازم آتا ہے کہ عورت کے بدلے مرد نہ قتل کیا جائے حالانکہ اس کا کوئی قائل نہیں۔

قطلوبغا وغیرہم کی نسبت قلت نظر کا کون گمان کر سکتا ہے۔ یہ لوگ عموماً حنفی مسائل کے حامی رہیں۔
اس کے علاوہ جو لوگ عموماً حافظ الحدیث تسلیم کئے گئے ہیں۔ ان کے مسائل امام ابو حنیفہؒ سے کیوں موافق ہیں۔ طبقہ اولیٰ میں سب سے بڑے محدث امام احمد بن حنبلؒ ہیں جن کی شاگردی پر امام بخاریؒ و مسلمؒ کو ناز تھا اور جن کی نسبت محدثین کا عام قول ہے کہ "جس حدیث کو احمد بن حنبلؒ نہیں جانتے وہ حدیث ہی نہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ بہت سے مسائل میں امام شافعیؒ کے مخالف اور امام ابو حنیفہؒ کے موافق ہیں۔ خوارزمی نے لکھا ہے کہ "فروع وجزئیات چھوڑ کر امہات فقہ کے متعلق ایک سو پچیس مسئلوں میں ان کو امام ابو حنیفہؒ کے ساتھ اتفاق ہے اور امام شافعیؒ سے اختلاف" ہم نے خود بہت سے مسائل میں تطبیق کی ہے جس سے خوارزمی کے دعویٰ کی تائید ہوتی ہے۔ سفیان ثوری کو محدثین نے امام الحدیث تسلیم کیا ہے۔ ان کے مسائل امام ابو حنیفہؒ کے مسائل کے موافق ہیں۔ قاضی ابو یوسف کہا کرتے تھے کہ واللہ سفیان اکثر متابعۃ منی لابی حنیفۃ "یعنی خدا کی قسم سفیان مجھ سے زیادہ ابو حنیفہؒ کی پیروی کرتے ہیں" صحیح ترمذی میں سفیان ثوریؒ کے مسائل مذکور ہیں جو زیادہ تر شافعیؒ کے مخالف اور ابو حنیفہؒ کے موافق ہیں۔

ایک تیمم سے کئی فرض ادا ہو سکتے ہیں

امام ابو حنیفہؒ کا مذہب ہے کہ ایک تیمم سے کئی فرض ادا ہو سکتے ہیں۔ امام مالکؒ و امام شافعیؒ کی رائے ہے کہ ہر فرض کے لئے نیا تیمم کرنا چاہئے۔ امام صاحبؒ کا استدلال ہے کہ جو حیثیت وضو کے حکم کی ہے وہی تیمم کی ہے اور جب ہر نماز کے لئے وضو کی ضرورت نہیں تو تیمم کی بھی تجدید کی ضرورت نہیں البتہ جن لوگوں کا مذہب ہے کہ ایک وضو سے کئی نمازیں ادا نہیں ہو سکتیں وہ تیمم کی نسبت بھی یہ حکم لگا سکتے ہیں لیکن وضو اور تیمم میں تفریق کرنی جیسا امام شافعیؒ وغیرہ نے کی محض بے وجہ ہے۔

تیمم کرنے والے کا اثنائے نماز میں پانی پر قادر ہونا

امام ابو حنیفہؒ کا مذہب ہے کہ اثنائے نماز میں تیمم کرنے والے کو اگر پانی مل جائے تو تیمم جاتا رہے گا۔ امام مالکؒ و احمد بن حنبلؒ اس کے مخالف ہیں۔ امام صاحبؒ کا استدلال یہ ہے کہ قرآن میں تیمم کا جواز اس قید کے ساتھ مشروط ہے کہ لَمْ تَجِدُوْا مَاءً یعنی "جب پانی نہ ملے"، صورت مذکورہ میں جب شرط باقی نہیں رہی تو مشروط بھی باقی نہیں رہا۔

باب الجنایات

جنایات کے باب میں جو احکام قرآن مجید میں وارد ہیں ان کی تعبیر جس صحت کے ساتھ امام ابو حنیفہؒ نے

میزان الاعتدال، طبقات الحفاظ، تہذیب الاسماء واللغات وغیرہ ان میں جرح وتعدیل کے متعلق ائمہ کے جو اقوال مذکور ہیں اکثر ان کا سلسلہ سند مذکور نہیں، اس لئے محدثانہ حیثیت سے اس کے ثبوت وعدم ثبوت کا تصفیہ نہیں ہو سکتا، اس کے علاوہ اکثر جرح وح مبہم ہیں اور جن جرحوں کو مفسر قرار دیا ہے وہ بھی ابہام سے خالی نہیں، قدما نے اس فن میں جو تصنیفات لکھیں ان سے بلاشبہ یہ مباحث طے ہو سکتے ہیں. لیکن وہ یہاں میسر نہیں آئیں. علمائے حنفیہ نے خاص اس بحث پر کہ حنفی فقہ کے مسائل احادیث صحیحہ سے ثابت ہیں، بہت سی کتابیں لکھی ہیں، جس کو زیادہ شوق ہو ان تصنیفات کی طرف رجوع کر سکتا ہے۔

لیکن قرآن مجید میں اس بحث کا بڑا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے کیونکہ قرآن کے ثبوت میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا اس لئے نزاع کا مدار صرف اس پر رہ جاتا ہے کہ جو مسئلہ اس سے مستنبط کیا گیا، صحیح طور پر کیا گیا یا نہیں. اس حالت میں بحث مختصر رہ جاتی ہے اور نہایت آسانی سے اس کا تصفیہ ہو جاتا ہے. قرآن مجید سے جو احکام ثابت ہیں ان کی تعداد بھی کچھ کم نہیں ہے. اور وہ فقہ کے مہمات مسائل ہیں اس لئے اگر یہ ثابت ہو کہ حنفی فقہ کے مسائل نصوص قرآن سے زیادہ مطابق ہیں تو مہمات مسائل میں فقہ حنفی کی ترجیح بآسانی ثابت ہو جائے گی، اس کے ساتھ یہ بھی ثابت ہو جائے گا کہ امام ابو حنیفہؒ کو حیثیت اجتہاد میں تمام ائمہ پر ترجیح ہے کیونکہ اجتہاد کا مدار زیادہ تر استنباط اور استخراج ہی پر ہے۔

اس بدگمانی کی تردید کہ فقہ حنفی کے مسائل حدیث کے مخالف ہیں

ان وجوہ کی بنا پر اگرچہ ہم صرف ان مسائل پر اکتفا کرتے ہیں جو قرآن سے ثابت ہیں تاہم حدیث کے متعلق ایک اجمالی بحث ضرور ہے جس سے بدگمانوں کو سوء ظن کا موقع نہ ہو. بعض بزرگوں کا خیال ہے کہ امام صاحبؒ کے بہت سے مسائل احادیث صحیحہ کے مخالف ہیں۔ ان لوگوں میں سے بعض نے الزام دیا ہے کہ امام صاحبؒ نے دانستہ حدیث کی مخالفت کی. بعض انصاف پسند وجہ یہ بتاتے ہیں کہ امام صاحبؒ کے زمانہ تک احادیث کا استقصاء نہیں کیا گیا تھا اس لئے بہت سی حدیثیں ان کو نہیں پہونچیں لیکن یہ خیال محض لغو اور بے سر و پا ہے. امام صاحبؒ کے زمانہ تک تو حدیثیں جمع نہیں ہوئی تھیں لیکن جب جمع ہو چکیں، اس وقت بڑے بڑے محدثین ان کے مسائل کو کیوں صحیح تسلیم کرتے رہے، وکیع بن الجراح جن کی روایتیں صحیح بخاری میں بکثرت موجود ہیں اور جن کی نسبت امام احمد بن حنبلؒ کہا کرتے تھے کہ میں نے ان سے بڑھ کر کسی کو حافظ العلم نہیں دیکھا. وہ امام ابو حنیفہؒ کے مسائل کی تقلید کرتے تھے. خطیب بغدادیؒ نے ان کے حال میں لکھا ہے. کان یفتی بقول ابی حنیفۃ.
یحییٰ بن سعید بن القطان جو فن جرح و تعدیل کے موجد ہیں. اکثر مسائل میں امام ابو حنیفہؒ کے پیرو تھے. خود ان کا قول ہے. قد اخذنا باکثر اقوالہ. امام طحاوی جو حافظ الحدیث تھے اور مجتہد فی المذہب کا درجہ رکھتے تھے. پہلے شافعی تھے پھر امام ابو حنیفہؒ کے مسائل اختیار کئے اور کہا کرتے تھے کہ میں ابو حنیفہؒ کا مقلد نہیں ہوں بلکہ مجھ کو ان سے توارد ہے. طحاویؒ، امام بخاریؒ اور مسلمؒ کے ہم زمان ہیں. اور یہ وہ زمانہ ہے جب حدیث کا دفتر کامل طور سے مرتب ہو گیا تھا. متاخرین میں علامہ ماردینی، حافظ زیلعی، ابن الہمام قاسم بن

ذمیوں پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا اور وہ اسلامی فوج میں شریک نہیں ہو سکتے۔ ذمی اگر کسی مسلمان کو قصداً قتل کر ڈالے یا کسی مسلمان عورت کے ساتھ زنا کا مرتکب ہو تو اسی وقت اس کے تمام حقوق باطل ہو جائیں گے اور وہ کافر حربی سمجھا جائے گا۔ یہ احکام بھی عیسائیوں اور یہودیوں کے ساتھ خاص ہیں۔ امام شافعیؒ کے نزدیک بت پرستوں کو جزیہ ادا کرنے پر بھی اسلامی حدود میں رہنے کی اجازت نہیں۔

یہ تمام احکام ایسے سخت ہیں جن کا تحمل ایک ضعیف سے ضعیف محکوم قوم بھی نہیں کر سکتی اور یہی وجہ ہے کہ امام شافعیؒ وغیرہ کا مذہب سلطنت کے ساتھ نہ نبھ سکا۔ مصر میں بے شبہ ایک مدت تک گورنمنٹ کا مذہب شافعی تھا لیکن اس کا نتیجہ یہ تھا کہ عیسائی اور یہودی قومیں اکثر بغاوت کرتی رہیں۔

اس موقع پر یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ فقہ حنفی کی کتابوں میں ذمیوں کے متعلق چند ایسے احکام بھی مذکور ہیں جو نہایت سختی اور تنگ دلی پر مبنی ہیں اور چونکہ وہ اس طریقہ سے ظاہر کئے گئے ہیں کہ گویا وہ خاص امام ابوحنیفہؒ کے مسائل ہیں اس لئے غیر قوموں کو مذہب حنفی پر بلکہ عموماً مذہب اسلام پر حملہ کرنے کا موقع ملا ہے۔ ہدایہ میں ہے کہ ذمیوں کو ضرور ہے کہ وہ وضع اور لباس میں مسلمانوں کی ہمسری نہ کریں۔ وہ گھوڑوں پر سوار نہ ہوں ہتھیار نہ لگائیں، زنار باندھیں، ان کے گھروں پر علامت بنا دی جائے جس سے ظاہر ہو کہ وہ دائرہ اسلام سے خارج ہیں، وغیرہ وغیرہ صاحب ہدایہ نے ان احکام کی وجہ یہ بتائی ہے کہ ذمیوں کی تحقیر ضروری ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں اس سے بھی زیادہ سخت دبے رحمانہ احکام ہیں۔ لیکن یہ جو کچھ ہے متاخرین فقہاء کی ایجاد ہے ورنہ امام ابوحنیفہؒ کا دامن اس داغ سے پاک ہے۔

فقہ حنفی کا نصوصِ شرعی کے موافق ہونا

ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ جو احکام نصوص سے ماخوذ ہیں اور جن میں ائمہ کا اختلاف ہے ان میں امام ابوحنیفہؒ جو پہلو اختیار کرتے ہیں وہ عموماً نہایت قوی اور مدلل ہوتا ہے۔

نص کا لفظ قرآن، حدیث دونوں پر اطلاق کیا جاتا ہے۔ اور اس لحاظ سے وہ احکام بھی نصی کہے جاتے ہیں جو قرآن سے نہیں بلکہ صرف حدیث سے ثابت ہیں لیکن اس موقع پر ہم ان سے بحث نہیں کر سکتے۔ اور اس کے مختلف وجوہ ہیں۔ اول تو یہ کہ اس قسم کے مسائل نہایت کثرت سے ہیں جن کا مختصر سے مختصر حصہ بھی اس کتاب میں نہیں آ سکتا۔ اگر چند مسائل نمونہ کے طور پر بیان کئے جائیں تو بدگمانوں کو اس سوءظن کا موقع باقی رہتا ہے کہ چند قوی مسائل لے لئے اور ضعیف چھوڑ دیئے، دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ آج ان مسائل کا فیصلہ مجتہدانہ نہیں ہو سکتا۔ حدیث کے متعلق بہت بڑی بحث صحت و عدم صحت کی پیدا ہوتی ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جس نے مسائلِ فقہ میں ائمہ کو مختلف الآراء کر دیا، ایک امام کے نزدیک ایک حدیث قابلِ حجت ہے اور دوسرے کے نزدیک نہیں، اس بحث کے تصفیہ کے لئے جو سامان ہمارے ملک میں موجود ہے، وہ بالکل ناکافی ہے اور اس سے کسی حدیث کی نسبت مجتہدانہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ بڑا مرحلہ اسماء الرجال کا ہے، اس فن کی جو کتابیں ہمارے ملک میں موجود ہیں مثلاً تہذیب الکمال مزی، تہذیب التہذیب،

امام ابوحنیفہؒ نے ذمیوں کے لئے جو قواعد مقرر کئے وہ نہایت فیاضانہ قواعد ہیں۔ وہ تجارت میں مسلمانوں کی طرح آزاد ہیں، ہر قسم کی تجارت کر سکتے ہیں اور ان سے اسی شرح سے ٹیکس لیا جائے گا جس طرح مسلمانوں سے لیا جاتا ہے۔ جزیہ جو ان کی محافظت کا ٹیکس ہے۔ اس کی شرح حسب حیثیت قائم کی جائے گی۔ مفلس شخص جزیہ کا باقی دار ہو کر مر جائے تو جزیہ ساقط ہو جائے گا۔ ذمیوں کے معاملات انہی کی شریعت کے موافق فیصل کئے جائیں گے یہاں تک کہ مثلاً اگر کسی مجوسی نے اپنی بیٹی سے نکاح کیا تو اسلامی گورنمنٹ اس نکاح کو اس کی شریعت کے موافق صحیح تسلیم کر لے گی۔ ذمیوں کی شہادت ان کے باہمی مقدمات میں مقبول ہوگی۔ ذمیوں کی اعزازی حالت یہ ہے کہ وہ حرم محترم میں جا سکتے ہیں۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں آباد ہو سکتے ہیں۔ تمام مسجدوں میں بغیر اجازت داخل ہو سکتے ہیں؛ بجز ان خاص شہروں کے جو مسلمانوں نے آباد کئے ہیں ہر جگہ وہ اپنی عبادت گاہ بنا سکتے ہیں۔ وہ اگر حربی کافروں کے مقابلہ میں مسلمانوں کا ساتھ دینا چاہیں تو سپہ سالار ان پر اعتماد کر سکتا ہے اور ان سے ہر طرح اعانت لے سکتا ہے۔

اس قسم کے اور احکام ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے عموماً تمام معاملات میں ذمیوں کے حقوق مسلمانوں کے برابر قرار دیئے ہیں بلکہ سچ یہ ہے کہ بعض امور میں تو انہوں نے اعتدال سے زیادہ فیاضی کی ہے مثلاً اس امر میں کہ ذمی کس حالت میں عہد سے باہر ہو جاتا ہے۔ ان کا مذہب ہے کہ بجز اس حالت کے کہ ان کے پاس جمعیت ہو اور وہ گورنمنٹ سے بمقابلہ پیش آئیں اور کسی صورت میں ان کے حقوق باطل نہیں ہوتے۔ مثلاً کوئی ذمی جزیہ ادا نہ کرے یا مسلمان عورت کے ساتھ زنا کا مرتکب ہو یا کافروں کی جاسوسی کرے یا کسی مسلمان کو کفر کی ترغیب دے یا خدا اور رسول کی شان میں بے ادبی کرے تو ان تمام حالتوں میں وہ سزا کا مستحق ہوگا لیکن باغی نہ سمجھا جائے گا اور اس کے حقوق باطل نہ ہوں گے۔

اب اس کے مقابلہ میں اور ائمہ کے مسائل دیکھو۔ امام شافعیؒ کے نزدیک کسی مسلمان نے گو بے جرم اور عمداً کسی ذمی کو قتل کیا ہو تاہم وہ قصاص سے بری رہے گا صرف دیت دینی ہوگی یا مالی معاوضہ ادا کرنا ہوگا۔ وہ بھی مسلمانوں کی دیت کا ایک ثلث اور امام مالکؒ کے نزدیک نصف۔ تجارت میں یہ سختی ہے کہ ذمی اگر تجارت کا مال ایک شہر سے دوسرے شہر کو لے جائے تو سال میں جتنی بار لے جائے ہر بار اس سے نیا ٹیکس لیا جائے گا۔ جزیہ کے متعلق امام شافعیؒ کا مذہب ہے کہ کسی حال میں ایک اشرفی سے کم نہیں ہو سکتا۔ اور بوڑھے، اندھے، اپاہج، مفلس، تارک الدنیا تک اس سے معاف نہیں بلکہ امام شافعیؒ سے ایک اور روایت ہے کہ جو شخص مفلس ہونے کی وجہ سے جزیہ نہیں ادا کر سکتا وہ اسلام کی عملداری میں نہ رہنے پائے۔ جزیہ جو ان پر حضرت عمرؓ کے زمانہ میں مقرر کیا گیا تھا اس پر اضافہ ہو سکتا ہے مگر کسی صورت میں کمی نہیں ہو سکتی، ذمیوں کی شہادت گو فریقین مقدمہ ذمی ہوں کسی حال میں مقبول نہیں۔ اس مسئلہ میں امام مالکؒ و امام شافعیؒ دونوں متفق الرائے ہیں۔

ذمی کبھی حرم میں داخل نہیں ہو سکتا اور نہ وہ مکہ اور مدینہ منورہ میں آباد ہو سکتا ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک عام مسجدوں میں اجازت کے ساتھ داخل ہو سکتا ہے لیکن امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک اس کو بالکل اجازت نہیں مل سکتی۔ ذمی اسلامی حدود حکومت میں کہیں اپنی عبادت گاہ نہیں بنا سکتا۔

ذمیوں کے حقوق

ایک بڑی خصوصیت جو حنفی فقہ کو حاصل ہے وہ یہ ہے کہ اس نے ذمیوں یعنی ان لوگوں کو جو مسلمان نہیں ہیں لیکن مسلمانوں کی حکومت میں مطیعانہ رہتے ہیں۔ نہایت فیاضی اور آزادی سے حقوق بخشے ہیں اور یہی خصوصیت ہے جس کی نظیر کسی امام اور مجتہد کے مسائل میں نہیں ملتی اگرچہ ذمیوں کے حقوق کی حفاظت خود شارع کی ہدایتوں میں جا بجا موجود ہے لیکن چونکہ وہ عام کلیات ہیں۔ اس کے علاوہ شارع کے بعض اقوال ظاہراً اس کے خلاف معلوم ہوتے ہیں اس لئے ان کی تعبیر مطالب میں اختلاف پیدا ہوئے ہیں، تاہم کچھ شبہ نہیں کہ جو تعبیر امام ابوحنیفہؒ نے کی ہے وہی صحیح ہے، اسلام نہایت وسیع دنیا پر حکمراں رہا ہے اور اس کی حدود حکومت میں سینکڑوں غیر قومیں آباد تھیں اور ہیں، اس لئے اگر ان کے حقوق کی واجبی حفاظت نہ کی جائے تو ایک دن بھی امن قائم نہیں رہ سکتا۔ امام ابوحنیفہؒ نے ذمیوں کو جو حقوق دیئے ہیں' دنیا میں کسی گورنمنٹ نے کبھی کسی غیر قوم کو نہیں دیئے، یورپ جس کو اپنے قانون اور انصاف پر بڑا ناز ہے، بے شک زبانی دعویٰ کر سکتا ہے لیکن عملی مثالیں نہیں پیش کر سکتا۔ حالانکہ امام ابوحنیفہؒ کے یہ احکام اسلامی گورنمنٹوں میں عموماً نافذ تھے۔ اور خاص کر ہارون الرشید اعظم کی وسیع حکومت انہی احکام پر قائم تھی۔

سب سے بڑا مسئلہ قتل وقصاص کا ہے، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ذمیوں کا خون مسلمانوں کے خون کے برابر ہے، یعنی اگر کوئی مسلمان ذمی کو عمداً قتل کر ڈالے تو مسلمان بھی اس کے بدلے قتل کیا جائے گا۔ اور اگر غلطی سے قتل کیا ہے تو جو خون بہا مسلمانوں کے قتل بالخطا سے لازم آتا ہے، وہی ذمی کے قتل سے بھی لازم آئے گا۔

امام رازیؒ نے اپنی کتاب مناقب الشافعیؒ میں حنفیوں کو طعنہ دیا ہے کہ ان کے نزدیک ابوبکر صدیقؓ کا خون اور ایک ذلیل ذمی کا خون برابر ہے۔ یعنی اگر ابوبکر صدیقؓ بے جرم کسی ذمی کو قتل کر ڈالتے تو حنفیوں کے نزدیک وہ بھی قتل کئے جانے کے مستحق تھے۔ حنفیوں نے اس مسئلہ کی تعمیم میں کہیں یہ مثال نہیں دی ہے امام رازیؒ نے اس غرض سے کہ وہ اس مسئلہ کو بدنما کر کے دکھائیں خود یہ مثال فرض کی ہے لیکن ہم فخر کے ساتھ اس طعنہ کو قبول کرتے ہیں، بے شبہ انصاف اور حق کی حکومت میں شاہ وگدا، مقبول ومردود کا ایک رتبہ ہے بے شبہ یہ اسلام کی بڑی فیاضی ہے کہ اس نے اپنی رعایا کو اپنے برابر سمجھا، اسلام کو اس انصاف پر ناز ہو سکتا ہے اور اگر امام رازیؒ کو عار آتی ہے تو آئے۔

خود صحابہ کا کیا قول اور کیا عمل تھا حضرت علیؓ کا قول ہے من کانت له ذمتنا فدمه کدمنا ودیته کدیتنا۔ یعنی "ذمی کا خون ہمارا خون ہے اور اس کی دیت ہماری دیت ہے" حضرت علیؓ پر موقوف نہیں تمام مہاجرین اور انصار کا یہی قول تھا اور اسی پر عمل درآمد تھا، عبیداللہ جو حضرت عمر فاروقؓ کے فرزند تھے انہوں نے حضرت عمرؓ کے زخمی ہونے کے وقت دو شخصوں کو جو کافر تھے اور جن پر ان کا شبہ تھا قتل کر ڈالا، حضرت عثمانؓ مسند خلافت پر بیٹھے تو انہوں نے مہاجرین وانصار کو بلایا اور اس بارے میں رائے پوچھی۔ تمام مہاجرین نے بالاتفاق کہا کہ عبیداللہ کو قتل کرنا چاہیے۔

۸۔ رجعت کے لئے اظہار زبانی کی ضرورت نہیں۔ ہر فعل جس سے رضامندی ظاہر ہو رجعت کے لئے کافی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آسانی دی جائے تاکہ رجعت یا دنی مصالحت ہو سکے۔

۸۔ امام شافعیؒ کے نزدیک بغیر اقرار و اظہار رجعت ہو ہی نہیں سکتی۔

۹۔ رجعت پر گواہ مقرر کرنے کی کچھ ضرورت نہیں ورنہ بعض حالتوں میں گواہ نہ مل سکے اور رجعت کی مدت قریب الانقضاء ہے تو طلاق بائن ہو جائے گی۔

۹۔ امام مالکؒ کے نزدیک بغیر استشہاد کے رجعت صحیح نہیں ہے۔

نکاح کے قواعد مرتب ہونے کے لئے یہ ایک نہایت ضروری امر ہے کہ فریقین کے حقوق نہایت فیاضی اور اعتدال کے ساتھ قائم کئے جائیں، عورتوں کو مردوں کے ساتھ جن باتوں میں مساوات حاصل ہے وہ باطل نہ ہونے پائے کیونکہ نکاح سے عورت کو اپنے امن و راحت کی توقع ہونی چاہئے نہ یہ کہ اس کے اصلی حقوق میں بھی زوال آئے۔ یہ اسلام کی خاص فیاضی ہے جس کی نظیر اور کسی مذہب میں نہیں مل سکتی کہ اس نے معاملہ نکاح میں عورتوں کے حقوق نہایت وسعت کے ساتھ قائم کئے ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ نے اس اصول کو تمام مسائل میں محفوظ رکھا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان مسائل میں جہاں اور ائمہ نے ان سے اختلاف کیا ہے۔ صریح غلطی کی ہے مثلاً خلع کا معاملہ جو طلاق سے مشابہ ہے۔

دستوراتِ نکاح

اخیر بحث یہ ہے کہ نکاح کن دستورات کے ساتھ عمل میں آئے؟ ان رسوم میں صرف دو مقصود پیشِ نظر ہیں۔ اول یہ کہ فریقین کی رضامندی محقق ہو جائے۔ دوسرے یہ کہ واقعۂ عقد کا اشتہار ہو جائے۔ ان اغراض کے لحاظ سے امام ابو حنیفہؒ نے نہایت مناسب قاعدے قرار دیئے ہیں یعنی یہ کہ فریقین ایسے الفاظ استعمال کریں جن سے ظاہر ہو کہ انہوں نے معاملۂ نکاح کو قبول کر لیا ہے اور یہ کہ عقدِ نکاح دو گواہوں کے سامنے عمل میں آئے۔ یہ دونوں سادہ اور آسان شرطیں ہیں جو ہر موقع پر استعمال کی جا سکتی ہیں لیکن بعض ائمہ نے ان کے خلاف اس کے ان شرطوں میں ایسی سخت قیدیں لگائی ہیں جن کی پابندی نہایت مشکل ہے۔ امام شافعیؒ کا مذہب ہے کہ گواہانِ نکاح عادل ہونے چاہئیں ورنہ نکاح صحیح نہیں۔ عدالت کے جو معنی مجتہدین اور خاص کر امام شافعیؒ نے بیان کئے ہیں۔ اس کے لحاظ سے ہزاروں میں ایک آدھ عادل ہو سکتا ہے اس لئے اگر یہ شرط ضروری سمجھی جائے تو صحیح نکاح کا وجود ڈھونڈے سے نہ مل سکے۔ امام شافعیؒ و امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک یہ بھی ضروری ہے کہ گواہ مرد ہوں۔ لیکن امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک عورتیں بھی گواہ ہو سکتی ہیں۔ اور یہی قرینِ عقل بھی ہے۔ امام شافعیؒ نے یہ بھی قید لگائی ہے کہ خاص تزویج کے الفاظ استعمال کئے جائیں۔ حالانکہ خاص الفاظ کی پابندی سے کچھ حاصل نہیں جو الفاظ اس مفہوم پر دلالت کرتے ہیں، مثلاً ہبہ، تملیک وغیرہ سب عقدِ نکاح کے لئے کافی ہیں۔

[illegible] طلاق مع استقامة حال الزوجین حرام۔ کی جب
تک زوجین کی حالت استقامت پر ہے طلاق دینا حرام ہے بہ ضرورت اور مجبوری کی حالت میں طلاق کو جائز قرار
دیا ہے تو اس کا طریقہ ایسا رکھا ہے جس سے اصلاح اور رجعت کی امید منقطع نہ ہو یعنی یہ کہ تین بار کر کے طلاق دے
اور ہر طلاق میں ایک مہینہ کا فاصلہ ہو تاکہ اس اثنا میں شوہر کو اپنے ارادے کے فیصل کے لئے کافی وقت ملے
اگر وہ اس ارادے سے باز آنا چاہے تو باز آسکے اور مستحب یہی ہے کہ باز آئے۔ اس وسیع مدت میں بھی اگر اصلاح
وآشتی کی توقع نہ ہو اور تجربہ سے ثابت ہو جائے کہ فریقین کی باہمی کسی طرح اصلاح پذیر نہیں ہے تو مجبوراً
طلاق دے، طلاق کے بعد اس کو مہر ادا کرنا ہوگا اور تین مہینہ تک زوجہ کی خورد و نوش کی کفالت کرنی ہوگی
اس سے یہ مقصد ہے کہ جب تک وہ دوسرا شوہر نہ پیدا کر سکے گذر اور بسر اوقات کے لئے اس کو تکلیف نہ اٹھانی
پڑے اور مہر کی رقم عام مصارف میں کام آئے، اس باب میں امام صاحبؒ کے مسائل جو اور ائمہ سے مختلف ہیں
ہم ان کو ذیل میں یکجائی طور پر لکھتے ہیں جس سے اندازہ ہو سکے گا کہ امام صاحبؒ نے معاملۂ نکاح کو کیسا مہتم
بالشان اور مضبوط معاملہ سمجھا ہے اور ہر حالت میں اس کے قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔

۱۔ جب تک فریقین کی حالت میں استقامت ہو طلاق دینا حرام ہے۔	۱۔ امام شافعیؒ کے نزدیک حرام نہیں۔
۲۔ ایک بار تین طلاق دینا حرام ہے اور اس کا مرتکب عاصی ہے۔	۲۔ امام شافعیؒ اور احمد بن حنبلؒ کے نزدیک کچھ مضائقہ نہیں۔
۳۔ مہر کی تعداد کسی حالت میں دس درہم سے کم نہیں ہو سکتی، اس سے یہ مقصد ہے کہ مرد کو فسخ طلاق پر آسانی سے جرأت نہ ہو کیونکہ یہ تعداد غریب اور مفلس کے لئے ہے جس کو اس رقم کا ادا کرنا ایسا ہی مشکل ہے جیسے امیروں کو دو چار ہزار کا ادا کرنا۔	۳۔ امام شافعیؒ و امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک ایک حبہ بھی مہر ہو سکتا ہے۔ جس کا یہ نتیجہ ہے کہ مرد بے دریغ، بے سوچے سمجھے طلاق دینے پر جرأت کر سکتا ہے اور عورت کو بوجہ اس کے کہ تفریق کے بعد محض مفلس اور نادار رہے گی، سخت تکالیف کا احتمال ہے۔
۴۔ خلوت صحیحہ سے پورا مہر واجب ہو جاتا ہے۔	۴۔ امام شافعیؒ کے نزدیک نصف واجب ہوتا ہے۔
۵۔ جسمانی بیماریاں مثل برص وغیرہ فسخ نکاح کا سبب نہیں ہو سکتیں۔	۵۔ امام شافعیؒ و مالکؒ کے نزدیک ان کی وجہ سے فسخ نکاح ہو سکتا ہے۔
۶۔ اگر کوئی شخص مرض الموت میں طلاق دے اور عدت کے زمانہ میں اس کا انتقال ہو جائے تو عورت کو میراث ملے گی۔	۶۔ امام شافعیؒ کے نزدیک نہیں ملے گی۔
۷۔ طلاق رجعی کی حالت میں وطی حرام نہیں ہے یعنی زوجیت کا تعلق ایسی معمولی بیزاری سے منقطع نہیں ہوتا۔	۷۔ امام شافعیؒ کے نزدیک حرام ہے۔ گویا وہ بائنہ ہو چکی۔

شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے حجۃ اللہ البالغہ اور فلاسفر بنتھم نے کتاب یوٹلٹی میں محرمات کی حرمت کے جو دلائل قائم کئے ہیں، بالکل مشترک ہیں، چونکہ یہ امر بالکل اصولِ فطرت کے مطابق ہے اور قرآن مجید میں محرمات کے نام تصریحاً مذکور ہیں، اس سے اصل مسئلہ میں تمام مجتہدین کا اتفاق رہا لیکن جو جزئیات ظاہر نص کے ذیل میں نہیں آئیں ان میں اختلاف پیدا ہو گیا، انہی میں حرمت بالزنا کا مسئلہ ہے جو امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے اختلاف کا ایک معرکۃ الآرا مسئلہ ہے۔ امام شافعیؒ کا مذہب ہے کہ زنا سے حرمت کے احکام نہیں پیدا ہوتے مثلاً باپ نے کسی عورت سے زنا کیا تو بیٹے کا نکاح اس عورت سے ناجائز نہیں ہے۔ امام شافعیؒ نے اس کو یہاں تک وسعت دی ہے کہ ایک شخص نے اگر کسی عورت کے ساتھ زنا کیا اور اس سے لڑکی پیدا ہوئی تو خود وہ شخص اس لڑکی سے نکاح کر سکتا ہے، ان کی دلیل ہے کہ زنا ایک حرام فعل ہے اس لئے وہ حلال کو حرام نہیں کر سکتا امام ابوحنیفہؒ اس کے بالکل مخالف ہیں۔ ان کے نزدیک مقاربت کے ذریعہ سے مرد عورت کے تعلقات پر جو فطری اثر پڑتا ہے وہ نکاح پر محدود نہیں ہے اور یہ بالکل صحیح ہے۔ محرمات کی حرمت جس اصول پر مبنی ہے اس کو نکاح کے ساتھ خصوصیت نہیں، اپنے نطفہ سے جو اولاد ہو گو زنا ہی سے ہو۔ اس کے ساتھ نکاح اور مقاربت کا جائز رکھنا بالکل اصولِ فطرت کے خلاف ہے۔ باپ کی موطوءہ کا بھی یہی حال ہے۔ وعلیٰ ہذا القیاس خود قرآن مجید میں اس کے اشارے موجود ہیں لیکن چونکہ یہاں نقلی بحث نہیں، ہم اس کا ذکر نہیں کرتے۔

معاملہ نکاح میں اختیار

دوسری بحث یہ ہے کہ معاملۂ نکاح کا مختار کون ہے۔ یہ ایک نہایت مہتم بالشان سوال ہے اور نکاح کے اثر کی خوبی یا برائی بہت کچھ اسی امر پر منحصر ہے۔ امام شافعیؒ و امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک عورت گو عاقلہ بالغہ ہو نکاح کے بارے میں خود مختار نہیں ہے یعنی کسی حال میں وہ اپنا نکاح آپ نہیں کر سکتی بلکہ ولی کی محتاج ہے ان بزرگوں نے ایک طرف تو عورت کو اس قدر مجبور کیا۔ دوسری طرف ولی کو ایسے وسیع اختیارات دیئے کہ وہ زبردستی جس شخص کے ساتھ چاہے نکاح باندھ دے، عورت کسی حال میں انکار نہیں کر سکتی، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک بالغہ عورت اپنے نکاح کی مختار ہے بلکہ اگر نابالغی کی حالت میں ولی نے نکاح کر دیا تو بالغ ہو کر نکاح کو فسخ کر سکتی ہے۔

اس بحث پر امام شافعیؒ کا مدار محض نقلی دلیلوں پر ہے لیکن اس میدان میں بھی امام ابوحنیفہؒ ان سے پیچھے نہیں۔ اگر امام شافعیؒ کو لا نکاح الا بولی پر استدلال ہے تو امام صاحبؒ کی طرف الثیب احق بنفسها من ولیها والبکر تستاذن فی نفسها موجود ہے لیکن اس بحث کا یہ موقع نہیں ہے۔

تیسری بحث یہ ہے کہ معاملہ نکاح کا استحکام و بقا کس حد تک ضروری ہے۔ عقد نکاح کی خوبی کی نسبت جو کچھ کہا گیا ہے یعنی یہ کہ وہ تمدن کی بنیاد اور جماعتوں کا شیرازہ ہے۔ یہ اسی حالت میں ہے جب وہ ایک مضبوط اور دیرپا معاملہ قرار دیا جائے ورنہ وہ صرف تقاضائے شہوت کا ایک ذریعہ ہے۔ امام ابوحنیفہؒ نے اس اصول کو نہایت قوت کے ساتھ ملحوظ رکھا ہے۔ انہوں نے طریقہ انعقاد تعین مہر، ایقاعِ طلاق، نفاذ خلع

فقہ حنفی کے قاعدے نہایت وسیع اور تمدن کے موافق ہیں

فقہ کا بہت بڑا حصہ جس سے دنیوی ضرورتیں متعلق ہیں معاملات کا حصہ ہے اور یہی وہ موقع ہے جہاں ہر مجتہد کی دقت نظر اور نکتہ شناسی کا پورا اندازہ ہو سکتا ہے۔

امام شافعیؒ ہبہ کے لئے قبضہ کو ضروری نہیں سمجھتے، شفعۂ ہمسایہ کو جائز نہیں رکھتے تمام معاملات میں مستور الحال کی شہادت کو ناجائز قرار دیتے ہیں گواہانِ نکاح کے لئے ثقہ اور عادل ہونے کی قید ضروری سمجھتے ہیں۔ ذمیوں کے باہمی معاملات میں بھی ان کی شہادت جائز نہیں قرار دیتے، بے شبہ یہ باتیں ان ممالک میں آسانی سے چل سکتی ہیں۔ جہاں تمدن نے وسعت نہیں حاصل کی ہے اور معاملات کی صورتیں بالکل سادہ اور نیچرل حالت میں ہیں لیکن جن ملکوں میں تمدن نے ترقی حاصل کی ہو، معاملات کی مختلف پیچ در پیچ صورتیں پیدا ہوتی جاتی ہیں، حقوق کی تحدید اور انضباط کے بغیر چارہ نہ ہو، وہاں ایسے احکام کا قائم رہنا آسان نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان تمام مسائل میں امام ابوحنیفہؒ امام شافعیؒ سے مخالف ہیں۔ مورخ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ امام مالکؒ کا مذہب انہی ممالک میں رواج پا سکا جہاں تمدن نے وسعت نہیں حاصل کی تھی، اس کی وجہ یہی تھی کہ امام مالکؒ کے مسائل میں اصولِ تمدن کی رعایت نہ تھی۔

امام ابوحنیفہؒ نے جس دقتِ نظر اور نکتہ شناسی کے ساتھ معاملات کے احکام منضبط کئے۔ اس کا صحیح اندازہ تو اس وقت ہو سکتا ہے کہ معاملات کے چند ابواب پر ایک مفصل ریویو لکھا جائے لیکن ایسی تفصیل کے لئے نہ وقت مساعد ہے نہ اس مختصر صحبت میں اس کی گنجائش ہے۔ نمونہ کے طور پر ہم صرف مسائلِ نکاح کا ذکر کرتے ہیں جو عبادات اور معاملات دونوں کا جامع ہے۔

نکاح کے مسائل

نکاح کو اگرچہ فقہاء نے عبادات میں شامل کیا ہے لیکن یہ صرف ایک اصطلاح ہے ورنہ نکاح بوجہ اس کے کہ تمدن و معاشرت کے دو بڑے بڑے نتائج اس پر متفرع ہوتے ہیں معاملات کا نہایت ضروری حصہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ نکاح کے مسائل جن اصول پر متفرع ہیں وہ یہ ہیں۔

۱۔ کن لوگوں کے ساتھ نکاح ہونا چاہیے۔ ۲۔ معاملہ نکاح کس اعتبار سے ہونا چاہیے۔ ۳۔ اس کی بقاء و ثبات کا استحکام کس حد تک ضروری ہے۔ ۴۔ فریقین کے بقاء و ثبات کے حقوق کیا قرار دیئے جائیں۔ ۵۔ نکاح کن دستورات اور رسومات کے ساتھ عمل میں آئے۔

یہ امر کہ نکاح کی وسعت کو کس حد تک محدود کیا جائے، تھوڑے سے اختلافات کے ساتھ تمام مذاہب میں یکساں طور پر پایا جاتا ہے، چند محرمات قریباً تمام مذہبوں میں مشترک ہیں جس کی وجہ یہی ہے کہ یہ امر نہایت صریح اصولِ عقلی پر مبنی ہے۔

مفہوم میں الفاظ کو داخل نہیں سمجھتے۔ یعنی ان کے نزدیک صرف قرآن کے معنی پر قرآن کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ بے شبہ امام صاحبؒ کی اس غلطی کو ہم تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن فقہ حنفیہ کے مطابق امام صاحبؒ نے بالآخر اس قول سے رجوع کیا ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک ترجمہ سے کسی حالت میں نماز نہیں ہوسکتی۔

اس سے یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ امام ابوحنیفہؒ یا کسی مجتہد نے صرف عقل و قیاس سے نماز کے ارکان متعین کیئے ہیں۔ ائمہ نے ان ارکان کے ثبوت کے لئے عموماً احادیث کی تصریحات و اشارات سے استدلال کیا ہے چنانچہ ہر مجتہد کے نقلی دلائل کتب فقہ میں بہ تفصیل مذکور ہیں، ہمارا یہ مطلب ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے دعووں پر جس طرح نقلی دلائل یعنی احادیث کی تصریحیں اور اشارے موجود ہیں اسی طرح عقلی وجوہ بھی ان کی صحت کے شاہد ہیں، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام صاحبؒ شریعت کے اسرار و مصالح کو نہایت دقیق نگاہ سے دیکھتے تھے۔

زکوٰۃ کے مسائل اور فقہ حنفی

زکوٰۃ کے مسائل کا بھی یہی حال ہے۔ زکوٰۃ کا اصلی مقصد بنی نوع انسان کی ہمدردی اور اعانت ہے، اسی لئے زکوٰۃ کے مصرف میں وہ لوگ خاص کر دیئے گئے ہیں جو سب سے زیادہ ہمدردی اور اعانت کا استحقاق رکھتے ہیں یعنی فقراء و مساکین، عمالِ زکوٰۃ، مولفۃ القلوب، مقروض، مسافر، غازی، مکاتب۔ چونکہ ان لوگوں کی تصریح خود قرآن مجید میں مذکور ہے اسی لئے اس امر میں سب مجتہدین کا اتفاق رہا کہ یہ لوگ مصرفِ زکوٰۃ ہیں لیکن تعیین نے ایک اختلاف پیدا کر دیا۔ امام شافعیؒ نے ان اقسام کے ذکر سے یہ خیال کیا کہ یہ سب اشخاص زکوٰۃ کے ادا میں لازمی ہیں یعنی جب تک ان آٹھوں اقسام کے لوگوں کو زکوٰۃ ادا نہ کی جائے، فرض ادا ہی نہیں ہوسکتا بخلاف اس کے امام ابوحنیفہؒ کا یہ مذہب ہے کہ زکوٰۃ ان اقسام سے باہر نہ جانے پائے باقی یہ امر کہ ان لوگوں میں سے سب کو دی جائے یا بعض کو، یہ امر مقتضائے وقت اور ضرورت پر موقوف ہے۔ امام اور حاکمِ وقت ضرورت کے لحاظ سے جس کو چاہے انتخاب کرسکتا ہے۔

حنفی فقہ کا آسان اور سہل ہونا

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ حنفی فقہ بہ نسبت تمام اور فقہوں کے نہایت آسان اور سیر التعمیل ہے۔ قرآن مجید میں متعدد جگہ آیا ہے کہ "خدا تم لوگوں کے ساتھ آسانی چاہتا ہے، سختی نہیں چاہتا" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے کہ "میں نرم اور آسان شریعت لے کر آیا ہوں" بے شبہ اسلام کو تمام اور مذہبوں کے مقابلہ میں یہ فخر حاصل ہے کہ وہ رہبانیت سے نہایت بعید ہے۔ اس میں عباداتِ شاقہ نہیں ہیں۔ اس کے مسائل آسان اور سیر التعمیل ہیں، حنفی فقہ کو بھی اور فقہوں پر یہی ترجیح حاصل ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کے مسائل ایسے آسان اور نرم ہیں جو شریعت سہلہ کی شان ہے بخلاف اس کے اور ائمہ کے بہت سے احکام بہت سخت اور عسیر التعمیل ہیں۔

پڑتی تھیں۔ اس غور اور تدقیق، مشق و مہارت سے ان کو ثابت ہو گیا تھا کہ شریعت کا ہر مسئلہ اصولِ عقل کے مطابق ہے۔ علم کلام کے بعد وہ فقہ کی طرف متوجہ ہوئے تو ان مسائل میں بھی وہی جستجو رہی۔

حنفی فقہ کے مسائل کا دوسری فقہوں کے مسائل سے مقابلہ کیا جائے تو یہ تفاوت صاف نظر آتا ہے۔ معاملات تو معاملات عبادات میں بھی جس کی نسبت ظاہر بینوں کا خیال ہے کہ اس میں عقل کو دخل نہیں۔ امام صاحبؒ کے مسائل عموماً عقل کے موافق معلوم ہوتے ہیں۔

اگر اس بات پر غور کیا جائے کہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ شریعت میں کن مصلحتوں سے فرض کئے گئے ہیں اور ان مصالح کے لحاظ سے ان احکام کی بجاآوری کا کیا طریقہ ہونا چاہئے تو وہی طریقہ موزوں ثابت ہوگا جو حنفی فقہ سے ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً نماز چند افعال کے مجموعہ کا نام ہے لیکن اس لحاظ سے کہ نماز کی اصل غرض کیا ہے یعنی خضوع اظہار تعبد، اقرار عظمت الٰہی (دعا) اور اس کے حاصل ہونے میں کن افعال کو کس نسبت سے دخل ہے؟ ان افعال کے مراتب مختلف ہیں، بعض لازمی اور ضروری ہیں کیونکہ ان کے نہ ہونے سے نماز کی اصل غرض فوت ہوتی ہے۔ ان افعال کو شریعت کی زبان میں فرض سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بعض افعال ایسے ہیں جو طریقۂ ادا میں صرف ایک حسن و خوبی پیدا کرتے ہیں۔ لیکن ان کے فوت ہونے سے اصل غرض فوت نہیں ہوتی، ان افعال کا رتبہ پہلی قسم سے کم ہے اور ان کو سنت و مستحب سے تعبیر کرتے ہیں۔

اوپر ہم لکھ آئے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرض و واجب و سنت کی تصریح نہیں فرمائی لیکن اس میں کچھ شبہ نہیں ہو سکتا تھا کہ نماز کے تمام افعال یکساں درجہ نہیں رکھتے تھے، اس لئے تمام مجتہدین نے ان کے امتیاز مراتب پر توجہ کی اور استنباط و اجتہاد کی رو سے ان افعال کے مختلف مدارج قائم کئے اور ان کے جدا جدا نام رکھے۔ امام ابوحنیفہؒ نے بھی ایسا ہی کیا لیکن اس باب میں ان کو اور ائمہ پر جو ترجیح ہے، وہ یہ ہے کہ انہوں نے جن افعال کو جس رتبہ پر رکھا درحقیقت ان کا وہی رتبہ تھا۔ مثلاً سب سے ضروری امر یہ ہے کہ نماز کے ارکان یعنی وہ افعال جن کے بغیر نماز ہو ہی نہیں سکتی، کیا ہیں؟ چونکہ نماز اصل میں اقرارِ عبودیت اور اظہارِ خشوع کا نام ہے۔ اس لئے اس قدر تو سب مجتہدوں کے نزدیک مسلّم رہا کہ نیت، تکبیر، قرأت، رکوع، سجود وغیرہ جن سے بڑھ کر اقرارِ عبودیت اور اظہارِ خشوع کا کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا، فرض اور لازمی ہیں اور خود شارع نے ان کے لازمی اور ضروری ہونے کی طرف اشارے کئے بلکہ بعض جگہ تصریح بھی کی لیکن اور ائمہ نے یہ زیادتی کی کہ ارکان کی ادا کی خصوصیتوں کو بھی فرض قرار دے دیا حالانکہ وہ خصوصیتیں لازمی نہ تھیں اس لئے امام ابوحنیفہؒ ان کی فرضیت کے قائل نہیں مثلاً امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک تکبیر تحریمہ اللہ اکبر کے سوا اور الفاظ سے بھی ادا ہو سکتی ہے جو اس کے ہم معنیٰ ہیں (مثلاً اللّٰہُ اَعْظَمُ اللّٰہُ اَجَلُّ) امام شافعیؒ کے نزدیک نہیں ہو سکتی، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک تکبیر اگر فارسی زبان میں کہی جائے تب بھی جائز ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک اس سے نماز باطل ہو جاتی ہے، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک قرآن مجید کی کسی آیت کے پڑھنے سے قرأت کا فرض ادا ہو جاتا ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک بغیر سورۂ فاتحہ کے نماز ہو ہی نہیں سکتی، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جو شخص عربی میں قرآن پڑھنے سے معذور ہے وہ مجبوراً ترجمہ پڑھ سکتا ہے۔ (امام محمدؒ نے جامع صغیر میں جو روایت کی ہے اس میں مجبوری کی قید نہیں ہے اور اسی بنا پر مخالفین نے امام صاحبؒ پر یہ سخت اعتراض کیا ہے کہ وہ قرآن کی حقیقت و

اور شاید اسی کا اثر تھا کہ ابوالحسن اشعریؒ نے جو شافعیوں میں علم کلام کے بانی ہیں، علم کلام کی بنیاد اسی مسئلہ پر رکھی۔

دوسرے فرقہ کا یہ مذہب ہے کہ شریعت کے تمام احکام مصالح پر مبنی ہیں البتہ بعض مسائل ایسے بھی ہیں جن کی مصلحت عام لوگ نہیں سمجھ سکتے لیکن درحقیقت وہ مصلحت سے خالی نہیں، یہ مسئلہ اگرچہ بوجہ اس کے کہ اس کے دونوں پہلو بڑے بڑے علما نے اختیار کئے ہیں۔ ایک معرکۃ الآراء مسئلہ بن گیا ہے لیکن انصاف یہ ہے کہ وہ اس قدر بحث و اختلاف کے قابل نہ تھا، تمام مہمات مسائل کی مصلحت اور غایت خود کلام الٰہی میں مذکور ہے۔ کفار کے مقابلہ میں قرآن کا طرزِ استدلال عموماً اسی اصول کے مطابق ہے، نماز کی مصلحت خدا نے خود بتائی تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ روزہ کی فرضیت کے ساتھ ارشاد فرمایا لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۔ جہاد کی نسبت فرمایا حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ اسی طرح اور احکام کے متعلق قرآن و حدیث میں جا بجا تصریحیں اور اشارے موجود ہیں کہ ان کی غرض و غایت کیا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کا یہی مذہب تھا اور یہ اصول ان کے مسائل فقہ میں عموماً مرعی ہے۔ اسی کا اثر ہے کہ حنفی فقہ جس قدر اصول عقلی کے مطابق ہے اور کوئی فقہ نہیں۔ امام طحاویؒ نے جو محدث اور مجتہد دونوں تھے، اس بحث میں ایک کتاب لکھی ہے جو شرح معانی الآثار کے نام سے مشہور ہے اور جس کا موضوع یہ ہے کہ مسائل فقہ کو نصوص و طریق خبر سے ثابت کیا جائے، محدث مذکور نے فقہ کے ہر باب کو لیا ہے اور اگرچہ انصاف پرستی کے ساتھ بعض مسئلوں میں امام ابو حنیفہؒ سے مخالفت کی ہے لیکن اکثر مسائل کی نسبت مجتہدانہ طرز استدلال سے ثابت کیا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کا مذہب احادیث اور طریق نظر دونوں کے موافق ہے۔ امام محمدؒ نے بھی کتاب الحج میں اکثر مسائل میں عقلی وجوہ سے استدلال کیا ہے۔ یہ دونوں کتابیں چھپ گئی ہیں اور ہر جگہ ملتی ہیں جس کو تفصیل مقصود ہو، ان کتابوں کی طرف رجوع کرے۔

اس دعویٰ سے کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب عقل کے موافق ہے۔ شافعیہ وغیرہ کو بھی انکار نہیں اور وہ انکار کیوں کرتے، ان کے نزدیک احکامِ شرعیہ خصوصاً عبادات جس قدر عقل سے بعید ہوں اسی قدر ان کی خوبی ہے۔

امام رازیؒ کا استدلال

امام رازیؒ نے زکوٰۃ کی بحث میں لکھا ہے کہ امام شافعیؒ کا مذہب امام ابو حنیفہؒ سے زیادہ صحیح ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ امام شافعیؒ کا مذہب عقل و قیاس سے بعید ہے اور یہی اس کی صحت کی دلیل ہے کیونکہ زکوٰۃ کے مسائل زیادہ تر تعبدی احکام ہیں جن میں عقل و رائے کو دخل نہیں۔

بخلاف اور ہمعصروں کے امام ابو حنیفہؒ کا اس اصول کی طرف مائل ہونا ایک خاص سبب سے تھا۔ دوسرے ائمہ جنہوں نے فقہ کی تدوین و ترتیب کی ان کی علمی ابتداء فقہی مسائل سے ہوئی تھی بخلاف اس کے امام ابو حنیفہؒ کی تحصیل علم کلام سے شروع ہوئی جس کی ممارست نے ان کی قوت فکر اور حدت نظر کو نہایت قوی کر دیا تھا۔ معتزلہ وغیرہ جن سے ان کے معرکے رہتے تھے، عقلی اصول کے پابند تھے اس لئے امام صاحبؒ کو بھی ان کے مقابلہ میں انہی اصول سے کام لینا پڑتا تھا اور متنازع فیہ مسئلوں میں مصالح و اسرار کی خصوصیتیں دکھانی

فقہ کا دوسرا حصہ جو صرف قانون کی حیثیت رکھتا ہے، پہلے حصہ کی نسبت بہت زیادہ وسیع ہے اور یہ وہ قانون حقہ ہے جس میں امام ابو حنیفہؒ علانیہ تمام مجتہدین سے ممتاز ہیں بلکہ سچ ہے کہ اگر اسلام میں کوئی شخص واضعِ قانون گزرا ہے تو وہ صرف امام ابو حنیفہؒ ہیں۔

امام ابو حنیفہؒ اس وصف میں اپنے ہمعصروں سے ممتاز تھے کہ وہ مذہبی تقدس کے ساتھ دنیاوی اغراض کے اندازہ شناس تھے اور تمدن کی ضرورتوں کو اچھی طرح سمجھتے تھے، مرجعیت اور فصلِ قضایا کی وجہ سے ہزاروں پیچیدہ معاملات ان کی نگاہ سے گزر چکے تھے، ان کی مجلسِ افتا بہت بڑی عدالتِ عالیہ تھی جس نے لاکھوں مقدمات کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ ملکی حیثیت رکھتی تھی اور ارکانِ سلطنت مہمات امور میں ان سے مشورہ لیتے تھے۔ ان کے شاگرد اور ہمنشیں جن کی تعداد سینکڑوں سے زیادہ تھی۔ عموماً وہ لوگ تھے جو منصبِ قضا پر مامور تھے، ان باتوں کے ساتھ خود ان کی طبیعت مقننانہ اور معاملہ سنج واقع ہوئی تھی، وہ ہر بات کو قانونی حیثیت سے دیکھتے تھے اور اس کے دقیق نکتوں تک پہونچتے تھے۔ اس بات کا اندازہ واقعات سے ہو سکتا ہے جن کا ذکر اکثر مؤرخین نے کیا ہے۔

اب ہم ان خصوصیتوں کا ذکر کرتے ہیں جن کی وجہ سے حنفی فقہ کو اور فقہوں کے مقابلہ میں ترجیح حاصل ہے۔

فقہ حنفی کا اصول عقلی کے موافق ہونا

سب سے مقدم اور قابلِ قدر خصوصیت جو فقہ حنفی کو حاصل ہے۔ مسائل کا اسرار اور مصالح پر مبنی ہونا ہے۔ احکامِ شرعیہ کے متعلق اسلام میں شروع ہی سے دو فرقے قائم ہو گئے۔ ایک گروہ کی یہ رائے۔ یہ احکام تعبدی احکام ہیں یعنی ان میں کوئی سر اور مصلحت نہیں ہے مثلاً شراب خوری یا فسق و فجور صرف اس لئے ناپسندیدہ ہیں کہ شریعت نے ان سے منع کیا ہے اور خیرات و زکوٰۃ صرف اس لئے مستحسن ہیں کہ شارع نے اس کی تاکید کی ہے ورنہ فی نفسہٖ یہ افعال برے یا بھلے نہیں ہیں۔ امام شافعیؒ کا اسی طرف میلان پایا جاتا

مسائل نہیں، انہی وجوہ اور اسباب سے اخبار احاد کے متعلق مختلف رائیں پیدا ہوگئیں۔ معتزلہ نے تو سرے سے انکار کر دیا۔ ان کے مقابلہ میں بعض محدثین نے یہ شدت کی کہ خبر واحد کو قطعی قرار دیا، صرف شرط یہ لگائی کہ رواۃ ثقہ ہوں اور انقطاع و شذوذ و علت نہ ہو۔ بعض محدثین اگرچہ اصول کے طور پر اخبار احاد کو ظنی کہتے ہیں لیکن جزئیاتِ احکام اور مسائلِ اعتقادی میں اس کا خیال نہیں رکھتے۔ امام ابو حنیفہؒ نے اس بحث میں جو مسلک اختیار کیا وہ نہایت معتدل اور ان کی دقتِ نظر کی بڑی دلیل ہے۔ انہوں نے نہ معتزلہ کی طرح سرے سے انکار کیا نہ ظاہر بینوں کی طرح خوش اعتقادی سے اس کی قطعیت تسلیم کی، امام صاحبؒ کی یہ رائے بڑے صحابہ کی رائے کے موافق ہے۔

خبر واحد قطعی نہیں

حضرت عمرؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے متعدد مواقع پر خبر واحد کی تسلیم میں تردد کیا ہے جس کی وجہ یہی تھی کہ وہ اخبار احاد کو قطعی نہیں سمجھتے تھے فاطمہ بنت قیس نے جب، حضرت عمرؓ کے سامنے رسول اللہؐ سے روایت کی کہ لاسکنی ولا نفقۃ تو حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ اتترك كتاب الله بقول امرأة لا ندرى صدقت ام كذبت۔ یعنی ایک عورت کی روایت کی بنا پر جس کی نسبت معلوم نہیں کہ اس نے غلط کہا یا صحیح۔ ہم کتابِ الٰہی کو چھوڑ نہیں سکتے۔ فقہی احکام میں اس قاعدہ کی متعدد تفریعیں ہیں مثلاً یہ کہ اخبار احاد سے کسی حکم کا فرض ہونا ثابت نہیں ہو سکتا کیونکہ فرضیت ثبوت قطعی کی محتاج ہے البتہ اس سے ظن غالب پیدا ہوتا ہے اس لئے وجوب، سنن و استحباب ثابت ہو سکتا ہے۔ اسی بناء پر نماز میں قرات فاتحہ کو امام شافعیؒ فرض سمجھتے ہیں اور امام ابو حنیفہؒ واجب، اس اصول پر بہت سے احکام متفرع ہیں۔

اس قاعدہ کا اثر علمِ کلام کے مسائل پر

فقہ سے زیادہ اس قاعدہ کا اثر علمِ کلام پر پڑتا ہے۔ اور یہی چیز ہے جس نے ایک زمانہ کو امام ابو حنیفہؒ کا مخالف بنا دیا تھا۔ امام صاحبؒ نے مذکورہ بالا قاعدہ کی بنا پر یہ اصول قرار دیا تھا کہ جو مسائل اور عقائد اسلام میں متفق علیہ ہیں ان کے خلاف اخبار احاد قابلِ اعتبار نہیں مثلاً انبیاء کی عصمت اہلِ حق کا ایک مسلمہ مسئلہ ہے۔ اس کے برخلاف جن روایتوں سے انبیاء کا مرتکب کبائر ہونا ثابت ہوتا ہے۔ امام ابو حنیفہ کے اصول کے موافق وہ روایتیں قابلِ اعتبار نہیں۔ اس اصول کی بنا پر بہت سے اشکالات سے جو ملاحدہ پیش کرتے ہیں نجات ملتی ہے لیکن افسوس ہے کہ اکثر اربابِ روایت نے اس عمدہ اصول کی قدر نہ کی بلکہ الٹی اور مخالفت کی۔ علامہ ابن عبدالبر نے جو مشہور محدث ہیں کتاب العلم میں لکھا ہے۔

كان من مذهب الامام ابى حنيفة فى اخبار احاد ان لايقبل عنها المخالف لاصول المجمع عليها فانكر عليها اصحاب الحديث فافرط۔

"یعنی اخبار احاد میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مذہب تھا کہ اصول متفق علیہ کے خلاف ہو تو قابل قبول نہیں۔ اس پر اصحابِ حدیث نے ان کی مخالفت کی اور افراط کو پہونچا دیا" (اس عبارت کو حافظ ابو المحاسن نے عقود الجمان میں نقل کیا۔) (مرتبہ رئیس احمد جعفری) ●●

معارضات کے رفع کرنے کے لئے اصول قرار دیئے ہیں، لیکن وہ اصول خود اجتہادی اور مختلف فیہ ہیں۔ اس کے علاوہ متعدد موقعوں پر محدثین کو خود اپنے اصول سے انحراف کرنا پڑتا ہے۔ جرح کو عموماً تعدیل پر مقدم مانا گیا ہے لیکن بہت سے رواۃ ہیں جن کی نسبت اس قاعدہ کی پابندی نہیں کی جاتی۔ محمد بن بشار مصری، احمد بن صالح مصری، عکرمہ مولیٰ ابن عباسؓ کی نسبت مفصل جرحیں موجود ہیں تاہم ان جرحوں کا اعتبار نہیں کیا جاتا۔

تعجب یہ ہے کہ جارحین و معدلین دونوں ائمہ فن ہوتے ہیں اور ان کی رایوں میں اس قدر اختلاف ہوتا ہے جس سے سخت تعجب پیدا ہوتا ہے، جابر جعفی کوفی ایک مشہور راوی ہے جس کا دعویٰ تھا کہ مجھ کو پچاس ہزار حدیثیں یاد ہیں ان کی نسبت ائمہ جرح و تعدیل کی یہ رائیں ہیں۔

سفیان کا قول ہے کہ میں نے جابر سے زیادہ محتاط حدیث میں نہیں دیکھا، شعبہ کہتے ہیں کہ جابر جب اخبرنا وحدثنا کہیں تو وہ اوثق الناس ہیں۔ امام سفیان ثوری نے شعبہ سے کہا کہ اگر تم جابر جعفی میں گفتگو کروگے تو میں تم سے گفتگو نہ کروں گا۔ وکیع کا قول ہے کہ تم لوگ اور کسی بات میں شک کرو تو کرو لیکن اس بات میں کچھ شک نہ کرو کہ جابر جعفی ثقہ ہیں۔ اس کے مقابلہ میں اور ائمہ فن کی رائیں ہیں جن کے یہ الفاظ ہیں کہ وہ متروک ہیں، کذاب ہے، وضاع ہے۔ چنانچہ اخیر فیصلہ جو محدثوں نے کیا وہ یہی ہے کہ جابر کی روایت قابل اعتنا نہیں۔

اس سے یہ غرض نہیں کہ جرح و تعدیل کا فن ناقابل اعتبار ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ جن وسائل اور طرق سے رجال کے حالات قلمبند کئے گئے اور کئے جاسکتے تھے۔ ان کا مرتبہ ظن غالب یا محض ظن سے فائق نہیں ہوسکتا۔ اس لئے اس پر یقینیات اور قطعیات کی بنیاد نہیں قائم ہوسکتی۔

ادائے مطلب ان امور کے بعد تادیہ معنیٰ کی بحث باقی رہتی ہے مثلاً ایک حدیث تمام محدثین اور مجتہدین کے اصول کے موافق متصل بھی ہے۔ رواۃ بھی ثقہ ہیں شذوذ بھی نہیں ہے لیکن یہ بحث اب بھی باقی ہے کہ راوی نے ادائے مطلب کیونکر کیا؟ موقع اور محل روایت کی تمام خصوصیتیں ملحوظ رکھیں یا نہیں؟ فہم مطلب یا طریقہ ادا میں تو کوئی غلطی نہیں کی؟ چونکہ یہ مسلم ہے کہ حدیثیں اکثر بالمعنی روایات کی گئی ہیں اس لئے ان احتمالات کو زیادہ قوت ہوجاتی ہے۔ صحابہ کے زمانہ میں کسی روایت کی صحت سے انکار کیا جاتا تھا تو اسی بنا پر کیا جاتا تھا ورنہ یہ ظاہر ہے کہ صحابہ عموماً ثقہ تھے اور ان کی روایت میں انقطاع کا کوئی احتمال نہ تھا۔ صحیح مسلم باب التیمم میں ہے کہ ایک شخص نے حضرت عمرؓ سے مسئلہ دریافت کیا کہ مجھ کو غسل کی حاجت ہوئی اور پانی نہ مل سکا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ نماز نہ پڑھو، عمارؓ موجود تھے۔ انھوں نے اس مسئلہ کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک روایت بیان کی اور کہا کہ اس موقع پر آپ بھی موجود تھے۔ حضرت عمرؓ نے کہا اتق اللہ یا عمار یعنی "اے عمار! خدا سے ڈرو" ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ عمارؓ کو کاذب الروایۃ نہیں سمجھتے تھے لیکن اس احتمال پر کہ شاید ادائے مطلب میں غلطی ہوئی، یہ الفاظ فرمائے۔ چنانچہ عمارؓ نے کہا کہ "اگر آپ کی مرضی نہ ہو تو میں حدیث نہ روایت کروں" اخبار احاد کی بحث کو ہم نے قصداً اس لئے طول دیا کہ محدثین زیادہ تر اسی مسئلہ کی وجہ سے امام ابوحنیفہؒ پر رد و قدح کرتے ہیں حالانکہ امام صاحب کا مذہب نہایت تحقیق اور دقت نظر پر مبنی ہے۔

یہ تمام احتمالات اور اجتہادات اخبار احاد کے ساتھ مخصوص ہیں۔ متواتر اور مشہور میں ان بحثوں میں

خود ان کا قیاس واجتہاد تھا لیکن اکثر محدثین نے ان حدیثوں کو مرفوع کہا۔ اس خیال نے یہ آفت پیدا کی کہ اس کی بناء پر بعض رواۃ نے صریح مرفوع الفاظ میں حدیث کی روایت کر دی جس کی وجہ سے ایک عام شبہ پیدا ہو گیا۔

معنعن حدیثوں کے بارے میں

معنعن روایتوں میں اتصال کا ثابت ہونا نہایت مشکل ہے حالانکہ اس قسم کی روایتیں کثرت سے ہیں، امام بخاریؒ کا مذہب ہے کہ معنعن حدیثوں میں اگر یہ ثابت ہو کہ راوی اور مروی عنہ دونوں ہم زماں اور کبھی ملے بھی تھے تو وہ حدیث متصل سمجھی جائے گی۔ امام مسلم حالانکہ امام بخاری کے شاگرد اور زیادہ تر انہی کے طریقے کے پیرو تھے تاہم انہوں نے نہایت سختی سے اس شرط کی مخالفت کی ہم زماں ہونا کافی سمجھا، اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہے کہ بخاری کے اصول کے موافق امام مسلم کی وہ تمام معنعن روایتیں جن میں لقا ثابت نہیں ہے مقطوع ہیں حالانکہ امام مسلم ان کو متصل سمجھتے ہیں اور اس پر ان کو یہاں تک اصرار ہے کہ اپنے مخالف کو سخت الفاظ سے یاد کرتے ہیں، امام مسلم نے تو زیادہ توسیع کی لیکن امام بخاری کی شرط کے موافق بھی معنعن روایت میں اتصال کا ثبوت محض ظنی ہے۔ یہ کچھ ضرور نہیں کہ دو شخص ہم زمان اور ہم لقا ہوں تو ان کی روایتیں ہمیشہ بالذات ہوں، جہاں حدثنا اور اخبرنا ہو گا وہاں ایسا ہونا البتہ ضرور ہے لیکن اگر یہ الفاظ نہیں ہیں اور راوی نے "عن" کے لفظ سے روایت کی ہے تو اتصال کا خیال قیاس غالب ہو گا لیکن یقینی نہ ہو گا۔ حدیث و سیر میں بیسیوں مثالیں مل سکتی ہیں کہ دو راوی ایک زمانہ میں تھے اور آپس میں ملاقات بھی تھی تاہم ایک نے دوسرے سے بعض روایتیں بواسطہ کیں، روزمرہ کے تجربوں میں اس کی سینکڑوں شہادتیں ملتی ہیں۔

رجال کی تنقید

سب سے بڑا ضروری اور اہم مسئلہ رجال کی تنقید ہے۔ اخبار احاد کا تمام تر مدار رجال پر ہے لیکن رجال کی تنقید و توثیق ایسا ظنی مسئلہ ہے جس کا قطعی فیصلہ نہایت مشکل اور قلیل الوجود ہے۔ ایک شخص کو بہت سے لوگ نہایت ثقہ، نہایت متدین، نہایت راست باز سمجھتے ہیں، اسی شخص کو دوسرے اشخاص ضعیف الروایۃ غیر ثقہ، ناقابل اعتبار خیال کرتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ دونوں فریق اس رتبہ کے ہوتے ہیں جن کی عظمت وشان سے انکار نہیں کیا جا سکتا، امام بخاری و مسلم میں گو ایسا سخت اختلاف نہیں ہے تاہم بہت سے رواۃ ہیں جن کو ان دونوں اماموں میں سے ایک قابل حجت سمجھتا ہے اور دوسرا نہیں سمجھتا، علامہ نووی نے مقدمہ شرح صحیح مسلم میں بعضوں کے نام بھی لکھے ہیں اور محدث حاکم کی کتاب المدخل سے نقل کیا ہے کہ ان لوگوں کی تعداد جن سے امام مسلم نے مسند صحیح میں احتجاج کیا ہے اور امام بخاری نے جامع صحیح میں ان سے حجت نہیں لی، ۶۲۵ ہے۔

راویوں کی جرح وتعدیل میں اختلاف

میزان الاعتدال کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سینکڑوں بلکہ ہزاروں رواۃ ہیں جن کی جرح و تعدیل مختلف فیہ ہے اور ایسا ہونا ضرور تھا، کسی شخص کے ان اوصاف وعادات پر مطلع ہونا جن کا اثر روایت کی قوت وضعف پر پڑ سکتا ہے۔ مدتوں کی ملاقات اور تجربہ پر موقوف ہے۔ جو لوگ جرح وتعدیل کے کام میں مصروف تھے، سینکڑوں ہزاروں راویوں سے ایسی عمیق واقفیت کیونکر حاصل کر سکتے تھے۔ اسی مختلف قرائن ظاہری آثار، عام شہرت، سمعی روایتوں سے کام لینا پڑتا ہے اور بہت کم قطعی فیصلہ ہو سکتا تھا اگرچہ محدثین نے

ایک یا چند محدثین نے کسی حدیث کو اگر صحیح کہا ہے اور دوسرا شخص اس کی صحت نہیں تسلیم کرتا تو وہ صرف اس گناہ کا مجرم ہے کہ اس محدث یا محدثین کے اصولِ تحقیق، قواعدِ استنباط، طریقِ روایت، غرض ان کے اجتہادات اور مزعومات کا مخالف ہے۔

حدیث کی تحقیق و تنقید کے لئے محدثین نے جو اصول مقرر کئے ہیں۔ اور جن پر احادیث کی صحت کا مدار ہے۔ سب عقلی اور اجتہادی مسائل ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان میں خود محدثین باہم اختلافِ عظیم رکھتے ہیں۔ ظاہر بینوں کا خیال ہے کہ حدیث کا فن نقلی ہے (نہ عقلی) لیکن جس شخص نے اصولِ حدیث پر غور کیا ہے وہ اس خیال کی غلطی کو نہایت آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ اس نکتہ کی طرف امام ابو حنیفہؒ نے اشارہ کیا ہے کہ ھذا الذی نحن فیہ رای لایخبر علیہ احدا ولا نقول یجب علی احد قبولہ۔ بعضوں نے غلطی سے امام صاحب کے اس وسیع قول کو فقہ پر محدود سمجھا لیکن ان کو معلوم نہیں کہ مجتہد کو مسائل کے ماخذ سے بحث ہوتی ہے۔

صحت اور عدمِ صحت پر اختلاف

اصولِ حدیث کے ظنی اور اجتہادی ہونے کا ہی اثر ہے کہ محدثین کو احادیث کی صحت و عدمِ صحت میں باہم اختلاف ہوتا ہے۔ ایک محدث ایک حدیث کو نہایت صحیح مستند، واجب العمل قرار دیتا ہے، دوسرا اسی کو ضعیف بلکہ موضوع کہتا ہے۔ محدث ابن جوزیؒ نے بہت سی حدیثوں کو موضوعات میں داخل کیا ہے جن کو دوسرے محدثین صحیح اور حسن کہتے ہیں۔ ابن جوزی نے تو یہ قیامت کی کہ صحیحین کی بعض حدیثوں کو موضوع لکھ دیا۔ علامہ سخاوی لکھتے ہیں بل ربما ادرج فیھا الحسن والصحیح مما ھو فی احد الصحیحین فضلا عن غیرھما یعنی" ابن جوزی نے حسن اور صحیح تک کو جو بخاری یا مسلم میں موجود ہیں موضوعات میں درج کر دیا ہے، دوسری کتابوں کا ذکر کیا ہے "بے شبہ ابن جوزی نے اس افراط میں غلطی کی لیکن یہ غلطی ایک اجتہادی غلطی ہے جس کا حاصل اسی قدر ہے کہ انہوں نے بخاری یا مسلم کے صحیح اجتہاد کو غلط تقسیم کیا۔ ان اصولی اختلافات کی وجہ سے احادیث کی صحت اور عدمِ صحت میں جو اختلافات پیدا ہو گئے ہیں۔ ان کا استقصا کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔

حدیث مرفوع کی پہلی ضروری شرط یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک ثابت ہو لیکن اتصال کے ثبوت کے جو طریقے تسلیم کئے گئے ہیں، ان میں اکثر ظنی اور اجتہادی ہیں۔ صحابہ کے ان الفاظ کو" یہ امر سنت ہے، ہم کو یہ حکم دیا گیا تھا۔ ہم اس بات سے روکے گئے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہم فلاں کام کرتے تھے یا ہم اس کو برا نہیں سمجھتے تھے " اکثروں نے مرفوع قرار دیا ہے اور بعضوں نے یہاں تک وسعت دی کہ جن حدیثوں میں یہ الفاظ تھے ان کو لفظوں سے روایت کر دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا" حالانکہ یہ الفاظ اس معنیٰ میں قطعی الدلالہ نہیں ہیں بلکہ صحابہ کے ظن اور اجتہاد پر مبنی ہیں جس کی نسبت عموماً تسلیم کیا گیا ہے فھم الصحابی لیس بحجۃ "یعنی صحابی کی سمجھ کوئی دلیل نہیں"۔ اس بنا پر بعض علماء نے اختلاف کیا اور کہا یہ الفاظ اتصال و رفع کے لئے کافی نہیں ہیں۔ امام شافعیؒ ابن حزم ظاہری، ابوبکر رازی اور دیگر محققین نے صحابہ کے اس قول کو کہ "یہ فعل سنت ہے"، حدیث مرفوع نہیں قرار دیا، کتبِ سیر و احادیث میں بیسیوں مثالیں ملتی ہیں جن میں صحابہ نے یہ الفاظ استعمال کئے، وہ حدیث نبوی نہ تھی بلکہ

اخبار احاد کی حیثیت

اخبار احاد کی نسبت اگرچہ محققین اور اکثر ائمہ حدیث کا بھی یہی مذہب ہے کہ وہ ظنی الثبوت ہیں لیکن ایک فرقہ اس کے خلاف بھی ہے جس کے سرگروہ علامہ ابن الصلاح ہیں اگرچہ علامہ ابن الصلاح نے بھی اخبار احاد کی تمام حدیثوں کو قطعی نہیں تسلیم کیا ہے۔ انہوں نے صحیح حدیث کی سات قسمیں کی ہیں (۱) جس پر بخاری و مسلم دونوں متفق ہوں (۲) بخاری منفرد ہوں (۳) مسلم منفرد ہوں (۴) بخاری و مسلم نے اس کو روایت نہ کیا ہو لیکن ان کی شرطوں کے موافق ہو (۵) صرف بخاری کی شرط پر ہو (۶) صرف مسلم کی شرط پر ہو (۷) بخاری و مسلم کی شرط کے موافق نہ ہو لیکن اور محدثین نے اس کو صحیح تسلیم کیا ہو۔ ان سات قسموں میں سے علامہ ابن الصلاح پہلی قسم کو قطعی الصحۃ قرار دیتے ہیں اور لکھتے ہیں۔

وھذا القسم جمیعہ مقطوع بصحتہ والعلم النظری واقع بہ مفردات بخاری و مسلم کی نسبت ان کی رائے ہے کہ اسی قبیل میں بجز ان چند حدیثوں کے جن پر دار قطنی وغیرہ نے جرح کی ہے، ابن الصلاح کا قول اگرچہ ظاہر بینوں میں اور بالخصوص آج کل زیادہ رواج پا گیا ہے لیکن کچھ شبہ نہیں کہ وہ بالکل غلط اور بے دلیل خیال ہے اور خود ائمہ حدیث اس کے مخالف ہیں۔ علامہ نووی شرح صحیح مسلم میں ابن الصلاح کا قول تفصیلاً نقل کر کے لکھتے ہیں۔

وھذا الذی ذکرہ الشیخ فی ھذہ المواضع خلاف ما قالہ المحققون والاکثرون فانھم قالوا احادیث الصحیحین التی لیست لمتواترۃ انما تفید الظن فانھا احاد والاحاد انما تفید الظن علی ما تقرر ولا فرق بین البخاری ومسلم وغیرھما فی ذالک۔

یعنی شیخ ابن الصلاح نے ان موقعوں پر جو کچھ کہا وہ محققین اور اکثروں کی رائے کے خلاف ہے کیونکہ محققین اور اکثروں کا قول ہے کہ صحیحین کی حدیثیں جو تواتر کے رتبہ کو نہیں پہونچی ہیں، صرف ظن کی مفید ہیں کیونکہ وہ اخبار احاد ہیں اور اخبار احاد کی نسبت ثابت ہو چکا ہے کہ ان سے صرف ظن پیدا ہو سکتا ہے۔ اور اس بات میں بخاری و مسلم اور اور لوگ سب برابر ہیں۔ ابن الصلاح کے قول کو اور ائمہ فن نے بھی رد کیا ہے لیکن ہم اس بحث کو لفظی طور سے طے کرنا نہیں چاہتے، ہم کو خود غور کرنا چاہئے کہ اخبار احاد سے یقین پیدا ہو سکتا ہے یا ظن۔

احادیث کے ظنی الثبوت ہونے کی تحقیق

کسی حدیث کو جب ایک محدث گو وہ کسی رتبہ کا ہو صحیح کہتا ہے تو اس کا یہ دعویٰ درحقیقت چند ضمنی دعووں پر مشتمل ہوتا ہے یعنی یہ کہ روایت متصل ہے اس کے رواۃ ثقہ ہیں۔ ضابط القلب ہیں، روایت میں شذوذ نہیں ہے کوئی علت قادحہ نہیں ہے، یہ سب امور ظنی اور اجتہادی ہیں جن پر یقین کی بنیاد قائم ہو سکتی ہے۔ جس طرح ایک فقیہ کسی مسئلہ کو قرآن یا حدیث سے استنباط کر کے اپنی دانست میں صحیح سمجھتا ہے اور اس قسم کی صحت یقینی نہیں ہوتی۔ کیونکہ استنباط میں جن مقدمات سے اس نے کام لیا ہے۔ اکثر اس کے ظنیات ہیں، اسی طرح حدیث کا حال ہے، کسی حدیث کو صحیح کہنا محدث کے ظنیات و اجتہادات پر مبنی ہے۔

اور تصریحِ مسائل ان کا فرض نہ تھا۔ لیکن امام ابو حنیفہؒ کو تدوینِ فقہ کی وجہ سے جس کے وہ بانی اول ہیں زیادہ تدقیق اور فرقِ مراتب کی ضرورت پڑی۔ انہوں نے نوعیت کے ثبوت کے لحاظ سے حدیث کی تین قسمیں قرار دیں۔

متواتر

۱۔ متواتر یعنی وہ حدیث جس کے رواۃ پہلے طبقہ روایت میں اس کثرت سے ہوں جن کے تواتر علی الکذب کا گمان نہیں ہوسکتا، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بے شمار لوگوں نے روایت کی ہو، اسی طرح ان لوگوں سے لے کر اخیر زمانہ تک بے شمار رواۃ روایت کرتے آئے ہوں۔

۲۔ مشہور یعنی وہ حدیث جس کے رواۃ پہلے طبقہ روایت میں تو بہت نہ ہوں لیکن دوسرے طبقہ سے اخیر تک اسی کثرت سے ہوں جو متواتر کے لئے مشروط ہے۔

۳۔ احاد جو متواتر اور مشہور نہ ہو۔

اس تقسیم کا اثر ان کی رائے کے موافق احکامِ شرعیہ پر جو پڑتا ہے وہ یہ ہے کہ متواتر سے فرضیت اور رکنیت ثابت ہوسکتی ہے۔ مشہور کا درجہ چونکہ متواتر سے کم ہے اس لئے فرضیت کا اثبات تو نہیں ہوسکتا لیکن قرآن میں جو حکم مطلق ہو حدیث مشہور سے مقید ہوسکتا ہے۔ اسی طرح اس سے زیادت علی الکتاب ہوسکتی ہے۔ احاد کا ثبوت چونکہ بالکل ظنی ہے اس لئے وہ قرآن کے احکامِ منصوصہ پر کچھ اثر نہیں پیدا کرسکتی، یہ مسئلہ اگرچہ نہایت واضح اور صاف ہے لیکن تعجب ہے کہ امام شافعی اور بعض محدثین اس کے مخالف ہیں۔ امام بیہقی وغیرہ نے بعض مناظرات نقل کئے ہیں جو امام شافعیؒ اور امام محمدؒ میں واقع ہوئے اور جن میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس مسئلہ میں امام شافعیؒ نے امام محمدؒ کو بند کردیا۔ اگرچہ ہمارے نزدیک یہ مناظرے فرضی مناظرے ہیں جن کا ثبوت اصولِ روایت کے مطابق ہرگز نہیں ہوسکتا لیکن اس قدر ضرور ثابت ہوتا ہے کہ اس مسئلہ کا انتساب امام ابوحنیفہ کی طرف ضرور صحیح ہے۔

قوی سے قوی اعتراض جو اس مسئلہ پر کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ خود امام ابوحنیفہؒ اور ان کے تلامذہ اس کے پابند نہ رہ سکے، شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں لکھا ہے کہ امام شافعیؒ نے امام محمدؒ سے کہا کہ کیا آپ کے نزدیک خبر واحد سے قرآن پر زیادتی نہیں سکتی۔ امام محمدؒ نے کہا ہاں، امام شافعیؒ نے کہا کہ قرآن مجید میں وارثوں کے حق میں وصیت کا حکم ہے آپ اس حدیث کی بنا پر لاوصیۃ للوارث وصیت کو ناجائز کیوں قرار دیتے ہو۔

غالباً شاہ صاحب نے یہ روایت بیہقی کی مناقب الشافعیؒ سے لی ہے جس میں اور بھی بے سروپا روایتیں مذکور ہیں لیکن ہم شاہ صاحبؒ کی خدمت میں عرض کرتے ہیں کہ حنفیوں کے نزدیک وارثوں کے حق میں وراثت کا حکم کسی حدیث سے نہیں منسوخ ہوا بلکہ خود قرآن مجید کی اس آیت سے جس میں توریث کے احکام ہیں، یہ صرف حنفیوں ہی کی رائے نہیں ہے بلکہ تمام مفسرین کا یہی قول ہے۔ الا الشاذ النادر منہم۔

ان مسائل پر اور بھی بہت سی بحثیں پیدا ہوگئی ہیں جن کی تفصیل ہم نہیں کرسکتے لیکن اخبار احاد کی بحث اور اس سے عقائد اسلام پر جو اثر پڑتا ہے اس کو ہم اس موقع پر تفصیل سے لکھتے ہیں کیونکہ بعض محدثین کو زیادہ تر اسی مسئلہ میں ان سے اختلاف ہے۔

بعض کو صحیح بتایا، پوچھنے والے نے کہا کہ آپ کو کیونکر معلوم ہوا۔ کیا آپ کو راوی نے ان باتوں کی اطلاع دی، ابوحاتم نے کہا نہیں بلکہ مجھ کو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ سائل نے کہا تو کیا آپ علمِ غیب کے مدعی ہیں۔ ابوحاتم نے جواب دیا کہ تم اور ماہرین فن سے پوچھو، اگر وہ میرے ہم زبان ہوں تو سمجھنا کہ میں نے بے جا نہیں کہا۔ سائل نے ابوزرعہ سے وہ حدیثیں جاکر دریافت کیں، انہوں نے ابوحاتم کی موافقت کی تب سائل کو تسکین ہوئی۔

بعض محدثین کا قول ہے اثر یهجم علی قلوبهم لا یمکنهم رده وهیئة نفسانیة لا معدل لهم یعنی وہ ایک امر ہے جو ائمہ حدیث کے دل پر وارد ہوتا ہے اور وہ اس کو رد نہیں کر سکتے اور نفسانی اثر ہے جس سے گریز نہیں ہو سکتا۔ محدثین کا یہ دعویٰ بالکل صحیح ہے، بلاشبہ فنِ روایت کی ممارست سے ایک ملکہ یا ذوق پیدا ہوجاتا ہے جس سے خود تمیز ہوجاتی ہے کہ یہ قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اسی طرح شریعت کے احکام اور مسائل اور ان کے اسرار و مصالح کے تتبع اور استقراء سے ایسا ذوق حاصل ہو سکتا ہے جس سے یہ تمیز ہو سکتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم دیا ہوگا یا نہیں لیکن ان اسرار و مصالح کا تتبع محدث کا فرض نہیں ہے۔ وہ مجتہد کے ساتھ مخصوص ہے اور یہی وجہ ہے کہ جب ان دقیق وجوہ کے لحاظ سے امام ابوحنیفہؒ نے بعض حدیثوں کو معلل قرار دیا تو اربابِ ظاہر نے مخالفت کی اور بعضوں کو بدگمانی ہوئی کہ امام صاحب حدیث کو عقل و رائے کی بنا پر رد کرتے ہیں لیکن انصاف پسند انصاف کر سکتا ہے کہ جب روایات اور ظاہر الفاظ کے استقراء سے محدثین کو ایسا مذاق پیدا ہوجاتا ہے جس سے وہ ایک حدیث کو جس میں بظاہر صحت کی تمام شرطیں پائی جاتی ہیں، رد کر سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ جس شخص نے دقتِ نظر اور نکتہ شناسی کے ساتھ احکامِ شریعت کے اسرار و مصالح کا تتبع کیا ہو وہ ایسے وجدان اور ذوق سے محروم رہے۔ البتہ یہ نازک اور ذمہ داری کا کام ہے جس کا صرف وہ شخص متکفل ہو سکتا ہے جو بہت ہی بڑا عالم، مجتہد، محدث، دقیقہ بیں مؤید بتائیدِ الٰہی ہو لیکن ان شرطوں کا جامع امام ابوحنیفہؒ سے زیادہ کون ہو سکتا ہے۔

مراتب احادیث کا تفاوت

نہایت مہتم بالشان اور دقیق چیز جو امام ابوحنیفہؒ نے اس فن میں اضافہ کی، وہ احادیث کے مراتب کا تفاوت ہے۔ احکام اور مسائل کا پہلا ماخذ قرآن ہے جس میں کسی کو گفتگو نہیں ہو سکتی۔ قرآن کے بعد حدیث کا رتبہ ہے۔ حدیث اور قرآن میں اصل امر کے لحاظ سے تو چنداں فرق نہیں۔ وہ وحی متلو ہے اور یہ غیر متلو جو کچھ تفاوت اور اختلاف ہے وہ ثبوت کی حیثیت سے ہے اگر کوئی حدیث اسی تواتر اور قطعیت سے ثابت ہو جس طرح قرآن ثابت ہے تو اثباتِ احکام میں وہ قرآن کے ہم پلہ ہے لیکن حدیثوں کے مراتب متفاوت ہیں اور احکام کے ثبوت میں انہی تفاوتوں کے لحاظ کی ضرورت ہے۔ محدثین نے حدیث کی جو تقسیمیں کی ہیں یعنی صحیح، حسن، ضعیف، مشہور، عزیز، غریب وغیرہ ان کے اختلافِ مراتب سے احکام پر چنداں اثر نہیں پڑتا۔ چنانچہ ان قسموں میں سے محدثین صرف ضعیف کا اعتبار نہیں کرتے، باقی اقسام کو قریباً یکساں قابلِ حجت قرار دیتے ہیں۔ محدثین کو اس سے زیادہ تدقیق اور امتیازِ مراتب کی ضرورت بھی نہ تھی کیونکہ استنباطِ احکام

سنتے تھے تو صرف یہ دیکھ لیتے تھے کہ اس کے راوی ثقہ ہیں یا نہیں؟ اگر ان کے خیال کے موافق قابل حجت ہیں تو پھر ان کو کوئی بحث نہیں ہوتی تھی اور بے تکلف اس حدیث کو قبول کر لیتے تھے، دوسرا فریق جو حسن و قبح عقلی کا قائل تھا یہ بھی دیکھتا تھا کہ جو مسئلہ یا عقیدہ حدیث سے مستنبط ہوتا ہے وہ عقل و مصلحت کے موافق یا نہیں، اگر نہیں ہوتا تھا تو وہ حدیث کی زیادہ تحقیق و تنقید کی طرف مائل ہوتے تھے، وہ دیکھتے تھے کہ راوی فہم و درایت کے لحاظ سے کیا پایہ رکھتے ہیں، روایت باللفظ ہے یا بالمعنیٰ، موقع حدیث کیا تھا؟ کون لوگ مخاطب تھے، کیا حالت تھی؟ غرض اس قسم کے اسباب اور وجوہ پر غور کرتے تھے، ان باتوں سے اکثر اصل حقیقت کا پتہ لگ جاتا تھا۔

صحیح ابن ماجہ و ترمذی میں ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث روایت کی توضؤا مما غیرت النار یعنی جس چیز کو آگ نے متغیر کر دیا ہو اس کے استعمال سے وضو ٹوٹ جاتا ہے اسی بنا پر بعض مجتہدین قائل ہیں کہ گوشت کھانے سے وضو لازم آتا ہے۔ ابوہریرہؓ نے جب یہ حدیث بیان کی تو عبداللہ بن عباسؓ موجود تھے، بولے کہ اتوضأ من الحمیم یعنی اس بنا پر تو گرم پانی کے استعمال سے بھی وضو لازم آتا ہے۔ ابوہریرہؓ نے کہا۔ اے برادر زادہ! جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی روایت سنو تو اس پر مثالیں نہ کہو۔ لیکن عبداللہ بن عباسؓ اپنی رائے پر قائم رہے۔ حضرت عائشہؓ نے ابن عمرؓ کی اس حدیث ان المیت یعذب ببکاء اهله پر جو اعتراض کیا تھا اسی طرز تحقیق پر مبنی تھا صحابہؓ کے حالات میں اس قسم کی متعدد مثالیں ملتی ہیں جن کا استقصاء اس موقع پر ضروری نہیں۔

امام ابوحنیفہ کا بھی یہی مسلک تھا اور اسی کو لوگوں نے قیاس کے لفظ سے شہرت دی اس مسئلہ پر کہ احکام شریعت مصالح پر مبنی ہیں، اس موقع پر ہم تفصیلی گفتگو نہیں کر سکتے، شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی بینظیر کتاب حجۃ اللہ البالغہ اس بحث کے لئے کافی و وافی ہے، یہاں صرف اس قدر کہنا ضروری ہے کہ علمائے اسلام میں جو لوگ عقل و نقل کے جامع تھے مثلاً امام غزالی، عزالدین عبدالسلام، شاہ ولی اللہ وغیرہ ان لوگوں کا یہی مسلک تھا، امام ابوحنیفہؒ احادیث کی تنقید میں اس اصول کو ضروری طور پر ملحوظ رکھتے تھے، دو متعارض حدیثیں جو روایت کی حیثیت سے یکساں نسبت رکھتی تھیں ان میں وہ اس حدیث کو ترجیح دیتے تھے جو اصول مذکور کے موافق ہو۔

امام صاحب نے بعض موقعوں پر محض اس اصول کی مخالفت کی وجہ سے بعض حدیثوں کے تسلیم کرنے میں تامل کیا، ان کی اصطلاح میں یہ ایک علت خفیہ ہے۔ محدثین نے اقسام حدیث میں ایک قسم معلل قرار دی ہے جس کی یہ تعریف قرار دی ہے کہ حدیث میں بظاہر صحت کی تمام شرطیں پائی جاتی ہیں اور وہ قابل استدلال نہیں ہوتی۔ اس قسم کی حدیثوں کی تمیز پر محدثین کو نہایت فخر ہے اور وہ اس کو ایک قسم کا الہام سمجھتے ہیں، علی بن المدینی جو امام بخاری کے استاد اور بہت بڑے مشہور محدث تھے ان کا قول ہے کہ ھی الھام ولو قلت للقیم بالعلل این لک ھذا لم تکن لہ حجۃ یعنی یہ الہام ہے اور اگر تم ماہر علل سے پوچھو کہ تم نے کیونکر اس کو معلل کہا تو وہ کوئی دلیل پیش نہیں کر سکتا۔

محدث ابوحاتم سے ایک شخص نے چند حدیثیں پوچھیں، انہوں نے بعض کو مدرج، بعض کو باطل بعض کو منکر،

محدث ابن جوزیؒ نے جرأت کرکے موضوع کہا لیکن حافظ ابن حجرؒ و جلال الدین سیوطی وغیرہ نے نہایت شدت سے مخالفت کی، امام صاحبؒ کے زمانہ میں اس سے زیادہ مخالفتیں ہوئیں لیکن وہ ان باتوں کی کچھ پروا نہیں کرتے تھے لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ لفظ عقل سے امام صاحبؒ کی مراد وہ وسیع معنیٰ نہیں ہیں جو آجکل کے تعلیم یافتہ لوگوں نے قرار دیئے ہیں جس کی رو سے شریعت کے بہت سے اصلی مسائل برباد ہوتے جاتے ہیں۔

۲۔ جو واقعات تمام لوگوں کو رات دن پیش آیا کرتے ہیں ان کے متعلق رسول اللہ سے کوئی ایسی روایت منقول ہو جو اخبار آحاد کے درجہ سے زیادہ نہ ہو تو وہ روایت مشتبہ ہو گی۔ یہ اصول اس بنا پر ہے کہ جو واقعات تمام لوگوں کو اکثر پیش آیا کرتے تھے ان کے متعلق جو کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد تھا اس کی ضرورت تمام لوگوں سے متعلق رہتی تھی اس لئے صرف ایک آدھ شخص تک اس روایت کا محدود رہنا درایت کے خلاف ہے۔

امام صاحب حدیث کے مقابلہ میں قیاس کا اعتبار نہیں کرتے تھے

امام ابوحنیفہؒ کی تصریحات سے ثابت ہے کہ وہ حدیث صحیح کے مقابلہ میں قیاس کا مطلق اعتبار نہیں کرتے تھے۔ امام محمدؒ اس بحث کے ذیل میں کہ جو شخص رمضان میں کچھ بھول کر کھا پی لے تو روزہ نہیں ٹوٹتا اور قضا نہیں لازم آتی، حدیث پر استدلال کرکے لکھتے ہیں کہ آثار کے ہوتے ہوئے رائے کچھ چیز نہیں پھر امام ابوحنیفہؒ کا خاص قول نقل کرتے ہیں کہ لولا ما جاء فی ھٰذا من الآثار لامرت بالقضاء یعنی اگر اس بارہ میں آثار موجود نہ ہوتے تو میں قضا کا حکم دیتا۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ احادیث کے ثبوت کے متعلق امام ابوحنیفہؒ کی شرطیں نہایت سخت ہیں جب تک وہ شرطیں پائی نہ جائیں وہ حدیث کو قابل استدلال نہیں سمجھتے لیکن ان شرطوں کے ساتھ حدیث ثابت ہو تو ان کے نزدیک پھر قیاس کوئی چیز نہیں۔

قیاس کے ایک اور معنیٰ

جس حد تک ہم تحقیق کر سکے امام ابوحنیفہؒ نے قیاس فقہی کو حدیث پر ہرگز مقدم نہیں رکھا لیکن ان کے زمانہ تک قیاس کا لفظ نہایت وسیع معنوں میں مستعمل تھا اور بے شبہ ان معنوں کے لحاظ سے امام صاحبؒ نے قیاس کو حدیثوں میں دخل دیا ہے۔ مسائل اور احکام شرعیہ کے متعلق اسلام میں شروع ہی سے دو فرقے قائم ہو گئے تھے، ایک کا خیال تھا کہ شرعی احکام کسی مصلحت اور اقتضائے عقلی پر مبنی نہیں ہیں۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ حسن و قبح اشیاء عقلی نہیں ہے۔ دوسرے فریق کی رائے تھی کہ تمام احکام مصالح پر مبنی ہیں جن میں سے بعض مصلحتیں صاف نمایاں ہیں اور خود شارع کے کلام سے اس کے اشارے پائے جاتے ہیں بعض ایسے ہیں جن کی مصلحت ہم کو معلوم نہیں لیکن فی الواقع وہ مصالح سے خالی نہیں۔

اس اختلاف رائے نے حدیثوں کی روایت پر مختلف اثر پیدا کئے۔ بعض لوگ جب کسی حدیث کو

اگر اس معیار پر پورا نہیں اترتا تو اس کی صحت بھی مشتبہ ہوگی یعنی یہ احتمال ہوگا کہ روایت کے تغیرات نے واقعہ کی صورت بدل دی ہے۔ اس قسم کے قواعد حدیث کی تحقیق و تنقید میں بھی استعمال کئے جاتے ہیں اور انہی کا نام اصولِ روایت ہے، علامہ ابن جوزیؒ جو فن حدیث میں بڑا پایہ رکھتے تھے لکھتے ہیں کہ۔

جس حدیث کو تم دیکھو کہ عقل کے مخالف یا اصول کے مناقض ہے تو یہ سمجھ لو کہ وہ موضوع ہے، اس میں تحقیقِ حال کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ اسی طرح وہ حدیث بھی موضوع ہے۔ جو حس و مشاہدہ سے باطل ثابت ہو یا جس میں ایک معمولی سی بات پر سخت عذاب کی دھمکی ہو یا ذرا سے کام پر بڑے انعام کا وعدہ ہو۔ اس طرح کی حدیثیں واعظوں اور صوفیوں کی روایتوں میں بہت پائی جاتی ہیں۔

امام ابوحنیفہؒ نے درایت کے جو اصول قائم کئے ان میں سے بعض ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

جو حدیث عقلِ قطعی کے مخالف ہو صحیح نہیں

۱۔"جو حدیث عقلِ قطعی کے مخالف ہو وہ اعتبار کے قابل نہیں"۔ یہ وہی قاعدہ ہے جس کو ابن جوزیؒ نے تمام اصولِ درایت پر مقدم رکھا ہے۔ ابن جوزی چھٹی صدی میں تھے، اس وقت اسلامی علوم اوجِ کمال پر پہونچ گئے تھے اور فلسفیانہ خیالات کا اثر زیادہ عام ہو گیا تھا لیکن امام ابوحنیفہؒ کے زمانہ تک مذہب میں عقل کا نام لینا ایک جرم عظیم تھا، امام صاحبؒ نے اول اول جب یہ قاعدہ قرار دیا اور روایات میں برتا تو سخت مخالفت ہوئی۔ اس قسم کی حدیثیں جن میں ناممکن اور محال واقعات بیان کئے جاتے ہیں۔ امام صاحبؒ کے سامنے پیش کی جاتی تھیں تو وہ ان سے انکار کرتے تھے، یہ امر عام لوگوں پر گراں گزرتا تھا کیونکہ ان لوگوں کے خیال میں روایات کی تحقیق و تنقید کا مدار صرف رواۃ کی حالت پر تھا، اصولِ درایت سے غرض نہ تھی، زمانہ مابعد میں اگرچہ یہ قاعدہ اصولِ حدیث میں داخل کر لیا گیا لیکن اربابِ ظاہر نے اس کو بہت کم برتا اور اسی کا نتیجہ ہے کہ آج بیسیوں مزخرف اور دور از کار حدیثیں قبولِ عام کے شرف سے ممتاز ہیں۔

تلک الغرانیق العلیٰ کی حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ کی زبان سے (سورۂ نجم کی تلاوت کے وقت) بتوں کی تعریف میں یہ الفاظ ادا ہوئے تلک الغرانیق العلیٰ وان شفاعتھم لترتجیٰ "یعنی یہ بت بہت معزز ہیں اور ان کی شفاعت کی امید کی جاسکتی ہے"۔ اور یہ الفاظ شیطان نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان میں ڈال دیئے تھے، چنانچہ تلاوت کے بعد جبرئیلؑ آئے اور انہوں نے یہ شکایت کی کہ میں نے تو یہ الفاظ آپ کو نہیں سکھلائے تھے، آپ نے کہاں سے پڑھ دیئے۔ اس حدیث کو امام صاحب کے اصول کے موافق بعض محدثین مثلاً قاضی عیاض و ابوبکر بیہقی وغیرہ نے غلط کہا لیکن محدثین کا ایک بڑا گروہ اس کو اب بھی صحیح تسلیم کرتا ہے۔ متاخرین میں حافظ ابن حجرؒ سے زیادہ نامور کوئی محدث نہیں گزرا، وہ بڑے زور شور سے اس حدیث کی تائید کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ چونکہ اس کے رواۃ ثقہ ہیں اس لئے اس کی صحت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح ردالشمس کی حدیث کو جس میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت علیؓ کی نمازِ عصر قضا ہو گئی تھی اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے آفتاب غروب ہونے کے بعد پھر طالع ہوا۔

تک محدود کر دیا اور لوگوں کے لئے روایت بالالفاظ کی قید لگائی اور امام طحاوی نے بسند متصل ان سے روایت کی ہے کہ صرف وہ حدیث روایت کرنی چاہئے جو روایت کرنے کے وقت یاد تھی۔ ملا علی قاری اس روایت کو نقل کر کے لکھتے ہیں۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ روایت بالمعنیٰ کو جائز رکھتے تھے۔

اس پابندی میں اگرچہ امام مالکؒ اور بعض محدثین نے امام ابوحنیفہؒ سے اتفاق کیا۔ فتح المغیث میں ہے۔

وقیل لا تجوز الروایۃ بالمعنیٰ مطلقا قال لہ طائفۃ من المحدثین الفقہاء الاصولیین من الشافعیۃ وغیرھم قال القرطبی وھو الصحیح من مذھب مالک۔ لیکن عام ارباب روایت اس سختی کے کیونکر پابند ہو سکتے۔ چنانچہ ایک بڑے فرقہ نے مخالفت کی اور امام صاحب کو مشدد فی الروایۃ ٹھہرایا تاہم انصاف یہ ہے کہ جو اصول امام صاحب نے اختیار کیا وہ ضروری اور نہایت ضروری تھا۔ خود حدیث میں آیا ہے کہ نضر اللہ امرأ سمع مناشیئا فبلغہ کما سمعہ یعنی رسول اللہؐ نے فرمایا کہ خدا اس کو شاداب کرے جس نے ہم سے کچھ سنا اور اس کو اسی طرح پہونچایا جیسا کہ ہم سے سنا تھا۔ اس سے زیادہ اس باب میں کسی دلیل کی کیا ضرورت ہے۔ صحابہ میں سے جو لوگ روایت باللفظ کو غیر ضروری سمجھتے تھے۔ ممکن ہے کہ یہ حدیث ان کو نہ پہونچی ہو۔ چنانچہ جن صحابہ کی نسبت ثابت ہے کہ انہوں نے اس حدیث کو سنا تھا مثلاً عبداللہ بن مسعودؓ جو اس حدیث کے راوی ہیں وہ الفاظ کے پابند تھے۔ امام ابوحنیفہؒ کے زمانہ میں یہ حدیث عام ہو چکی تھی اسلئے ان کو اس کی تکمیل سے کیا عذر ہو سکتا ہے۔

فن حدیث میں سب سے بڑا کام امام ابوحنیفہؒ نے یہ کیا کہ درایت کے اصول قائم کئے اور ان کو احادیث کی تحقیق وتنقید میں برتا۔ فن حدیث کی شاخ یعنی روایت پر ہمارے علماء نے جس قدر توجہ کی۔ اس کی کوئی نظیر دنیا کی گذشتہ اور موجودہ تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ لیکن یہ افسوس ہے کہ اصول درایت کے ساتھ چنداں اعتنا نہیں کیا گیا۔ حافظ ابن حجرؒ کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فن میں بعض تصنیفیں لکھی گئیں۔ لیکن وہ اس قدر کم اور غیر متعارف ہیں کہ گویا نہیں ہیں۔ اصول حدیث ایک مستقل فن بن گیا ہے اور بڑی بڑی کتابیں جو اس میں لکھی گئیں عموماً متداول ہیں لیکن ان سے اصول درایت کے متعلق بہت کم واقفیت ہوتی ہے حالانکہ یہی اصول فن حدیث کے نہایت ضروری اجزاء ہیں۔ یہ عزت صرف امام ابوحنیفہؒ کو حاصل ہے کہ اس فن کا نام ونشان بھی نہ تھا۔ اس وقت ان کی نگاہ ان باریک نکتوں پر پہونچی۔ بے شبہ صحابہ کی تاریخ میں جستہ جستہ اصول درایت کے آثار نظر آتے ہیں اور درحقیقت وہی امام ابوحنیفہؒ کے لئے دلیل راہ بنے لیکن وہ باتیں عام مسائل کے ہجوم میں ایسی گم اور ناپید تھیں کہ ان پر عام لوگوں کی نگاہ نہیں پڑ سکتی تھی۔

روایات کی صحت وعدم صحت کا مدار ہمیشہ راویوں کے اعتبار وعدم اعتبار پر نہیں ہوتا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک دفعہ کی روایات جس سند سے بیان کی جاتی ہے۔ اس کے تمام راوی ثقہ اور قابل اعتبار ہوتے ہیں لیکن واقعہ صحیح نہیں، حدیث میں بھی اس کی سینکڑوں مثالیں ملتی ہیں۔ اس لئے ضرور ہے کہ صرف رواۃ کی بنا پر احادیث کا فیصلہ نہ کیا جائے بلکہ یہ بھی دیکھا جائے کہ وہ اصول روایت کے مطابق ہیں یا نہیں۔

درایت سے یہ مطلب ہے کہ جب کوئی واقعہ بیان کیا جائے تو اس پر غور کیا جائے کہ وہ طبیعت انسانی کے اقتضا وزمانہ کی خصوصیتوں، منسوب الیہ کے حالات اور دیگر قرائن عقلی کے ساتھ کیا نسبت رکھتا ہے۔
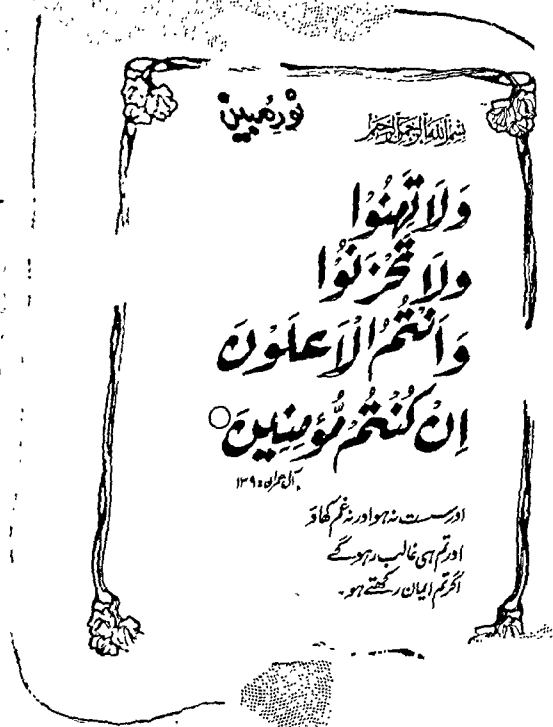
امر کا صیغہ ہے لیکن اس میں وہ تحتم اور تاکید نہیں ہے جو امر میں ہے۔

روایت بالمعنیٰ کے متعلق امام ابو حنیفہؒ کے اصول

امام ابو حنیفہؒ نے ان مشکلات کا اندازہ کر کے نہایت معتدل طریقہ اختیار کیا۔ جو حدیثیں ان کے زمانہ سے پہلے بالمعنیٰ روایت ہو چکی تھیں اور محدثین میں شائع تھیں۔

امام صاحبؒ نے ان حدیثوں کو قبول کیا لیکن یہ قید لگائی کہ رواۃ حدیث فقیہ ہوں یعنی الفاظ کے اثر اور مطالب کی تعبیر سے واقف ہوں۔ تعبیر مطالب کا احتمال اب بھی باقی رہتا ہے لیکن احادیث کا مدار (جیسا کہ محدثین نے تصریح کر دی ہے) ظن غالب پر ہے اس لئے جب تک کوئی مخالف دلیل موجود نہ ہو۔ روایت بالمعنیٰ قابل عمل ہو گی۔ امام صاحب نے ان احادیث کو بھی قبول کیا جن کے رواۃ ثقہ ہوں اور فقیہ نہ ہوں لیکن ان کا درجہ پہلے کی بہ نسبت کم قرار دیا اور ان میں اصول درایت کی زیادہ ضرورت سمجھی، امام صاحبؒ کے ان اصول سے اور ائمہ نے بھی اتفاق کیا۔ الفقیہ الحدیث میں ہے کہ جو شخص مدلول الفاظ کو اچھی طرح نہیں سمجھتا۔ اس کو روایت باللفظ ضروری ہے البتہ جو شخص مطالب کا اندازہ دان ہے۔ اس کی نسبت اختلاف ہے، کثرت رائے اس طرف ہے کہ " وہ الفاظ کا پابند نہیں " لیکن امام ابو حنیفہؒ نے اس اجازت کو صحابہ اور تابعین

مطلب کو نہایت عام وسعت دی ہے، صحابہ سے زیادہ کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ و مطالب
کا اندازہ دان نہیں ہو سکتا تھا، اول تو وہ زبان دان اور زبان کے حاکم تھے۔ اس کے ساتھ شرفِ صحبت کی
وجہ سے رسول اللہؐ کی طرزِ ادا، طریقہ گفتگو، اندازِ کلام، فحوائے سخن سے خوب واقف تھے تاہم کتبِ حدیث میں
اس کی متعدد نظیریں ملتی ہیں کہ خود صحابہ سے ادائے مطلب میں کمی یا زیادتی ہو گئی۔

ادائے مطالب میں صحابہؓ سے کمی زیادتی

ابن ماجہ میں روایت ہے کہ ابوموسیٰ اشعریؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ان المیت
یعذب ببکاء الحی انا قالوا واعضداہ واکاسباہ وا ناصراہ واجبلاہ "یعنی جب مردہ پر یہ الفاظ کہہ کر رویا
جاتا ہے تو اس کو عذاب دیا جاتا ہے" کسی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ ابن عمرؓ یہ حدیث بیان کرتے
تھے، حضرت عائشہؓ نے کہا۔ میں یہ نہیں کہتی کہ ابن عمر جھوٹ کہتے ہیں لیکن ان کو سہو ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک
یہودی عورت مر گئی، اس کے گھر والے اس پر رو رہے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو فرمایا کہ اس کے گھر
والے رو رہے ہیں اور اس پر قبر میں عذاب ہو رہا ہے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عائشہؓ نے قرآن کی
یہ آیت پڑھی لاتزر وازرۃ وزر اخریٰ جس سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ ایک شخص کے فعل کا دوسرا
شخص ذمہ دار نہیں ہو سکتا۔ گھر والے روتے ہیں تو ان کا قصور ہے۔ مردہ نے کیا گناہ کیا ہے کہ اس پر عذاب کیا جائے
دیکھو اس حدیث میں رسول اللہ نے یہودیہ عورت کا معذب ہونا بطور ایک واقعہ بیان کیا تھا۔ راوی نے رونے کو اس
کا سبب قرار دیا اور حدیث کے یہ الفاظ بیان کئے ان المیت یعذب ببکاء الحی یعنی مردوں کو زندوں کے رونے
کی وجہ سے عذاب دیا جاتا ہے"
اسی طرح غزوۂ بدر کے واقعہ میں عام روایت یہ ہے کہ رسول اللہ نے قلیب پر کھڑے ہو کر فرمایا هل وجدتم
ما فعل ربکم حقا لوگوں نے عرض کی کہ "آپ مردوں سے خطاب فرماتے ہیں" ارشاد ہوا کہ "جو میں نے کہا ان
لوگوں نے سن لیا" لیکن یہ واقعہ حضرت عائشہؓ کے سامنے بیان کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہؐ نے یہ نہیں فرمایا
تھا بلکہ یہ الفاظ کہے تھے لقد علموا ان ما دعوتھم حق۔
یعنی ان لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ جس چیز کی میں نے دعوت کی تھی، وہ حق ہے، دیکھو ان دونوں جملوں کے
مفہوم میں کس قدر فرق ہے اور اس سے سماعِ موتیٰ کے مسئلہ پر کیسا مختلف اثر پڑتا ہے۔
غرض جب صحابہ سے اس قسم کے مسامحات واقع ہوتے تھے تو دوسرے اور تیسرے دور کا ذکر کیا۔ لطف
یہ ہے کہ جو لوگ روایت بالمعنیٰ کے قائل ہیں۔ انہوں نے چند الفاظ مثالاً بتائے ہیں کہ ان کو دوسرے لفظوں
میں اس طرح ادا کرتے ہیں اور معنیٰ میں مطلق فرق نہیں پیدا ہوگا۔ حالانکہ غور سے دیکھئے تو ان لفظوں کے اثر میں
صاف تفاوت نظر آتا ہے۔ محدث سخاوی لکھتے ہیں کہ حدیث میں آیا ہے۔ اقتلوا الاسودین الحیۃ و
العقرب۔ اب بجائے اس کے یہ کہہ سکتے ہیں کہ امر بقتلھما محدث سخاوی کے نزدیک اس مثال میں الفاظ کے
اختلاف نے معنیٰ میں کچھ فرق نہیں پیدا کیا حالانکہ اقتلوا اور امر بالقتل میں صریح تفاوت ہے۔ اقتلوا اگرچہ

تے تھے تو روایت کا بعینہا ادا کرنا قریبًا ناممکن ہوتا تھا اسی ضرورت سے امام ابوحنیفہؒ نے اس طریقہ کو
رد کر دیا اور انصاف یہ ہے کہ ایسا کرنا ضروری تھا۔

سب سے زیادہ مہتم بالشان اور قابلِ بحث مسئلہ یہ ہے کہ روایت بالمعنیٰ جائز ہے یا نہیں؟ یا یہ کہ ایسی
روایت قطعًا قابلِ حجت ہے یا نہیں۔ یہ مسئلہ ہمیشہ مختلف فیہ رہا ہے اور اب بھی ہے۔ امام شافعیؒ نے
روایت کی ہے کہ بعض تابعین نے ایک حدیث متعدد صحابہ سے سنی جس کو سب نے مختلف لفظوں میں بیان
کیا لیکن مطلب ایک تھا۔ انہوں نے کسی صحابی سے یہ حقیقت بیان کی، صحابی نے جواب دیا کہ جب مختلف
نہیں تو کچھ مضائقہ نہیں مگر امام شافعیؒ نے تابعی کا نام نہ بتایا جس سے روایت کی قوت اور ضعف کا اندازہ
ہوسکتا تاہم اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ بعض صحابہ روایت بالمعنیٰ جائز سمجھتے تھے اور اس پر عمل کرتے تھے
بخلاف اس کے بعض صحابہ مثلاً عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو روایت باللفظ پر اصرار تھا۔

روایت بالمعنیٰ میں صحابہؓ کی احتیاط

علامہ ذہبی تذکرۃ الحفاظ میں ان کے حالات کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ "وہ روایت میں سختی کرتے تھے
اور اپنے شاگردوں کو زجر کرتے تھے کہ الفاظ کے ضبط میں بے پروائی نہ کریں۔ عبداللہ بن مسعودؓ جب کبھی
بالمعنیٰ روایت کرتے تھے اومثلہ اونحوہ اور شبیہ بہ اما فوق ذالك واما دون ذالك واما قریب من
ذالك یعنی رسول اللہ نے اس طرح فرمایا تھا یا اس کے مثل یا اس کے مشابہ یا اس سے کچھ زیادہ یا کم یا اس کے قریب
قریب فرمایا تھا۔ ابوالدرداء کا بھی یہی حال تھا وہ حدیث بیان کر کے کہا کرتے تھے ھذا او نحوہ ھذا او شکلہ
حضرت عمرؓ جو لوگوں کو روایتِ حدیث سے منع کیا کرتے تھے ان کا بھی غالبًا یہی منشا تھا، وہ جانتے تھے کہ الفاظ
کم یاد رہ سکتے ہیں اور معنیٰ کی عام اجازت میں تغیر و تبدل کا احتمال بڑھتا جاتا ہے۔

صحابہ کے دور کے بعد بھی یہ مسئلہ یک سو نہ ہوا۔ تابعین کے دو گروہ تھے اور خود امام ابوحنیفہ کے استاد الاستا
روایت بالمعنیٰ کے قائل تھے۔ آگے چل کر تو گویا اس پر اتفاق عام ہوگیا کہ روایت بالمعنیٰ جائز ہے۔ چنانچہ اصو
حدیث کی کتابوں میں جمہور کا یہی مذہب بیان کیا جاتا ہے۔ مجتہدین میں سے صرف امام مالکؒ اس کے خلاف ہیں
محدثین کا ایک گروہ جن میں امام مسلم، قاسم بن سیر بن رجاء بن حیواۃ، ابوزرعہ، سام بن ابی الجعد، عبدالمالک
عمر داخل ہیں۔ روایت باللفظ پر عمل کرتا تھا لیکن عام محدثین جواز ہی کے قائل ہیں اور درحقیقت ایک ا
فرقہ جس کا عام میلان ہر حالت میں کثرتِ روایت کی طرف ہو جواز ہی کا قائل ہوسکتا تھا۔

اس میں شبہ نہیں کہ اکثر تابعین اور صحابہ نے بالمعنیٰ حدیثیں روایت کیں اور اگر شروع سے یہ قید لگا
جائے تو روایت کا دائرہ اس قدر تنگ ہو جاتا ہے کہ مسائل و احکام کے لئے کچھ باقی نہیں رہتا لیکن اس۔
بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ روایت بالمعنیٰ میں اصل روایت کا اصلی حالت پر قائم رکھنا اس قدر مشکل ہے
قریبًا ناممکن ہے۔ زبان کے نکتہ شناس جانتے ہیں کہ مرادف الفاظ بھی یکساں اثر نہیں رکھتے اور معنیٰ کی
حیثیتوں میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور پیدا ہو جاتا ہے حالانکہ مجوزین نے مرادف وغیرہ کی قید بھی نہیں رکھی اور اد

امام ابوحنیفہ کو اس احتیاط پر جس چیز نے مجبور کیا تھا وہ یہ تھی کہ ان کے زمانہ تک روایت بالمعنیٰ کا طریقہ نہایت عام تھا اور بہت کم لوگ تھے جو الفاظ حدیث کی پابندی کرتے تھے اس لئے روایت میں تغیر و تبدل کا احتمال ہر واسطہ میں بڑھتا جاتا تھا، کم از کم یہ کہ ہر روایت پہلے واسطہ میں جس قدر قوی ہوتی ہے، دوسرے واسطہ میں اس کا وہ پایہ نہیں قائم رہ سکتا تھا، بے شبہ مستملی کے کام کرنے کا طریقہ قائم رکھنا ضروری تھا کیونکہ اکثر موقعوں پر بغیر مستملی کے کام نہیں چل سکتا تھا لیکن ناانصافی تھی کہ جس شخص نے بلا واسطہ شیخ سے سنا ہو اور جس نے مستملی سے روایت کی ہو، دونوں کا ایک ہی درجہ قرار دیا جائے، مستملی کبھی کبھی نہایت غافل بے سمجھ ہوتے تھے اس لئے غلطیوں کا احتمال اور بھی زیادہ ہو جاتا تھا۔

اس طرح بلکہ اس سے زیادہ غیر محتاط طریقہ یہ تھا کہ اخبرنا و حدثنا کو بعض محدثین نہایت عام معنوں میں استعمال کرتے تھے۔ امام حسن بصری نے متعدد روایتوں میں کہا ہے۔ حدثنا ابوھریرۃ حالانکہ وہ ابوہریرہ سے کبھی نہیں ملے تھے۔ انہوں نے اس کی یہ تاویل کی تھی کہ ابوہریرہؓ نے جب وہ حدیث بیان کی تھی تو اس شہر میں وہ موجود تھے۔

"حدثنا" کا مفہوم اور اس کا استعمال

اسی طرح اور شیوخ و صحابہ کی نسبت حدثنا کا لفظ استعمال کرتے تھے اور معنی یہ لیتے تھے کہ ان کے شہر والوں نے ان شیوخ سے سنا تھا۔ محدث بزار نے لکھا ہے کہ حسن بصری نے ان لوگوں سے روایت کی ہے جن سے وہ کبھی نہیں ملے اور تاویل یہ کرتے تھے کہ ان کی قوم نے وہ حدیث ان لوگوں سے سنی تھی۔ یہ امر علاوہ اس کے کہ ایک قسم کی غلط بیانی تھی، حدیث کی اسناد کو مشتبہ کر دیتا تھا کیونکہ راوی نے جب خود شیخ سے حدیث نہیں سنی تو بیچ میں کوئی واسطہ ہوگا اور چونکہ راوی نے اس کا نام نہیں بتایا۔ اس لئے اس کے ثقہ و غیر ثقہ ہونے کا حال نہیں معلوم ہو سکتا۔ صرف حسن ظن پر مدار رہ گیا۔ ایسے شخص نے جس سے سنا ہوگا وہ ضرور قابل استناد ہوگا۔ امام ابوحنیفہؒ نے اس طریقہ کو ناجائز قرار دیا اور ان کے بعد اور ائمہ حدیث نے بھی ان کی متابعت کی۔

ارباب روایت کا ایک یہ طریقہ تھا کہ جب کسی شخص سے کچھ حدیثیں سنیں اور قلمبند کر لیں تو ان اجزا سے روایت کرنی ہمیشہ جائز سمجھتے تھے۔ اس کو اس قدر وسعت دی گئی کہ راوی کو ان حدیثوں کے الفاظ و معانی کچھ یاد نہ رہے ہوں تاہم اس بنا پر کہ اجزا اس کے پاس موجود ہیں۔ ان کی روایت کر سکتا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ نے اس طریقہ کو قائم رکھا لیکن یہ قید لگائی کہ حدیث کے الفاظ و مطالب محفوظ ہونے چاہئیں ورنہ روایت جائز نہیں۔

یہ مسئلہ بھی اگرچہ عام طور پر نہیں تسلیم کیا گیا تاہم جیسا کہ محدث سخاوی نے تصریح کی ہے۔ امام مالکؒ اور بہت سے ائمہ فن نے اس کی موافقت کی۔ امام بخاری و مسلم کے زمانہ میں اس قید کی چنداں ضرورت نہیں رہی تھی کیونکہ اس وقت روایت باللفظ کا عام رواج ہو چکا تھا لیکن امام ابوحنیفہؒ کے عہد تک حدیثیں زیادہ تر بالمعنیٰ روایت کی جاتی تھیں اس لئے اگر راوی کو الفاظ حدیث، موقع حدیث، شان نزول وغیرہ یاد نہیں

"بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور دن رات کی
تبدیلیوں میں عقل مندوں کے لئے نشانیاں ہیں،
جو ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے ہیں اور زمین کی کوکھ سے
جنم لینے والی نئی نئی موجودات پر غور و فکر کرتے ہیں،
اے رب تو نے یہ سب کچھ بیکار پیدا نہیں کیا،
تو پاک ہے ہمیں ایسی زندگی سے محفوظ کر دے
جس زندگی کے اوپر خوف اور حزن و ملال محیط ہے"۔
(سورہ آل عمران)

امام صاحبؒ نے روایت کے متعلق جو شرطیں اختیار کیں کچھ تو وہی ہیں جو اور محدثین کے نزدیک مسلم ہیں۔ کچھ ایسی ہیں جن میں وہ منفرد ہیں یا صرف امام مالک اور بعض اور مجتہدین ان کے ہم زبان ہیں۔

ان میں سے ایک یہ مسئلہ ہے کہ "صرف وہ حدیث حجت ہے جس کو راوی نے اپنے کان سے سنا ہو، اور روایت کے وقت تک یاد رکھا ہو"۔ یہ قاعدہ بظاہر نہایت صاف ہے جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا لیکن اس کی تفریعیں نہایت وسیع اثر رکھتی ہیں اور عام محدثین کو ان سے اتفاق نہیں ہے۔ محدثین کے نزدیک ان پابندیوں سے روایت کا دائرہ تنگ ہو جاتا ہے اور اس سے ہم کو بھی انکار نہیں لیکن اس کا فیصلہ ناظرین خود کر سکتے ہیں کہ احتیاط مقدم ہے یا روایت کی وسعت ہم بعض تفریعات کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ ذکر کرتے ہیں جس سے ظاہر ہوگا کہ امام ابوحنیفہ کو کس خیال نے اس قسم کی سختیوں پر مجبور کیا تھا۔

اکثر شیوخ کا حلقۂ درس نہایت وسیع ہوتا تھا یہاں تک کہ ایک ایک مجلس میں دس دس ہزار سامعین جمع ہوتے تھے، اس وقت متعدد مستملی یعنی نائب جا بجا بٹھائے جاتے تھے کہ شیخ کے الفاظ کو دور والوں تک پہونچائیں، بہت سے ایسے لوگ ہوتے تھے جن کے کانوں میں شیخ کا ایک لفظ بھی نہیں پہونچتا تھا۔ وہ صرف مستملی کے الفاظ سن کر حدیث روایت کرتے تھے، اب بحث یہ پیدا ہوتی ہے کہ جس شخص نے صرف مستملی سے سنا وہ اصل شیخ کی نسبت حدثنا کہہ سکتا ہے یا نہیں، اکثر ارباب روایت کا مذہب ہے کہ کہہ سکتا ہے امام ابوحنیفہؒ اس کے خلاف ہیں، ائمہ محدثین میں سے حافظ ابونعیم، فضل بن دکین، زائد بن کدامہ، امام صاحب کے ہم زبان ہیں۔ حافظ ابن کثیر نے لکھا کہ مقتضائے عقل یہی امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے لیکن عمل مذہب
نسائی ہے۔

امام مالکؒ و امام ابو حنیفہؒ کی شروط روایت قریب متحد ہیں

امام صاحب کے اس خیال نے اگرچہ قبول عام کی سند حاصل نہیں کی لیکن وہ بالکل بے اثر نہیں رہا۔ امام مالک و امام شافعی جو اجتہاد میں امام ابو حنیفہؒ سے متاخر ہیں۔ ان کے اصول اجتہاد میں اس خیال کا صاف پرتو پایا جاتا ہے۔ امام مالکؒ نے روایت کے متعلق جو قیدا ور شرطیں لگائی ہیں۔ وہ امام ابو حنیفہؒ کے شرائط کے قریب قریب ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ مشددین فی الروایۃ میں امام ابو حنیفہ و امام مالک کا نام ساتھ لیا جاتا ہے، ابن الصلاح مقدمہ میں لکھتے ہیں۔ ومن مذاھب التشدید مذھب من قال لاحجۃ الافیما روایۃ الراوی من حفظہ وتذکرہ وذالك مروی عن مالك وابی حنیفۃ یعنی مشددین کا یہ مذہب ہے کہ صرف وہ حدیث قابل حجت ہے جس کو راوی نے اپنے حفظ سے یاد رکھا ہے اور یہ قول مالک و ابو حنیفہ سے منقول ہے۔ محدثین نے لکھا ہے کہ امام مالکؒ نے اول جب مؤطا لکھی تو اس میں دس ہزار حدیثیں تھیں، پھر امام مالکؒ زیادہ تحقیق کرنے لگے تو یہ تعداد کم ہوتی گئی یہاں تک کہ چھ سات سو رہ گئی، امام شافعیؒ نے صاف لفظوں میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے خیالات ظاہر کئے ہیں۔

امام شافعیؒ کا قول تھا کہ صحیح حدیثیں بہت کم ہیں

امام بیہقی نے روایت کی ہے کہ ایک دن ایک قرشی نے امام شافعیؒ سے کہا کہ آپ وہ حدیثیں لکھوایئے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں انہوں نے جواب دیا کہ ارباب معرفت کے نزدیک صحیح حدیثیں کم ہیں کیونکہ ابوبکر صدیقؓ نے جو حدیثیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہیں ان کی تعداد سترہ سے زیادہ نہیں ہے۔ عمر بن الخطابؓ باوجود اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مدت تک زندہ رہے ان کی روایت سے پچاس حدیثیں بھی ثابت نہیں، حضرت عثمانؓ کا بھی یہی حال ہے، حضرت علی اگرچہ لوگوں کو حدیث سیکھنے کی ترغیب دلاتے تھے لیکن ان سے بھی کم حدیثیں مروی ہیں کیونکہ وہ مطمئن نہیں رہے، ان سے جو حدیثیں مروی ہیں اکثر حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت کی ہیں۔ ان لوگوں کے سوا اور صحابہ سے بہت سی حدیثیں مروی ہیں لیکن اہل معرفت کے نزدیک وہ روائتیں صحیح سند سے ثابت نہیں۔

امام صاحبؒ نے روایت کے لئے کیا شرطیں مقرر کیں

ان باتوں سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ امام ابو حنیفہؒ معتزلہ کی طرح احادیث کے منکر تھے یا صرف دس بیس حدیثوں کو تسلیم کرتے تھے، ان کے شاگردوں نے خود ان سے سینکڑوں حدیثیں روایت کی ہیں۔ مؤطا امام محمد کتاب الآثار، کتاب الحج جو عام طور پر متداول ہیں ان میں بھی امام صاحب سے بیسیوں حدیثیں مروی ہیں البتہ اور محدثین کی نسبت ان کی احادیث مسلمہ کی تعداد کم ہے اور اس کی وجہ وہی شروط روایت کی سختی ہے۔

غرض امام ابوحنیفہؒ کے زمانہ میں احادیث کا جو دفتر تیار ہو چکا تھا۔ ہزاروں موضوعات، اغالیط، ضعاف، مدرجات سے بھرا ہوا تھا، اس وقت امام بخاری و مسلم نہ تھے جو صحیح حدیثوں کے انتخاب کی کوشش کرتے، امام ابوحنیفہؒ گو مہمات فقہ کی وجہ سے اس طرف متوجہ نہ ہو سکے تاہم انہوں نے روایتوں کی تنقید کی بنیاد ڈالی اور اس کے اصول وضوابط قرار دیئے، ان کے اصولِ تنقید نہایت سخت خیال کئے گئے ہیں یہاں تک کہ محدثین نے ان کو مشدد فی الروایۃ کا لقب دیا ہے، تمام اور محدثین کی بہ نسبت امام صاحب کے قلیل الروایۃ ہونے کی ایک یہ بھی وجہ ہے بلکہ تمام اور وجوہ کی بہ نسبت یہ زیادہ قوی سبب ہے۔ علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں۔ والامام ابوحنیفۃ انما قلت روایتہ لما شدد فی شروط الروایۃ والتحمل یعنی امام ابوحنیفہؒ کی روایتیں اس لئے کم ہیں کہ انہوں نے روایت اور تحمل کی شرطوں میں سختی کی۔

حدیث کے متعلق پہلا اجمالی خیال جو امام صاحب کے دل میں پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ بہت کم حدیثیں ہیں جو صحیح ہیں یا کہ بہت حدیثیں ہیں جن کی صحت کا کافی ثبوت موجود نہیں ہے۔ یہ صدا اگرچہ جدت کی وجہ سے کسی قدر نامانوس صدا تھی۔

امام صاحبؒ کا خیال تھا کہ بہت کم حدیثیں صحیح ہیں

اور اسی وجہ سے بعض ارباب حدیث نے نہایت سخت مخالفت کی لیکن امام صاحب اس خیال پر مجبور بلکہ معذور تھے، انہوں نے یہ رائے مقلدانہ نہیں قائم کی تھی۔ وہ اپنے زمانہ کے اکثر شیوخ سے ملے تھے اور ان کے سرمایہ حدیث سے متمتع ہوئے تھے، حرمین کی بڑی بڑی درسگاہوں میں برسوں تعلیم پائی تھی۔ کوفہ، بصرہ، حرمین میں ارباب روایت کا جو گروہ موجود تھا۔ برسوں کے تجربے سے ان کے ذاتی اوصاف، اخلاق وعادات پر اطلاع حاصل کی تھی، غرض اس مسئلہ کے متعلق اثباتاً یا نفیاً مجتہدانہ رائے قائم کرنے کے لئے جو شرطیں درکار تھیں، سب ان میں موجود تھیں۔

اس خیال کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ یہ مسئلہ کسی نہ کسی پیرایہ میں ان کے خاندانِ تعلیم میں وراثۃً چلا آتا تھا۔ حدیث وفقہ میں ان کے خاندانِ تعلیم کے مورثِ اول عبداللہ بن مسعودؓ ہیں اور مذہب حنفی کی بنیاد زیادہ تر انہی کی روایات واستنباط پر ہے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اگرچہ بہت بڑے محدث تھے لیکن اور محدثین صحابہ کی نسبت قلیل الروایۃ تھے جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ مشدد اور محتاط تھے۔ علامہ ذہبی ان کے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ کان ممن یتحری فی الاداء ویشدد فی الروایۃ وکان یقل من الروایۃ الحدیث یعنی عبداللہ بن مسعودؓ آداء میں تحری اور روایت میں تشدد کرتے تھے اور حدیث کی روایت کم کرتے تھے۔ ابراہیم نخعی جو عبداللہ بن مسعودؓ کے بہ یک واسطہ شاگرد اور امام ابوحنیفہؒ کے بہ یک واسطہ استاد تھے۔ ان کا بھی یہی مذہب تھا اور اسی وجہ سے وہ صیرفی الحدیث کہلاتے تھے، امام ابوحنیفہؒ نے گو اور بہت درسگاہوں میں تعلیم پائی تھی لیکن ان کی معلومات اور خیالات کا اصلی مرکز یہی خاندانی اثر تھا جس نے ان کے دل میں یہ خیال پیدا کیا اور اس کو ان کے ذاتی تجربہ اور دقتِ نظر نے اور بھی قوت دی۔

پیدا کرنے کی اس سے بڑھ کر کوئی تدبیر نہ تھی، ان باتوں نے ان کو معلوماتِ مذہبی کا اس قدر شائق بنا دیا تھا کہ خود عرب ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتے تھے، غرض تمام ممالکِ اسلامیہ میں گھر گھر حدیث و روایت کے چرچے تھے اور سینکڑوں ہزاروں درسگاہیں قائم ہو گئیں۔

لیکن جس قدر اشاعت کو وسعت حاصل ہوتی جاتی تھی، اعتماد اور صحت کا معیار کم ہوتا جاتا تھا ارباب روایت کا دائرہ اس قدر وسیع تھا کہ اس میں مختلف خیال، مختلف عادات، مختلف عقائد، مختلف اقوام کے لوگ شامل تھے، اہلِ بدعت جا بجا پھیل گئے تھے اور اپنے مسائل کی ترویج میں مصروف تھے، سب سے زیادہ یہ کہ پوری ایک صدی گزر جانے پر بھی کتابت کا طریقہ مروج نہیں ہوا تھا۔ ان اسباب سے روایتوں میں اس قدر بے احتیاطیاں ہوئیں کہ موضوعات اور اغالیط کا ایک دفترِ بے پایاں تیار ہو گیا۔ یہاں تک کہ امام بخاری نے اپنے زمانہ میں صحیح حدیثوں کا جدا کرنا چاہا تو کئی لاکھ سے انتخاب کر کے جامع صحیح لکھی جس میں کل ۷۳۹۷ حدیثیں ہیں ان میں بھی اگر مکررات نکال ڈالی جائیں تو صرف ۲۷۶۱ حدیثیں باقی رہتی ہیں۔

زنادقہ نے چودہ ہزار حدیثیں اور ایک شخص نے چار ہزار حدیثیں وضع کیں

سینکڑوں ہزاروں بلکہ لاکھوں حدیثیں دانستہ لوگوں نے وضع کر لیں، حماد بن زید کا بیان ہے کہ چودہ ہزار حدیثیں صرف ایک فرقہ زنادقہ نے وضع کر لیں۔ عبدالکریم ضاع نے خود تسلیم کیا تھا کہ چار ہزار حدیثیں اس کی موضوعات سے ہیں۔ بہت سے ثقات اور پارسا تھے، جو نیک نیتی سے فضائل اور ترغیب میں حدیثیں وضع کر لیتے تھے، حافظ زین الدین عراقی لکھتے ہیں کہ ان حدیثوں نے بہت ضرر پہونچایا کیونکہ ان واضعین کے تشقہ اور تورع و زہد کی وجہ سے یہ حدیثیں اکثر مقبول ہو گئیں اور رواج پا گئیں "

وضع کے بعد مساہلات، غلط فہمیوں، بے احتیاطیوں کا درجہ تھا، جن کی وجہ سے ہزاروں اقوال رسول اللہ کی طرف بے قصد منسوب ہو گئے، بعض محدثین کا قاعدہ تھا کہ حدیث کے ساتھ تفسیر بھی بیان کرتے جاتے تھے اور اکثر حروف تفسیر حذف کر دیتے تھے جس سے سامعین کو دھوکا ہوتا تھا۔ اور وہ ان کے تفسیری جملوں کو حدیث مرفوع سمجھ لیتے تھے، تعجب یہ ہے کہ اس قسم کے مسامحات بڑے بڑے ائمہ فن سے صادر ہوتے۔ امام زہری جو امام مالک کے استاد اور حدیث کے ایک بڑے رکن تھے، ان کی نسبت علامہ سخاوی لکھتے ہیں۔ وکذا کان الزھری تفسیر الحدیث کثیرا ور بما اسقط اداۃ التفسیر یعنی اسی طرح زہری اکثر حدیث کی تفسیر کرتے تھے اور وہ حرف جن سے اس عبارت کا تفسیر ہونا ظاہر ہو چھوڑ دیتے تھے .. وکیع کا بھی یہی حال تھا، وہ اکثر حدیث کے بیچ بیچ میں "یعنی" کہہ کر مطلب بیان کرتے جاتے تھے اور اکثر "یعنی" کا لفظ چھوڑ دیتے تھے جس سے سامعین کو اشتباہ ہوتا تھا، کتب رجال و اصول حدیث میں اس قسم کی اور بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔

بڑی آفت تدلیس کی تھی جس کا ارتکاب بڑے بڑے ائمہ فن کرتے تھے، اس تدلیس نے اسناد کے اتصال کو بالکل مشتبہ کر دیا تھا۔ ان کے سوا اور بہت سی بے احتیاطیاں تھیں جن کی تفصیل حدیث کی کتابوں میں مل سکتی ہے۔

حضرت عثمانؓ و حضرت علیؓ کی مجموعی خلافت بیس اکیس برس تک رہی۔ اس میں احادیث کی زیادہ اشاعت ہوئی، صحابہ دور دور پہونچ گئے تھے، ضرورتیں بڑھتی جاتی تھیں، نئے نئے مسئلے پیش آتے، ان اسباب نے حدیث و روایت کے سلسلے کو بہت وسعت دی، حضرت عثمانؓ کے اخیر زمانہ میں بغاوت ہوئی جس کا خاتمہ خلیفۂ وقت کی شہادت پر ہوا، اور یہ پہلا موقع تھا کہ جماعتِ اسلام میں فرقہ بندیاں قائم ہوئیں۔

حدیثوں کا وضع کیا جانا

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت شروع ہی سے پرآشوب رہی، ان اختلافات اور فتن کے ساتھ وضع احادیث کی ابتداء ہوئی اور اگرچہ کثرت اور انتشار زیادہ تر زمانہ مابعد میں ہوا لیکن خود صحابہ کے عہد میں اہلِ بدعت نے سینکڑوں ہزاروں حدیثیں ایجاد کرلی تھیں۔ مقدمہ صحیح مسلم میں ہے کہ ایک بار بشیر عدوی حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے پاس آیا اور حدیث بیان کرنی شروع کی، انہوں نے کچھ خیال نہ کیا، بشیر نے کہا، ابن عباسؓ! میں رسول اللہ سے روایت کر رہا ہوں اور تم متوجہ نہیں ہوتے۔ فرمایا کہ "ایک زمانہ میں ہمارا یہ حال تھا کہ کسی کو قال رسول اللہ کہتے سنتے تو فوراً ہماری نگاہیں اٹھ جاتی تھیں اور کان لگا کر سنتے تھے لیکن جب سے لوگوں نے نیک و بد میں تمیز نہیں رکھی، ہم صرف ان حدیثوں کو سنتے ہیں جن کو ہم خود بھی جانتے ہیں۔"

زبانی روایت سے گذر کر تحریروں میں بھی جعل شروع ہوگیا تھا۔ مسلم نے روایت کی ہے کہ ایک دفعہ عبداللہ بن عباسؓ حضرت علیؓ کے ایک فیصلہ کی نقل لے رہے تھے، بیچ بیچ میں الفاظ چھوڑتے جاتے تھے اور کہتے تھے کہ "واللہ علیؓ نے ہرگز یہ فیصلہ نہیں کیا ہوگا۔" اسی طرح ایک اور دفعہ عبداللہ بن عباسؓ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک تحریر دیکھی تو تھوڑے سے الفاظ کے سوا باقی عبارت مٹا دی۔

وضع حدیث اور روایت میں بے احتیاطی کے اسباب

لوگوں کو وضع حدیث کی زیادہ جرأت اس وجہ سے ہوتی تھی کہ اس وقت تک اسناد و روایت کا طریقہ جاری نہیں ہوا تھا۔ جو شخص چاہتا تھا قال رسول اللہ کہہ دیتا تھا اور اثباتِ سند کے مواخذہ سے بری رہتا تھا۔ ترمذی نے کتاب العلل میں امام ابن سیرینؒ سے روایت کی ہے کہ پہلے زمانہ میں لوگ اسناد نہیں پوچھا کرتے تھے، جب فتنہ پیدا ہوا تو اسناد کی پوچھ گچھ ہوئی تاکہ اہلِ سنت کی حدیثیں لی جائیں اور اہلِ بدعت کی ترک کی جائیں لیکن حدیث کی بے اعتباری اہلِ بدعت پر موقوف نہ تھی اس لئے یہ احتیاط چنداں مفید نہ ہوئی اور غلطیوں کا سلسلہ برابر جاری رہا۔

بنو امیہ کا دور شروع ہوا اور بڑے زور شور سے حدیث نے ترویج پائی۔ صحابہ کی تعداد جس قدر کم ہوتی جاتی تھی اسی قدر ان کی قدر اور ان کی طرف التفات بڑھتا جاتا تھا، تمدن میں کچھ ترقی ہوگئی تھی، نئی نئی قومیں مسلمان ہوتی جاتی تھیں، ان نومسلموں کو ادھر تو اسلام کا نیا جوش تھا ادھر قوم فاتح کے مجمع میں عزت و اثر

جمعہ و عیدین سرے سے مامور بہ نہ تھے، ۲ھ یعنی نبوت سے تیرہویں برس روزے فرض ہوئے، زکوٰۃ کی نسبت اختلاف ہے، علامہ ابن الاثیر نے لکھا ہے کہ ۹ھ میں فرض ہوئی، حج کا حکم بھی اسی سنہ میں ہوا، غرض آغازِ نبوت سے ایک مدت تک نماز کے سوا نہ اور احکام صادر ہوئے تھے نہ ان کے متعلق حدیثیں اور روایتیں پیدا ہوئی تھیں، صحابہ مسائل و احکام کے متعلق زیادہ پرس و جو نہیں کرتے تھے، خود قرآن میں حکم آچکا تھا۔ لاتسئلوا عن اشیاء ان تبد لکم تسؤکم۔

عبداللہ بن عباسؓ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب سے کسی قوم کو بہتر نہیں دیکھا! تمام زمانہ نبوت میں صرف تیرہ مسئلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھے جو سب قرآن میں مذکور ہیں اور صحابہ سے بھی اسی قسم کے اقوال منقول ہیں۔

جو احکام اور واقعات پیش آتے تھے، ان میں روایت کا سلسلہ کم جاری ہوا تھا۔ صحابہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ لیا کرتے تھے اور واسطہ در روایت کی کم ضرورت پڑتی تھی، حدیثوں کے قلم بند کرنے کی اجازت نہ تھی، صحیح مسلم میں روایت ہے کہ لاتکتبوا عنی شیئاً غیر القرآن ومن کتب عنی شیئاً غیر القرآن فلیمحہ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکرؓ کی خلافت شروع ہوئی، ابتداء ہی میں عرب کی بغاوتِ عام کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اس سے فارغ ہو کر روم، ایران کی مہمیں شروع ہو گئیں اور ان کی مختصر خلافت میں حدیثوں کی چنداں اشاعت نہ ہو سکی۔

حضرت عمرؓ کثرتِ روایت سے روکتے تھے

حضرت عمرؓ نے سات برس خلافت کی اور ملک میں نہایت امن و امان رہا لیکن وہ دانستہ حدیثوں کی کثرت کو روکتے رہے۔ علامہ ذہبی نے طبقات الحفاظ میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ اس خوف سے حدیث بیان کرنے والا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غلط روایت منسوب نہ کر دے صحابہ کو ہمیشہ حکم دیتے تھے کہ حدیثیں کم بیان کیا کریں۔ ایک بار انصار کے ایک گروہ کو کوفہ بھیجا، چلتے وقت ان سے فرمایا کہ تم لوگ کوفہ جا رہے ہو، وہاں ایک قوم سے ملو گے جو بڑی رقت سے قرآن کی تلاوت کرتے ہیں وہ تمہاری آمد سنکر مشتاق ہوں گے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب آئے ہیں، لیکن جب وہ تمہارے پاس آئیں اور حدیثیں سننی چاہیں تو زیادہ حدیثیں نہ بیان کرنا۔ اسی طرح عراق کو صحابہ جانے لگے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خود ان کی مشایعت کی اور ان سے پوچھا کہ جانتے ہو میں کیوں تمہارے ساتھ آرہا ہوں۔ لوگوں نے کہا "تکرمۃ علینا" یعنی ہماری عزت افزائی کے لئے۔ فرمایا کہ ہاں۔ لیکن ایک اور مقصد ہے۔ وہ یہ کہ جہاں جا رہے ہو وہاں کے لوگ اکثر قرآن کی تلاوت کیا کرتے ہیں ان کو حدیثوں میں نہ پھنسا لینا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کم روایت کرنا۔ چنانچہ جب یہ لوگ قرظہ پہونچے تو لوگ یہ سنکر کہ صحابہ تشریف لائے ہیں، زیارت کو آئے اور حدیثوں کی خواہش ظاہر کی۔ ان لوگوں نے اس بنا پر انکار کیا کہ حضرت عمرؓ نے منع کیا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے ابوسلمہ نے پوچھا کہ آپ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بھی اس طرح حدیثیں روایت کیا کرتے تھے بولے کہ نہیں ورنہ عمرؓ درّے مارتے۔

اُن کی شریعت

ڈاکٹر محبوب راہی

اُنؐ کے افکار عمل ان کا شریعت اُنؐ کی
رہنما جادۂ ہستی میں ہے سیرت اُنؐ کی

سارے نبیوں سے الگ شانِ نبوّت اُنؐ کی
منفرد سارے رسولوں سے رسالت اُنؐ کی

رہبری اُنؐ کی ہر اک گام ہدایت اُنؐ کی
کامرانی کی بشارت ہے قیادت اُنؐ کی

روزِ محشر جو ہو مطلوب شفاعت اُنؐ کی
ہم پہ لازم ہے ہر اک گام اطاعت اُنؐ کی

تا قیامت ہیں جہاں بھر کے لئے مشعلِ راہ
نظریات اُنؐ کے اصول اُنؐ کے سیادت اُن کی

ایسا اُمّی جسے علموں کا سمندر کہیے
نکتہ سنجی وہ فصاحت وہ بلاغت اُنؐ کی

ان کا ہر نقشِ قدم ہے مرا رہبر راہی
میری منزل ہے وہی جو بھی ہے سُنّت اُنؐ کی

سلسلہ حدیث کی مختصر تشریح

اسناد وروایت کا سلسلہ اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک ہی میں شروع ہوچکا تھا لیکن
اس وقت تک جس قدر تھا۔ نہایت سادہ اور قدرتی صورت میں تھا، آغاز نبوت سے تیرہ برس کا زمانہ تو ایسا
پرآشوب زمانہ تھا کہ اپنی اپنی جان کی پڑی تھی اسناد وروایت کا کہاں موقع تھا، اسی ضرورت سے احکام
دفرائض بھی کم تھے یعنی نماز کے سوا اور کچھ فرض نہ ہوا تھا کیونکہ اس زحمت میں اور فرائض کی تکلیف، تکلیف
مالایطاق سے کم نہ تھی، نمازیں بھی مختصر تھیں یعنی ظہر، عصر، عشاء سب میں صرف دو دو رکعتیں فرض تھیں،

پیشوا اور امام ہیں۔ حفاظِ حدیث کے حالات میں ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔ دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ یہ ان لوگوں کا تذکرہ ہے جو علم نبوی کے حامل ہیں اور جن کے اجتہاد پر توثیق اور تضعیف، تصحیح و تزئیف میں رجوع کیا جاتا ہے۔ علامہ موصوف نے تمام کتاب میں اس اصول کو ملحوظ رکھا ہے اور کسی ایسے شخص کا حال نہیں لکھا جو علمِ حدیث کا بڑا ماہر نہ ہو، چنانچہ خارجہ بن زید بن ثابت کا ضمناً ایک موقع پر ذکر آگیا ہے تو لکھتے ہیں کہ میں نے ان کو حفاظِ حدیث میں اس لئے ذکر نہیں کیا کہ وہ قلیل الحدیث تھے، امام ابوحنیفہؒ کے محدث ہونے کا اس سے زیادہ کیا ثبوت درکار ہے کہ علامہ ذہبیؒ نے اس کتاب میں ان کا ترجمہ لکھا ہے اور ان کو حفاظِ حدیث میں شمار کیا ہے۔

حافظ ابوالمحاسن دمشقی شافعی نے عقود الجمان میں ایک خاص باب باندھا ہے جس کے یہ الفاظ ہیں۔ الباب الثالث والعشرون فی بیان کثرۃ حدیثہ وکونہ من اعیان الحفاظ المحدثین یعنی تئیسواں باب اس بیان میں کہ وہ (امام ابوحنیفہؒ) کثیر الحدیث اور اعیان الحفاظ سے تھے، قاضی ابویوسف صاحب جن کو یحییٰ بن معین صاحب الحدیث کہتے تھے اور علامہ ذہبی نے ان کو حفاظِ حدیث میں محسوب کیا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ ہم لوگ امام ابوحنیفہ سے مسائل میں بحث کرتے ہوتے تھے، جب ان کی رائے قائم ہوجاتی تھی تو میں حلقہ درس سے اٹھ کر کوفہ کے محدثین کے پاس جاتا تھا اور ان سے مسئلہ کے متعلق حدیثیں دریافت کرکے امام صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ امام صاحب ان حدیثوں میں سے بعض کو قبول کرتے تھے اور بعض کو فرماتے تھے کہ صحیح نہیں، میں پوچھتا کہ آپ کو کیونکر معلوم ہوا۔ فرماتے کہ "کوفہ میں جو علم ہے میں اس کا عالم ہوں۔

یہ تمام باتیں اس بات کی دلیل ہیں کہ علم حدیث میں امام ابوحنیفہ کا کیا پایہ تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان باتوں نے امام ابوحنیفہؒ کو امام ابوحنیفہ نہیں بنایا اگر وہ حافظ الحدیث تھے تو اور لوگ بھی تھے، اگر ان کے شیوخِ حدیث کئی سو تھے تو بعض ائمہ سلف کے شیوخ کئی کئی ہزار تھے۔ اگر انہوں نے کوفہ وحرمین کی درسگاہوں میں تعلیم پائی تھی تو اوروں نے بھی یہ شرف حاصل کیا تھا، امام ابوحنیفہؒ کو جس بات نے تمام ہمعصروں میں امتیاز دیا اور چیز ہے، جو ان سب باتوں سے بالاتر ہے یعنی احادیث کی تنقید اور بلحاظ ثبوت احکام ان کے مراتب کی تفریق۔ امام ابوحنیفہ کے بعد علم حدیث کو بہت ترقی ہوئی، غیر مرتب اور پریشان حدیثیں یکجا کی گئیں، صحاح کا التزام کیا گیا، اصول حدیث کا مستقل فن قائم ہوگیا جس کے متعلق سینکڑوں بیش بہا کتابیں تصنیف ہوئیں، زمانہ اس قدر ترقی کرگیا ہے کہ باریک بینی اور دقت آفرینی کی حد نہیں رہی۔ تجربہ اور دقت نظر نے سینکڑوں نئے نکتے ایجاد کئے لیکن تنقید احادیث، اصول و روایت، امتیاز مراتب میں امام ابوحنیفہ کی تحقیق کی جو حد ہے آج بھی ترقی کا قدم اس سے آگے نہیں بڑھتا۔

اس اجمال کی تفصیل اس وقت سمجھ میں آسکتی ہے کہ فن حدیث کے آغاز اور طرز ترقی کا اجمالی نقشہ کھینچا جائے جس سے ظاہر ہو کہ روایتوں کا سلسلہ کیونکر پیدا ہوا اور کس کس دور میں اس کی کیا کیا حالتیں بدلیں، اسی سے ایک بات کا اندازہ ہوسکے گا کہ احادیث کی تنقید میں اجتہاد رائے کا کس قدر کام ہے اور امام ابوحنیفہؒ کو اس لحاظ سے اپنے تمام فنون میں کیا خاص امتیاز حاصل ہے۔

اس کے ساتھ امام صاحب کے شاگردوں پر لحاظ کرو۔ یحییٰ بن سعید القطان جو فنِ جرح و تعدیل کے امام ہیں، عبدالرزاق بن ہمام جن کی جامع کبیر سے امام بخاری نے فائدہ اٹھایا ہے۔ یزید بن ہارون جو امام احمد بن حنبلؒ کے استاد تھے۔ وکیع بن الجراح جن کی نسبت امام احمد بن حنبلؒ کہا کرتے تھے کہ حفظ اسناد روایت میں میں نے ان کا ہمسر کسی کو نہیں دیکھا، عبداللہ بن المبارک جو فنِ حدیث میں امیر المؤمنین تسلیم کئے گئے ہیں، یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہ جن کو علی بن المدینی (استاد بخاری) منتہائے علم کہا کرتے تھے۔ یہ لوگ برائے نام امام صاحبؒ کے شاگرد نہ تھے بلکہ برسوں ان کے دامنِ فیض میں تعلیم پائی تھی اور اس انتساب پر ان کو فخر و ناز تھا۔ عبداللہ بن المبارکؒ کہا کرتے تھے کہ اگر خدا نے ابوحنیفہؒ و سفیان ثوریؒ سے میری مدد نہ کی ہوتی تو میں ایک معمولی آدمی ہوتا۔ وکیع اور یحییٰ بن ابی زائدہ امام صاحبؒ کی صحبت میں اتنی مدت تک رہے تھے کہ صاحب ابی حنیفہ کہلاتے تھے۔ کیا اس رتبہ کے لوگ جو خدمتِ حدیث اور روایت کے پیشوا اور مقتدا تھے کسی معمولی شخص کے سامنے سر جھکا سکتے تھے۔

اجتہاد کی شرط اور امام ابوحنیفہؒ کا مجتہد مطلق ہونا

ان باتوں کے علاوہ امام ابوحنیفہؒ کا مجتہد مطلق ہونا ایک مسلّم مسئلہ ہے جس سے بارہ سو برس کی مدت میں شاید ایک آدھ ہی شخص نے انکار کیا ہو، اجتہاد کی تعریف علمائے حدیث مثلاً بغوی، رافعی، علامہ نووی وغیرہ نے ان لفظوں میں کی ہے۔ مجتہد وہ شخص ہے جو قرآن، حدیث، مذاہب سلف، لغت، قیاس ان پانچ چیزوں میں کافی دستگاہ رکھتا ہو یعنی مسائلِ شرعیہ کے متعلق جس قدر قرآن میں آیتیں ہیں، جو حدیثیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں، جس قدر علم لغت درکار ہے، سلف کے جو اقوال ہیں، قیاس کے جو طریق ہیں قریب قریب کل کو جانتا ہو، اگر ان میں سے کسی میں کمی ہے تو وہ مجتہد نہیں ہے اور اس کو تقلید کرنی چاہیئے۔

اسی بنا پر علامہ ابن خلدون نے فصل علوم الحدیث میں مجتہدین کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ بعض ناانصاف مخالفین کا قول ہے کہ ان مجتہدوں میں سے بعض فنِ حدیث میں کم مایہ تھے اس لئے ان کی روایتیں کم ہیں، لیکن یہ خیال غلط ہے کہ ائمہ کبار کی نسبت یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کیونکہ شریعت قرآن و حدیث سے ماخوذ ہے پس جو شخص حدیث میں کم مایہ ہے اس کو تلاش اور کوشش کرنی چاہیئے تاکہ دین کو اصول صحیحہ سے اخذ کر سکے۔ اس کے بعد علامہ موصوف لکھتے ہیں کہ فنِ حدیث میں امام ابوحنیفہؒ کا کبار مجتہدین میں ہونا اس سے ثابت ہے کہ ان کا مذہب محدثین میں معتبر خیال کیا جاتا ہے اور ردّاً و قبولاً اس سے بحث کی جاتی ہے۔ علامہ موصوف نے اس کا سبب بھی بتایا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کی روایتیں کم کیوں ہیں۔ ہم خود اس کو مفصل لکھیں گے۔

محدث ذہبیؒ نے امام ابوحنیفہؒ کو حفاظِ حدیث میں محسوب کیا ہے

محدثین میں بھی اکثروں نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ علامہ ذہبی نے جو زمانہ مابعد کے تمام محدثین کے

نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ایسا لگا پہنچ کے مدینے کہ جیسے ہم واپس گھر اپنے آئے ہیں لمبے سفر کے بعد

ہیں بے شمار "ختم نبوت" کے جانثار
سر سینکڑوں کٹیں گے تمنا کے سر کے بعد

عبدالحق تمنا

قیاس کی کثرت استعمال کے ساتھ اس کے اصول و قواعد بھی مرتب کرنا پڑے، اس بات نے ان کو رائے اور قیاس کے انتساب سے زیادہ شہرت دی، چنانچہ تاریخوں میں جہاں ان کا نام لکھا جاتا ہے۔ امام اہل الرائے لکھا جاتا ہے۔

اس شہرت کی ایک اور وجہ ہوئی، عام محدثین حدیث و روایت میں درایت سے بالکل کام نہیں لیتے تھے۔ امام ابوحنیفہؒ نے اس کی ابتدا کی اور اس کے اصول و قواعد منضبط کئے، انہوں نے بہت سی حدیثیں اس بنا پر قبول نہ کیں کہ اصولِ درایت کے موافق ثابت نہ تھیں اس لئے اس لقب کو زیادہ شہرت ہوئی کیونکہ درایت اور رائے مترادف سے الفاظ ہیں اور کم از کم یہ کہ عام لوگ ان دونوں میں فرق نہیں کر سکتے تھے۔

ان عارضی بحثوں کے بعد ہم اصل مسئلہ پر متوجہ ہوتے ہیں یعنی یہ کہ امام ابوحنیفہؒ کو فنِ حدیث میں کیا رتبہ حاصل تھا، اس بحث کے فیصلے کے لئے ان کی علمی زندگی کے ان واقعات پر نظر ڈالنی چاہئے جو نہایت صحیح اور مستند روایتوں سے ثابت ہیں، اس کتاب میں ہم امام ابوحنیفہؒ کی تحصیل حدیث کے حالات ان کتابوں کی سند سے لکھ آئے ہیں جن پر فنِ رجال کا دار و مدار ہے۔ اب غور کرو کہ جس شخص نے بیس برس کی عمر سے جو فہم کی درستی اور پختگی کا زمانہ ہے۔ علمِ حدیث پر توجہ کی ہو اور ایک مدت تک اس شغل میں مصروف رہا ہو، جس نے کوفہ کے مشہور شیوخِ حدیث سے حدیثیں سیکھی ہوں، جو حرم محترم کی درسگاہوں میں تحصیل حدیث کرتا رہا ہو، جس کو مدینہ منورہ کے شیوخ نے سندِ فضیلت دی ہو، جس کے اساتذۂ حدیث عطا بن ابی رباح، نافع ابن عمر دینار، محارب بن دثار، اعمش کوفی، امام باقر، علقمہ بن مرثد، مکحول شامی، امام اوزاعی، محمد بن مسلم الزہری، ابواسحٰق سبیعی، سلیمان بن یسار، عبدالرحمٰن بن ہرمز الاعرج، منصور المعتمر، ہشام بن عروہ وغیرہ ہوں جو فنِ روایت کے ارکان ہیں اور جن کی روایتوں سے بخاری و مسلم مالا مال ہیں وہ حدیث میں کس رتبہ کا شخص ہوگا۔

المعارف میں اہل الرائے کی سرخی سے ایک باب باندھا ہے اور عنوان کے نیچے یہ نام لکھے ہیں، ابن ابی لیلیٰ، ابوحنیفہ ربیعۃ الرائے، زفر، اوزاعی، سفیان ثوری، مالک بن انس، قاضی ابو یوسف، محمد بن حسن۔ ابن قتیبہ نے ۲۷۶ھ میں وفات پائی، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کم ازکم تیسری صدی تک مذکورہ بالا لوگ اہل الرائے کے لقب سے مشہور تھے اگرچہ یہ سب لوگ درحقیقت (زفر کے سوا) محدث ہیں لیکن امام مالکؒ، سفیان ثوریؒ، امام اوزاعیؒ کی شہرت تو محتاجِ بیان نہیں۔

محدثین میں دو گروہ تھے

اصل یہ ہے کہ جو لوگ علمِ حدیث کے درس وتدریس میں مشغول تھے، ان میں دو فرقے قائم ہو گئے تھے۔ ایک وہ جن کا کام صرف حدیثوں اور روایتوں کا جمع کرنا تھا۔ وہ حدیث سے صرف من حیث الروایۃ بحث کرتے تھے یہاں تک کہ ان کو ناسخ ومنسوخ سے بھی سروکار نہ تھا، دوسرا فرقہ حدیثوں کو استنباطِ احکام اور استخراجِ مسائل کے لحاظ سے دیکھتا ہے اور کوئی نصِ صریح نہیں ملتی تھی۔ تو قیاس سے کام لیتا تھا اگرچہ یہ دونوں حیثیتیں دونوں فریق میں کسی قدر مشترک تھیں لیکن وصف غالب کے لحاظ سے ایک دوسرے سے ممتاز تھا، پہلا فرقہ اہل الروایۃ اور اہل الحدیث اور دوسرا فرقہ مجتہد اور اہل الرائے کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ امام مالکؒ، سفیان ثوریؒ، اوزاعیؒ اسی لئے اہل الرائے کہلائے کہ وہ محدث ہونے کے ساتھ مجتہد مستقل اور بانی مذہب تھے لیکن چونکہ ان لوگوں میں بھی معلومات حدیث اور قوتِ اجتہاد کے لحاظ سے اختلاف مراتب تھا، اس لئے اضافی طور پر کبھی کبھی اس فرقے میں سے ایک کو اہل الرائے اور دوسرے کو اہلِ حدیث کہتے تھے مثلاً امام مالکؒ کی بہ نسبت امام ابوحنیفہؒ پر مجتہد اور اہل الرائے کا لقب زیادہ موزوں تھا، امام احمد بن حنبلؒ سے ایک بار نضر بن یحییٰ نے پوچھا کہ آپ لوگوں کو ابوحنیفہؒ پر کیا اعتراض ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ "رائے"، نضر نے کہا کیا امام مالکؒ رائے پر نہیں عمل کرتے، امام احمد بن حنبلؒ بولے کہ ہاں لیکن ابوحنیفہؒ رائے کو زیادہ دخل دیتے ہیں، نضر نے کہا تو حصہ رسدی کے موافق دونوں پر الزام آنا چاہئے، نہ صرف ایک پر، امام احمد بن حنبلؒ کچھ جواب نہ دے سکے اور چپ ہو گئے۔

اہل الرائے کے لقب سے مشہور ہونے کی وجہ

امام ابوحنیفہؒ سے پہلے فقہ کوئی مستقل اور مرتب فن نہ تھا، امام صاحبؒ نے جب اس کی تدوین کی تو ہزاروں مسئلے ایسے پیش آئے جن میں کوئی حدیث صحیح بلکہ صحابہ کا قول بھی موجود نہ تھا اس لئے ان کو قیاس سے کام لینا پڑا، قیاس پر پہلے بھی عمل تھا، خود صحابہ قیاس کرتے تھے اور اس کے مطابق فتوے دیتے تھے (اس کا مفصل بیان آگے آئے گا) لیکن اس وقت تک تمدن کو چنداں وسعت حاصل نہ تھی اس لئے نہ کثرت سے واقعات پیش آتے تھے، نہ چنداں قیاس کی ضرورت پڑتی تھی، امام صاحب نے فقہ کو مستقل فن بنانا چاہا

بن اسمٰعیل البخاری فقد ذکر الشافعی فی تاریخہ الکبیر فقال فی باب محمد بن عبد اللہ محمد الشافعی القرشی مات سنۃ اربع ومأتین ثم انہ ماذکرہ فی باب الضعفآء مع علمہ بانہ قد روی شیئاً کثیراً من الحدیث ولوکان من الضعفآء فی ھذا الباب لذکرہ ۔"یعنی امام بخاریؒ نے شافعیؒ کا ذکر تاریخ کبیر میں کیا ہے، چنانچہ فلاں باب میں لکھا ہے کہ محمد بن ادریس بن عبداللہ محمد الشافعی القرشی نے ۲۰۴ھ میں وفات پائی لیکن ان کو ضعفاء کے باب میں ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ امام بخاری جانتے تھے کہ شافعی نے بہت سی حدیثیں روایت کی ہیں اور اگر وہ اس باب میں ضعیف ہوتے تو امام بخاری ضرور ان کو ضعیف لکھتے "

امام اوزاعی جو محدث اور مجتہد مستقل تھے اور بلادِ شام میں ان کا وہی اعزاز و اعتبار تھا جو عرب و عراق میں امام مالکؒ و شافعیؒ کا ان کی نسبت کسی نے امام احمد بن حنبلؒ سے رائے پوچھی فرمایا۔ حدیث ضعیف و رای ضعیف۔

لطف یہ ہے کہ مجتہدین جس چیز پر فخر کر سکتے ہیں وہ دقتِ نظر، قوتِ استنباط، استخراجِ مسائل، تفریعِ احکام ہے لیکن محدثین کے ایک گروہ کے نزدیک یہی باتیں عیب و نقص میں داخل ہیں۔ علامہ ابوجعفر محمد بن جریر طبری، قاضی ابویوسف کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ اہلِ حدیث میں سے ایک گروہ نے ان کی روایت سے اس بنا پر احتراز کیا کہ ان پر رائے غالب تھی اور فروعِ احکام کی تفریع کرتے تھے۔ ان باتوں کے ساتھ بادشاہ کی صحبت میں رہتے تھے اور منصبِ قضا پر مامور تھے۔ اگر فروع اور احکام کا استنباط بھی جرم ہے تو بے شبہ امام ابوحنیفہؒ قاضی ابویوسفؒ سے زیادہ مجرم ہیں۔

البتہ یہ بات غور کے قابل ہے کہ امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اتباع کو کیوں اہل الرائے کہا جاتا تھا، اس بات میں اکثر لوگوں نے غلطی کی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے شہرت عام کے مقابلے میں تحقیق کی پروا نہ کی۔

اہل الرائے کی تحقیق

اس بحث کے تصفیہ کے لئے سب سے پہلے یہ پتہ لگانا چاہئے کہ یہ لقب کب ایجاد ہوا، اور کن لوگوں پر اطلاق کیا گیا۔ جہاں تک ہم کو علم ہے اس لقب کے ساتھ اول جس کو یہ امتیاز حاصل ہے وہ ربیعۃ الرائے ہیں جو امام مالکؒ کے استاد اور شیخ الحدیث تھے، رائے کا لفظ ان کے نام کا جز بن گیا ہے اور تاریخ اور اسماء الرجال میں ہمیشہ ان کا نام ربیعۃ الرائے لکھا جاتا ہے۔ یہ مشہور محدث اور فقیہ تھے اور بہت سے صحابہ سے ملے تھے۔ علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں ان سے احتجاج کیا ہے۔ عبدالعزیز ماجشون کا قول ہے کہ "واللہ میں نے ربیعہ سے زیادہ کسی کو حافظ الحدیث نہیں دیکھا"

جو لوگ اہل الرائے کے لقب سے مشہور تھے

اسی زمانہ میں اور اس کے بعد کے اور لوگ بھی اس لقب سے پکارے گئے، محدث ابن قتیبہ نے کتاب

نذرانہ

ہر اِک قدم پہ جنّتِ رضواں کا ہے گماں
سوئے حرم رواں ہے خیالوں کا کارواں

اللہ رے رسولِ مقدّس کا آستاں
ہر سو ہر تجلیاتِ الٰہی ہیں ضَو فشاں

اس سرزمیں کی خاک کو خاکِ شفا کہو
اُنؐ کے قدم کے نقش پڑے ہیں جہاں جہاں

اُنؐ کا خیال جیسے بہاروں کی تازگی
اُنؐ کا پیام جیسے ستاروں کا سائباں

اُنؐ کا مزاج خلقِ معلیٰ کی صبحِ نو
اُنؐ کا بیان مصحفِ قرآں کا ترجماں

قائم ہے اُنؐ کے فیض سے معیارِ زندگی
روشن ہے اُنؐ کی ذات سے تہذیب کا نشاں

خوش بخت ہوں کہ اُنؐ کی غلامی ملی نصیر
ورنہ وہ ذاتِ پاک کہاں اور میں کہاں

صلّے اللہ علیہ وسلم

نصیر سراجی، بنارس

لوگوں کے لئے کم گنجائش تھی۔ علامہ قسطلانی نے شرح صحیح بخاری میں لکھا ہے کہ امام بخاریؒ فرمایا کرتے تھے کہ
نے کسی ایسے شخص سے حدیث نہیں لکھی جس کا یہ قول نہ تھا الایمان قول وعمل، اگر یہ صحیح ہے تو امام ابوحنیفہ
ان کے دربار میں پہونچنے کی کیونکر امید ہو سکتی تھی۔
امام بخاریؒ نے تاریخ کبیر میں امام شافعیؒ کا ذکر کیا ہے لیکن جس بے پروائی سے کیا ہے اس کے لیے
امام رازیؒ نے یہی غنیمت سمجھا کہ تضعیف نہیں کی چنانچہ امام شافعیؒ کے فضائل میں فرماتے ہیں۔ واما الامام

توجہ کی ہوتی تو ہم لوگوں کو سب سے بے نیاز کر دیا ہوتا۔ (مناقب الشافعی الامام الرازی، خلفائے اربعہ کی نسبت یہ تعداد میں نے امام شافعی کے قول کے مطابق لکھی ہے اور محدثین کے نزدیک اس سے زیادہ حدیثیں ان لوگوں سے مروی ہیں۔ تاہم اس سے زیادہ تعداد نہیں پہونچتی، جس پر کثرتِ روایت کا اطلاق کیا جائے۔)

خلفائے اربعہ کی قلت روایت

اس قدر ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ مغازی، قصص، سیر وغیرہ میں ان کی نظر چنداں وسیع نہ تھی۔ امام مالکؒ و امام شافعیؒ کا بھی یہی حال تھا لیکن احکام و عقائد کے متعلق امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو جو واقفیت اور تحقیق حاصل تھی، اس سے انکار کرنا صرف کم نظری اور ظاہر بینی کا نتیجہ ہے، ان کی تصنیفات یا روایتوں کا مدون نہ ہونا قلتِ نظر کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ سے زیادہ کسی صحابی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جلوت و خلوت میں رہنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال سے جس قدر وہ واقف تھے اور کون ہو سکتا تھا لیکن حدیث کی تمام کتابوں میں ان کی روایت سے جس قدر صحیح حدیثیں ہیں ان کی تعداد ستر سے زیادہ نہیں۔ کون شخص کہہ سکتا ہے کہ ان کو صرف اسی قدر حدیثیں معلوم تھیں، حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بعد عمر فاروقؓ کا درجہ ہے، ان سے بھی پچاس حدیثیں مروی ہیں جن میں سے بعض کا کافی ثبوت نہیں، حضرت عثمانؓ اور جناب امیرؓ کا بھی یہی حال ہے۔ بخلاف ان کے حضرت ابوہریرہؓ سے ۵۳۴۶، انسؓ سے ۲۲۸۶، عبداللہ بن عباسؓ سے ۲۲۶۰، جابرؓ سے ۲۵۴۰، عبداللہ ابن عمرؓ سے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نوجوان تھے، ۲۶۳ حدیثیں مروی ہیں۔ اگر روایتوں کا موجود ہونا ہی معیار ہے، تو خلفائے اربعہ کی نسبت تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان کا حافظہ ضعیف اور نہایت ضعیف تھا یا دانستہ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کی طرف التفات اور توجہ نہ تھی سو حاشاھم عن ذالک۔

یہ سچ ہے کہ صحاح ستہ کے مصنفین نے امام صاحب سے روایت نہیں کی (دو ایک روایتیں مستثنیٰ ہیں) لیکن اس الزام میں اور ائمہ بھی ان کے شریک ہیں۔ امام شافعیؒ نے جن کو بڑے بڑے محدثین مثلاً امام احمد بن حنبلؒ، اسحٰق بن راہویہ، ابوثور حمیدی، ابوزرعہ الرازی، ابوحاتم نے حدیث اور روایت کا مخزن تسلیم کیا ہے۔ ان کی سند سے صحیحین میں ایک روایت بھی موجود نہیں بلکہ بخاری و مسلم نے کسی اور تصنیف میں بھی امام شافعیؒ کی سند سے کوئی روایت نہیں کی، امام رازی نے بخاری و مسلم کی اس بے اعتنائی کی بہت سی تاویلیں کی ہیں مگر کوئی معقول بات نہیں بتا سکے، صحیحین پر موقوف نہیں ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ میں بھی بہت کم ایسی حدیثیں ہیں جن کے سلسلۂ رواۃ میں امام شافعیؒ کا نام آیا ہو۔

امام بخاریؒ نے روایت کیوں نہیں قبول کی؟

حقیقت یہ ہے کہ بعض محدثین نے اعتماد اور استنباط کا جو معیار قرار دیا تھا اس میں اہلِ نقد بلکہ اکثر
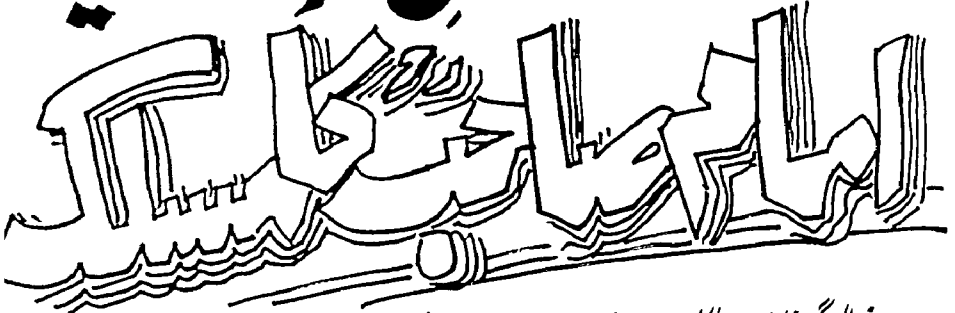
یہ خیال اگرچہ غلط اور بالکل غلط ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ علم حدیث میں کم مایہ تھے۔ تاہم اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ عام طور پر وہ محدث کے لقب سے مشہور نہیں، بزرگانِ سلف میں سینکڑوں ایسے گزرے ہیں جو اجتہاد و روایت دونوں کے جامع تھے لیکن شہرت اسی صفت کے ساتھ ہوئی جو ان کا کمال غالب تھ امام ابوحنیفہؒ کی تو حدیث میں کوئی تصنیف نہیں ہے، تعجب ہے کہ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ بھی اس لقب کے ساتھ مشہور نہ ہوئے، نہ ان کی تصنیفوں کو وہ قبولِ عام حاصل ہوا جو صحاحِ ستہ کو ہوا، امام احمد بن حنبلؒ ان لوگوں کی نسبت علمِ حدیث میں زیادہ نام آور ہیں، ان کی مسند کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ صحیح حدیثوں کا اتنا بڑ مجموعہ اور کوئی نہیں مل سکتا لیکن جس قدر حدیث و روایت میں ان کا زیادہ اعتبار ہے اسی قدر استنباط او اجتہاد میں ان کی نام آوری کم ہے۔ علامہ طبریؒ نے جو خود بھی محدث اور مجتہد تھے، مجتہدین میں ان کا شمار نہیں کیا۔ قاضی ابن عبدالبر نے کتاب الانتہار فی الثلثۃ الفقہاء میں جو مجتہدین کے حالات میں ہے، امام ابوحنیفہؒ امام مالکؒ و امام شافعیؒ پر اکتفا کی، امام رازی مناقب الشافعی میں لکھتے ہیں کہ امام شافعیؒ کے بعد کوئی مجتہد مطلق پیدا نہیں ہوا۔ اگرچہ امام احمد بن حنبلؒ کی نسبت گروہِ کثیر علماء کی یہی رائے تھی کہ وہ اجتہادِ کامل کا منصب رکھتے تھے۔

مجتہد و محدث کی حیثیتیں الگ الگ ہیں

حقیقت یہ ہے کہ مجتہد و محدث مواعظ و قصص، فضائل و سیر، ہر ایک قسم کی روایتوں کا استقصار کرتا ہے بخلاف اس کے مجتہد کو زیادہ تر صرف ان احادیث سے غرض ہوتی ہے جن سے کوئی حکم شرعی مستنبط ہوتا ہے یہی سبب ہے کہ محدثین کی نسبت مجتہدین ہمیشہ قلیل الروایہ ہوئے۔ موطا میں جو امام مالک کی تمام روایتوں کا مجموعہ ہے۔ زیادہ سے زیادہ ہزار حدیثیں ہیں جن میں صحابہ اور تابعین کے اقوال بھی شامل ہیں۔ امام شافعیؒ نے امام احمد بن حنبلؒ کے سامنے اکثر اعتراف کیا ہے کہ تم لوگ بہ نسبت ہمارے احادیث سے زیادہ واقف ہو قاضی یحییٰ بن اکثم جو ترمذی کے شیخ ہیں، حسرت سے کہا کرتے تھے کہ اگر شافعیؒ نے علمِ حدیث کی طرف پوری

ہے گو عارضی طور سے آدمی مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے لیکن عند اللہ و عند الناس قدر و منزلت کی راہیں اسی سے کھلتی ہیں۔ بے لاگ تنقید و تبصرے کے باوجود خلیفہ کو ذاتی اور سرکاری معاملات میں کبھی امام صاحبؒ کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔

ایک دفعہ خلیفہ منصور اور اس کی بیگم میں دوسری شادی کے متعلق بات بڑھ گئی خلیفہ دوسری شادی کرنا چاہتا تھا لیکن بیگم اس کو پسند نہیں کرتی تھی لہٰذا امام صاحب کو حکم مقرر کیا گیا کہ جو وہ فرمائیں اسی پر عمل کیا جائے۔ امام صاحبؒ تشریف لائے۔ بیگم پسِ پردہ ہو بیٹھیں خلیفہ نے سوال کیا کہ حُرّ کو کتنی شادیاں کرنے کا حق ہے؟ امام صاحبؒ نے فرمایا چار کا۔ یہ جواب سنتے ہی خلیفہ نے پردہ کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔ "دیکھا"۔ تب امام صاحبؒ نے فرمایا: لیکن: فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً (الآیۃ) "اگر تمہیں عدل نہ کرنے کا خوف ہو تو بس ایک ہی کافی ہے۔"

خلیفہ یہ سن کر خاموش ہو گیا اور امام صاحبؒ باہر تشریف لے آئے جب امام صاحبؒ گھر پہونچے تو بیگم کا غلام اشرفیوں کی تھیلی لے کر حاضر ہوا اور بیگم کی طرف سے کہا کہ لونڈی آپ کا شکریہ ادا کرتی ہے اور یہ حقیر ہدیہ قبول فرمائیے۔ امام صاحبؒ نے فرمایا، جاؤ! میرا سلام پیش کرنا اور کہنا کہ شکریہ اور ہدیہ کی کوئی بات نہیں ہے یہ تو میرا فریضہ تھا جو میں نے ادا کیا ہے۔ (ابوزہرہ)

ایک دفعہ خلیفہ نے علمائے کوفہ کو جمع کیا اور پوچھا کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد صحیح نہیں ہے: المؤمنون عند شروطهم "مومنین کا معاملہ ان کی شروط کے مطابق ہوتا ہے"۔ سب نے کہا بے شک! تب منصور نے کہا کہ اہل موصل نے میرے خلاف خروج نہ کرنے کی بیعت کی تھی، لیکن اب انہوں نے میرے خلاف خروج کیا ہے انہوں نے میرے عامل کو بھی قتل کر دیا ہے کیا اب میرے لئے جائز ہے کہ میں ان کو قتل کر دوں مجمع میں سے ایک عالم نے کہا وہ آپ کے قبضہ میں ہیں اگر آپ ان کو معاف کر دیں تو بہتر ہے۔ خلیفہ نے امام صاحبؒ سے دریافت کیا امام صاحبؒ نے فرمایا ہم اس وقت بیتِ خلافت میں ہیں اگر جان کی امان ہو تو کچھ عرض کیا جائے خلیفہ نے کہا امان ہے۔ امام صاحبؒ نے فرمایا:-

"اہلِ موصل نے آپ کے ساتھ ایسی شرط کی ہے جس کے وہ خود مالک نہیں ہیں (یعنی جان) اور جان اللہ کی ملکیت ہے۔ إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَمْوَالَهُمْ وَأَنْفُسَهُمْ لہٰذا اس میں بذل و اباحت جاری نہ ہوگی۔ بدیں وجہ اگر کسی آدمی نے دوسرے کو امر کیا کہ تو مجھے قتل کر دے اور اس نے تعمیل کرتے ہوئے قتل کر دیا تو اس پر دیت واجب ہو جائے گی۔ لہٰذا آپ نے نامناسب شرط لگائی تھی اور مسلمان کا خون تین وجہ کے علاوہ بہانا جائز نہیں ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی شرط ہے جس کا پورا کرنا آپ پر مقدم ہے۔"

منصور یہ سن کر لاجواب ہو گیا اور کہا "اے شیخ! آپ تشریف لے جا سکتے ہیں لیکن آپ ایسا فتویٰ نہ دیں کیونکہ اگر آپ نے اپنے امام کے خلاف ایسا فتویٰ دے دیا تو خوارج کے ہاتھ آپ کے امام کی طرف دراز ہونے لگیں گے۔" (ماخوذ از "امام اعظم ابوحنیفہؒ" از قلم مفتی عزیز الرحمٰن تلخیص احمد مصطفےٰ صدیقی راہی)

غیبی تنبیہہ

ایک دفعہ کسی کو مسئلہ بتا رہے تھے، ایک شخص نے کہا کہ ابو حنیفہؒ خدا سے ڈر کر فتویٰ دیا کرو۔ امام صاحبؒ پر اس کا اس قدر اثر ہوا کہ چہرہ کی رنگت زرد پڑ گئی، اس شخص کی طرف مخاطب ہوتے اور کہا "بھائی خدا تم کو جزائے خیر دے اگر مجھ کو یہ یقین نہ ہوتا کہ خدا مجھ سے مواخذہ کرے گا کہ تو نے جان کر علم کو کیوں چھپایا تو میں ہرگز فتویٰ نہ دیتا۔" کوئی مسئلہ مشکل آجاتا اور جواب نہ معلوم ہوتا تو متردد ہوتے کہ غالباً میں کسی گناہ کا مرتکب ہوا۔ یہ اسی کی شامت ہے۔ پھر وضو کر کے نماز پڑھتے اور استغفار کرتے، فضیل بن عیاض کہ مشہور صوفی گزرے ہیں، ان سے کسی نے یہ حکایت بیان کی بہت روئے اور کہا ابو حنیفہؒ کے گناہ بہت کم تھے، اس لئے ان کو یہ خیال ہوتا تھا جو لوگ گناہوں میں غرق ہیں۔ ان پر ہزار آفتیں آتی ہیں، اور مطلق خبر نہیں ہوتی کہ یہ غیبی تنبیہہ ہے"

تھے اس وقت پایۂ تخت ہاشمیہ کوفہ سے چند میل کے فاصلہ پر تھا۔

ایک مرتبہ خلیفہ منصور نے ابن شبرمہ، ابن ابی لیلےٰ اور دیگر علماء کو طلب کیا اور بیع و شراء اور زکوٰۃ وغیرہ کے متعلق کتاب لکھنے کو کہا۔ چنانچہ طویل مدت کے بعد ان حضرات نے مسودات پیش کئے تو خلیفہ کو پسند نہ آئے۔ کسی درباری نے خلیفہ سے عرض کیا حضور! کوفہ میں ایک شخص ابو حنیفہ نعمان ہیں ان کو اور بلائیے چنانچہ امام صاحبؒ کو بلایا گیا اور کتاب لکھنے کے لئے کہا گیا۔ امام صاحبؒ نے صرف دو دن میں وہ کتاب مرتب کر کے پیش کر دی خلیفہ نے اس کتاب کو بہت پسند کیا اور بطور انعام دس ہزار درہم پیش کئے تو امام صاحبؒ نے لینے سے انکار کر دیا۔
(موفق)

ایک دفعہ خلیفہ نے امام مالک، ابن ابی ذئب اور امام صاحبؒ کو بلوایا اور اپنی خلافت کے متعلق ان سے اظہار رائے چاہی۔ ہر ایک نے جو اس کے نزدیک حق تھا بیان کر دیا امام صاحبؒ سے پوچھا تو فرمایا:۔
"جب آپ کی خلافت پر دو اہل فتویٰ متفق نہیں ہو پائے تو خلافت تو اجماع مومنین کا نام ہے"۔
یہ سن کر خلیفہ نے خادم کو حکم دیا کہ جب یہ لوگ باہر جائیں تو تین تین ہزار درہم ہر ایک کو پیش کرنا، اگر امام مالکؒ لیں تو کل کے کل دے دینا اور اگر یہ دونوں لیں تو ہر ایک کی گردن اڑا دینا۔ چنانچہ غلام نے ان کے سامنے تین ہزار کی تھیلی پیش کی امام مالکؒ کے علاوہ دونوں نے انکار کر دیا۔ (موفق)
امام صاحبؒ کا جواب اگرچہ گستاخانہ شمار کیا جا سکتا ہے لیکن حق و صداقت بہر حال حق و صداقت

تھے لوگوں نے مشورے کے لئے آکر گھیر لیا کہ اب کیا کریں۔ امام صاحبؒ نے فرمایا تمہاری اور اپنی طرف سے خلیفہ سے جا کر گفتگو کرتا ہوں چنانچہ آپ گئے اور ایک مختصر اور بلیغ تقریر خلیفہ کے سامنے فرمائی کہ۔

الحمد للہ الذی بلغ الحق قرابۃ نبیہ صلے اللہ علیہ وسلم وامات عنا جور الظلمۃ وبسط السنتنا بالحق قد بایعناك علی امر اللہ والوفالك بعهدك الی قیام السّاعۃ (ابوزہرہ)

" اس خدا کی تعریف جس نے خلافت حضورؐ کے قرابت داروں کو عطا کی اور ظالموں کے ظلم کا ہم پر سے خاتمہ کر دیا اور ہماری زبانوں کو حق کے لئے بچھا دیا ہیں آپ سے احکامِ خداوندی اور وفائے عہد پر قیامِ ساعت تک کے لئے بیعت کرتا ہوں "

یہ دیکھ کر دوسرے لوگوں نے بھی بیعت کی۔

(بعض حضرات نے لفظ " قیام الساعۃ " کے متعلق لطائف بیان کئے ہیں اور کہا ہے کہ امام صاحبؒ نے تلفظ میں میم کے کسرہ کو بڑھا دیا تھا یعنی " قیامی الساعۃ " (یعنی اپنے یہاں کھڑے ہونے تک) اور کسرہ اور یا میں کوئی فرق نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ امام صاحب نے اس جگہ توریہ سے کام لیا تھا لیکن یہ مناسب نہیں کیونکہ اس سے امام صاحبؒ پر اعتراض وارد ہوتا ہے کہ وہ تو بچ گئے لیکن عوام کو معصیت میں گرفتار کر دیا بلکہ حق یہ ہے کہ جو الفاظ بیعت سے صاف ظاہر ہے کہ آپ کی بیعت مشروط تھی اور مشروط بیعت شرط پوری نہ ہونے کی وجہ سے خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔)

ابراہیم بن میمون کا قتل

ابراہیم بن میمون امام صاحبؒ کے دوست ہیں آپ بڑے فقیہ اور محدث تھے امام صاحبؒ اور عطاؒ سے حدیث روایت کرتے ہیں اور اُن سے حسان بن ابراہیم نے روایت کی ہے۔ ابوداؤد اور نسائی اُن کے بارے میں فرماتے ہیں لاباس بہ اور یحییٰ بن معین اور ابن حبان بھی اُن کی توثیق کرتے ہیں۔ امام صاحبؒ کے پاس کی آمد ورفت رہتی تھی آپ امام صاحبؒ سے جہاد کے متعلق مشورہ کیا کرتے تھے امام صاحبؒ فرما دیتے معروف اور نہی عن المنکر اگرچہ فرض ہے لیکن اس کے لئے حالات اور سامان کی بھی ضرورت ہے نہ آئے بالآخر ابو مسلم خراسانی نے ان کو گرفتار کر لیا اور قتل کر دیا۔ ان کے قتل کی خبر سن کر امام صاحب روئے حضرت عبداللہ بن مبارکؒ بیان فرماتے ہیں کہ گریہ کی وجہ سے آپ کی یہ حالت ہو گئی تھی نے لگا تھا کہ کہیں آپ کی روح پرواز نہ کر جائے۔

امام ابو حنیفہؒ کا قیام کوفہ

میں پھر دوبارہ آپ نے کوفہ میں مستقل قیام فرما لیا اس وقت ابوجعفر منصور خلیفہ تھا اس کی علماء اس کے یہاں آمد ورفت رکھیں بہت سے حضرات کو اس نے مرکزی عہدے بھی دیے

بلاغرض حق گوئی

خلیفہ منصور اور حرہ خاتون (منصور کی بیوی) میں کچھ شکر رنجی ہوگئی تھی۔ خاتون کو شکایت تھی کہ خلیفہ عدل نہیں کرتا۔ منصور نے کہا کسی کو منصف قرار دو، اس نے امام صاحبؒ کا نام لیا۔ اسی وقت طلبی کا فرمان گیا۔ خاتون پردہ کے قریب بیٹھی تھی کہ اپنے سامنے ساری کارروائی دیکھ لے اور امام صاحبؒ جو فیصلہ کریں خود اپنے کانوں سے سنے۔ منصور نے پوچھا، شرع کی رو سے مرد کتنے نکاح کرسکتا ہے۔ امام صاحبؒ نے کہا، چار، منصور خاتون کی طرف مخاطب ہوا کہ سنتی ہو۔ پردہ سے آواز آئی، ہاں سنا۔ امام صاحبؒ نے منصور کی طرف خطاب کرکے کہا۔ مگر یہ اجازت اس شخص کے لئے خاص ہے۔ جو عدل پر قادر ہو ورنہ ایک سے زیادہ نکاح کرنا اچھا نہیں خدا فرماتا ہے :۔

وَاِنْ خِفْتُمْ اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَۃً۔ منصور چپ ہوگیا، امام صاحبؒ گھر آئے تو ایک خادم، پچاس ہزار درہم کے توڑے لئے ہوئے حاضر ہوا کہ خاتون نے نذر بھیجی ہے، اور کہا ہے کہ آپ کی کنیز آپ کو سلام کہتی ہے۔ اور آپ کی حق گوئی کی نہایت مشکور ہے۔" امام صاحبؒ نے روپے پھیر دیئے اور خادم سے فرمایا جاکر خاتون سے کہنا کہ میں نے جو کچھ کہا کسی غرض سے نہیں بلکہ میرا فرض منصبی تھا۔

اس جگہ امام صاحبؒ نے علقمہ کو حضرت ابن عمرؓ پر فقہ کے اعتبار سے فوقیت دی ہے اور اس میں عیب کی کوئی بات نہیں ہے کیونکہ فضلِ صحبت اور چیز ہے اور فقاہت کسی دوسری چیز کا نام ہے جیسا کہ حضرت علقمہ حضرت وائل بن حجر کے بہت زیادہ مدّاح تھے اور ان کی بہت زیادہ تعریف و تعظیم کیا کرتے تھے لیکن ان کے علم کے بارے میں فرمایا کرتے تھے :۔ انه اعرابي لايعرف الاسلام " وہ اعرابی ہیں اسلام سے واقف نہیں "۔ (تنسیق)

ابوالعباس سے بیعت

ابوالعباس السفاح بنی عباس کا پہلا خلیفہ ہے جب یہ خلیفہ ہوا تو لوگوں کو امید ہوگئی تھی کہ اب ظلم و ستم بند ہوجائے گا، لیکن ایسا ہوا نہیں کیونکہ نئی نئی خلافت تھی جگہ جگہ بغاوتیں ہورہی تھیں اس لئے انتظاماً بہت زیادہ قتل و غارتگری ہوئی۔

خلیفہ ہونے کے بعد اس کو اخذ بیعت کی ضرورت پیش آئی اور وہ اس غرض سے کوفہ آیا۔ کوفہ ان دنوں حکومتِ اسلامیہ کا سب سے بڑا شہر شمار کیا جاتا تھا۔ اتفاق سے ان دنوں امام صاحبؒ کوفہ تشریف لائے ہوئے

جمع ہو ہی جاتے ہیں اسی طرح کا یہ اجتماع ہوگا، لیکن اصل سوال مجلس تدوین فقہ کا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ آپ نے تدوین فقہ کا کام ۱۲۱ھ سے شروع کر دیا تھا اور یہ کام کم و بیش ۳۰ سال (۱۵۰ھ) جاری رہا اور اس مجلس میں ۴۰ فقہاء مجتہدین برابر شریک رہے اگر کوئی موجود نہ ہوتا تو کام بند رہتا تھا، تو کیا مجلس تدوین فقہ کے شرکاء آپ کے ہمراہ آگئے تھے اسی کو ابو زہرہ مصری نے ترجیح دی ہے۔ (ابو زہرہ)

دوسری روایت یہ ہے کہ یہ قیام عارضی تھا اور ۱۳۲ھ میں آپ نے کوفہ آمد و رفت شروع کر دی پھر ۱۳۶ھ میں مستقل کوفہ آگئے گویا اسی عارضی قیام میں تدوینِ فقہ کا کام بند رہا۔

امام اعظمؒ کا امام اوزاعیؒ سے مناظرہ

۱۳۰ھ میں جب آپ مکہ پہونچے تو یہاں امام اوزاعی سے رفع الیدین کے متعلق مناظرہ پیش آگیا، امام اوزاعی پہلے ہی سے امام صاحب کے متعلق اچھا خیال نہیں رکھتے تھے چنانچہ حضرت عبداللہ بن مبارک فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں اوزاعی کے پاس حاضر ہوا تو انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ اے خراسانی کوفہ میں یہ کون بدعتی شخص پیدا ہوا ہے جس کی کنیت ابو حنیفہ ہے یہ سُن کر میں واپس آیا اور تین دن مسلسل امام صاحبؒ کے عمدہ عمدہ مسائل منتخب کئے اور تیسرے دن اپنے ہمراہ کتاب لے کر آیا اور امام اوزاعی کی خدمت میں پیش کی امام اوزاعی نے پوچھا یہ مسائل کس نے بیان کئے ہیں؟ میں نے کہا عراق میں ایک شخص سے ملاقات ہوئی تھی جس کا نام نعمان ہے! امام اوزاعی نے کہا یہ تو بڑے پایہ کے شیخ معلوم ہوتے ہیں جاؤ ان سے علم حاصل کرو! میں نے کہا جی ہاں! یہ وہی نعمان ہیں جن کی کنیت ابو حنیفہؒ ہے اور جن کے پاس جانے سے آپ مجھے روکتے تھے"

اس مرتبہ (۱۳۰ھ) میں جب دونوں شیخ ایک جگہ جمع ہوئے تو مسئلہ رفع الیدین پر ذرا تفصیلی بات چیت ہوئی جس کو "مسند امام اعظم" سے نقل کیا جا رہا ہے:۔

" سفیان بن عیینہ کہتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ اور امام اوزاعی مکہ میں دار حناطین میں جمع ہوئے تو امام اوزاعی نے امام صاحبؒ سے پوچھا آپ رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت رفع الیدین کیوں نہیں کرتے۔ امام اوزاعی نے فرمایا عجیب بات ہے مجھ سے زہری نے بروایت سالم عن ابیہ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہی نقل کیا ہے کہ آپ رفع الیدین کرتے تھے۔ امام صاحب نے جواب دیا، مجھ سے امام حماد نے بروایت ابراہیم نخعی عن علقمہ و اسود عن ابن مسعود عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حدیث بیان کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم افتتاح صلوٰۃ کے علاوہ رفع الیدین نہیں کرتے تھے۔ امام اوزاعی نے کہا میں تو زہری عن سالم عن ابیہ سے روایت بیان کر رہا ہوں اور آپ کہتے ہیں کہ حدثنی حماد الخ بھلا کوئی جوڑ بھی ہے؟ تب امام صاحب نے فرمایا حماد زہری سے زیادہ فقیہ تھے اور ابراہیم سالم سے افقہ تھے؟ اور علقمہ ابن عمر سے فقہ میں کم نہیں تھے اگرچہ ابن عمر کو صحبت کی فضیلت حاصل ہے اور عبداللہ بن مسعود بہر حال عبداللہ بن مسعود ہیں۔ پس یہ جواب سُن کر امام اوزاعی خاموش ہوگئے

امام صاحبؒ نے صحابہ کی زیارت کی تھی

اس وقت عبدالملک بن مروان جو دولت مروانیہ کا دوسرا تاجدار شمار کیا جاتا ہے مسند آرائے خلافت تھا، یہ وہ عہدِ مبارک تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جمالِ مبارک سے جن لوگوں کی آنکھیں روشن ہوئی تھیں، اُن میں سے چند بزرگ موجود تھے جن میں سے بعض امام ابو حنیفہؒ کے آغاز شباب تک زندہ رہے۔ انس بن مالکؓ نے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص تھے ۹۳ھ میں وفات پائی۔ سہل بن سعدؓ نے ۹۱ھ میں انتقال کیا اور ابو الطفیل عامر بن واثلہؓ تو سو ہجری تک زندہ رہے۔ لیکن یہ ثابت نہیں ہوتا کہ امام ابو حنیفہؒ نے کسی سے بھی کوئی حدیث روایت کی۔ اس پر لوگوں کو نہایت تعجب ہے اور مؤرخوں نے اس کے مختلف اسباب بیان کئے ہیں۔ بعضوں کی رائے ہے کہ امام ابو حنیفہؒ نے اس وقت تک کسی قسم کی تعلیم نہیں حاصل کی تھی۔ اُن کے باپ دادا تجارت کرتے تھے۔ اس لئے ان کی نشو و نما بھی ایک عام تاجر کی حیثیت سے ہوئی۔ بڑے ہونے پر امام شعبیؒ کی ہدایت سے علم کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس لئے موقع ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ یعنی صحابہ میں سے کوئی باقی نہیں رہا تھا۔

کو آزاد کر دیا۔

اہل تاریخ نے یہ واقعہ ۱۳۰ھ کا بتلایا ہے اس کے بعد آپ نے کوفہ کی سکونت کو ترک کر دیا اور مکہ معظمہ کا سفر اختیار کیا اور ۱۳۶ھ تک آپ وہیں مقیم رہے جب ابو العباس السفاح خلیفہ ہوا تو آپ پھر دوبارہ کوفہ آ گئے تھے۔

امام اعظم کا قیام مکہ معظمہ

زمانہ قیام مکہ معظمہ میں آپ کا کیا مشغلہ تھا۔ بعض مؤرخین نے آپ کے حلقہ درس کا یہاں انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ آپ نے کوفہ اور بغداد کے علاوہ کہیں حلقہ درس قائم نہیں کیا لیکن ابو زہرہ نے اس روایت کی تردید کی ہے اور علامہ موفق نے بھی وہی بیان کیا ہے جو ابو زہرہ کی رائے ہے چنانچہ موصوف نے دلیل میں حضرت عبداللہ بن مبارک کی یہ روایت پیش کی ہے:۔ رأیت ابا حنیفة جالسًا فی المسجد الحرام یفتی اهل المشرق واهل المغرب والناس یومئذٍ ناس یعنی الفقهاء الکبار وخیار الناس حضور "میں نے ابو حنیفہ کو مسجد حرام میں بیٹھے دیکھا کہ آپ اہلِ مشرق اور اہل مغرب کو فتویٰ دیتے تھے یہ وہ زمانہ ہے کہ جب بڑے بڑے فقہاء اور بہترین انسان موجود ہوتے تھے"۔

اس روایت سے آپ کا حلقہ درس وافتاء مسجد حرام میں بھی ثابت ہے لیکن یہ مجلس مستقل نہیں تھی بلکہ عام دستور کے مطابق جب کسی بڑے شہر میں بڑا عالم پہونچ جاتا ہے تو استفادہ کی غرض سے وہاں آدمی

گا اس منصوبے کے تحت تمام علمائے عراق کو جمع کیا اور مختلف عہدے اور جاگیریں عطا کیں جس کو انہوں نے قبول کر لیا، امام صاحب کو قاضی القضاۃ کا عہدہ سپرد کرنا چاہا تو انہوں نے اس سے انکار کر دیا۔ ابن ہبیرہ نے قسم کھائی کہ آپ کو قبول کرنا ہوگا۔ امام صاحب نے بھی قسم کھائی کہ ہرگز قبول نہیں کروں گا اور حدیہ ہے کہ آپ اگر مسجد کے ستون شمار کرنے کو بھی کہیں گے تو نہیں کروں گا چہ جائیکہ ایک مسلمان کے قتل پر دستخط کروں اس پر ابن ہبیرہ کو غصہ آگیا اور حکم دیا کہ ان کے روزانہ دس کوڑے مارے جایا کریں چنانچہ امام صاحب کو گرفتار کر لیا گیا اور روزانہ دس کوڑے مارے جانے لگے جس کی وجہ سے آپ کا چہرہ اور جسم ورم کر آیا تھا مگر آپ اپنی بات پر اٹل رہے (علامہ شبلی نے اپنے بعض مقالات میں امام صاحبؒ کے مجدد ہونے سے انکار کیا ہے انہوں نے بیان فرمایا ہے کہ: "مجدد ہونے کے لئے تین شرطیں ہیں ان میں سے تیسری شرط یہ ہے کہ جسمانی مصیبتیں اٹھائی ہوں، جان پر کھیلا ہو اور سرفروشی کی ہو، اس کے بعد ہمارے ایک معاصر مؤلف ابن تیمیہ نے بیان کیا ہے کہ شرط ۳ کی وجہ سے علامہ شبلی نے امام ابو حنیفہ، امام غزالی، شاہ ولی اللہ کو مجددیت کے دائرے سے خارج کر دیا ہے..... لیکن مؤدبانہ گذارش ہے کہ دو شرطیں تو امام صاحب میں موجود ہیں تیسری شرط کے پورا ہونے کے لئے زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ابن ہبیرہ کا کوڑے مارنا اور اسی طرح خلافتِ عباسیہ میں کوڑوں کی سزا پھر قید خانہ اور اس میں زہر پلا کر شہید کر دینا۔" ان سے اگر تیسری شرط پوری ہو رہی ہو یعنی مصیبتیں برداشت کرنا جان پر کھیلنا اور سرفروشی کرنا، پھر تو امام صاحبؒ کے مقام مجددیت سے انکار کرنا ناانصافی ہوگی۔

عبداللہ بن ابی حفص الکبیر اور امام حلبی بیان فرماتے ہیں کہ جن دنوں امام صاحبؒ کو کوڑوں کی سزا دی جارہی تھی آپ یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

عطاء ذی العرش خیر من عطاءکم	وفضله واسع یرجی وینتظر
انتم یکدر ما تعطون بمنکم	والله یعطی فلا من ولاکدر

"یعنی اللہ تعالیٰ کی عطا تمہاری عطا سے بہتر ہے اور اس کا فضل بہت وسیع ہے اسی سے امید کی جاسکتی ہے اور اسی کا انتظار کیا جاسکتا ہے تم تو احسان جتلا کر اپنی عطایا کی مشقت میں مبتلا کر دیتے ہو اور اللہ تعالیٰ عطا کرتا ہے نہ احسان جتلاتا ہے اور نہ مشقت میں مبتلا کرتا ہے:"

ایک شاعر نے اس المیہ کو نظم کیا ہے جس کے شروع کے دو شعر کا ترجمہ پیش ہے:۔

(۱) اے نعمان کے مارنے والے تو اپنے نفس سے خوش ہے تو نے جہالت اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کو کمایا ہے۔ (۲) اے یزید تو ہمیشہ ان کے مارنے کی وجہ سے مبغوض رہے گا تو نے بہت بری چیز میزان آخرت کے لئے پیشگی بھیجی ہے۔

امام صاحب کو یہ سزا کتنے دنوں دی گئی؟ بعض روایات میں چالیس اور بعض میں دس یوم مذکور ہیں۔ امام صاحب نے اس مصیبت سے کس طرح نجات پائی اس کے لئے علامہ کردری کی تحریر پیش ہے۔

"ابن ہبیرہ نے کہا کہ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ آپ فرما رہے ہیں: تو خدا سے نہیں ڈرتا جو میری امت کے ایک بلاقصور آدمی کو مارتا ہے" اس کے بعد ابن ہبیرہ نے امام صاحب

امام صاحبؒ نے فقہ کیوں سیکھا

ایک دن امام صاحبؒ اپنی دوکان پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک عورت آپ کے پاس طلاق یا حیض کے متعلق ایک مسئلہ دریافت کرنے آئی۔ امام صاحبؒ نے لاعلمی کا اظہار فرمایا اور امام حمادؒ کے حلقۂ درس کی طرف اشارہ کردیا جو آپ کے مکان کے قریب ہی تھا اور ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا کہ وہ جو کچھ جواب دیں مجھے بھی بتلادینا۔ چنانچہ اس عورت نے واپسی پر جواب سنادیا۔ اس سے امام صاحبؒ کو افسوس ہوا اور اسی وقت سے فقہ سیکھنے کا ارادہ کرلیا اور امام حمادؒ کے حلقۂ درس میں پابندی کے ساتھ شریک ہونے لگے۔

یہ روایت مختلف الفاظ کے ساتھ منقول ہے لیکن قدرے مشترک واقعہ ایک ہی بیان کیا گیا ہے اس بارے میں امام صاحبؒ کے الفاظ یہ ہیں:۔ خدعتنی امراۃ و زھدتنی اخریٰ و فقھتنی اخریٰ "فرمایا ایک عورت نے مجھے دھوکہ دیا اور ایک عورت نے مجھے زاہد بنادیا اور ایک عورت نے مجھے فقیہ بنادیا۔ یعنی ایک عورت کی وجہ سے مجھے فقہ سیکھنا پڑا جس کے نتیجے میں، میں فقیہ ہوگیا۔

پیدا کردی ورنہ تاریخی شہادتیں بالکل اس کے خلاف ہیں" (سیرت النعمان)

امام اعظمؒ کا سفر مکہ

۱۰۵ھ میں یزید بن عبدالملک کا انتقال ہوا تو اس کے بیٹے ولید کی عمر اس وقت بہت کم تھی اس۔ اپنے چھوٹے بھائی ہشام بن عبدالملک کے لئے بیعت خلافت لی اور ولید کو ولی عہد مقرر کیا لیکن یہ حد عیاش تھا۔ ہشام نے ہرچند چاہا کہ کسی طرح اس کی اصلاح ہوجائے اس کے لئے ایک دفعہ ولید کو امیر مقرر کیا تاکہ اس کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہو لیکن ولید نے یہ کیا کہ صندوقوں میں گتے بچھائے او شراب کی بوتلیں بھریں اس ارادے سے کہ اب تو بیت اللہ کی چھت پر خیمہ نصب کرکے وہاں دورِ شراب چ لوگوں کو جب یہ معلوم ہوا تو اس کو امیر الحج کے عہدے سے برطرف کرایا۔ (طبری)

ہشام نے اس کی جگہ اپنے بیٹے کو خلیفہ بنانا چاہا لیکن ہشام اس میں کامیاب نہ ہوسکا اور ۱۲۵ میں ولید ہی تختِ خلافت پر قابض ہوگیا چنانچہ جگہ جگہ بغاوتیں شروع ہوگئیں۔

خلافتِ عباسیہ کے دعوے دار موقع کے متلاشی تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یزید الناقص، ابراہیم بز ولید، مروان الحمار یکے بعد دیگرے خلیفہ ہوئے اور ختم ہوگئے۔

مروان کے زمانے میں یزید بن عمرو بن ہبیرہ کوفہ کا گورنر ہوا یہ نہایت مدبر اور سیاست داں تھا اس۔ منصوبہ بنایا کہ امورِ سلطنت میں علماء کو شریک کرنا چاہیئے اس طرح پبلک کے اوپر سہولت سے قبضہ ہوجا

نے خلافت کا مقابلہ کیا اور ۱۲۱ھ میں مقابلہ کرتے ہوئے میدانِ جنگ میں قتل کر دیئے گئے۔

شیعہ حضرات نے زید بن علی کے ہاتھ پر کوفہ میں اس شرط پر بیعت کی تھی کہ آپ کوفہ سے باہر نہ جائیں، لاکھوں تلواریں آپ کے لئے موجود ہیں (طبری) اس وقت امام صاحبؒ کوفہ ہی میں تھے اور آپ کے حلقہ درس کو جاری ہوئے ایک سال ہو چکا تھا۔ امام صاحب کی اس وقت جو پوزیشن تھی علامہ موفق نے لکھا ہے:۔

"زید بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب نے ایک قاصد امام صاحبؒ کی خدمت میں اپنی اعانت کے لئے بھیجا تو امام صاحبؒ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ اگر مجھے یہ معلوم ہو جاتا کہ لوگ (یعنی آپ کے رفقاء کار شیعہ) آپ کو ذلیل نہ کریں گے اور آپ کو شکست نہ دلائیں گے اور وفاداری کے ساتھ آپ کا ساتھ دیں گے تو میں ضرور آپ کی اتباع کرتا اور آپ کے ساتھ جہاد کرتا اس لئے کہ آپ امام برحق ہیں، لیکن یہ لوگ آپ کے ساتھ غدر کریں گے جیسا کہ آپ کے آباء واجداد کے ساتھ غدر کیا ہے، لیکن میں آپ کی مال کے ذریعہ اعانت کرتا ہوں تاکہ آپ کو تقویت پہونچے یہ کہہ کر قاصد سے کہا کہ میرا یہ عذر بیان کر دینا اور یہ دس ہزار درہم میری جانب سے ان کو پیش کر دینا۔" (موفق)

دوسری روایت میں اس طرح مذکور ہے:۔

"آپ سے پوچھا گیا کہ زید بن علی کے ساتھ نکلنا کیسا ہے تو آپ نے فرمایا جیسا کہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ کا آپ کے ساتھ بدر کے لئے نکلنا! یہ سن کر آپ سے عدم شرکت کی وجہ دریافت کی گئی تو فرمایا میرے پاس کچھ امانتیں ہیں میں نے ان کو ابن ابی لیلیٰ کے سپرد کرنا چاہا تھا مگر انہوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ جب امام صاحبؒ نے زید بن علی کے قتل کی خبر سنی تو رو دیئے۔" (موفق)

ان دونوں روایتوں کو ابوزہرہ نے بلا تنقید کے قبول کیا ہے، حالانکہ تاریخی شہادتوں سے اس کی وجہ جواز معلوم نہیں ہوتی ہے۔ (تاریخ طبری) اس سلسلے میں سب سے بہترین رائے محقق ہند علامہ شبلی کی ہے:۔

"شاہ عبدالعزیزؒ کے تحفہ میں لکھا ہے کہ زید بن علی نے بنو امیہ کے عہد میں جو بغاوت کی تھی اس میں امام صاحبؒ بھی شریک تھے ("نامہ دانشوراں" کے مؤلفوں نے بھی ایسا ہی لکھا ہے) لیکن ہم اس پر یقین نہیں کر سکتے جس قدر تاریخ اور رجال کی کتابیں ہیں سب ہمارے سامنے ہیں اس میں کہیں اس کا ذکر نہیں ہے حالانکہ اگر ایسا ہوتا تو ایک قابل ذکر واقعہ تھا زید بن علی نے ۱۲۱ھ میں بغاوت کی، اس وقت ہشام بن عبدالملک تختِ خلافت پر متمکن تھا، ہشام اگرچہ نہایت کفایت شعار اور بعض امور میں نہایت جزرس تھا لیکن اس کی سلطنت نہایت امن وامان کی سلطنت تھی ملک میں ہر طرف امن وامان کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔ رعایا عموماً رضامند تھی بیت المال میں ناجائز آمدنیاں نہیں داخل ہو سکتی تھیں۔ ایسی حالت میں امام صاحب کے مخالفت کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔

زید بن علی سادات میں ایک صاحب ادعا شخص تھے اس لئے ان کو بغاوت کرنا ضرور تھی (بخیال ان کے، کہ خلافت ان کا حق ہے لیکن امام صاحبؒ کے متعلق غلط فہمی کا منشاء یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ خاندان اہل بیت کے ساتھ ایک خاص ارادت رکھتے تھے امام صاحب نے ایک مدت تک امام باقرؒ کے دامنِ فیض میں تربیت پائی تھی اور کوفہ کی ہوا میں ایک مدت تک شیعوں کا اثر تھا، ان اتفاقی واقعات نے امام صاحبؒ کے متعلق یہ غلط

جس وقت امام صاحبؒ نے مسندِ درس و افتاء کو زینت بخشی تھی اس وقت ہشام بن عبدالملک کا دورِ خلافت تھا یہ ۱۰۵ھ میں خلیفہ ہوا اور ۱۲۵ھ میں اس نے وفات پائی اس کی کل مدتِ خلافت بروایتِ واقدی ۱۹ سال سات ماہ دس یوم ہے اس کی عمر ۵۵ سال کی ہوئی یہ بہت سے اوصافِ حمیدہ کا مالک تھا مؤرخ طبری لکھتا ہے

"عفان بن شیبہ کہتا ہے کہ میں ہشام کی خدمت میں باریاب ہوا وہ ایک سبز رنگ کی پوستین پہنے ہوئے تھا مجھے اس نے خراسان جانے کا حکم دیا اور کچھ ہدایتیں کرنے لگا میں اس کا لباس ہی دیکھتا رہا۔ ہشام تاڑ گیا کہا کیا ہے؟ میں نے کہا خلیفہ ہونے سے پہلے بھی میں نے آپ کو اسی لباس میں دیکھا تھا۔ اب میں یہی غور کر رہا ہوں کہ یہ وہی ہے یا کوئی اور ہے۔ ہشام نے کہا اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے میرے پاس اس پوستین کے سوا کوئی اور کپڑا نہیں ہے۔ یہ جو کچھ تم دیکھتے ہو کہ میں روپیہ جمع کرتا ہوں یہ سب آپ حضرات کے لئے ہوتا ہے۔" (طبری)

مؤرخ مذکور نے اسی خلیفہ کے بارے میں ایک دوسرا واقعہ بیان کیا ہے:۔

"ایک شخص نے ہشام سے سخت کلامی کی اس نے کہا تجھے یہ زیبا نہیں ہے کہ تو اپنے امام کے ساتھ سخت کلامی کرے۔" (طبری)

اس خلیفہ کے متعلق مؤرخین نے متعدد واقعات اسی قسم کے بیان کئے ہیں بایں ہمہ اُموی دورِ خلافت کے خلاف اس کے حریفوں کے قلوب میں جو کینہ اور حسد پرورش پا رہا تھا وہ ان کو چین سے نہ بیٹھنے دیتا مختلف مقامات پر فسادات اور نقضِ امن کے واقعات ہوتے رہتے تھے لیکن حکومت کی طاقت ان کو کچل دیتی

زید بن علی کا خروج

زید بن علی بن حسینؓ بن علیؓ بن ابی طالب کے خروج کے اسباب کے متعلق مؤرخین نے متعدد روایات کی ہیں، شیعہ حضرات ان کے گرد جمع تھے اور ان کو جہاد کے لئے اکسا رہے تھے جس کا انجام یہ ہوا کہ زید بن

عورت پر نہیں آئی اس لئے کہ طلاق قبل دخول تھی۔ امام صاحبؒ کی اس تدبیر کی سب نے تحسین کی۔"

انگوٹھی کا مسئلہ

ایک دفعہ ابن ہبیرہ نے امام صاحبؒ سے پوچھا کہ یہ میرے پاس انگوٹھی ہے جو مجھے بہت محبوب ہے لیکن اس پر نام "عطا بن عبداللہ" کندہ ہے۔ جو مجھے پسند نہیں ہے بتایئے کیا کردوں؟ امام صاحبؒ نے فرمایا لفظ "بن" کی ب کو گول کردو اور "عبد" کے اوپر نقطہ لگادو "عطا من عنداللہ" ہو جائے گا۔ ابن ہبیرہ نے اس کو بہت پسند کیا۔

تکفیر میں احتیاط

امام صاحبؒ کا مسلک ہے کہ اگر کسی شخص میں ۹۹ وجہ سے تکفیر ثابت ہو اور صرف ایک وجہ سے ایمان تو اسی ایک وجہ کو ترجیح دی جائے گی لہٰذا وہ حتی الامکان مومن کے فعل کی تاویل کرتے ہیں ایک مرتبہ امام صاحبؒ کی خدمت میں ایک شخص آیا، اور عرض کیا کہ ایک شخص جو اپنے کو مسلمان کہتا ہے لیکن اس کو جنت کی خواہش نہیں، دوزخ کا خوف نہیں مردار کھاتا ہے، بلا رکوع وسجدہ کے نماز پڑھتا ہے، بن دیکھے شہادت دیتا ہے، حق سے بغض اور فتنہ کو محبوب رکھتا ہے، رحمت سے بھاگتا ہے۔ یہود و نصاریٰ کے قول کی تصدیق کرتا ہے۔ ایسے شخص کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

امام صاحبؒ نے فرمایا وہ مومن ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی خواہش میں اس کو جنت کی خواہش نہیں وہ نار سے نہیں بلکہ رب النار سے ڈرتا ہے اور مچھلیاں جو کہ میتہ ہیں کھاتا ہے، نماز جنازہ پڑھتا ہے اور اس میں رکوع و سجدہ نہیں۔ کلمۂ شہادت پڑھتا ہے حالانکہ نہ اس نے خدا کو دیکھا اور نہ رسولؐ کو، موت کہ امر حق ہے اس سے بغض رکھتا ہے تاکہ خوب عبادت کرے، مال اور اولاد جن کو قرآن نے فتنہ کہا ہے محبوب رکھتا ہے اور یہود و نصاریٰ کے اس قول لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ" اور لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ" جو کہ قرآنی آیت ہے تصدیق کرتا ہے یہ جواب سن کر تمام اہل مجلس آپ کا منہ حیرت سے تکنے لگے۔

حضرت عائشہؓ کا سفر

ایک شخص نے سوال کیا حضرت عائشہؓ کے سفر کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا کیا حرج ہے وہ تو ام المومنین ہیں تمام مومن ان کے محرم ہیں اس لئے ان کو مزید محرم کی کیا ضرورت تھی۔

ایک قیاس

ایک آدمی نے سوال کیا، ایک پیالہ ہے اس میں ایک طرف چاندی کا پتر لگا ہے کیا اس سے پانی پینا جائز ہے؟ آپ نے فرمایا اگر کوئی آدمی ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی پہنے ہو اور وہ چلو سے پانی پینا چاہے تو جائز ہے یا نہیں؟ اس نے کہا جائز ہے۔ امام صاحبؒ نے فرمایا یہ بھی جائز ہے۔

فقہاء کرام نے بیان کیا ہے کہ ایسی صورت میں پینے کی جگہ اور ہاتھ میں پکڑنے کی جگہ ایسی ہونا چاہئے کہ جو خالی ہو تاکہ چاندی یا سونے کا استعمال لازم نہ آجائے مذکورہ صورت میں یہی بات ہے۔

(تحریر مفتی عزیز الرحمن بجنوری)

امام صاحبؒ کا حلم و عفو

ایک دفعہ مسجد خیف میں تشریف رکھتے تھے۔ شاگردوں اور ارادت مندوں کا حلقہ تھا۔ ایک اجنبی شخص نے مسئلہ پوچھا، امام صاحبؒ نے جواب مناسب دیا، اس نے کہا "مگر حسن بصریؒ نے اس کے خلاف بتایا ہے۔" امام صاحبؒ نے فرمایا "حسنؒ نے غلطی کی"۔ حاضرین میں سے ایک شخص حسنؒ کا معتقد تھا طیش میں آگیا، اور چھلا کر کہا "او ابن الفاحشہ! تو حسن کو خاطی کہتا ہے۔" اس گستاخی اور بے ہودہ گوئی نے تمام مجلس کو برہم کر دیا اور لوگوں نے چاہا کہ اس کو پکڑ کر سزا دیں، امام صاحبؒ نے روکا، ان کے لحاظ سے لوگ مجبور ہو گئے۔ مگر مجلس میں سناٹا رہا۔ لوگوں کا جوش کم ہوا تو امام صاحبؒ نے اس شخص کو مخاطب کیا اور فرمایا کہ ہاں حسنؒ نے غلطی کی، عبداللہ بن مسعودؓ نے اس باب میں جو روایت کی ہے وہ صحیح ہے۔"

عورت نے بھی شدت اختیار کر لی اور بولنا بند کر دیا۔ امام اعمش نے قسم کھائی کہ اگر آج کی رات تو مجھ سے نہ بولی تو تجھ پر طلاق بائنہ۔ امام اعمش نے کہنے کو تو کہہ دیا لیکن اس کے بعد بہت پریشان ہوئے کیونکہ چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ ادھر عورت درپئے آزار تھی۔ سوائے اس کے کوئی تدبیر نظر نہ آئی کہ امام صاحبؒ سے جا کر کوئی صورت دریافت کریں لہٰذا امام صاحبؒ کے گھر گئے اور صورت حال سامنے رکھی۔ امام صاحب نے فرمایا کوئی فکر کی بات نہیں ہے آج صبح کی اذان صبح صادق سے پہلے پڑھوا دوں گا چنانچہ امام صاحبؒ اس محلے کے مؤذن کے پاس پہونچے اور فرمایا آج صبح کی اذان صبح صادق سے پہلے پڑھ دینا وہ تیار ہو گیا اور صبح صادق سے پہلے اذان دے دی تو عورت کو خوشی ہوئی اور بولی: "خدا کا شکر ہے آج تجھ بوڑھے بد اخلاق سے میرا دامن پاک ہوا۔"

دو بھائیوں کا عقد

کوفہ میں ایک رئیس تھا۔ اس کے دو لڑکے تھے ان دونوں کی شادی ایک دوسرے رئیس کی دو لڑکیوں سے ہوئی تھی جب بارات رخصت ہو کر آئی تو غلطی سے عورتوں نے دلہنوں کو زفاف گاہ میں داخل کرنے میں تبدیل کر دی۔ اسی غلط فہمی میں ہر دولہا نے اپنی اسی دولہن سے وطی بھی کر لی جو اس کی خوابگاہ میں تھی۔ صبح ہوئی ادھر ولیمہ کا انتظام کافی تھا شہر کے شرفاء اور علماء موجود تھے کہ یکایک زنان خانے میں شور بلند ہوا۔ اہل خانہ باہر آئے تو نہایت پریشان اب جتنے منہ اتنی باتیں۔ بالآخر امام صاحبؒ سے دریافت کیا گیا تو آپ نے دونوں شوہروں کو بلایا اور دریافت کیا۔ رات تم نے جس دولہن کے ساتھ شب باشی کی ہے وہ تمہیں پسند ہے۔ اس نے کہا ہاں تب امام صاحبؒ نے فرمایا اچھا تم اپنی اصل منکوحہ کو طلاق دے دو اور اس کا آدھا مہر ادا کر دو اس کے بعد دونوں شوہروں کا عقد اسی عورت سے پڑھا دیا گیا جس کے ساتھ اس نے شب باشی کی تھی اس صورت میں عدت بھی کسی

حال معلوم ہو جائے گا :۔ ایک دن ایک مجلس میں امام ابو حنیفہؒ سفیان ثوریؒ، قاضی ابن ابی لیلیٰؒ موجود تھے ایک آدمی نے مسئلہ دریافت کیا کہ ایک سانپ اپنے سوراخ سے نکلا اور اہلِ مجلس میں سے ایک کے اوپر چڑھنے لگا اس نے اضطراب میں دوسرے پر پھینک دیا اور اسی طرح دوسرے نے تیسرے پر جھٹک دیا بالآخر سانپ نے آخری آدمی کے کاٹ لیا اور وہ مر گیا۔ اب دیت کس پر آئے گی۔ اس کے جواب میں کسی نے کہا پہلے پر آئے گی، کسی نے کہا سب پر آئے گی کسی نے کہا آخری پر آئے گی۔ امام صاحبؒ یہ سب سنتے رہے اور مسکراتے رہے۔ آخر میں امام صاحبؒ نے فرمایا جب پہلے آدمی نے دوسرے پر جھٹکا اور وہ محفوظ رہا تو پہلا آدمی تو بری الذمہ ہو گیا اسی طرح یکے بعد دیگرے سب بری الذمہ ہو گئے۔ ہاں صرف آخری آدمی سے پہلے آدمی کے بارے میں کلام ہے۔ اگر اس کے پھینکتے ہی سانپ نے کاٹ لیا تو اس پر دیت آئے گی اور اگر کچھ وقفہ کے بعد کاٹا تو یہ آدمی بھی بری الذمہ ہو گیا اور جو آدمی مرا صرف اسی کی غفلت پائی گئی، کیونکہ اس نے اپنی حفاظت میں جلدی اور تیزی سے کام نہیں لیا۔ خود اسی کا قصور ثابت ہوا۔ اس رائے سے سب نے اتفاق کیا اور امام صاحبؒ کی تعریف کی۔

امام صاحبؒ کا مسلک اور طلاق کی قسم

ایک آدمی امام صاحبؒ کے پاس آیا اور عرض کیا، میں جُنبی ہوں اور میں نے قسم کھائی ہے کہ اگر میں غسلِ جنابت کروں تو میری بیوی پر تین طلاق۔ اب کیا کروں؟ امام صاحبؒ نے اس کا ہاتھ پکڑا اور ایک نہر کے پُل پر لائے اور اسے نیچے دھکا دے دیا اور پھر اس کو باہر نکلوا لیا اور فرمایا جا، اب تو پاک ہو گیا اور تیری بیوی پر بھی تین طلاق نہیں پڑیں۔

غسل کے سلسلے میں امام صاحبؒ کا مسلک یہ ہے کہ ناک میں پانی ڈالنا کلی کرنا اور پورے جسم پر پانی بہانا فرض ہے جسم کو ملنا فرض نہیں ہے اور نیت بھی فرض نہیں ہے اور اس مسئلہ میں بلا قصد و ارادہ فرض ادا ہو چکے ہیں اس لئے غسل بھی ہو گیا اور اس شخص کی عورت پر بھی طلاق واقع نہیں ہوئی۔

(۲) آپ سے دریافت کیا گیا کہ ایک آدمی نے قسم کھائی کہ اگر میں آج کسی بھی وقت کی نماز ترک کروں تو میری بیوی پر تین طلاق، پھر قسم کھائی اگر میں آج اپنی بیوی سے وطی نہ کروں تو اس پر تین طلاق۔ پھر قسم کھائی کہ اگر میں آج غسل جنابت کروں تو اس پر تین طلاق۔ امام صاحبؒ نے فرمایا، اس شخص کو عصر کی نماز پڑھنا چاہئے۔ اور عصر اور مغرب کے درمیان اپنی بیوی سے وطی کر لینا چاہئے اور سورج چھپ جانے کے بعد غسل کر کے مغرب اور عشاء کی نماز ادا کرنی چاہئے۔

شریعت کی اصطلاح میں رات دن کے تابع ہے سورج غروب ہونے کے بعد اگلا دن شمار ہونے لگتا ہے، جیسا کہ رمضان، عید کی چاند رات ہوتے ہی رمضان اور عید کا حکم لگا دیا جاتا ہے۔

امام اعمشؒ شکل و صورت کے اعتبار سے تو اچھے نہ تھے مگر اُن کی بیوی نہایت حسین و جمیل تھی، اسی وجہ سے دونوں میں جھگڑا رہتا تھا۔ ایک دفعہ عشاء کے بعد دونوں میں جھگڑا شروع ہوا اور شدت اختیار کر گیا اور

امام صاحبؒ کی کنیت کی توجیہ

امام صاحبؒ کی کنیت جو نام سے زیادہ مشہور ہے حقیقی کنیت نہیں ہے۔ امام صاحبؒ کی کسی اولاد کا نام حنیفہ نہ تھا، یہ کنیت وصفی معنی کے اعتبار سے ہے یعنی ابوالملتہ الحنیفہ، قرآن مجید میں خدا نے مسلمانوں سے خطاب کرکے کہا ہے: فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا (آل عمران) "سو ابراہیم کی طریقہ کی پیروی کرو۔ جو ایک خدا کے ہو رہے تھے"

امام ابوحنیفہؒ نے اسی نسبت سے اپنی کنیت ابوحنیفہؒ اختیار کی۔

کروا ڈالا تھا۔ امام صاحبؒ نے فرمایا اور آپ ہی نے کونسی رعایت برتی تھی۔

حضرت امام اعظمؒ کی امام باقرؒ سے ملاقات

ایک دفعہ امام صاحبؒ مدینہ منورہ تشریف لے گئے وہاں امام باقرؒ سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے فرمایا آپ وہی ابوحنیفہ ہیں جنھوں نے میرے نانا کے دین کو بدل دیا ہے۔ امام صاحبؒ نے فرمایا یہ آپ کو غلط خبر پہونچی۔ مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ تشریف رکھیں تب میں اپنی صفائی پیش کروں۔ امام باقر بیٹھ گئے اور امام صاحبؒ ان کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ گئے اور فرمایا بتلائیے! عورت کمزور ہے یا مرد؟ انہوں نے کہا عورت! اچھا بتلائیے عورت کا حصہ کتنا ہے اور مرد کا کتنا؟ امام باقرؒ نے کہا مرد کے دو اور عورت کا ایک۔ تب امام صاحبؒ نے فرمایا اگر میں قیاس سے کام لیتا تو عورت (ضعیف) کے دو حصہ مقرر کرتا۔ پھر پوچھا، نماز افضل ہے یا روزہ؟ جواب دیا نماز! امام صاحبؒ نے فرمایا اگر میں قیاس سے کام لیتا تو عورت سے ایام حیض کی نمازوں کی قضا ادا کرواتا، اور روزے کی نہ کراتا کیونکہ نماز افضل ہے۔ پھر پوچھا نطفہ زیادہ نجس ہے یا پیشاب؟ فرمایا پیشاب! امام صاحبؒ نے فرمایا، اگر میں قیاس سے کام لیتا تو پیشاب سے غسل کو واجب قرار دیتا اور نطفہ سے وضو کو فرض قرار دیتا، مگر میں ایسا نہیں کرتا ہوں۔ تب امام باقرؒ نے امام صاحبؒ کی تحسین فرمائی اور پیشانی کو بوسہ دیا۔

امام رحمۃ اللہ علیہ کے چند حیرت انگیز فتوے اور مسائل

ان مناظروں کے علاوہ امام صاحبؒ کے چند حیرت انگیز فتاویٰ اور تعجب خیز مسائل اور مسکت جوابات کو سطور ذیل میں ذکر کیا جارہا ہے جن سے امام صاحبؒ کی حاضر جوابی اور ذہانت و ذکاوت اور تفقہ کا کچھ

سے قرأۃ خلف الامام پر مناظرہ کرنا چاہتے ہیں۔ امام صاحبؒ نے فرمایا تم سب سے ایک ساتھ کس طرح مناظرہ ہو سکتا ہے تم اپنے میں سے سب سے زیادہ عالم کو منتخب کر لو! انہوں نے ایک آدمی کو منتخب کر دیا امام صاحبؒ نے فرمایا: یہ تم میں سب سے زیادہ عالم ہے۔ انہوں نے جواب دیا ہاں! امام صاحبؒ نے پھر پوچھا، اگر یہ ہار گئے تو آپ کی ہار شمار ہو گی۔ انہوں نے کہا ہاں! تب امام صاحبؒ نے فرمایا مناظرہ ختم۔ اس وجہ سے کہ ہم نماز میں امام کو اسی لئے تو منتخب کرتے ہیں حدیث میں موجود ہے:

مَنْ كَانَ لَهُ اِمَامٌ فَقِرَأَةُ الْاِمَامِ قِرَأَةٌ لَهُ "جس کا امام موجود ہو تو امام کی قرأۃ اس کی قرأۃ ہوتی ہے"

ابنِ اسحاق سے مناظرہ

ایک دفعہ خلیفہ منصور نے اپنی رعایا کے سب علماء کو جمع کیا امام صاحبؒ بھی تشریف لائے۔ اتفاق سے ابن اسحاق صاحبِ مغازی بھی آئے یہ خلیفہ کے بیٹے کے استاذ تھے اور امام صاحبؒ سے حسد اور کینہ رکھتے تھے۔ انھوں نے خلیفہ کی موجودگی میں امام صاحبؒ سے دریافت کر لیا؟

"اے ابو حنیفہؒ! آپ کی کیا رائے ہے، اگر کسی آدمی نے یہ کہا کہ میں فلاں کام کروں گا یا نہیں کروں گا اور انشاء اللہ متصلاً نہیں کہا اور تھوڑی دیر کے بعد انشاء اللہ کہہ دیا"

امام صاحبؒ نے فرمایا استثنائے مقطوع سے اس کو کوئی فائدہ نہیں پہونچے گا ہاں اگر متصلاً کہتا تو اس کے حق میں مفید تھا۔ ابن اسحاق نے یہ سُنا اور خوش ہوئے اور کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ امیر المؤمنین کے جد اکبر حضرت ابنِ عباسؓ نے فرمایا ہے:۔

ان الاستثناء جائز ولو كان بعد سنة "استثناء اگر سال بھر کے بعد بھی ہو تب بھی جائز ہے"

اور حضرت ابنِ عباسؓ کا استدلال اس آیت سے ہے:۔

وَاذْكُرْ رَبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ "آپ جب اپنے رب کا نام بھول جائیں (تو جب یاد آئے) یاد کر لیجئے:

منصور نے کہا کیا حضرت ابنِ عباسؓ نے یہی فرمایا ہے........ ابن اسحٰق نے کہا جی ہاں! پھر کیا تھا منصور غضبناک ہوا اور ابن اسحٰق یہی چاہتے تھے خلیفہ نے کہا آپ حضرت ابنِ عباسؓ کی مخالفت کرتے ہیں امام صاحبؒ نے فرمایا:۔ نہیں! میرے پاس اس قول کی ایک بہترین تاویل ہے اور اس کے مقابلہ میں ایک حدیث ہے اور وہ یہ ہے کہ:۔

مَنْ حَلَفَ عَلٰى يَمِيْنٍ وَّيَسْتَثْنِيْ فَلَا حَنَثَ عَلَيْهِ "جس نے قسم کھائی اور استثناء کر لیا وہ حانث نہیں"

اور یہ جتنے حضرات ہیں آپ کی خلافت ہی کو نہیں مانتے ان حضرات کا کہنا ہے کہ ہمارے اوپر خلیفہ کی بیعت کی ذمہ داری نہیں اس لئے کہ ہم اپنے گھر جا کر انشاء اللہ کہہ لیتے ہیں غرض کہ یہ لوگ جب چاہیں استثناء کر لیں ان کے اوپر بیعت کی ذمہ داری نہیں رہتی۔ خلیفہ نے یہ سُنا اور حکم دیا ابن اسحاق کی گردن میں چادر ڈال کر باہر کر دو! جب امام صاحبؒ باہر تشریف لائے تو ابن اسحاق نے کہا آج تو آپ نے قتل ہی

ناسزاالفاظ کا جواب

ایک دن مسجد میں درس دے رہے تھے۔ ایک شخص نے جس کو اُن سے کچھ عداوت تھی، مجلس میں اُن کی نسبت ناسزاالفاظ کہے۔ انہوں نے کچھ التفات نہ کی اور اسی طرح درس میں مشغول رہے۔ شاگردوں کو بھی منع کر دیا کہ اس کی طرف متوجہ نہ ہوں، درس سے اُٹھے تو وہ شخص ساتھ ہوا اور جو کچھ مُنہ میں آتا تھا بکتا جاتا تھا، امام صاحبؒ اپنے گھر پہونچے تو کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ بھائی یہ میرا گھر ہے، کچھ ہے، کچھ باقی رہ گیا ہو تو اٹھا نہ رکھو، کہ اب میں اندر جاتا ہوں اور تم کو موقع نہ ملے گا۔

کو اختیار کر لیا۔ امام صاحبؒ فرماتے ہیں کہ جب کسی سے مناظرہ کرنا ہو تو اُلٹا اسی سے پوچھنا شروع کر دو تم ہی غالب آجاؤ گے۔

امام اعظمؒ کا ایک رومی سے مناظرہ

بغداد میں ایک رومی آیا اور اس نے خلیفہ سے آکر عرض کیا میرے یہ تین سوال ہیں اگر آپ کی سلطنت میں کوئی موجود ہو تو بلائیے! خلیفہ نے اعلان کرا دیا سب علما جمع ہوئے امام صاحبؒ بھی تشریف لائے۔ رومی ممبر پر چڑھا اور اس نے سوال کیا (۱) بتاؤ خدا سے پہلے کون تھا؟ (۲) بتاؤ خدا کا رُخ کدھر ہے؟ (۳) بتاؤ اس وقت خدا کیا کر رہا ہے؟۔ یہ سن کر سب خاموش ہو گئے۔ امام صاحبؒ آگے بڑھے اور کہا میں جواب دوں گا لیکن شرط یہ ہے کہ آپ ممبر سے نیچے اتر آئیں۔ رومی ممبر سے نیچے آگیا، امام صاحبؒ ممبر پر جا بیٹھے اور سوال دوہرانے کو فرمایا۔ رومی نے سوالات کا اعادہ کیا تو امام صاحب نے فرمایا (۱) گنتی شمار کرو، رومی نے گننا شروع کیا، امام صاحبؒ نے روکا اور کہا۔ ایک سے پہلے گنو! رومی نے کہا ایک سے پہلے کوئی گنتی نہیں ہے تو امام صاحبؒ نے فرمایا تو "خدا سے پہلے بھی کوئی نہیں ہے"

(۲) اور دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ امام صاحب نے ایک شمع روشن کی اور فرمایا، اس کا رُخ کدھر کو ہے؟ رُومی نے کہا "سب طرف کو ہے" امام صاحبؒ نے فرمایا" خدا کا رُخ بھی سب طرف کو ہے"

(۳) اور تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ خدا نے تجھے نیچے اُتار دیا اور مجھے اوپر چڑھا دیا۔ رُومی سُن کر شرمندہ ہوا اور واپس چلا گیا۔

امام رحمۃ اللہ علیہ کا اہل مدینہ سے مناظرہ

ایک مرتبہ امام صاحبؒ کی خدمت میں مدینہ منورہ سے کچھ حضرات آئے اور انہوں نے کہا کہ ہم آ

سے یہ شیطان بھی وہاں پہونچ گیا اور کہا کہ تمہارا اُستاذ تو مرگیا اور ہمیں اس سے نجات مل گئی۔ امام صاحبؒ نے فرمایا۔ بے شک، لیکن تمہارے اُستاذ (امام مہدی) کو قیامت تک کے لئے مہلت مل گئی ہے۔ یہ سن کر وہ حیران رہ گیا اور اپنا تہبند کھول کر کھڑا ہو گیا تو امام صاحبؒ نے آنکھیں بند کرلیں۔ اس نے کہا۔ آپ کب سے اندھے ہو گئے؟ امام صاحبؒ نے فرمایا خدا نے جب سے تیرا ستر پھاڑ دیا اور یہ فرما کر آپ باہر آگئے۔ (کردری)

امام اعظمؒ کا خوارج کے ساتھ مناظرہ

ایک دفعہ تقریباً ۷ خارجی امام صاحبؒ پر آچڑھے اور تلوار نکال کر کھڑے ہو گئے اور کہا کہ آپ کو قتل ہی کریں گے اس وجہ سے کہ آپ مرتکب کبیرہ کو کافر نہیں کہتے۔ امام صاحبؒ نے فرمایا پہلے تلوار نیاموں میں کرلو اس کے بعد سوال کرو اس کے بعد جو جی میں آئے کرنا۔ انہوں نے کہا ہم تو ان کو آپ کے خون سے رنگیں گے کیونکہ ایسا کرنے کو ہم ۷ سال جہاد فی سبیل اللہ سے افضل سمجھتے ہیں امام صاحبؒ نے فرمایا اچھا کہو کیا کہتے ہو تو خارجیوں نے کہا: "اس جگہ باہر دو جنازے ہیں جن میں ایک مرد ہے اور دوسرا عورت کا مرد شراب پی کر اسی حالت میں مرگیا۔ عورت عاملہ تھی اس نے خودکشی کرلی لہٰذا اب فرمایئے کیا کہتے ہیں؟"

امام صاحبؒ نے فرمایا اچھا یہ بتلاؤ یہ یہودی تھے یا نصرانی یا مجوسی۔ انہوں نے کہا اس میں سے کچھ بھی نہیں تھے تو امام صاحبؒ نے دریافت کیا تو پھر کس ملت سے تھے خارجیوں نے کہا وہ اس ملت سے تھے جو یہ کہتے ہیں اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ" امام صاحبؒ نے دریافت کیا کہ یہ کلمہ ایمان کا کون سا جزو ہے؟ نصف ہے یا چوتھائی یا تہائی۔ خارجیوں نے کہا یہ تو کُل ایمان ہے اس لئے کہ ایمان کے اجزاء نہیں ہوتے۔ امام صاحبؒ نے فرمایا تو اب تم ہی لوگ بتلاؤ یہ دونوں جنازے کس کے ہوئے مسلمان کے یا کافر کے؟ خارجیوں نے کہا اچھا اس کو رہنے دیجئے دوسری بات بتلایئے وہ یہ کہ: "یہ دونوں دوزخی ہیں یا جنتی؟" امام صاحبؒ نے فرمایا اس کے بارے میں تو وہی کہوں گا جو حضرت ابراہیمؑ نے ان دونوں سے زیادہ مجرم کے بارے میں فرمایا تھا یعنی:-

فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَهُوَ مِنِّيْ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ الآیۃ "جس نے میری اتباع کی وہ میرا ہے اور جس نے میری نافرمانی کی پس اے خدا تو غفور رحیم ہے" اور وہ کہوں گا جو حضرت عیسٰی علیہ السلام نے فرمایا تھا:-

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○

"اگر آپ ان کو عذاب دیں تو وہ آپ کے بندے ہیں اور اگر بخش دیں تو آپ غالب حکمت والے ہیں"۔

اور وہ کہوں گا جو حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا تھا۔

وَمَا عِلْمِيْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ اِنْ حِسَابُهُمْ اِلَّا عَلٰى رَبِّيْ۔

"جو کچھ انہوں نے کیا ہے وہ مجھ پر نہیں ان کا حساب تو اللہ تعالیٰ پر ہے وہ جو چاہے کرے"۔

یہ سن کر خارجیوں نے اپنی تلواروں کو نیاموں میں کرلیا اور تائب ہوئے اور عقیدہ اہلِ سنت والجماعت

امام اعظم کی خصوصیات

● تابعی تھے ● عالم، محدث، فقیہ، عابد، زاہد تھے ● محبِ اہل بیت تھے اور اس سلسلہ میں بڑی تکلیفیں وقت کی حکومت کے ہاتھوں اُٹھائیں ● امام مالک رحؒ سے عمر میں بڑے تھے لیکن اُن کے حلقہ درس میں شریک ہوئے ● فن فقہ کے موجد تھے۔ یہ نہ ہوتے تو آج فقہ کا علم نہ ہوتا ● دولتمند تھے لیکن دریا دل، معزز تھے لیکن منکسر المزاج، طاقت ور تھے لیکن متحمل ● حق کے مقابلہ میں حکومت کی ناخوشی مول لی۔ جیل بھیجے گئے، وہاں جب روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی تب رہائی ملی ● تقریباً تمام اسلامی حکومتوں کا مذہب حنفی رہا۔ عالم اسلام کی غیر معمولی اکثریت حنفی ہے ● امام جعفر صادق رحؒ کے اجل تلامذہ میں تھے۔

اتفاق سے امام صاحبؒ کی صاحبزادی نے اُن سے کوئی مسئلہ دریافت کیا، تو فرمایا جانِ پدر! اپنے بھائی حماد سے معلوم کرلو، مجھے حاکم کی طرف سے ممانعت ہے اور ہمیں اپنے حکام کا حکم ماننا چاہئے چند روز کے بعد خود گورنر ہی کو کوئی ضرورت پیش آئی جس کے لئے امام صاحبؒ کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ امام صاحبؒ نے فرمایا مجھے آپ کی طرف سے ممانعت ہے۔ گورنر نے کہا اب اجازت ہے۔

ایک شخص سے مناظرہ

کوفہ میں ایک شخص تھا جو حضرت عثمان غنیؓ کو کافر اور یہودی کہا کرتا تھا امام صاحبؒ کو خبر ہوئی تو اس کے پاس گئے اور کہا بھائی! میں تیری لڑکی کے لئے ایک آدمی کا پیغام لایا ہوں، وہ آدمی حافظ قرآن ہے، رات بھر نماز میں قرآن پڑھتا ہے، خدا کے خوف سے بہت روتا ہے لیکن وہ یہودی ہے اس شخص نے چہ خوش کیا میں اپنی لڑکی کی شادی یہودی سے کردوں؟ امام صاحبؒ نے فرمایا تو پھر پیغمبر خدا نے ایک چھوڑ دو لڑکی کی شادی حضرت عثمانؓ سے کیوں کردی تھی؟ یہ سن کر وہ متنبہ ہوا اور توبہ کی اور اپنی اس حرکت سے باز آیا۔

ایک دن امام صاحبؒ مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک عالم آیا جس کو "شیطان طاق" کہا جاتا تھا، اس نے کہا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے زیادہ طاقتور کون تھا؟ اس نے خود ہی کہا کہ ہم تو حضرت علیؓ کو کہتے ہیں اور آپ حضرت صدیق اکبرؓ کو کہتے ہیں، امام صاحبؒ نے فرمایا کہ حق حضرت علیؓ کا تھا، لیکن حضرت صدیق اکبرؓ نے قوت کے بل بوتے پر لے لیا تو کون طاقتور ہوا یہ سن کر وہ حیران رہ گیا۔

امام مرغینانی کہتے ہیں کہ امام حمادؒ کے انتقال کے بعد امام صاحبؒ ایک حمام میں تشریف لے گئے اتفاق

لئے تشریف لے گئے اور فرمایا: لَئِنْ مَّاتَ هٰذَا الْغُلَامُ لَمْ يَخْلُفْ عَلٰى وَجْهِ الْاَرْضِ مِثْلُهٗ۔

"اگر ان کا انتقال ہوگیا تو زمین پر ان کا کوئی جانشین ان جیسا نہ پایا جائے گا۔"

یعنی امام صاحبؒ نے امام ابو یوسفؒ کے کمالات کو سراہا۔ کچھ دنوں کے بعد امام ابو یوسفؒ اچھے ہوگئے تو انہوں نے اپنی مجلس درس علیحدہ قائم کرلی۔ امام صاحبؒ کو جب یہ معلوم ہوا تو انہوں نے ایک شخص کو سکھا کر بھیجا کہ یہ سوال کرنا:

"کہ ایک آدمی نے دھوبی کو کپڑا دھونے کے لئے دیا، جب وہ مانگنے آیا تو اس دھوبی نے کپڑا دینے سے انکار کر دیا۔ پھر اس کے بعد دھوبی کپڑا لے کر آیا تو کیا اس دھوبی کی اُجرت واجب ہوگئی یا نہیں؟ اگر ابو یوسفؒ کہیں واجب ہوگئی تو کہہ دینا غلط اور اگر کہیں نہیں واجب ہوئی تب بھی کہہ دینا غلط۔"

چنانچہ یہ آدمی گیا اور اس نے اسی طرح سے کہا جیسا کہ اس کو بتلایا گیا تھا تب تو امام ابو یوسفؒ گھبرا گئے اور اپنے اس فعل پر متنبہ ہو کر امام صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے امام صاحبؒ نے فرمایا: "آپ کو تو یہاں دھوبی والا مسئلہ کھینچ لایا ہے۔ پھر امام صاحبؒ نے جواب دیا اگر دھوبی نے کپڑا دھونے سے پہلے انکار کر دیا تھا تب تو وہ غاصب ہے اور غاصب کی اُجرت نہیں ہوتی اور اگر کپڑا دھونے کے بعد انکار کیا تھا تو اُجرت واجب ہوگئی تھی مگر جب وہ کپڑا لے کر آگیا تو اس پر سے غصب کا جرم ساقط ہوگیا اور اُجرت بدستور رہی۔

حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ کی قاضی ابن ابی لیلےٰ پر تنقید

ابن ابی لیلےٰ کوفہ کے قاضی اور بڑے فقیہ تھے ۳۳ سال منصب قضا پر فائز رہے امام صاحب اور ان کے درمیان کسی قدر رنجش رہتی تھی، ایک دن یہ اپنی مجلس قضا (مسجد) سے آ رہے تھے کہ راستہ میں ایک عورت کو ایک آدمی سے جھگڑتے دیکھا تو کھڑے ہوگئے۔ عورت نے اثنائے گفتگو میں اس مرد کو "یَا ابْنَ الزَّانِیَتَیْن" کہہ دیا، امام ابن ابی لیلےٰ نے سُنا اور عورت کو پکڑوا کر مجلس قضا (مسجد) میں لائے اور دو حد جاری کرنے کا حکم فرمایا، کیونکہ عورت نے ایک ساتھ اس شخص کے ماں اور باپ دونوں پر تہمت لگائی تھی۔ امام صاحبؒ کو جب یہ معلوم ہوا تو فرمایا ابن ابی لیلےٰ نے چند غلطیاں کی ہیں:

اصول عدالت کے خلاف لوٹ کر پھر مجلس قضا میں آئے (۱) اس میں کوئی مدعی نہیں تھا۔ ابن ابی لیلےٰ نے خود ہی مقدمہ بنا لیا (۲) عورت پر مجلس قضا ہی میں حد جاری کرادی۔ حالانکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت پر بٹھلا کر حد جاری کرنے کا حکم فرمایا ہے (۳) ایک ساتھ دو حد جاری کر دیں، حالانکہ ایک حد مارنے کے بعد جب آرام ہو جاتا تب دوسری حد جاری کی جاتی (۴) اس عورت پر دو حد نہیں آتی تھیں بلکہ ایک ہی حد کافی تھی اس لئے کہ اس نے ایک ہی جرم کیا تھا۔

قاضی صاحب یہ سن کر بہت برہم ہوئے اور امام صاحبؒ کی شکایت گورنر کوفہ سے جا کر کر دی۔ گورنر نے حکم دے دیا کہ امام ابو حنیفہؒ اب فتویٰ نہیں دے سکتے۔ چنانچہ امام صاحبؒ فتوے سے رک گئے ایک دن

بذل وعطا

ایک دفعہ لوگ ملنے آئے، ان میں ایک شخص ظاہری صورت سے شکستہ حال معلوم ہوتا تھا۔ لوگ رخصت ہوکر چلے تو امام صاحبؒ نے فرمایا ذرا ٹھہر جاؤ، جانماز کی طرف اشارہ کیا کہ اس کو اٹھا، اس نے دیکھا کہ ہزار درہم کی تھیلی تھی، عرض کی کہ میں دولت مند ہوں مجھ کو اس کی ضرورت نہیں فرمایا تو صورت ایسی بنانی چاہئے کہ دوسروں کو شبہ نہ ہو۔

ایمان کے بارے میں سوال کیا گیا اَوَلَمْ تُؤْمِنْ "کیا آپ ایمان نہیں لائے"، تو انہوں نے جواب میں فرمایا تھا۔ بَلٰی "بے شک میں ایمان لایا ہوں"

آپ نے یہاں ان کی تقلید کیوں نہیں کی تو قتادہ خاموش ہو گئے۔

یحییٰ بن سعید سے مناظرہ

یحییٰ بن انصاری کوفہ کے قاضی تھے اور سرکاری دربار میں اُن کا بڑا مرتبہ تھا، لیکن امام صاحب کے ہوتے ہوئے کوفہ میں ان کا کچھ بھی اثر نہ تھا جس کی وجہ سے وہ کہا کرتے تھے اہل کوفہ بھی عجیب ہیں محض ایک شخص (ابوحنیفہ) کے اشاروں پر حرکت کرتے ہیں۔ امام صاحبؒ نے امام ابویوسفؒ امام زفرؒ اور چند دیگر شاگردوں کو بھیجا کہ قاضی یحییٰ سے مناظرہ کریں چنانچہ یہ سب حضرات گئے امام ابویوسفؒ نے بیان کرنا شروع کیا۔

ایک غلام دو شخصوں میں مشترک ہے جن میں سے ایک آزاد کرنا چاہتا ہے تو وہ کرسکتا ہے یا نہیں؟

قاضی یحییٰ نے کہا نہیں کرسکتا ہے! کیونکہ حدیث میں موجود ہے لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ "نہ نقصان پہونچاؤ اور نہ نقصان اٹھاؤ" اور مسئولہ صورت میں چونکہ دوسرے شریک کا نقصان ہے اس لئے جائز نہیں ہے۔ امام ابویوسفؒ نے فرمایا، اگر دوسرا شریک آزاد کرے؟ تو قاضی صاحب نے جواب دیا تب جائز ہے اور غلام آزاد ہو جائے گا۔ امام ابویوسفؒ نے فرمایا آپ خود اپنے قول کی مخالفت کررہے ہیں کیونکہ آپ کے نزدیک ایک شریک کے آزاد کرنے سے غلام آزاد نہیں ہوتا، کیونکہ اگر وہ آزاد کرنا بھی چاہے تو آزاد نہیں ہوگا لہٰذا دوسرے شریک کے بارے میں بھی یہی صورت پیش آئے گی اور غلام بدستور غلام رہے گا۔

(سیرت النعمان)

حضرت امام اعظمؒ کی امام ابویوسفؒ کو تادیب

ایک دفعہ امام ابویوسفؒ شدید بیمار ہوئے اور بچنے کی کوئی امید باقی نہ رہی۔ امام ابوحنیفہؒ عیادت کے

جواب دوں گا۔ لہٰذا سوالات کرنے کے لئے ایک مخلوق جمع ہوگئی امام صاحبؒ بھی تشریف لائے اور کیوں نہ لاتے جب عام اجازت تھی ہاں اگرا بتداءً امام صاحبؒ کی طرف سے ہوتی تو گستاخی کی بات تھی کہ استاذ کا مقابلہ کیا لیکن جب اُستاذ ہی ایسا اعلان کرے تو پھر اس کے اندر گنجائش موجود ہے۔

امام صاحبؒ نے پوچھا، مفقود الخبر کی بیوی نے اس سے مایوس ہوکر اور یہ خیال کرکے کہ وہ مرگیا ہوگا، دوسرا نکاح کرلیا، کچھ عرصہ بعد اولاد پیدا ہوئی اتنے میں پہلا شوہر بھی آگیا۔ اب دونوں شوہروں میں سے ہر ایک اس اولاد سے انکار کرتا ہے کہ میری نہیں ہے گویا عورت پر زنا کی تہمت لگا رہا ہے۔ اس عورت کے ساتھ کس شوہر کو لعان کرنا چاہیئے۔ قتادہؒ نے کہا۔ کیا ایسا ہوا ہے۔ امام صاحبؒ نے ...

فرمایا ایسا ہوسکتا ہے، اس لئے علماء کو پہلے سے تیار رہنا چاہیئے۔ قتادہؒ نے کہا اس کو رہنے دیجئے کچھ تفسیر میں دریافت کیجئے۔ امام صاحبؒ نے دریافت کیا اس آیت کا مطلب بتلایئے:۔

قَالَ الَّذِیْ عِنْدَہٗ عِلْمٌ مِّنَ الْکِتَابِ اَنَا اٰتِیْکَ بِہٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْکَ طَرْفُکَ۔

"اس نے کہا جو کتاب اللہ کے علم سے واقف تھا میں آپ کے پاس ملکہ بلقیس کے تخت کو آپ کی پلک جھپکنے سے پیشتر لے آؤں گا"

یہ وہ قصہ ہے کہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ بلقیس کے تخت لانے کے بارے میں اعلان کیا کہ کون اس کو جلدی سے جلدی لاسکتا ہے تو اس روایت کے مطابق حضرت سلیمان علیہ السلام کے وزیر آصف بن برخیا نے (جن کو اسم اعظم آتا تھا) کہا کہ میں آپ کی پلک جھپکنے سے پہلے لاسکتا ہوں۔ یہ روایت اس وقت عام مسلمانوں میں بھی مشہور تھی لہٰذا حضرت قتادہؒ نے بھی یہی جواب دیا، تو امام صاحبؒ نے دریافت کیا کیا حضرت سلیمان علیہ السلام بھی اسم اعظم جانتے تھے؟ قتادہؒ نے کہا نہیں! تب امام صاحبؒ نے فرمایا ہر ایک نبی کے زمانے میں اس سے زیادہ کوئی دوسرا عالم نہیں ہوتا ہے۔ اس کے بعد قتادہؒ نے کہا اچھا عقائد کے بارے میں دریافت کیجئے آپ نے پوچھا آپ مومن ہیں؟ قتادہؒ نے کہا، ہاں انشاء اللہ میں مومن ہوں۔

محدثین کا مسلک یہ ہے کہ جب وہ اپنے ایمان کے بارے میں کہتے ہیں تو انشاء اللہ لگا دیتے ہیں۔ اسی طرح کسی نے امام حسن بصریؒ سے پوچھا تو انہوں نے بھی انشاء اللہ لگا دیا۔ سائل نے کہا یہاں انشاء اللہ کا کیا محل تھا تب حسن بصری نے فرمایا میں نے اس وجہ سے کہا کہ زبان سے دعویٰ کروں اور خدا کے نزدیک اس دعویٰ میں جھوٹا ثابت ہوں۔ امام صاحبؒ نے قتادہ سے کہا، ایسا کیوں کرتے ہو؟ تو انہوں نے فرمایا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تقلید میں:

وَالَّذِیْ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَلِیْ خَطِیْئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ (الآیۃ) "اور وہ ذات کہ جس سے میں امید کرتا ہوں کہ قیامت کو وہ میری خطائیں معاف کردے گا"

یہ ظاہر ہے کہ اس آیت سے استدلال ناقص ہے کیونکہ وجود ایمان اور آخرت میں مغفرت خطائے ذنوب کی امید دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں۔ امام صاحبؒ نے پھر سوال کیا حضرت ابراہیم سے جب ان کے

حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ کی ذکاوت اور ذہانت کے لئے یہی کیا کچھ کم ہے کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ان کے متعلق ارشاد فرمایا ہے :-

" اگر دین ثریا پر بھی ہوگا تو ابنائے فارس میں سے ایک شخص اس کو وہاں سے اُتار لائے گا" (مسلم)

علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ نے باتفاق علمائے اُمت اس کا مصداق امام صاحب رحمہ ہی کو قرار دیا ہے اسی طرح جب امام مالک رحمہ سے آپ کے بارے میں دریافت کیا گیا تو فرمایا :-

" اگر وہ شخص دلائل کے ذریعہ سے اس ستون کو سونے کا ثابت کرنا چاہے تو ثابت کر سکتا ہے۔"

امام صاحب رحمہ کی فہم و ذکاوت اور تفقہ کا اعتراف دانشمندان عالم نے کیا۔ امام صاحب رحمہ کا مدوّن شدہ فقہ ان کے علمی کمالات کا اعلان کر رہا ہے تاہم کچھ نمونے کے طور پر اس عنوان میں بھی درج کیا جاتا ہے۔

امام اعظم رحمہ کا قتادہ رحمہ سے مناظرہ

حضرت قتادہ رحمہ مشہور محدّث اور تابعی ہیں بصرہ وطن ہے حضرت انس رضی، حضرت عبداللہ بن جرجیس، حضرت ابوالطفیل رضی سے روایت کرتے ہیں۔ حضرت انس رضی کے دو شاگرد ہیں جو بہت مشہور ہوئے ہیں ان میں سے ایک یہ ہیں۔ حدیث کو اس طرح ادا کرتے ہیں کہ الفاظ و معنی میں ذرہ برابر فرق نہیں آتا تھا لوگ ان کو احفظ الناس کہتے تھے۔ امام صاحب رحمہ حدیث میں ان کے شاگرد ہیں۔

اُن کے متعلق ایک واقعہ مشہور ہے۔ یہ جب مدینہ منورہ میں حضرت سعید بن مسیّب سے حدیث پڑھتے تھے تو درمیان درس میں بہت زیادہ سوال کیا کرتے تھے ایک دن اُستاذ نے ان سے دریافت کر لیا کہ تم بہت زیادہ پوچھتے ہو کچھ یاد بھی رکھتے ہو تو انہوں نے بقیہ تاریخ لفظاً لفظاً سنا دیا امام صاحب رحمہ نے ان کے بارے میں فرماتے ہیں کہ قتادہ فقہ، واقفیت اختلاف، تفسیر میں بہت بڑے عالم ہیں۔

ایک دن حضرت قتادہ رحمہ کوفہ تشریف لائے اور اعلان کرا دیا کہ جس کو جو پوچھنا ہو پوچھے، میں اس کا

غرض سے شریک ہونے لگے تھے مثلاً مسعر بن کدام، امام اعمش، یہ حضرات دوسروں کو بھی آپ کے حلقہ درس میں شریک ہونے کے لئے کہتے تھے غرض کہ اس وقت اسلامی دنیا میں اسپین کے سوا کوئی حصہ ایسا نہ تھا کہ جہاں کے باشندے آپ کے حلقہ درس میں شریک نہ ہوتے ہوں۔ صاحب الجواہر المفیۃ نے ذکر کیا ہے کہ آپ کے حلقہ درس میں مکہ، مدینہ، دمشق، بصرہ، واسطہ، موصل، جزیرہ، رقہ، نصیبین، رملہ، مصر، یمن، یمامہ، بحرین، بغداد، اہواز، کرمان، اصفہان، حلوان، استرآباد، ہمدان، رے، قومس، ذوامغان، طبرستان، جرجان، نیشاپور، سرخس، بخارا، سمرقند، کس، صنعاء، ترمذ، ہرات، نہستار، الزم، خوارزم، سیستان، مدائن، مصیصہ، حمص وغیرہ اضلاع کے باشندے شریک رہتے تھے۔

امام صاحبؒ کے حلقہ درس کی یہ مقبولیت بلا وجہ نہیں تھی بلکہ لوگوں کو امام صاحبؒ کی حق گوئی، نفسی زہد و تقویٰ، قوت استدلال، مشکوٰۃ نبوت سے اخذ و استنباط نے گرویدہ بنا دیا تھا علوم کے پیاسے دنیا بھر میں گشت کرآتے تھے لیکن ان کی تشنگی یہیں رفع ہوتی تھی لہٰذا کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ ایک خلق کثیر ایک ایسے شخص کے گرد جمع ہو گئی تھی جو قیاس، مرجی، ضعیف اور روایت حدیث میں ایک نا قابل استناد شخص ہو بلکہ ہمارا عقیدہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ: "میری امت گمراہی پر مجتمع نہ ہو سکے گی۔"

پھر زمانہ بھی وہ جس کو خیر القرون کی شرافت حاصل ہے جن کو شر کے مقابلہ میں خیر سے زیادہ تعلق ہے جو اپنی دیانت، امانت، زہد و تقویٰ وغیرہ اوصاف حمیدہ میں آج کے انسانوں سے بدرجہا بہتر اور افضل ہیں جو حق گوئی اور بے باکی میں بڑی سے بڑی شخصیت سے مرعوب ہونا نہیں جانتے تھے اُن کے بارے میں ہم یہ خیال نہیں کر سکتے کہ ایک غلط آدمی کے گرد جمع ہو گئے تھے بلکہ حق یہی ہے کہ اس زمانے کے صاحب فضل و کمال حضرات کا امام صاحبؒ کے گرد جمع ہو جانا، امام صاحبؒ کے فضل و کمال ہی کی وجہ سے تھا۔

یہ ایک نا قابل انکار حقیقت ہے کسی زمانے میں بھی ایسا نہیں ہوا ہے کہ کسی نا اہل کے گرد اس زمانے کے عقلاء اور علماء جمع ہوئے ہوں اور اگر کسی ذی علم صاحب فہم کو کسی نا اہل کے گرد دیکھا جائے تو اس کلیہ پر کوئی فرق نہیں آتا ہے کیونکہ اس صاحبؒ علم و فہم کا انکار اس کے اس غلط اقدام سے ہو رہا ہے کہ وہ نا اہل کے حضور میں حاضر ہو گیا ہے۔

امام صاحبؒ کے گرد جو حضرات تھے وہ اپنے زمانہ کے آفتاب و ماہتاب تھے ان میں سے ۲۸ آدمی تو قاضی ہونے کے لائق تھے اور بڑی تعداد ایسی تھی جو مفتی بنانے کی اہلیت رکھتے تھے۔ امام صاحبؒ بھی ان کے قدر داں تھے۔ کبھی کبھی امام صاحبؒ نے اپنی رائے کو ان پر نہیں تھوپا تین تین، چار چار دن کم بلکہ بعض دفعہ پورے پورے مہینہ آزادی کے ساتھ گفتگو چلتی رہتی تھی۔ یہ امام صاحبؒ کے کمال ہی کی دلیل ہے کہ انہوں نے اپنے مقابلہ اور موجودگی میں آزادی رائے کو نہیں روکا۔" اسلام کے نزدیک آزادی رائے یہی ہے۔

حلقۂ درس کی مقبولیت

مندرجہ بالا خصوصیات کی وجہ سے امام صاحبؒ کے حلقۂ درس کو بے انتہا مقبولیت حاصل ہوئی ابتداءً تو صرف امام حمادؒ کے تلامذہ ہی شریک رہتے تھے لیکن بعد میں ائمۂ فن اور آپ کے اساتذہ بھی استفادہ کی

بھری مجلس میں یہ کوئی معمولی حادثہ نہ تھا نہ معلوم کتنے تلامذہ کے خون کھولنے لگے ہوں گے اور کتنوں نے آستینیں چڑھالی ہوں گی۔ آپ نے سب کو خاموش کیا اور پھر نرمی سے فرمایا۔
واللہ اخطا الحسن واصاب ابن مسعود "قسم خدا کی حسن سے خطا ہوئی اور ابن مسعودؓ نے صحیح فرمایا"
ایسے ناخوشگوار مواقع پر آپ یہ فرمایا کرتے تھے

اللھم من ضاق بنا صدرہ فان قلوبنا قد اتسعت لہ

"اے اللہ جن کے قلوب ہماری جانب سے تنگ ہیں ہمارے قلوب ان کے لئے کشادہ ہیں"
چنانچہ آپ ایسے گستاخوں کو معاف کر دیتے تھے۔ آپ نے ارشاد فرمایا ہے "اہل علم میں سے اگر کسی نے میرے متعلق کچھ کہا ہے اور وہ چیز میرے اندر نہیں ہے تو وہ غلطی پر ہے اور علماء کی غیبت تو کچھ نہ کچھ ان کے بعد میں بھی رہتی ہے۔"
امام صاحبؒ درس پوری محویت اور توجہ کے ساتھ دیتے تھے، اگر کوئی حادثہ بھی پیش آجاتا تو آپ کی محویت میں فرق نہیں آنے پاتا تھا ایک مرتبہ چھت میں سے آپ کی گود میں سانپ آگرا۔ لوگ دیکھتے ہی بھاگ کھڑے ہوئے لیکن آپ کی ہیئت میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی معمولی طور پر کپڑے کو جھٹک دیا اور پڑھانا شروع کر دیا۔
امام صاحبؒ چونکہ نہایت ذہین تھے اس لئے حاضر جواب بھی تھے۔ درسگاہ میں کوئی کیسا ہی سوال پیش کرے فوراً ہی اس کا جواب دیتے تھے ایک مرتبہ آپ کی مجلس میں ضحاک بن قیس خارجی نے کہا آپ حکم بنانے کو کیوں جائز قرار دیتے ہیں امام صاحبؒ نے فرمایا اگر میں عرض کروں تو فیصلہ کون کرے گا۔ ضحاک نے کہا ان میں سے جس کو چاہو مقرر کرلو وہی فیصلہ کر دے گا۔ امام صاحبؒ نے فرمایا یہی تو میں کہتا ہوں۔
اس قسم کے واقعات اگرچہ خارج از موضوع ہیں لیکن بتلانا یہ ہے کہ سلسلہ درس کے درمیان آپ کو اس قسم کے واقعات سے بھی سابقہ پڑتا تھا غالباً اس وقت کا دستور یہی ہوگا۔
امام صاحبؒ اپنی رائے میں نہایت محتاط تھے اپنی رائے کو حرفِ آخر نہیں سمجھتے تھے بلکہ اظہار رائے کے بعد فرما دیتے تھے:

ھٰذَا رَاْئِیْ وَھُوَ اَحْسَنُ مَا قَدَرْنَا عَلَیْہِ فمن جاء باحسن من قولنا فھو اولیٰ بالصواب
"میری یہ رائے احسن ہے جس پر میں قادر تھا لیکن اگر کوئی اس سے بھی اچھی رائے ظاہر کرے وہی قبولیت کے لئے زیادہ مناسب ہے۔"
ایک مرتبہ کسی تلمیذ نے حلقہ درس میں سے کہا آپ کا یہ ارشاد خوب ہے۔ آپ نے فرمایا ممکن ہے کہ غلط ہو۔
امام ابو یوسفؒ کی عادت تھی کہ تقریرات درس قلمبند کرتے رہتے تھے ایک دن امام صاحبؒ نے فرمایا مجھ سے سنا کرو لکھا نہ کرو، ممکن ہے کہ آج کی بات کل کو غلط ثابت ہو جائے۔

امام صاحبؒ اور والدہ کی خدمت

امام صاحبؒ کے والد نے امام کے سن رشد سے پہلے قضا کی، لیکن والدہ مدت تک زندہ رہیں اور امام کو ان کی خدمت گذاری کا کافی موقع ہاتھ آیا، وہ مزاج کی شکّی تھیں، اور جیسا کہ عورتوں کا قاعدہ ہے واعظوں اور قصہ گویوں کے ساتھ نہایت عقیدت رکھتی تھیں، کوفہ میں عمرو بن زرقہ ایک مشہور واعظ تھے اُن کے ساتھ خاص عقیدت تھی۔ کوئی مسئلہ پیش آتا تو امام صاحبؒ کو حکم دیتیں کہ عمرو بن زرقہ سے پوچھ آؤ، امام تعمیل ارشاد کے لئے اُن کے پاس جاکر مسئلہ پوچھتے، وہ عذر کرتے کہ آپ کے سامنے میں کیا زبان کھول سکتا ہوں، فرماتے کہ والدہ کا یہی حکم ہے۔" اکثر ایسا ہوتا کہ عمرو کو مسئلہ کا جواب نہ آتا تو امام صاحبؒ سے درخواست کرتے کہ آپ مجھ کو بتا دیں میں اسی کو آپ کے سامنے دہرا دوں گا۔"

کبھی کبھی اصرار کرتیں کہ میں خود چل کر پوچھوں گی، خچر پر سوار ہوتیں امام صاحبؒ پا پیادہ ساتھ ہوتے خود مسئلہ کی صورت بیان کرتیں اور اپنے کانوں سے جواب سن لیتیں، تب تسکین ہوتی، ایک دفعہ امام صاحبؒ سے پوچھا کہ یہ صورت پیش آئی ہے، مجھ کو کیا کرنا چاہئے، امام صاحبؒ نے جواب بتایا۔ بولیں تمہاری سند نہیں، زرقہ واعظ تصدیق کریں تو مجھ کو اعتبار آئے، امام صاحبؒ ان کو لے کر زرقہ کے پاس گئے اور مسئلہ کی صورت بیان کی، زرقہ نے کہا آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ آپ کیوں نہیں بتا دیتے، امام صاحبؒ نے فرمایا میں نے یہ فتویٰ دیا تھا زرقہ نے کہا کہ بالکل صحیح ہے۔ یہ سن کر ان کو تسکین ہوئی اور گھر واپس آئیں۔ ابن ہبیرہ نے جب امام صاحبؒ کو بلا کر میر منشی مقرر کرنا چاہا اور انکار کے جرم پر دُرّے لگوائے، اس وقت امام صاحبؒ کی والدہ زندہ تھیں، ان کو نہایت صدمہ ہوا، امام صاحب فرمایا کرتے تھے کہ مجھ کو اپنی تکلیف کا چنداں خیال نہ تھا البتہ یہ رنج ہوتا تھا کہ میری تکلیف کی وجہ سے والدہ کے دل کو صدمہ پہونچتا ہے۔

کہ ایک دن دھوپ کے سایہ میں امام محمدؒ کی داڑھی کے بال دکھلائی دیئے تب امام صاحبؒ کو معلوم ہوا۔ یہ کتنے بڑے تقوے کی بات ہے کہ آپ امرد کو بھی نہیں دیکھتے تھے۔

امام صاحبؒ چونکہ نہایت محتاط اور متحمل المزاج واقع ہوئے تھے اس لئے طلبار کے اشکالات اور اعتراضات کو نہایت خندہ پیشانی سے سنتے اور نہایت نرمی سے اس کا جواب دیتے تھے ایک دفعہ آپ کے حلقہ درس میں واعظ عراق جو حسن بصریؒ کے عزیز بھی ہوتے تھے، شریک تھے۔ امام صاحبؒ نے کسی مسئلہ پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا الخطا الحسن یعنی حسن سے چوک ہوگئی۔ اس پر واعظ عراق کو غصہ آگیا اور فوراً ہی اٹھ کر کہہ دیا:

تقول الحسن اخطا یا ابن الزانیۃ "ارے حرامی بچے تو حسن کو یہ کہتا ہے کہ اس نے خطا کی۔"

"مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا ہے کہ مذہب حنفی میں عمدہ راستہ ہے اور جو سنت بخاریؒ کے زمانے میں جمع ہوئی ہے اس سے زیادہ موافق ہے یعنی صحیح حدیثا سے۔"

حضرت مجدد الف ثانیؒ اور حضرت شاہ صاحبؒ کے ان دونوں ارشاد کی حقیقت اگرچہ کشف کی ہے لیکن نواب صدیق حسن صاحب فرماتے ہیں:

اگر کشف دو کس باہم متوافق شود ظن غالب شود۔" دو بزرگوں کے کشف اگر موافق ہوجائیں تو غلبہ ظن کا حکم رکھتے ہیں۔"

اس میں شک نہیں کہ امام صاحبؒ کا طریقہ تعلیم اور آپ کی درسگاہ کے اصول کی بنیاد کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور اقوال صحابہ پر تھی آپ نے ان کو سمجھا اور حقیقت کو ظاہر فرمایا۔ یہی وجہ ہے کہ حنفی مسلک کے تمام مسائل جہاں ایک طرف عقل کے معیار پر پورے اترتے ہیں وہاں وہ قرآن و حدیث سے بھی پورے طور پر وابستہ ہیں گویا امام صاحبؒ کا فقہ قرآن و حدیث کی ایک صحیح اور مدوّن شدہ تفسیر ہے، جس میں اصول و فروع کے ساتھ ترتیب بھی ہے۔ اور انسانوں کے لئے ایک بہترین لائحہ عمل بھی۔

حالاتِ درس

گزشتہ زمانے میں سامعین کو آواز پہونچانے کے لئے اُستاذ کسی بلند مقام پر بیٹھ جاتا اور سامنے تلامذہ کا حلقہ حسب استعداد دو زانو ہوتا اُستاذ کسی مسئلہ کو بیان کرتا اور طلبار یاد کر لیتے تھے لیکن جن لوگوں کو اپنے حافظہ پر اعتماد نہ ہوتا وہ لکھ بھی لیتے تھے یہی حال امام صاحبؒ کے حلقہ درس کا تھا۔

امام صاحبؒ چونکہ ایک بڑے زبردست متکلم بھی تھے اس لئے ہر ایک مسئلہ پر بحث و نظر اور تنقید و تبصرہ بھی کیا جاتا تھا ان پر استدلال اور اعتراضات کی بھرمار بھی ہوتی تھی اور ایک ایک مسئلہ پر بہت کافی عرصہ تک بحث کا سلسلہ جاری رہتا تھا تب کہیں تلامذہ اپنے اپنے صحیفوں میں اس کو درج کرتے تھے۔

امام صاحبؒ کی درسگاہ کی ہفتہ میں دو یوم کی تعطیل رہتی تھی یعنی جمعہ اور ہفتہ۔ ہفتہ کا دن آپ کی ذاتی اور گھریلو مصروفیات کا دن تھا۔ جمعہ کا دن اہتمام جمعہ اور احباب سے ملاقات کے لئے مقرر تھا اس روز آپ کے احباب جمع ہوتے اور آپ ان کے لئے انواع و اقسام کے کھانے تیار کراتے تھے۔ روزانہ اشراق سے چاشت تک تجارتی کاروبار کی نگرانی بھی فرماتے تھے اور پھر بعد ظہر سے شام تک درس کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ امام صاحبؒ کے اوقات یہی ہوں بلکہ حالات و زمان کے اعتبار سے آپ ان اوقات میں ترمیم اور تبدیل بھی فرمالیتے تھے۔

طلبار کی نشست و برخاست کا بھی آپ بہت زیادہ خیال رکھتے تھے۔ امام محمدؒ چونکہ نوعمر اور حسین و جمیل تھے جب یہ آپ کی درسگاہ میں داخل ہوئے تو آپ نے ان کو اپنی پشت کی طرف بیٹھنے کے لئے فرمایا اور جب ان کے داڑھی نکل آئی تو سامنے بٹھانا شروع کر دیا تھا۔ بعض نے اس طرح بھی روایت کیا ہے

امام صاحبؒ کی درباری ٹوپی

امام صاحبؒ اگرچہ دربار سے متعلق نہ تھے لیکن اس قسم کی ٹوپی جو اہل دربار اور امرا کے ساتھ مخصوص تھی، کبھی کبھی استعمال کرتے تھے۔ دنیا دار دولت مندوں کے لئے تو ایک معمولی بات ہے لیکن علمار کے دائرے میں یہ امر تعجب کی نگاہ سے دیکھا گیا کہ امام صاحبؒ کے توشہ خانہ میں اکثر سات آٹھ ٹوپیاں موجود رہتی تھیں۔

اور باتوں میں بھی امام صاحب کا طرز معاشرت ان حیثیتوں میں علمار سے بالکل جُدا تھا۔ ان کے ہمعصر عمومًا شاہی دربار یا وزرار اور امرار کے وظیفہ خوار تھے، اور اس کو عیب نہیں سمجھتے تھے۔ قاضی ابن عبدالبر پر کسی نے اعتراض کیا تھا کہ آپ امرار کے وظیفہ خوار ہیں۔ انہوں نے اس کے جواب میں بعض صحابہ اور بہت سے تابعین اور تبع تابعین کی نظیریں پیش کیں جو امرار کے روزینے اور انعامات سے زندگی بسر کرتے تھے۔

ہے کہ صحیح حدیث میرا مذہب ہے"

امام صاحبؒ کے طریقہ اجتہاد اور اس میں سلامت روی اور احتیاط کے متعلق ابن حزم جیسے انسان نے اعتراف کیا ہے:۔

جمیع اصحاب ابی حنیفۃ مجمعون ان مذھبہ ان ضعیف الحدیث اولیٰ عندہٗ من القیاس۔ (خیرات الحسان ص۲۷)

"تمام اصحاب ابی حنیفہؒ کا اتفاق ہے کہ امام صاحبؒ کا مسلک یہ ہے کہ ضعیف حدیث قیاس سے بہتر ہے"

غالبًا یہی وجہ ہے کہ متاخرین کی ان مایہ ناز اور بین الاقوامی شخصیتوں نے (جو اپنے زمانے میں حق و صداقت کا روشن منارہ رہیں اور مذہبی تعصب کو اپنے پاس کبھی نہیں آنے دیا) حنفی مکتب فکر کی تائید کی اور اس کو اختیار کیا۔ حضرت مجدّد الفِ ثانی بیان فرماتے ہیں:

بریں فقیر ظاہر ساختہ اند کہ در خلافیات کلام حق بجانب حنفی است و در خلافیات فقہی در اکثر مسائل حق بجانب حنفی و در اقل متردد۔

"اس فقیر پر ظاہر ہوا ہے کہ خلافیات علم کلام میں حق حنفی مسلک کی جانب ہے اور خلافیات فقہی کے اکثر مسائل میں حق بجانب حنفی ہے اور بہت کم میں تردّد ہے"

اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے فیوض الحرمین میں ارشاد فرمایا ہے:۔

عرفنی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان فی المذاھب الحنفی طریقۃ انیقۃ ھی اوفق الطرق بالسنۃ المعروفۃ التی جمعت ونضجت فی زمان البخاری۔

امام اعظم ابوحنیفہ موجود تھے، جنازہ رکھا ہوا تھا، کسی میں اٹھانے کی مجال نہ تھی کسی عالم کی سمجھ میں مسئلہ کا حل نہیں آتا تھا۔ سب پریشان تھے کیا کرنا چاہیئے۔ آخر میں امام صاحبؒ سے دریافت کیا تو آپ نے میت کی ماں کو بُلوایا اور فرمایا تو یہیں نماز جنازہ پڑھ لے" جب وہ نماز جنازہ پڑھ چکی تو فرمایا "اب واپس ہو جاؤ" وہ واپس چلی گئی تب جنازہ اُٹھایا گیا اس وقت ابن شبرمہ نے امام صاحبؒ کے بارے میں ارشاد فرمایا:۔

عجزت النساء ان یلدن مثله "عورتیں ان جیسا پیدا کرنے سے عاجز ہیں"

یعنی اب امام صاحبؒ جیسا اس دنیا میں پیدا نہ ہو سکے گا فقہ فی الحدیث اسی کا نام ہے کہ تمام نصوص سامنے رہیں اور حوادثات کی نزاکتیں بھی پیش نظر رہیں اور حد شریعت میں ذرہ برابر بھی بال نہ آنے پائے یہ صرف امام صاحبؒ کا ہی دل گردہ ہے کہ وہ ان سب نزاکتوں کو سامنے رکھتے ہیں۔

غرض کہ اس قسم کے واقعات تاریخ فقہ میں ہزار ہا موجود ہیں جن کی وجہ سے فقہ کے ساتھ حدیث کا تعلق اور اس کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے امام ترمذیؒ نے اپنی جامع میں بیان فرمایا ہے:۔

وکذلك قال الفقهاء وهم اعلم بمعنى الحديث "فقہا نے یوں ہی فرمایا ہے اور وہ ہی حدیث کے معنی سے زیادہ واقف کار ہیں"۔

چوتھی صدی ہجری کے مشہور محدث امام ابوبکر محمد بن اسحاق نے اپنی کتاب "معانی الاخبار" میں چند جگہ تحریر فرمایا ہے کہ شرعی علوم میں علماء کا اطلاق صرف فقہاء ہی پر ہوتا ہے۔ دوسرے علماء کو قید کے ساتھ بولتے ہیں مثلاً علمائے حدیث، علمائے تفسیر وغیرہ" فقہ ہی وہ علم ہے جو سب کو جامع ہے غالباً اسی وجہ سے فہم حدیث اور قرآن کے لئے فقہ ضروری ہے۔

اصول درسگاہ ابی حنیفہؒ

اسی سے امام صاحبؒ کی درسگاہ کے درسی اصول بھی معلوم کئے جا سکتے ہیں تاہم امام صاحبؒ کے طریقہ درس کے متعلق تصریحات بھی موجود ہیں۔

امام صاحبؒ کی عادت تھی کہ وہ پہلے کسی مسئلہ میں قرآن سے استدلال کرتے تھے پھر احادیث کی طرف متوجہ ہوتے اور اس کے بعد اقوال صحابہ کا تتبع فرماتے تھے۔ اقوال صحابہؓ میں اقرب الی القرآن اور پھر اقرب الی الحدیث کو ترجیح دیتے تھے اور بس امام صاحبؒ اقوال تابعین کا تتبع نہیں فرماتے بلکہ آپ کا فرمانا ہے کہ:

نَحْنُ رِجَالٌ وَّهُمْ رِجَالٌ "ہم بھی آدمی ہیں اور وہ بھی آدمی ہیں"

لہٰذا اجتہاد فرماتے اور یہ اجتہاد ان کا کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ و نیز آثار صحابہؓ کے خلاف ہرگز نہیں ہوتا تھا۔ امام صاحبؒ کا فرمانا ہے:

اترکوا قولی بخبر رسول الله صلى الله عليه وسلم وقول الصحابة ونقل انه قال اذا صح الحديث فهو مذهبی - (تفسیر مظہری)

"میرے قول کو خبر رسول ﷺ اور قول صحابہؓ کے مقابلہ میں ترک کر دو۔ آپ کے بارے میں منقول

امام صاحبؒ کا استقلال

ایک دفعہ مسجد میں بیٹھے تھے، کسی نے آکر کہا کہ فلاں شخص کوٹھے پر سے گر پڑا۔ دفعۃً اس زور سے چیخ اٹھے کہ مسجد میں تہلکہ پڑ گیا۔ حلقۂ درس چھوڑ کر برہنہ پا دوڑے اور اس شخص کے گھر پر جاکر بہت کچھ غمخواری اور ہمدردی کی جب تک وہ اچھا نہ ہوا روزانہ صبح کو جاتے اور اس کی تیمارداری کرتے، تاہم اپنے اوپر کوئی مصیبت آن پڑتی تو اس استقلال سے برداشت کرتے کہ لوگوں کو تعجب ہوتا عمال اور اہل دربار کے ہاتھ سے اکثر ان کو تکلیفیں پہونچیں مگر کبھی ان کے پائے ثبات کو لغزش نہیں ہوئی نہایت مضبوط دل رکھتے تھے۔ اور ضبط واستقلال گویا مایۂ خمیر تھا۔

ایک دن جامع مسجد میں درس دے رہے تھے، مستفیدوں اور ارادت مندوں کا مجمع تھا۔ اتفاقاً چھت سے ایک سانپ گرا، امام کی گود میں آیا، تمام لوگ گھبرا کر بھاگ گئے مگر وہ اسی اطمینان سے بیٹھے رہے، امام مالک کو بھی ایک بار ایسا ہی اتفاق پیش آیا اور وہ ان کی تاریخ زندگی کا مشہور اور دلچسپ واقعہ ہے۔

بات نہایت کم کرتے اور غیر ضروری باتوں میں کبھی دخل نہ دیتے۔ درس میں بھی معمول تھا کہ شاگرد آپس میں نہایت آزادی سے بحثیں کرتے، آپ چپ بیٹھے سنا کرتے جب بحث زیادہ بڑھ جاتی اور کسی بات کا تصفیہ نہ ہوتا تو قولِ فیصل بیان کر دیتے کہ سب کو تشفی ہو جاتی۔

اُستاذ نے حضرت عبداللہ کا یہ مسئلہ کیوں ترک کر دیا کہ باندی پر آزاد ہونے سے طلاق واقع ہو جاتی ہے امام ابویوسف نے فرمایا اسی حدیث کی وجہ سے جو آپ نے اُن سے بواسطہ ابراہیم عن اسود عن عائشہؓ بیان فرمائی ہے کہ بریرہؓ جب آزاد ہوئیں تو اُن کی آزادی طلاق نہیں سمجھی گئی، بلکہ ان کو یہ اختیار دیا گیا کہ اگر وہ چاہیں تو اپنے پہلے نکاح کو قائم رکھیں اور چاہیں تو فسخ کر دیں۔ اس پر اعمش نے فرمایا بلاشبہ ابوحنیفہؒ نہایت سمجھدار ہیں۔

اسلامی شریعت میں عورتوں کو اجازت نہیں ہے کہ وہ جنازے کے ساتھ چلیں یا جنازہ کی نماز میں شرکت کریں، چنانچہ ابوداؤدؒ نے ام عطیہؓ کی روایت نقل کی ہے :۔ نهينا ان نتبع الجنائز "ہمیں جنازہ کے ساتھ چلنے سے منع کیا گیا ہے۔" (ابوداؤد، کتاب الجنائز)

صاحب درمختارؒ نے بیان فرمایا ہے :۔ يكره خروجهن تحريما عورتوں کا جنازہ کے ساتھ چلنا مکروہ تحریمی ہے۔

امام صاحبؒ کے زمانہ میں ایک واقعہ ایسا ہوا کہ کوفہ کے خاندان سادات میں سے کسی ہاشمی جوان کا انتقال ہوا، فرطِ محبت میں اس کی ماں نے جنازہ کے ساتھ چلنے اور نماز پڑھنے کی ضد کی، بہت سمجھایا اور منع کیا تو قسم کھائی کہ بغیر جنازہ کی نماز پڑھے واپس نہ ہوں گی اس کے شوہر یعنی میت کے باپ نے جب دیکھا تو کہا، اگر یہ یہیں سے واپس نہ ہوئی تو اس پر طلاق، اس وقت امام سفیان ثوریؒ، ابن ابی لیلےٰ، ابن شبرمہ، ابوالاحوص، حبان اور

قبول کرنے کے لئے سدِّراہ بنے۔ آپ فرماتے ہیں کہ خوف کی وجہ سے میں نے مجلس میں آنا جانا بھی بند کر دیا تھا اور لوگوں سے صفائی کے ساتھ کہہ دیا تھا کہ مجھے اندیشہ ہے۔ بالآخر جب ابن سیرین سے دریافت کیا تو انہوں نے بتلایا:۔

صَاحِبُ هٰذِهِ الرُّؤْيَا يُحْيِي عِلْمًا: "یہ خواب دیکھنے والا علم کو زندہ کرے گا۔"

اس کے علاوہ اور دوسرے اسباب بھی پیدا ہو گئے جن کی وجہ سے آپ نے حلقہ درس کی ذمہ داریوں کو سنبھال لیا۔

فقہ اور حدیث

مجلس فقہ اور حدیث میں کچھ زیادہ مغایریت نہیں بلکہ تنہا فقہ کا درس تمام چیزوں کا جامع ہے کیونکہ ایک مجتہد کے نزدیک الفاظ حدیث پر بحث کرتے وقت معنی حدیث کو خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے اور محدثین کرام کے یہاں صرف الفاظ حدیث ہی مقصود بالذات ہوتے ہیں لہٰذا محدّث بننے کے لئے اجتہاد کی شرط نہیں ہے اور نہ فقہ کی لیکن ایک فقیہ کے لئے حامل قرآن و حدیث ہونا ضروری ہے ورنہ اس کا اجتہاد غلط اور باطل ہوگا صاحبِ ہدایہ فرماتے ہیں:۔

ان یکون صاحب حدیث له معرفة بالفقه لیعرف معانی الآثار وصاحب فقه له معرفة بالحدیث لئلا یشتغل بالقیاس "مجتہد ایسا صاحبِ حدیث ہو کہ اس کو فقہ بھی آتا ہو تاکہ احادیث کے معنی جان سکے اور صاحبِ فقہ کے لئے معرفت حدیث ضروری ہے تاکہ قیاس میں مبتلا نہ ہو جائے۔" اس لئے کہ نصوص کی موجودگی میں قیاس جائز نہیں ہے۔

فقہ کے لئے حدیث کی اہمیت تو ظاہر ہے لیکن حدیث کے لئے فقہ کا ہونا ضروری کیوں ہے اس لئے کہ سطور ذیل میں چند مستند واقعات پیش ہیں۔

امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ اعمش نے مجھ سے مسئلہ دریافت کیا اس وقت میرے اور ان کے سوا تیسرا آدمی نہ تھا میں نے اس کا جواب دیا۔ انہوں نے فرمایا اے یعقوب! تم نے اس کا جواب کس حدیث سے دیا؟ میں نے کہا اسی حدیث سے جو آپ نے مجھ سے بیان فرمائی تھی انہوں نے کہا یعقوب! یہ حدیث تو مجھے تمہاری پیدائش سے بھی پہلے یاد تھی مگر میں آج تک اس کا یہ مطلب نہ سمجھ سکا تھا۔

عبید اللہ بن عمر کہتے ہیں کہ میں اعمش کی مجلس میں موجود تھا کہ ایک شخص ان کے پاس آیا اور ایک مسئلہ دریافت کیا اور وہ اس کا جواب نہ دے سکے۔ دیکھا تو وہاں امام ابو حنیفہؒ بھی موجود تھے اعمشؒ نے کہا اے نعمان! اس کے متعلق تم ہی کچھ بیان کرو۔ امام صاحبؒ نے فرمایا اس کا جواب یہ ہے اعمش نے پوچھا کہاں سے کہتے ہو۔ امام صاحبؒ نے فرمایا اسی حدیث سے جو آپ نے ہم سے بیان کی تھی اس پر اعمش نے فرمایا:

نحن الصیادلة وانتم الاطباء "ہم عطار ہیں اور آپ اطباء ہیں"

خطیب بغدادی نے امام ابو یوسفؒ سے نقل کیا ہے کہ ایک دن ان سے اعمش نے پوچھا۔ تمہارے

امام صاحبؒ کا حلقۂ درس اور فتاویٰ

سنہ ۱۲۰ھ میں جب امام حمادؒ کا انتقال ہوگیا تو ضروریات کے پیش نظر اس جگہ کو پُر کرنے کے لئے لوگوں کے دلوں میں زبردست داعیہ پیدا ہوا اس لئے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا فقہ جو بروایت ابراہیم نخعی حضرت امام حماد نقل فرمارہے تھے اور لوگوں کی دینی ضروریات پوری کررہے تھے اس کا سلسلہ منقطع کردینا اور ایک دم سے اس خیر کے دروازہ کو بند کردینا نہایت نقصان دہ تھا اس لئے تلامذہ کی نظریں اولاً استاد زادے پر پڑیں لیکن تجربہ نے ان کو جلد ہی بتلا دیا کہ ان سے مقصد پورا نہ ہوسکے گا، لہٰذا استاد زادے کے بعد ابو نہشلی ابو بردہ موسیٰ بن ابو کثیر کو یکے بعد دیگرے قائم مقام بنایا گیا لیکن "جائے استاد خالیست" کا مصداق پایا اور حماد کی سی خصوصیات کسی میں نہ پائیں کیونکہ کسی پر شعر و ادب کا غلبہ تھا تو کوئی ایام العرب کا ماہر تھا۔ (الموفق

(الموفق ص ج ۱)

اِدھر امام صاحبؒ نے اپنے سابقہ تجربہ کی بنا پر یا کسی اور وجہ سے طے کرلیا تھا کہ جب تک کم از کم مجھے دس اشخاص مجبور نہ کریں گے اس وقت تک حلقہ درس کی ذمہ داریوں کو نہیں سنبھالوں گا۔ اُدھر لوگوں نے میدان خالی پایا اور سوائے امام ابو حنیفہؒ کے اس مسند کے لائق کسی کو نہ پایا تو اصرار کرنا شروع کردیا اس لئے کہ لوگوں نے امام صاحبؒ میں وہ علوم اور خصوصیات پائے جو موسیٰ اور موسیٰ کے اوپر درجہ کے علماء میں نہ تھے اور تمام معاصرین کو وہ اس سے تہی دست نظر آتے تھے لیکن اس کے برخلاف لوگوں نے امام ابو حنیفہؒ کو تمام خصوصیات کا مالک اور تمام علوم کا ماہر پایا لہٰذا ان کا دامن تھام لیا اور شاگرد ہوگئے۔

پھر تو امام ابو یوسف، امام زفر، اسد بن عمر، قاسم بن معن وغیرہ نے بھی امام صاحبؒ کے حلقہ درس کو اختیار کرلیا۔ ان حضرات کے ادھر آجانے کی وجہ سے دوسرے حلقہائے درس (مثلاً ابن ابی لیلےٰ، ابن شبرمہ، شریک، سفیان ثوری) کی طرف سے لوگوں کی رجوعات کم ہوگئیں اور یہ حلقہ درس روز بروز بڑھتا ہی گیا۔

جن ایام میں امام حماد کی جانشینی کا مسئلہ چل رہا تھا انہیں دنوں میں امام صاحبؒ نے ایک خواب دیکھا کہ میں نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کھود ڈالی ہے اور میں آپؐ کے عظام مبارکہ چن رہا ہوں۔" یہ دیکھ کر آپ گھبرا گئے اور خوفزدہ ہوگئے طرح طرح کے خیالات دل میں آنے لگے جو حلقۂ درس کی ذمہ داریاں

کہ علامہ نسفیؒ کے بعد دنیا مجتہد سے خالی ہوگئی ہے۔ ان کی مراد مجتہد فی المذہب ہے ورنہ اجتہاد مطلق تو ان کے نزدیک ائمہ اربعہ پر ختم ہوگیا ہے۔ یہاں تک کہ انھوں نے امت پر انہی ائمہ اربعہ کی تقلید لازم کردی ہے۔ یہ سب کچھ ان کا خیال محض ہے جس پر کوئی شرعی دلیل یہ لوگ پیش نہیں کرسکتے اور دلیل کے بغیر کسی کے ذاتی خیال کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ حقیقت میں یہ لوگ ان لوگوں میں شامل ہیں جن کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ وہ بغیر علم کے فتویٰ دیں گے تو خود بھی گمراہ ہوجائیں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کردیں گے۔ یہ لوگ جانتے نہیں کہ اجتہاد کے بند ہونے کی خبر غیب کی خبر ہے جس کا علم اللہ ہی کو حاصل ہے۔" (فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت بر حاشیہ المستصفٰی، بحث اجتہاد، ج ۲، ص ۳۹۹)

بحرالعلوم کی بات صحیح تو ہے مگر تھوڑی سی تلخ اور غیر متوازن معلوم ہوتی ہے کیونکہ عدم امتناع اور نفس امکان سے کسی چیز کا وقوع پذیر ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ اس پہلو سے جب ہم غور کرتے ہیں تو صاف طور پر نظر آتا ہے کہ جواز اور امکان کے باوجود ائمہ اربعہ کے بعد ایسا مجتہد اب تک پیدا نہیں ہوا جس نے ان کے اصول اجتہاد سے بے نیاز ہوکر اجتہاد کیا ہو۔ البتہ ائمہ اربعہ کے اصول اجتہاد کی روشنی میں تفسیر آیات، تشریح احادیث، ترجیح فی الآراء اور مسائل جدیدہ کے حل کے لئے اجتہادی عمل ہر دور میں موجود رہا ہے اور جب تک اللہ چاہے گا موجود رہے گا۔ ظاہر ہے کہ نئے مسائل ونوازل کو نہ روکا جاسکتا ہے اور نہ حل کئے بغیر چھوڑا جاسکتا ہے۔ اگر بحث وتحقیق اور فقہ واجتہاد کے دروازے پر تالا لگا دیا جائے تو نئے مسائل کے شرعی احکام آخر کیسے معلوم کئے جائیں گے؟ علامہ شہرستانیؒ (ف ۵۴۸ھ) لکھتے ہیں: "ہم اس بات کو قطعی اور یقینی طور پر جانتے ہیں کہ ہر واقعے کے بارے میں نص موجود نہیں ہے اور اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ جب نصوص محدود ہیں اور واقعات ومسائل غیر محدود ہیں اور غیر محدود چیزوں کا احاطہ محدود چیزیں نہیں کرسکتیں تو اس سے قطعی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اجتہاد وقیاس کا اعتبار واجب ہے تاکہ ہر مسئلے کے لئے اجتہاد کیا جاسکے۔"

(الملل والنحل للشہرستانی، طبع مصطفٰی البابی، مصر، ج ۱، ص ۱۹۹)

اسی دلیل کی بنا پر شہرستانیؒ نے آگے چل کر لکھا ہے کہ ثم الاجتهاد من فروض الکفایات (ایضا، ص ۱۰۵)۔ ابواسحٰق الشاطبیؒ (ف ۷۹۰ھ) نے بھی اجتہاد کے جاری رہنے کے لئے وہی دلائل دیئے ہیں جو شہرستانیؒ نے دیئے ہیں (الموافقات للشاطبیؒ، طبع بیروت، ج ۴، ص ۱۰۴)۔ لیکن اجتہاد کے لئے اہلیت اور اصول اجتہاد کی پابندی ضروری ہے۔ آج کل کے متجددین اور یورپین طرز کے مجتہدین منصوص اور اجماعی احکام میں، ترمیم وتحریف کو بھی اجتہاد کا نام دے دیتے ہیں جس کی تردید علماء ربانیین کا دینی فریضہ ہے۔ جسے وہ ہر دور میں ادا کرتے رہے ہیں اور ان شاء اللہ ادا کرتے رہیں گے۔ اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے مطابق متجددین کے مقابلے میں مجددین، اور ناتغین کے مقابلے میں راسخین وقتِ موعود تک موجود رہیں گے۔

(تحریر مولانا گوہر رحمٰن)
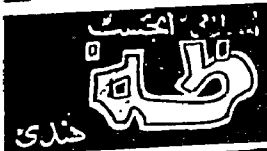
اس کی تاثیر تلاش کرنا ضروری نہیں ہے۔

کیا اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے؟

مسائل ونوازل کا تغیر وتنوع ناگزیر ہے۔ اس لئے اجتہاد کا دروازہ کھلا رہنا بھی ناگزیر ہے۔ اجتہاد نبوت نہیں ہے جس پر ختم نبوت کی طرح ختم اجتہاد کی مہر لگ چکی ہو اور نہ خاتم النبیینؐ کی طرح امت میں کوئی خاتم المجتہدین ہے جس پر اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہو۔ امام عبدالوہاب شعرانیؒ فرماتے ہیں: "اگر تم پوچھو کہ اب (۱۰۰۰ھ میں) یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص ائمہ مجتہدین کے مقام تک پہونچ سکے؟ تو جواب یہ ہے کہ ہاں ممکن ہے، کیونکہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور اس مقام تک پہونچنے کے لئے امتناع پر کوئی کمزور دلیل بھی موجود نہیں ہے۔" (المیزان الکبریٰ للشعرانی، ج ۱، ص ۳۸)

مشہور حنفی عالم مولانا عبدالعلی بحر العلومؒ (ف ۱۲۵۲ھ) لکھتے ہیں: "بعض لوگوں کا دعویٰ ہے

(ف ۹۱ ۷ھ) نے اجتہاد کی تعریف عام الفاظ میں کی ہے۔ یعنی شرعی احکام معلوم کرنے کے لئے پوری محنت وکوشش کرنا۔" (منہاج الوصول برحاشیہ شرح تحریر الاصول، ج ۳، ص ۲۸۴)

اس تعریف سے معلوم ہوتا ہے کہ اجتہاد صرف غیر منصوص مسائل پر قیاس کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ قرآن وسُنّت کی تعبیر کرنے اور احکام کو حالات و واقعات پر منطبق کرنے کو بھی اجتہاد کہا جاتا ہے۔ اسی طرح اختلافی تعبیرات میں سے کسی ایک کو ترجیح دینے کے لئے بھی اجتہاد کیا جا سکتا ہے مگر قرآن وسنّت کی جس تعبیر پر صحابہؓ اور مجتہدین کا اجماع ہو چکا ہو، اس کے خلاف تعبیر کرنا اجتہاد نہیں ہے بلکہ تحریف ہے۔

امام ابوحنیفہؒ قرآن، سنّت، اجماع اور قول صحابیؓ سے کسی مسئلے کا حکم معلوم نہ کر سکنے کی صورت میں قیاس واجتہاد پر فتویٰ دیتے تھے لیکن آپ نے فرمایا ہے: "اللہ کی قسم! جھوٹ بولتا ہے اور ہم پر الزام لگاتا ہے جو کہتا ہے کہ ہم قیاس کو نص پر مقدم سمجھتے ہیں۔ کیا نص کی موجودگی میں قیاس کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ ہم تو ضرورت کے بغیر قیاس نہیں کرتے۔" (میزان کبریٰ للشعرانی، ج ۱، ص ۶۵)

موفق الدین مکیؒ نے زہیر بن معاویہ سے نقل کیا ہے کہ: "ایک روز ابوحنیفہؒ اور ابیض بن اغر کسی قیاسی مسئلے پر مباحثہ فرما رہے تھے کہ مسجد کے کونے سے ایک شخص نے جو میرے خیال میں مدینے کا رہنے والا تھا، باواز بلند کہا: یہ کیا قیاس آرائیاں ہو رہی ہیں؟ قیاس تو سب سے اوّل ابلیس نے کیا تھا۔ امام ابوحنیفہؒ نے کہا کہ تیری یہ بات بے محل اور بے موقع ہے۔ ابلیس نے قیاس کے ذریعے اللہ کا حکم رد کر دیا تھا اور ہم غیر منصوص مسئلے کو قرآن وسنّت اور اجماع امت میں سے کسی اصل پر قیاس کرتے ہیں اور اتباع کے لئے اجتہاد کرتے ہیں تو ہمارے اور ابلیس کے قیاس کے درمیان کیا مناسبت ہے؟ یہ جواب سن کر اس شخص نے کہا کہ اللہ آپ کے دل کو نور سے بھر دے جس طرح کہ آپ نے میرے دل کو نور سے منور کر دیا ہے۔ یعنی شکوک کا ازالہ کر دیا ہے۔"

(مناقب الامام الاعظم للمکیؒ، ج ۱، ص ۸۱)

قیاس کا رکن اصلی علّت ہے اور علّت کے معنی ہیں وہ وصف جو حکمت ومصلحت پر مشتمل ہو، جس کی بنا پر اصل کا حکم فرع پر بھی جاری کیا جا سکتا ہو۔ علّت اگر منصوص یا اجماعی نہ ہو بلکہ استنباطی ہو تو حنفیہ کے نزدیک اس کے معتبر ہونے اور حکم کا مدار بننے کے لئے دو شرطیں ہیں۔ ایک مناسبت اور دوسری تاثیر۔ مناسبت سے مراد یہ ہے کہ جس چیز کو علّت قرار دیا گیا ہو اس کی حکم کے ساتھ معقول مناسبت ہو اور تاثیر کا مطلب یہ ہے کہ جس چیز کو علت بنایا گیا ہو اس کا یا اس جیسی کسی اور علّت کا کسی دوسرے مقام پر قرآن وسنّت یا اجماع سے موثر ہونا ثابت ہو۔ یعنی صرف مناسبت کی بنا پر حنفیہ کے نزدیک قیاس جائز نہیں ہے بلکہ علّت کا یا اس کی نظیر کا کسی نص یا اجماع سے موثر ہونا بھی ضروری ہے۔ حنفیہ نے موثر ہونے کی شرط اس لئے لگائی ہے کہ قیاس، نصوص سے قریب تر ہو جائے اور اس کا استعمال کم سے کم کیا جائے۔ مگر فقہائے شافعیہ کی اکثریت قیاس کے لئے "اخالہ" کافی سمجھتے ہیں۔ "اخالہ" کا مطلب یہ ہے کہ جب مجتہد کو کسی چیز کے علّت ہونے پر اطمینان حاصل ہو جائے تو پھر دوسری جگہ

قول اس طرح نقل ہوا ہے: "ہم نے اہل علم کو پایا ہے کہ وہ صحابیؓ کے قول کو کبھی لے لیتے تھے اور کبھی چھوڑ دیتے تھے اور بعض اقوال کے لینے نہ لینے میں ان کے درمیان اختلاف رہا ہے۔ سائل نے پوچھا کہ آپ کا اپنا رجحان کس طرف ہے؟ میں نے کہا کہ میرا رجحان تو اس طرف ہے کہ میں جب کتاب وسنّت اور اجماع میں کوئی حکم نہیں پاتا تو پھر صحابہؓ کے اقوال میں سے کسی ایک کے قول کا اتباع کرتا ہوں۔"

(الرسالہ للشافعی، طبع مصطفےٰ البابی، مصر ۱۹۶۹ء، ص ۲۶۱)

حافظ ابن القیمؒ کی تحقیق یہ ہے کہ ائمہ اربعہ اور جمہور ائمت کے نزدیک قرآن وسنّت اور اجماع میں کوئی دلیل نہ ملتی ہو تو صحابیؓ کا قول حجّت ہے۔ امام ابو حنیفہؒ سے تو صراحۃً منقول ہے مگر امام مالکؒ کی کتاب موطا کے اسلوب سے معلوم ہوتا ہے کہ امام مالکؒ اور اُن کے اصحاب کا مسلک بھی یہی ہے۔ اسحاق بن راہویہؒ اور ابو عبید قاسم بن سلامؒ کی رائے بھی یہی ہے۔ امام احمدؒ سے بھی متعدد مقامات پر اسی طرح منقول ہے اور امام شافعیؒ سے مروی روایات میں بھی اس کی تصریح موجود ہے اس کے بعد حافظ ابن قیمؒ نے امام شافعیؒ کے اقوال نقل کئے ہیں۔ (اعلام الموقعین، ج ۴، ص ۱۲۰ تا ۱۵۱)

امام مالکؒ، امام احمدؒ اور امام شافعیؒ سے تو عدم حجیت کے اقوال بھی مروی ہیں بلکہ شافعیہ کے ہاں عدم حجیت کا قول متداول بھی ہے لیکن امام ابو حنیفہؒ سے مروی تمام روایات اس بات پر متفق ہیں کہ آپ کتاب وسنت اور اجماع کے بعد صحابیؓ کے قول کو اپنے قیاس پر ترجیح دیتے تھے۔ آپ حدیث مرسل اور حدیث ضعیف کو بھی قیاس پر ترجیح دیتے تھے، بشرطیکہ حدیث کا ضعف شدید نہ ہو بلکہ صرف راوی کے حافظے کی کمزوری کی وجہ سے ہو۔

قیاس واجتہاد

قیاس کے لغوی معنی ہیں اندازہ کرنا اور اصطلاحی معنی ہیں کسی علتِ مشترکہ کی بنا پر غیر منصوص مسئلے پر حکم کو جاری کرنا۔" امام جصاصؒ (ف ۳۷۰ھ) نے قیاس کے حجّت ہونے پر ۲۲ آیات، ۳۹ احادیث اور اجماعِ صحابہؓ کو بطور دلیل پیش کیا ہے۔ اس کے بعد عقلی دلائل بیان کئے ہیں اور پھر قیاس کے منکرین کے اعتراضات وشبہات کے جوابات دیئے ہیں۔ (الفصول فی الاصول، طبع مکتبہ علمیہ، لاہور، ص ۶۴ تا ۱۰۹۹)

امام سرخسیؒ (ف ۴۹۰ھ) فرماتے ہیں: "صحابہؓ، تابعینؒ وصالحین اور ائمہ دین کا مسلک یہ ہے کہ رائے کے ذریعے ان اصول پر قیاس کرنا جن کے احکام نص سے ثابت ہوں تاکہ نص کا حکم فروع پر (غیر منصوص مسئلے پر) نافذ کر دیا جائے، جائز ہے جس کے ذریعے اللہ کی اطاعت کی جاتی ہے اور یہ شرعی احکام کے ماخذ میں سے ایک ماخذ ہے۔ لیکن قیاس ورائے میں ابتداً حکم کے اثبات کی صلاحیت موجود نہیں ہے۔" (اصول السرخسی، طبع ریاض، ج ۲، ص ۱۱۸)

اجتہاد کے لغوی معنی ہیں کسی چیز کی تلاش اور حصول کے لئے اپنی پوری قوت استعمال کرنا اور ہر ممکن کوشش کرنا۔ اس کی اصطلاحی تعریف ہے "غیر منصوص مسائل کے احکام معلوم کرنے کے لئے علمی تحقیق وکاوش کرنا۔" (توضیح وتلویح، مصری، ج ۲، ص ۶۳۹) یہ تعریف "اجتہاد قیاسی" کی ہے جو غیر منصوص مسائل کے احکام نصوص سے مستنبط کرنے کے لئے کیا جاتا ہے لیکن قاضی بیضاویؒ

ملتان، ج ۱، ص ۱۷۱تا ۲۲۱)

اس مجلس تدوین فقہ کے ارکان میں سے ۳۶ کے بارے میں امام ابو حنیفہؒ کی رائے یہ تھی: "میرے یہ ۳۶ اصحاب ہیں جن میں سے ۲۸ قاضی بننے کے اہل ہیں، ۶ فتویٰ دینے کے اہل ہیں اور ابو یوسفؒ و زفرؒ قاضیوں اور مفتیوں کو تربیت دینے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ (مناقب الامام للکردری، متوفی ۸۲۷ھ فی ذیل المناقب للمکی، ج ۲، ص ۱۲۵)

یہی اجتماعی اجتہاد اور اجتماعیت وشورائیت فقہ حنفی کی امتیازی صفت ہے جس کی وجہ سے امت کی اکثریت اس کا اتباع کرتی ہے۔ مسائل کے حل کے لئے شورائیت و اجتماعیت کا قرآن و سنت نے حکم دیا ہے اور یہی خلفائے راشدین بالخصوص شیخین یعنی ابو بکرؓ و عمرؓ کی سنت تھی۔

اقوال صحابہؓ

اقوال صحابہؓ کے حجت ہونے میں مشائخ حنفیہ کا اختلاف رائے تو موجود ہے لیکن امام ابو حنیفہؒ کا اپنا قول پہلے نقل ہو چکا ہے کہ: "جب ہمارے پاس صحابہؓ کے اقوال آجائیں تو ہم ان میں کسی ایک کو پسند کریں گے۔"

قاضی ابو سعید البردعیؒ (ف ۳۱۷ھ) نے اسی قول کو ترجیح دی ہے اور حنفی اصول فقہ میں ابو حنیفہؒ کا مسلک اسی طرح نقل ہوا ہے۔ امام سرخسیؒ (۴۹۰ھ) لکھتے ہیں: "ابو سعید البردعیؒ کہا کرتے تھے کہ صحابیؓ کا قول قیاس پر مقدم ہے اور اس کے قول کے مقابلے میں قیاس کو ترک کر دیا جاتا ہے۔ ہم نے اپنے مشائخ کو اسی رائے پر پایا ہے۔" (اصول السرخسی، طبع ریاض، ج ۲، ص ۱۰۵)

حنفیہ کے مشہور فقیہ ابو الحسن کرخی (ف ۳۴۰ھ) کے نزدیک اگرچہ صحابیؓ کا قول قیاس پر مقدم نہیں ہے اور بعض حنفیہ نے ان سے اتفاق کیا ہے لیکن ہمارا موضوع ابو حنیفہؒ کے فقہی اصول کی وضاحت کرنا ہے اور ان کا قول ہم نقل کر چکے ہیں کہ صحابیؓ کا قول قیاس و اجتہاد پر مقدم ہے۔ امام سرخسیؒ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "ابو سعید البردعیؒ کا مسلک اصح ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا امکان و احتمال موجود ہے کہ صحابیؓ نے جو بات کہی ہو، وہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہوگی، اس لئے کہ صحابہؓ کی یہ عادت تھی کہ ان میں سے جس کے پاس کوئی نص ہوتی تو کبھی وہ اسے نقل کر دیتے اور کبھی نقل کئے بغیر اس کے مطابق فتویٰ دے دیتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جس بات میں رسول اللہ ﷺ سے سماع کا احتمال ہو وہ محض رائے پر مقدم ہونی چاہئے۔ اس اعتبار سے مجتہد کی رائے پر صحابی کے قول کو ترجیح دینا، خبر واحد کو قیاس پر مقدم کرنے کی طرح ہے۔ لیکن اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہ بات صحابیؓ کی اپنی رائے اور اجتہاد پر مبنی ہے تو پھر بھی صحابہؓ کی رائے غیر صحابہؓ کی رائے سے زیادہ قوی ہوتی ہے، اس لئے کہ انھوں نے مسائل و نوازل کے احکام بیان کرنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کا خود مشاہدہ کیا تھا اور ان حالات کو دیکھا تھا جن میں نصوص نازل ہوئی تھیں۔"

(اصول السرخسی، طبع ریاض، ج ۲، ص ۱۰۸، ونحوہ فی التلویح والتوضیح)

حنفیہ اور شافعیہ کی کتابوں میں امام شافعیؒ کا مسلک یہ نقل ہوا ہے کہ مجتہد، صحابیؓ کے قول کو نظر انداز کر کے اپنے قیاس و اجتہاد پر عمل کر سکتا ہے۔ لیکن امام شافعیؒ کی اپنی تصنیف الرسالہ میں ان کا

اجماعِ امّت

اجماع کے معنی ہیں "امّت کے مجتہدین کا کسی زمانے میں کسی امر پر متفق ہو جانا۔" یہ اہلِ سنّت کے تمام ائمہ کے نزدیک حجت شرعیہ اور ماخذ احکام ہے، اس لئے کہ اس کا حجت ہونا قرآن و سنت سے ثابت ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کی پالیسی یہ تھی کہ "فیصلہ طلب معاملے میں اہلِ علم کا جس بات پر اجماع ہو جاتا تو اسی کے مطابق فیصلہ فرما دیتے تھے۔" (سننِ دارمی، طبع بیروت ۱۹۸۷، ج ۱، ص ۷۰۔ مسند احمد، طبع دار صادر بیروت، ج ۲، ص ۱۶۶)

حضرت عمرؓ نے کوفہ کے قاضی شریحؒ کو لکھا تھا کہ: "اگر تیرے پاس ایسا معاملہ آجائے جس کا حکم قرآن میں مذکور نہ ہو اور اس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی سنت بھی معلوم نہ ہو تو جس حکم پر لوگوں نے اتفاق کر لیا ہو (یعنی اہلِ علم نے) اس کو تلاش کر کے اسی کے مطابق فیصلہ کرو۔" (سنن دارمی، طبع بیروت ۱۹۸۷، ج ۱، ص ۷۱۔ و نحوہ فی النسائیؒ، باب القضاء باتفاق اہل العلم)

حنفی اصول فقہ کے امام فخر الاسلام بزدویؒ فرماتے ہیں: "اجماع سے ثابت شدہ حکم پر اعتقاد رکھنا واجب ہے اور اس پر عمل کرنا بھی لازم ہے۔ قطعی اجماع سے انکار کرنا کفر ہے۔"

(الاصول للبزدویؒ، طبع کراچی، ص ۲۴۵)

اجماع کی حجیت کے دلائل بیان کرنا اور اس کی اقسام کا ذکر کرنا اس وقت موضوعِ بحث نہیں ہے اور اہلِ سنّت والجماعت کے درمیان یہ کوئی اختلافی مسئلہ بھی نہیں ہے بلکہ اجماعِ صحابہؓ کا حجت ہونے پر تو اہلِ ظاہر بھی متفق ہیں۔ اس وقت تو امام ابو حنیفہؒ کے فقہی اصول و ماخذ زیرِ غور ہیں۔ امام صاحبؒ نہ صرف یہ کہ اجماع کو حجت اور ماخذِ شریعت تسلیم کرتے تھے بلکہ آپ کی فقہ کی تدوین اجتماعی بحث و تحقیق کے طریقے پر ہوئی ہے اور آپ انفرادی رائے پر اجتماعی اجتہاد کو ترجیح دیتے تھے اس لئے کہ حضرت علیؓ کے ایک سوال کے جواب میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ: "ایسے معاملے میں جس کے متعلق قرآن و سنت میں کچھ معلوم نہ ہو سکا ہو، تم عبادت گزار فقہا سے مشورہ کر لیا کرو اور کسی کی شخصی رائے پر نہ چلو۔" (مجمع الزوائد، باب الاجماع، ج ۱، ص ۱۷۸)

اس ہدایتِ رسولؐ کی پیروی کرتے ہوئے امام ابو حنیفہؒ نے اپنے شاگردوں اور ممتاز اہلِ علم کی ایک مجلس بنائی تھی جس میں بحث و تحقیق کے بعد حل طلب مسائل کا فیصلہ کیا جاتا تھا۔ موفق الدین مکیؒ لکھتے ہیں: "ابو حنیفہؒ نے اپنا فقہی مسلک اپنے اصحاب کے درمیان مشاورت کے ذریعے مدون کیا تھا۔ وہ اپنی رائے پر اصرار نہیں کرتے تھے بلکہ مجلس بحث و تحقیق میں کوئی مسئلہ پیش کر کے شرکائے مجلس کی آرا سنتے تھے اور اپنی رائے سناتے تھے۔ بعض اوقات یہ مباحثہ و مناظرہ ایک ماہ سے بھی زیادہ دنوں تک جاری رہتا تھا، یہاں تک کہ کسی رائے پر اتفاق ہو جاتا اور امام ابو یوسفؒ اسے قلم بند کر لیتے۔" (مناقب الامام الاعظمؒ، ج ۲، ص ۱۳۳)

امام ابو حنیفہؒ کی قائم کردہ اس مجلس بحث و تحقیق کے ارکان کی تعداد ۴۰ بتائی جاتی ہے جن کے اسماء کو ترتیب وفات کے اعتبار سے علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے تلمیذ خاص مولانا سید احمد رضا خان بجنوریؒ نے مختصر تعارف کے ساتھ مرتب کر لیا ہے فجزاہ اللہ خیراً۔ (انوار الباری، شرح صحیح البخاریؒ، طبع

کرتا ہوں کہ خبر واحد کے ذریعے کسی قید کی زیادت جائز ہے مگر ظنیت کے درجے میں جائز ہے۔ یعنی جو چیز قرآن سے ثابت ہو وہ رکن یا شرط یعنی فرض ہوتی ہے، اور جو چیز خبر واحد سے ثابت ہو وہ واجب ہوتی ہے یا مستحب۔ میری اس بات سے اصولیین کا قاعدہ تبدیل نہیں ہوتا بلکہ صرف اس کی تعبیر بدل جاتی ہے۔ ان کے نزدیک رکنیت اور شرطیت کے درجے کے اضافے کو تو زیادت کہا جاتا ہے مگر وجوب یا استحباب کے درجے کی زیادت کو زیادت نہیں کہا جاتا۔ ان کے قول کا مفہوم یہ ہے کہ خبر واحد کے ذریعے قرآن پر رکنیت اور شرطیت کے درجے کی زیادت جائز نہیں ہے اور میرے قول کا مفہوم یہ ہے کہ خبر واحد کے ذریعے وجوب کے مرتبے کی زیادت جائز ہے۔ لہٰذا میرے اور ان کے درمیان حقیقی اختلاف نہیں ہے بلکہ صرف تعبیر کا اختلاف ہے۔ البتہ اصولیین کی تعبیر سے خبر واحد کا مرتبہ ہلکا سا محسوس ہوتا ہے اور میری تعبیر سے خبر واحد کی اہمیت ابتدا ہی سے معلوم ہو جاتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ خبر واحد ہمارے نزدیک بھی اسی طرح واجب العمل ہے جس طرح کہ شافعیہ کے نزدیک واجب العمل ہے۔ میں نے یہ تعبیر المنار اور ہدایہ کے کلام سے اخذ کی ہے۔"

(فیض الباری، طبع قاہرہ، ۱۹۳۸، ج ۱، ص ۴۷-۴۸)

شاہ صاحبؒ نے علامہ عبداللہ بن احمد نسفی (ف ۷۱۰ھ) کی کتاب المنار کی جس عبارت سے اخذ کر کے مذکورہ تعبیر اختیار کی ہے، وہ درج ذیل ہے: "رکوع و سجود کے حکم میں تعدیل ارکان کو فرض کے درجے میں شامل کرنا جائز نہیں ہے۔ اسی طرح آیت الوضو میں اعضا کو پے در پے دھونے، ترتیب کے ساتھ دھونے، اوّل میں بسم اللہ پڑھنے اور نیت کرنے کو اور آیت طواف میں طہارت کو شرط قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ (المنار متن نور الانوار، ص ۱۵ تا ۱۷)

"علیٰ سبیل الفرض" کے الفاظ سے صراحتہً ثابت ہوتا ہے کہ خبر واحد کے ذریعے قرآنی حکم پر اضافہ فرضیت و شرطیت کے طور پر جائز نہیں ہے مگر وجوب اور استحباب کے درجے میں جائز ہے۔ تعدیل ارکان سے مراد ہے رکوع، سجود، قومہ اور جلسہ میں اطمینان کے ساتھ ٹھہرنا۔ احناف کے نزدیک یہ واجب ہے مگر فرض اور شرط نہیں ہے، اس کا ثبوت خبر واحد سے ہوا ہے، آیت قرآنی یا خبر متواتر سے نہیں ہوا۔ اسی طرح ولاء، ترتیب، تسمیہ اور نیت کا ثبوت اخبار آحاد سے ہوا ہے۔ اس لئے یہ وضو کے سنن میں شامل ہیں، فرائض و شرائط میں شامل نہیں ہے۔ چھٹی مثال طواف کے لئے طہارت کی ہے کہ قرآن کریم میں طواف کے لئے طہارت کا حکم موجود نہیں ہے مگر خبر واحد میں اس کے لئے طہارت کا حکم موجود ہے۔ اس لئے طواف زیارت فرض اور رکن ہے اور اس کے لئے طہارت واجب ہے۔ یہ چھ مثالیں تو 'المنار' میں بیان ہوئی ہیں اور ساتویں مثال 'ھدایہ' میں اس طرح بیان ہوئی ہے کہ نماز میں مطلق قرات فرض ہے، اس لئے کہ قرآن سے ثابت ہے مگر فاتحہ اور اس پر کچھ زائد پڑھنا واجب ہے اس لئے کہ یہ خبر واحد سے ثابت ہے۔ (ہدایہ: بحث وجوب فاتحہ)

اس قسم کی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کے عام حکم پر خبر واحد صحیح الاسناد کے ذریعے کوئی قید لگانا یا اس میں تخصیص کرنا جائز ہے مگر یہ تقیید و تخصیص ظنیت کے درجے میں ہوگی۔ حقیقت میں یہ قرآن کی تعبیر و تشریح ہے جو خبر واحد کے ذریعے کی گئی ہے، نسخ نہیں ہے۔

امام عبدالعزیز بخاریؒ (ف ۷۳۰ھ) اصول بزدویؒ میں لکھتے ہیں: "جان لو کہ ہم نے جو یہ کہا کہ خبر واحد کے راوی کی فقاہت اس کی روایت کو قیاس پر مقدم کرنے کے شرط ہے تو یہ عیسیٰ بن ابانؒ کا مذہب ہے جسے قاضی ابوزید دبوسیؒ نے اختیار کیا ہے اور اکثر متاخرین نے اس کی متابعت کی ہے۔ مگر شیخ ابوالحسن کرخیؒ اور ہمارے اصحاب میں اس کی متابعت کرنے والوں کے نزدیک خبر واحد کی قیاس پر تقدیم کے لئے راوی کا فقیہ ہونا شرط نہیں بلکہ ہر عادل اور ضابط راوی کی خبر واحد قیاس پر مقدم ہے جب کہ وہ قرآن اور صحیح و مشہور حدیث کے خلاف نہ ہو۔ فخرالاسلام بزدویؒ کے بھائی صدر الاسلام ابوالیسر بزدویؒ (ف ۴۹۳ھ) نے فرمایا ہے کہ اکثر علماء کا میلان اسی طرف ہے... ابوحنیفہؒ سے یہ قول ثابت ہے کہ انھوں نے فرمایا ہے کہ اللہ و رسولؐ کی جو بات ہم تک پہونچ جائے وہ ہم کو بسر و چشم قبول ہے۔ سلف میں کسی سے یہ منقول نہیں ہے کہ خبر واحد کے قیاس پر مقدم ہونے کے لئے اس کے راوی کا فقیہ ہونا شرط ہے۔ پس ثابت ہوتا ہے کہ یہ ایک قول مستحدث ہے یعنی بعد میں بنایا گیا۔" (کشف الاسرار شرح اصول بزدوی، طبع کراچی، ج ۲، ص ۳۸۳)

ابن امیر الحاجؒ حنفی نے بھی تحریر الاصول کی شرح التقریر والتحریر میں امام ابوحنیفہؒ کا مسلک یہی نقل کیا ہے کہ خبر واحد کو قیاس پر مطلقاً ترجیح حاصل ہے خواہ اس کا راوی فقیہ ہو یا نہ ہو، اور خواہ وہ قیاس کے مطابق ہو یا مطابق نہ ہو۔ (التقریر والتحریر ج ۲، ص ۳۱۸)

اسی طرح محب اللہ بہاریؒ نے بھی خبر واحد کے قیاس پر مقدم ہونے کے لئے اس کے راوی کا فقیہ ہونا شرط قرار نہیں دیا۔ (مسلم الثبوت مع فواتح الرحموت فی ذیل المستصفی، ج ۲، ص ۱۴۵)

تعارض کے وقت ایک حدیث کو دوسری حدیث پر ترجیح دینے کے لئے تو راوی کی فقاہت کو وجوہ ترجیح میں سے ایک وجہ ترجیح تسلیم کیا گیا ہے مگر قیاس پر خبر واحد کی تقدیم و ترجیح کے لئے اس شرط کا ذکر متقدمین میں سے کسی نے نہیں کیا۔

خبر واحد کے ذریعے قرآن کے عام اور مطلق حکم کی تخصیص و تقیید جائز ہے

مشائخ حنفیہ نے اصول فقہ کی کتابوں میں ایک قاعدہ بیان کیا ہے کہ قرآن کے مطلق یا عام حکم پر خبر واحد کے ذریعے کوئی قید لگانا یا تخصیص کرنا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ قید لگانے اور تخصیص کرنے سے عام اور مطلق کی بعض جزئیات ختم ہو جاتی ہیں۔ قرآن کا کوئی حکم خبر واحد کے ذریعے منسوخ نہیں ہوسکتا کیونکہ خبر واحد اگرچہ حجت ہے مگر راویوں کی قلت کی وجہ سے اس کا ثبوت ظنی ہے اور قرآن کریم متواتر ہونے کی بنا پر حجت قطعیہ ہے اور ظنی دلیل قطعی دلیل سے ثابت شدہ حکم کی ناسخ نہیں بن سکتی۔ اس قاعدے پر شدید قسم کے اعتراضات ہوئے ہیں لیکن اس بارے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ قاعدہ امام ابوحنیفہؒ سے صراحۃً ثابت نہیں ہے۔ دوسری بات وہ ہے جو علامہ انور شاہ کشمیریؒ (ف ۱۳۵۲ھ) نے کی ہے جس کا حاصل مفہوم یہ ہے کہ: "بعض اعتراضات سوء تعبیر اور سوء فہم پر مبنی ہوتے ہیں، اس لئے میں اصولیین کے کلام کی تعبیر اس طرح

منکران کے اقوال سے باہر نکل کر کسی حسن بصریؒ، عطاؒ، سعیدؒ سے بشرطیکہ وہ تاویل و توجیہ صحیح الاسناد اور صریح الدلالت حدیث رسولؐ نے اجتہاد کیا تھا اس لئے کہ جو تفسیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ہو، وہ وحی پر مبنی ہوتی ہے اور طبع دار، اکثر حق دونوں کے خلاف کسی کا قول قبول نہیں کیا جا سکتا۔

حدیث رسولؐ

حدیثِ رسولؐ کا حجتِ شرعی اور ماخذِ دین ہونا قرآن کی آیات سے ثابت ہے اور یہ اجماعی مسئلہ ہے۔ قرآن کریم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اور یہ شرط نہیں لگائی کہ رسولؐ کی اسی بات کو مانو جو قرآن میں مذکور ہو بلکہ غیر مشروط اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ اسی طرح قضائے رسولؐ وامر رسولؐ کو تسلیم کرنا تقاضائے ایمان اور اس کی مخالفت کو موجب عذاب قرار دیا گیا ہے، چاہے وہ قضا وامر قرآن میں مذکور ہو یا نہ ہو۔ اس لئے تشریح احکام اور تنقید دین کے بارے میں اللہ کا رسولؐ جو کہتا ہے، کرتا ہے یا جسے برقرار رکھتا ہے وہ سب کچھ وحی ہوتی ہے اور کتاب منزل کی تعلیم وتبیین اللہ کے نبیؐ کا فرض منصبی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اہل ایمان کو حکم دیا ہے کہ تم اللہ اور رسولؐ سے آگے نہ بڑھو یعنی اپنی رائے یا کسی اور کی رائے کو قرآن وسنت سے آگے نہ کرو۔ باقی ائمہ کی طرح امام ابو حنیفہؒ بھی صحیح حدیث کے مقابلے میں نہ اپنی رائے کو ترجیح دیتے تھے اور نہ کسی اور کی رائے پر توجہ دیتے تھے۔ ان کے جو اقوال مستند کتابوں کے حوالوں کے ساتھ پہلے نقل ہوئے ہیں ان میں نہ یہ شرط لگائی گئی ہے کہ حدیث متواتر یا مشہور ہو اور نہ یہ شرط لگائی گئی ہے کہ خبر واحد کا راوی فقہ واجتہاد میں معروف ہو۔

اسی طرح یہ قید بھی امام صاحبؒ کے اپنے اقوال میں کہیں نظر نہیں آتی کہ خبر واحد کا راوی جب فقیہ ومجتہد ہو تو اس کی حدیث اسی وقت حجت بن سکتی ہے جب کہ وہ قیاس کے مطابق ہو۔ بلکہ ان اقوال میں بلا شرط وقید کہا گیا ہے کہ جو بات رسول اللہؐ نے کہی ہو وہ ہم کو بسروچشم قبول ہے اور میں رائے پر فتویٰ نہیں دیتا بلکہ حدیث پر فتویٰ دیتا ہوں۔

قیاس پر خبر واحد کی تقدیم کے لیے راوی کے فقیہ ہونے کی شرط

فخر الاسلام بزدویؒ (ف ۴۸۲ھ) نے اگرچہ یہ لکھا ہے کہ جو صحابیؓ فقہ واجتہاد میں معروف نہ ہو اس کی روایت کی قیاس کے ساتھ اگر مطابقت وموافقت ممکن نہ ہو اور قیاس کا باب بالکل بند ہو گیا ہو تو اس ضرورت کی بنا پر اسے ترک کر دیا جائے گا (الاصول للبزدوی برحاشیہ کشف الاسرار، طبع صدف، کراچی، ج ۲، ص ۳۷۹) لیکن یہ بات امام ابو حنیفہؒ اور ان کے اصحاب سے مروی نہیں ہے اور اس پر حنفیہ کا اتفاق بھی نہیں ہے بلکہ یہ عیسیٰ بن ابانؒ (ف ۲۲۱ھ) کی رائے ہے جسے قاضی ابو زید دبوسیؒ (ف ۴۳۰ھ) اور بزدویؒ نے اختیار کیا ہے اور متاخرین نے ان کی متابعت کی ہے۔ مگر شیخ ابوالحسن کرخیؒ (ف ۳۴۰ھ) اور اکثر علمائے راوی کی فقاہت واجتہاد کو شرط قرار نہیں دیا اور نہ خبر واحد کی حجیت کے لئے قیاس کے ساتھ مطابقت کو شرط قرار دیا ہے۔

کتاب اللہ

قرآن کریم تمام اصول و ماخذ کا اصل

اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَ

شَیْءٍ وَّ هُدًى وَّ رَحْمَةً وَّ بُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ (النحل ۱۶: ۹

کتاب جو دین کی ہر بات بیان کرتی اور ہدایت و رحمت ہے اور جو مسلم

قاضی بیضاویؒ (ف ۶۹۱ھ) فرماتے ہیں: "قرآن میں دینی امور

ہے، تفصیلاً یا اجمالاً یا سنت اور قیاس کے حوالے کے ذریعے"

(انوار التنزیل و اسرار التاویل، طبع بیروت ۱۹۸۸، ج ۱

یعنی جو بات حدیث رسولؐ میں بیان ہوئی ہو یا قیاس و اجتہاد کے ذریعے معلوم ہو ... ، وہ بھی قرآن

کا بیان ہے اس لئے کہ قرآن میں اطاعت رسولؐ کا حکم دیا گیا ہے اور اجتہاد و قیاس کی اجازت دی گئی

امام جصاص حنفیؒ (ف ۳۷۰) نے قرآن کے تبیان ہونے کی وضاحت اس طرح کی ہے: "جس حکم

اجماع ہو چکا ہو اس کا ماخذ و مصدر بھی قرآن ہے، اس لئے کہ قرآن اس کے حجت ہونے پر دلالت کرتا ہے

اور مسلمان سب گمراہی پر متفق نہیں ہو سکتے۔ اور جو احکام قیاس و اجتہاد اور استدلال کے باقی اقسا

مثلاً استحسان اور خبر واحد سے ثابت ہوتے ہیں وہ سب کے سب قرآن ہی کا بیان ہے۔ پس دین کا کوئی

حکم ایسا نہیں ہے جو مذکورہ طریقوں سے قرآن بیان نہ کیا ہو" (احکام القرآن للجصاصؒ، طبع دار احیا

التراث الاسلامی، بیروت، ج ۵، ص ۱۰، النحل)

امام شافعیؒ (ف ۲۰۴ھ) قرآن کی جامعیت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "اہل دین کو جو مسئلہ

بھی درپیش ہو اس کے بارے میں اللہ کی کتاب میں راہنمائی موجود ہے"

اس بات کا تجزیہ کرتے ہوئے آگے لکھتے ہیں:

- بعض احکام قرآن کریم میں تفصیل و صراحت کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔
- بعض احکام قرآن میں ذکر ہوئے ہیں، لیکن اُن کی تفصیلات اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے بیان کروائی ہیں۔
- بعض احکام کا ذکر قرآن میں نہیں مگر وہ اللہ کے رسولؐ نے نافذ کئے ہیں اور اللہ نے اپنے رسولؐ کی اطاعت فرض کر دی ہے۔
- بعض احکام وہ ہیں جو اجتہاد کے ذریعے معلوم ہوتے ہیں اور اللہ نے مجتہدین پر اجتہاد فرض کر دیا ہے۔

اس کے بعد قرآنی احکام کی مذکورہ اقسام اربعہ کی مثالیں بیان فرمائی ہیں۔

(الرسالۃ للشافعی، طبع مصطفےٰ البابی الحلبی مصر، ۱۹۶۹، ص ۱۵ تا ۲۵)

قرآن کریم سے احکام اور استدلال کے اصول کی تفصیلات اصول فقہ کی کتابوں میں بیان ہوئی

ہیں، لیکن ایک قاعدہ جامعہ یہ ہے کہ قرآن کی جس تعبیر و تشریح پر صحابہؓ کا اجماع ہوا اور وہ اجماعی تعبیر امت

مسلمہ میں قرناً بعد قرن چلی آ رہی ہو تو اس کے خلاف تعبیر و تاویل کرنا تفسیر نہیں بلکہ تحریف ہوگی۔ لیکن جس

آیت کی تعبیر و تاویل میں دور صحابہؓ سے اختلاف چلا آ رہا ہو اس میں ہر مجتہد کو حق حاصل ہے کہ وہ جس تاویل

چونکہ ہم نے جو یہ کہا کہ خبر واحد ... کا مذہب ہے ... ابو الحسن [illegible]

مگران کے اقوال سے باہر نکل کر کسی اور کا قول نہیں لیتا۔ لیکن جب بات ابراہیم نخعیؒ، عامر شعبیؒ، ابن سیرینؒ، حسن بصریؒ، عطاءؒ، سعید بن مسیبؒ اور اس درجے کے دوسرے افراد تک پہونچ جائے تو چونکہ ان لوگوں نے اجتہاد کیا تھا، پس میں بھی اجتہاد کروں گا جس طرح کہ انہوں نے اجتہاد کیا تھا۔" (تاریخ بغداد، طبع دار الکتب العزبی، بیروت، ج ۱۳، ص ۳۶۸)

فضیل بن عیاضؒ (ف ۱۷۸ ھ) نے امام ابو حنیفہؒ کا طریقہ اجتہاد اس طرح نقل کیا ہے:۔ "امام ابو حنیفہؒ کے پاس جب کوئی مسئلہ آجاتا جس کے بارے میں صحیح حدیث موجود ہوتی تو آپ اس کا اتباع کرتے۔ اگرچہ وہ صحابی کا قول ہوتا مگر جب کوئی حدیث (مرفوع یا موقوف) نہ ملتی تو پھر آپ قیاس کرتے تھے اور بڑے اچھے طریقے سے قیاس کرتے تھے۔" (مناقب الامام الاعظم لموفق بن احمد المکی، طبع کوئٹہ، ۱۴۰۷ھ، ج ۱، ص ۷۵)

عبداللہ بن مبارکؒ نے امام ابو حنیفہؒ کا قول اس طرح نقل کیا ہے:۔ "جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث ہم تک پہونچے تو وہ بسر وچشم تسلیم ہے اور جب صحابہؓ کے اقوال ہمارے پاس پہونچیں تو ہم ان میں سے کسی ایک رائے کو پسند کریں گے مگر جب تابعینؒ کے اقوال ہمارے سامنے آجائیں تو ہم ان کی مزاحمت بھی کر لیتے ہیں۔" (مناقب الامام الاعظم للمکی، ج ۱، ص ۴۴)

نعیم بن عمرؒ فرماتے ہیں کہ:۔ "میں نے ابو حنیفہؒ سے سنا ہے، فرماتے تھے کہ تعجب ہے لوگ کہتے ہیں کہ میں اپنی رائے سے فتوے دیتا ہوں۔ حالانکہ میں تو حدیث پر فتوے دیتا ہوں۔"
(مناقب الامام الاعظم للمکی، ج ۱، ص ۷۷-۷۸)

عبدالکریم بن بلالؒ کہتے ہیں کہ:۔ "میں نے ابو حنیفہؒ سے خود سنا ہے، فرماتے تھے کہ میں جب کوئی حکم اللہ کی کتاب یا اس کے رسولؐ کی سنت میں پالیتا ہوں تو اسی پر عمل کرتا ہوں اور اس سے ہٹ کر کوئی بات نہیں کرتا۔ جب صحابہؓ کے درمیان آراء کا اختلاف ہو تو میں ان کے اقوال میں سے کسی ایک کو پسند کر کے اختیار کر لیتا ہوں مگر جب بعد کے لوگوں سے کوئی بات ہمارے پاس آجائے تو میں اسے کبھی لے لیتا ہوں اور کبھی چھوڑ دیتا ہوں۔" (مناقب الامام الاعظم للمکی، ج ۱، ص ۸۰)

زفر بن ہذیلؒ (ف ۱۵۸ھ) فرماتے ہیں:۔ "مخالفین کی باتوں پر توجہ نہ دو! ابو حنیفہؒ اور ہمارے دوسرے اصحاب کسی بھی مسئلے میں کوئی بات نہیں کرتے تھے مگر قرآن وسنت اور صحابہؓ کے صحیح اقوال کے مطابق کرتے تھے اور پھر ان پر قیاس کرتے تھے۔" (مناقب الامام الاعظم للمکی، ج ۱، ص ۸۳)

حسن بن زیادؒ (ف ۲۰۴ھ) کا قول ہے کہ:۔ "امام ابو حنیفہؒ چار ہزار احادیث کے راوی تھے۔ دو ہزار حمادؒ سے اور دو ہزار باقی اساتذہ سے۔" (مناقب الامام الاعظم للمکی، ج ۱، ص ۹۰)

امام ابو حنیفہؒ کے شاگردوں کے ان مستند اقوال سے ان کے جو فقہی اصول ومصادر ثابت ہوتے ہیں ان کی مختصر تفصیل درج ذیل ہے:۔

القلوب و تزکیہ نفوس کے آداب و احکام علم تصوّف کے نام سے الگ مدون ہوئے تو عملی اور فروعی احکام کو فقہ کا نام دیا گیا اور متاخرین کی اصطلاح میں فقہ علم الفروع کے ساتھ مخصوص ہو کر رہ گیا۔ فخر الاسلام بزدوی ؒ (ف ۴۹۳ھ) نے فقہ کے شرعی مفہوم میں تین اجزاء کو شامل کیا ہے: "علم الفروع علم دین کی دوسری قسم ہے اور یہ فقہ ہے۔ فقہ کے تین اجزاء ہیں۔ ایک ہے نفس احکام کا علم، دوسرا ہے اس علم کی پختگی یعنی نصوص کے معانی و علل کی معرفت اور اصول کا فروع پر انطباق، اور تیسرا جزء ہے اس پر عمل کرنا تاکہ علم بالذات مقصود نہ بن جائے۔ جب یہ تینوں اجزاء مکمل ہو جائیں تو انسان فقیہ بن جاتا ہے۔"

(الاصول للبزدوی بر حاشیہ کشف الاسرار، طبع کراچی ج ۱ ص ۱۲)

مسلم الثبوت کے مصنف محب اللہ ؒ بہاری (ف ۱۱۱۹ھ) نے بزدوی ؒ کا دفاع کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اصل بحث یہ نہیں کہ فقہ کے لغوی اور اصطلاحی مفہوم میں عمل شامل ہے یا نہیں بلکہ اصل بحث یہ ہے کہ جس فقہ کی شارع اور صحابہؓ و تابعین ؒ نے مدح و تعریف کی ہے وہ کیا چیز ہے؟ اس اعتبار سے بزدوی ؒ کی بات درست ہے، اس لئے کہ فاسق مدح و تعریف کا مستحق نہیں ہے اور فاسق کو غیر فقیہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے۔ حجاج بن یوسف کو کسی نے بھی فقہاء میں شمار نہیں کیا حالانکہ وہ احکام کو دلائل کے ساتھ جانتا تھا۔ (فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت، طبع نولکشور، لکھنؤ، ۱۸۷۸، ص ۸)

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ دین کا وسیع اور تحقیقی علم رکھنے کے باوجود فسق و فجور میں مبتلا ہوں وہ فقہاء کہلانے کے مستحق نہیں ہیں بلکہ ایسے لوگوں کو قرآن میں "سفہاء" کا نام دیا گیا ہے۔ علم بلا عمل فقاہت نہیں ہے۔ بلکہ سفاہت و حماقت ہے، اس لئے کہ اسلامی تعلیمات کی رو سے علم و فقہ بذاتِ خود مقصود نہیں ہے۔

فقہ حنفی کے بنیادی ماخذ و مصادر

دین اسلام کا ماخذ و منبع وحیِ خداوندی ہے، اور وحی منحصر ہے قرآن و سنت میں اس لئے تمام مجتہدین و فقہاء کی فقہ کے مصادر قرآن و سنت کی نصوص ہوں گی یا وہ اصول ہوں گے جو ان نصوص سے ماخوذ ہوں گے۔ اختلافات جو بھی ہوں گے وہ نصوص کے فہم اور توجیہ و تطبیق میں ہوں گے یا پھر بعض ضمنی اور جزئی امور میں ہوں گے۔

ہمارا موضوع امام ابو حنیفہ ؒ کے فقہی اصول ہیں اس لئے پہلے امام صاحب ؒ کے اپنے اقوال مستند کتابوں سے نقل کئے جاتے ہیں اور پھر ان کی روشنی میں ان کے فقہی اصولوں کی تشریح کی جائے گی، ان شاء اللہ۔

خطیب بغدادی ؒ (ف ۴۶۳ھ) نے سند کے ساتھ امام ابو حنیفہ ؒ کا قول نقل کیا ہے کہ: "میں اللہ کی کتاب پر عمل کرتا ہوں، جب مجھے اس میں کوئی حکم نہیں ملتا تو پھر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو لیتا ہوں۔ اگر مجھے کتاب و سنت دونوں میں کوئی حکم نہیں ملتا تو پھر میں اصحابِ رسول ؐ کے قول کو لیتا ہوں۔ ان میں سے جس کے قول کو چاہتا ہوں لیتا ہوں اور جس کے قول کو چاہتا ہوں چھوڑ دیتا ہوں

اس مناسبت سے لفظ فقہ علم وفہم کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے، لیکن اہل اسلام کے عرف میں علم دین ور علم شریعت کو فقہ کہتے ہیں۔ علامہ جار اللہ زمخشری (ف ۵۸۳ھ) لکھتے ہیں: "فقہ کے حقیقی معنی ہیں پھاڑنا اور کھولنا اور فقیہ وہ ہوتا ہے جو احکام کا تجزیہ و تحقیق کرتا ہو، ان کے حقائق کی تفتیش کرتا ہو اور مبہم و مغلق احکام کو کھول کر واضح کرتا ہو۔" (الفائق فی غریب الحدیث، طبع بیروت، ۱۹۷۹ء ج ۲ ص ۱۳۴)

علامہ جوہریؒ (ف ۳۹۳ھ) فرماتے ہیں: "فقہ کے معنی ہیں فہم، مگر بعد میں یہ لفظ علم شریعت کے لئے مخصوص ہو گیا ہے۔" (الصحاح للجوہری، طبع ۱۹۸۴ء ج ۶، ص ۲۲۴۳)

ابن منظور افریقیؒ (ف ۷۱۱ھ) لکھتے ہیں: "فقہ کسی چیز کے جاننے اور سمجھنے کو کہتے ہیں لیکن اس کا اکثر استعمال علم دین کے لئے ہوتا ہے" (لسان العرب، ج ۱۳، ص ۵۲۲)

مذکورہ لغوی معنی کی مناسبت سے فقہ کے اصطلاحی معنی ہیں: "دین اسلام کا گہرا اور تحقیقی علم اور حق و باطل کی معرفت اور تمیز۔"

امام ابو حنیفہؒ سے فقہ کی تعریف اس طرح نقل ہوئی ہے: "فقہ نفس کو نفع پہونچانے والی اور نقصان پہونچانے والی چیزوں کی پہچان کا نام ہے۔" (تنقیح الاصول متن التوضیح۔)

یعنی زندگی کے ہر شعبے میں حق و باطل، حلال و حرام اور مفید و مضر کے درمیان فرق و امتیاز کرنے کی صلاحیت کا نام فقاہت ہے۔ ائمہ لغت نے اسی عموم کو ملحوظ رکھتے ہوئے لکھا ہے کہ اہل اسلام کے عرف میں پورے دین اور پوری شریعت کے علم کو فقہ کہا جاتا ہے، اس لئے کہ دین اصول و فروع دونوں پر مشتمل ہے، صرف فروعی اور عملی احکام کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ قرآن کریم میں پورے دین کے علم کو فقہ کہا گیا ہے مثلاً: فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ (التوبہ، آیت ۱۲۲) "ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کی آبادی کے ہر حصے میں سے کچھ لوگ نکل کر آتے اور دین کی سمجھ پیدا کرتے۔"

اسی طرح حدیث مرفوع میں آیا ہے کہ من یرد اللہ بہ خیرًا یفقھہ فی الدین، اللہ جس کے بارے میں خیر کا ارادہ کرتا ہے تو اسے دین میں فقاہت دے دیتا ہے۔ دوسری حدیث میں آیا ہے کہ ان رجالا یاتونکم من الارض یتفقھون فی الدین فاذا اتوکم فاستوصوا بھم خیرًا، کچھ لوگ تمہارے پاس مختلف علاقوں سے تفقہ فی الدین کے لئے آئیں گے۔ جب وہ آجائیں تو تم ان کے بارے میں میری وصیت کے مطابق اچھا سلوک کرو۔

قرآن و سنت کی ان نصوص میں فقہ کی نسبت پورے دین کی طرف کی گئی ہے۔ صرف عملی اور فروعی احکام کے ساتھ فقہ کو مخصوص نہیں کیا گیا۔ امام ابو حنیفہؒ کی درج بالا تعریف انہی نصوص سے ماخوذ ہے۔

متقدمین اور سلف صالحینؒ نے فقہ کی تعریف عمومی الفاظ میں کی ہے اور اسے علم الفروع کے ساتھ مخصوص نہیں کیا، لیکن متاخرین نے فقہ کو عملی احکام کے ساتھ مخصوص کر دیا ہے اور وہ اس کی تعریف اس طرح کرتے ہیں: "فقہ شریعت کے عملی احکام کا علم ہے جو تفصیلی دلائل سے ماخوذ ہو۔" (تنقیح الاصول متن التوضیح)

اس تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ جب علم الکلام کے نام سے اصول و عقائد کی تدوین الگ ہوئی اور اصلاح

دین اسلام واحد ہے اور امت مسلمہ امت واحدہ ہے۔ فقہائے اسلام و ائمہ مجتہدین کی حیثیت معلمین دین اور راہنمایانِ دین کی ہے جنھوں نے مسائل و نوازل (نو پیش آمدہ امور) کے احکام کے فہم و تفہیم کے لئے بحث و تحقیق اور اجتہاد و استنباط کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں، جن کی بنار پر پوری امّت ان کی ممنون ہے اور اللہ کے ہاں ان کے لئے انشار اللہ اجر غیر ممنون ہے۔ ان کی علمی و فقہی تحقیقات کی حیثیت مستقل مذاہب کی نہیں بلکہ قرآن و سنت کی تعبیرات و تشریحات کی ہے۔ ان کا فقہی اختلاف امّت کی وحدت کے منافی نہیں ہے بلکہ شریعت کے محاسن میں شامل ہے، جیسا کہ قاضی ابن العربیؒ نے فرمایا ہے: "ائمہ کا فروعی اختلاف شریعت کی خوبیوں میں شامل ہے" (احکام القرآن لابن العربیؒ ج ۱، ص ۳۸۲)

اس حقیقت کے پیشِ نظر مجتہدین کی اجتہادی آرار کو متوازی مذاہب کے طور پر پیش کرنا مناسب نہیں ہے بلکہ انکے اختلاف کو اختلاف تعبیر اور اختلاف تنوع کی حیثیت دینی چاہئے اور ان کی آرا متنوعہ کو فرقہ بندی اور عصبیت کا ذریعہ نہیں بنانا چاہئے۔ تمام فقہائے اسلام اور ائمہ مجتہدین ہمارے لئے واجب الاحترام ہیں اور ان کے مناقب و مباحث کا تذکرہ موجبِ برکت و سعادت ہے۔

فقہ کی حقیقت

امام ابوحنیفہؒ نہ صرف یہ کہ فقیہ تھے بلکہ امام الفقہار تھے۔ ہر فقیہ کے کچھ اصول ہوتے ہیں جن کو وہ اپنی تحقیق کے دوران مدنظر رکھتا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے بھی فقہی اور اجتہادی اصول ہیں جن کو وہ تدوین فقہ کے دوران مدنظر رکھتے تھے۔ ان اصولوں کے بیان سے پہلے فقہ کی حقیقت بیان کرنا مناسب ہے۔

لفظ فقہ کے اصل لغوی معنی تو ہیں اَلشَّقُّ وَالْفَتْحُ یعنی پھاڑنا اور کھولنا۔ کسی چیز کو جاننے اور سمجھنے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اس سے پردہ اٹھایا جائے اور صحیح و غلط کو الگ الگ کر دیا جائے

(۱) حضرت ابراہیم بن محمد (۲) حضرت ابراہیم بن زید (۳) حضرت اسماعیل بن حماد (۴) حضرت اسماعیل بن ابی خالد (۵) حضرت اسماعیل بن عبدالملک (۶) حضرت ایوب سختیانی (۷) حضرت بیان بن بشر (۸) حضرت جبلہ بن سحیم (۹) حضرت الحارث بن عبدالرحمٰن (۱۰) حضرت الحسن بن الزراد (۱۱) حضرت الحسن بن عبیداللہ (۱۲) حضرت الحسن البصری (۱۳) حضرت الحکم بن عتیبہ (۱۴) حضرت حماد بن ابی سلیمان (۱۵) حضرت حمید الاعرج (۱۶) حضرت خالد بن علقمہ (۱۷) حضرت ذر بن عبداللہ (۱۸) حضرت ربیعہ بن عبدالرحمٰن (۱۹) حضرت زبید (۲۰) حضرت زیاد بن علاقہ (۲۱) حضرت سالم بن عبداللہ (۲۲) حضرت سعید بن مسروق (۲۳) حضرت سلمہ بن کہیل (۲۴) حضرت سلمہ بن نبیط (۲۵) حضرت سلیمان بن عبدالرحمٰن (۲۶) حضرت سلمان بن یسار (۲۷) حضرت سماک بن حرب (۲۸) حضرت شداد بن عبدالرحمٰن (۲۹) حضرت شیبان بن عبدالرحمٰن (۳۰) حضرت طاؤس بن کیسان (۳۱) حضرت طریف بن شہاب (۳۲) حضرت طلحہ بن نافع الواسطی (۳۳) حضرت عاصم بن سلیمان (۳۴) حضرت عاصم بن کلیب (۳۵) حضرت عامر بن ابی موسیٰ (۳۶) حضرت عبداللہ بن الاقمر (۳۷) حضرت عامر بن شراحیل الشعبی (۳۸) حضرت عبداللہ بن حبیبہ (۳۹) حضرت عبداللہ بن دینار (۴۰) حضرت عبدالرحمٰن بن حزم (۴۱) حضرت عبدالرحمٰن بن ہرمز (۴۲) حضرت عبدالعزیز بن رفیع (۴۳) حضرت عبدالکریم بن ابی المخارق (۴۴) حضرت عبدالمالک بن عمیر (۴۵) حضرت عثمان بن عاصم (۴۶) حضرت عدی بن ثابت (۴۷) حضرت عطار بن ابی رباح (۴۸) حضرت عطار بن السائب (۴۹) حضرت عطار بن الیسار الہلالی (۵۰) حضرت عطیہ بن سعد (۵۱) حضرت عکرمہ بن عبداللہ (۵۲) حضرت علقمہ بن مرثد (۵۳) حضرت علی بن الاقمر (۵۴) حضرت علی بن الحسن الزراد (۵۵) حضرت عمرو بن دینار (۵۶) حضرت عمرو بن عبداللہ الہمدانی (۵۷) حضرت عون بن عبداللہ (۵۸) حضرت قاسم بن عبدالرحمٰن (۵۹) حضرت قاسم بن محمد (۶۰) حضرت قاسم بن معن (۶۱) حضرت قتادہ بن دعامہ (۶۲) حضرت قیس بن مسلم (۶۳) حضرت محارب بن دثار (۶۴) حضرت محمد بن الزبیر حنظلی (۶۵) حضرت محمد بن السائب (۶۶) حضرت محمد بن السائب (۶۷) حضرت محمد بن علی بن الحسین (۶۸) حضرت محمد بن عبس الہمدانی (۶۹) حضرت محمد بن مسلم بن تدرس (۷۰) حضرت محمد بن مسلم بن عبیداللہ (۷۱) حضرت محمد بن منصور (۷۲) حضرت محمد بن المنکدر (۷۳) حضرت منحول بن راشد (۷۴) حضرت مسلم بن سالم (۷۵) حضرت مسلم بن عمران (۷۶) حضرت مسلم بن کیسان (۷۷) حضرت معن بن عبدالرحمٰن (۷۸) حضرت مقسم بن بجرہ (۷۹) حضرت مکحول (۸۰) حضرت مکی بن ابراہیم (۸۱) حضرت منصور بن المعتمر (۸۲) حضرت منہال بن خلیفہ (۸۳) حضرت موسیٰ بن ابی عائشہ (۸۴) حضرت ناصح بن عبداللہ (۸۵) حضرت نافع (۸۶) حضرت وقدان (۸۷) حضرت ہشیم بن حبیب (۸۸) حضرت یحییٰ بن ابی جبر (۸۹) حضرت یحییٰ بن سعید بن قیس (۹۰) حضرت یحییٰ بن عبداللہ (۹۱) حضرت یحییٰ بن عبداللہ الکندری (۹۲) حضرت یزید بن صہیب (۹۳) حضرت یزید بن عبدالرحمٰن (۹۴) حضرت یزید بن الطوسی (۹۵) حضرت یونس بن عبداللہ (۹۶) حضرت ابواسحاق السبوعی (۹۷) حضرت ابوبردہ (۹۸) حضرت ابوبکر بن ابی الجہم (۹۹) حضرت ابوحصین (۱۰۰) حضرت ابوالزبیر (۱۰۱) حضرت ابوسفیان السعدی (۱۰۲) حضرت ابوسفیان (۱۰۳) حضرت ابوالسوار (۱۰۴) حضرت ابوغسان (۱۰۵) حضرت ابوعمر (۱۰۶) حضرت ابن شہاب (۱۰۷) حضرت ابوعون (۱۰۸) حضرت ابوذر (۱۰۹) حضرت ابوکثیر (۱۱۰) حضرت ابوالمالک (۱۱۱) حضرت ابوالہیثم (۱۱۲) حضرت ابویعفور۔

صاحب اور امام حماد شریکِ سفر تھے پانی موجود نہیں تھا اتنے میں عصر کی نماز کا وقت آ گیا۔ حماد نے تیمم کر کے نماز ادا کی، امام صاحبؒ نے نماز نہیں پڑھی بلکہ پانی ملنے کی امید پر نماز کو آخر وقتِ مستحب تک مؤخر رکھا جب آگے چل کر پانی مل گیا تو امام صاحبؒ نے وضو کیا اور نماز ادا کی۔ امام صاحبؒ کا فرمانا ہے کہ ایسے آدمی کو کہ جسے آخری وقتِ مستحب تک پانی ملنے کی امید ہو نماز کو موخر کر دینا چاہیئے۔ امام حمادؒ نے امام صاحبؒ کے اس اجتہاد کی تعریف کی یہ امام صاحبؒ کا اپنے استاد سے پہلا اختلاف تھا اور پہلا ہی اجتہاد تھا جو درست اور صحیح ثابت ہوا۔

اُستاذ کا احترام

بایں ہمہ امام صاحبؒ اپنے اُستاد کا بے حد احترام فرماتے تھے۔ امام محمدؒ امام صاحبؒ کا مقولہ نقل فرماتے ہیں کہ میں نے کوئی نماز ایسی نہیں پڑھی کہ اپنے والدین کے ساتھ اپنے اساتذہ اور امام حمادؒ کے لئے دعائے مغفرت نہ کی ہو، امام صاحب جب تک حیات رہے اپنے استاذ کے مکان کی طرف کو پیر پھیلا کر نہیں سوئے۔

اُستاذ کی نیابت

امام زفرؒ کہتے ہیں کہ "ایک دفعہ امام صاحبؒ نے فرمایا کہ ایک مرتبہ میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ میں کیوں نہ اپنا حلقۂ درس علیحدہ قائم کر لوں؟ اسی اثناء میں حضرت اُستاذ کے کسی قریبی عزیز کا بصرہ میں انتقال ہو گیا جس کی وجہ سے انہیں بصرہ جانا پڑا اور اپنی عدمِ موجودگی میں مجھے اپنا نائب مقرر کر دیا۔ اتفاق سے بصرہ میں انہیں دو مہینہ قیام کرنا پڑا اور اس مدّت میں لوگوں نے جو مجھ سے سوالات کئے ان سب کے جوابات میں نے علیحدہ کاغذ پر بھی لکھ کر رکھ لئے اور اُستاذ کے تشریف لانے پر وہ کاغذات میں نے ان کی خدمت میں پیش کر دیئے اُستاذ محترم نے جوابات پڑھے جن میں سے ۴۰ کی تصویب اور ۴۰ کی تغلیط فرمائی اس وقت میں نے عہد کیا کہ اب آئندہ اُستاذ کا حلقۂ درس نہ ترک کروں گا۔"

امام صاحبؒ کے دیگر اساتذہ

فقہ میں اگرچہ آپ امام حماد ہی کے تربیت یافتہ ہیں، لیکن آپ نے دوسروں سے بھی استفادہ کیا ہے مثلاً امام جعفر صادقؒ ان کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:۔ ومارأیت افقہ من جعفر بن محمد الصادق "میں نے امام جعفر صادقؒ سے زیادہ فقیہ نہیں دیکھا"

(امام جعفر الصادقؒ اہلِ بیت اور خاندانِ رسالت سے ہیں اپنے زمانہ میں ہر اعتبار سے امامِ فن اور صاحبِ کمال سمجھے جاتے تھے، صحاح ستہ میں متعدد روایات ان سے منقول ہیں۔)

علامہ شامیؒ نے شرح درمختار میں بیان فرمایا ہے کہ امام صاحبؒ کے چار ہزار اُستاذ تھے ایک دفعہ حنفیہ اور شافعیہ میں مناظرہ ہوا کہ امام شافعیؒ افضل ہیں یا امام ابوحنیفہؒ؟ جب اساتذہ کو شمار کیا گیا تو امام شافعیؒ کے ۸۰ اساتذہ شمار میں آئے اور امام صاحبؒ کے چار ہزار۔ (حدائق الحنفیہ)

کوفہ اور بصرہ علوم کے مراکز تھے اور امام صاحبؒ فرماتے ہیں کہ میں نے کوفہ اور بصرہ کا کوئی محدث نہیں چھوڑا جس کے پاس نہ گیا ہوں اس لئے بعض حضرات نے امام صاحبؒ کے اساتذہ کی تعداد ۹۹ بتلائی ہے حافظ ذہبی نے ۲۹۰ تعداد بتلائی ہے نہایت تحقیق کے بعد آپ کے اساتذہ کی فہرست اس طرح ہے:۔

تنسیق النظام صنہ۵ کی طرف رجوع کرے۔ امام صاحبؒ ان کے بارے میں فرماتے ہیں کہ "میں نے حماد سے زیادہ کسی کو فقیہ نہیں دیکھا"

امام حماد دینی علمی کمالات کے علاوہ اور دوسرے اوصافِ حمیدہ بھی تھے۔ وہ رمضان کے مہینہ میں ہر روز پچاس آدمیوں کو افطار کراتے اور کھانا کھلاتے تھے؛ در عید کے دن ہر ایک کو عمدہ قسم کا لباس اور سو درہم دے کر رخصت کرتے تھے اور امام شافعی فرماتے ہیں "میں امام حماد سے محبت کرتا ہوں اس وجہ سے کہ میں ان کے متعلق جانتا ہوں کہ وہ ایک مرتبہ جارہے تھے کہ ان کے گھوڑے کی زین ٹوٹ گئی انھوں نے ایک موچی سے مرمت کرائی اور اس کے عوض اشرفیوں کی تھیلی پیش کی اور معذرت چاہی۔

امام اعظمؒ کے استاد حمادؒ کا حلقۂ درس

زمانہ قدیم میں درس کا طریقہ یہ نہیں تھا جو آج ہے بلکہ حلقۂ درس میں تلامذہ استاد کی تقریر کو بغور سنتے اور اس کو اپنے حافظہ میں محفوظ کر لیتے اور بعض لکھ بھی لیتے تھے۔ امام حمادؒ کے یہاں بھی یہی دستور تھا، لیکن تلامذہ کے بیٹھنے میں ترتیب قائم ہوتی تھی قدیم اور ذہین طلباء کو آگے جگہ دی جاتی تھی لیکن امام صاحبؒ کو امام حمادؒ کے حلقۂ درس میں دوسرے دن ہی صفِ اوّل میں جگہ مل گئی تھی۔

امام صاحبؒ کس طرح امام حمادؒ کے حلقۂ درس میں پہونچے اس کے اسباب کیا تھے، یحییٰ بن شیبان امام صاحبؒ سے روایت کرتے ہیں:

"جب میں ایک مدت مناظرہ میں صرف کر چکا تو میں نے سوچا اور اپنے نفس سے سوال کیا کہ کیا وہ علوم مجھے آتے ہیں جو اصحابِ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو آتے تھے اور سب تابعین ان کے ماہر تھے وہ لوگ جدل و مناظرت نہیں کرتے تھے بلکہ تعلیم و افتاء میں لگے رہتے تھے لیکن آج لوگوں کا یہ حال نہیں ہے۔ یہ سوچ کر میں نے مناظرہ اور علم کلام کو ترک کر دیا اور ابوابِ فقہ کی تحصیل میں لگ گیا"

امام صاحبؒ کے ان خیالات کو مزید سہارا اس وقت ملا جب کسی عورت نے آپ سے ایک مسئلہ معلوم کیا جس کا آپ جواب نہ دے سکے اس کے فوراً بعد ہی بلا تامل امام حمادؒ کے حلقۂ درس میں آکر شریک ہوگئے جو آپ کے گھر کے قریب ہی تھا۔ اور اپنی استعداد اور خداداد ذہانت کی وجہ سے استاد کو اپنا گرویدہ کر لیا اور اس درجہ اپنی صلاحیت کا سکہ جما دیا کہ ایک دن استاد نے کہہ ہی دیا:-

افزتنی یا ابا حنیفۃ "اے ابو حنیفہ تو نے مجھے خالی کر دیا"

امام اعظمؒ کا استاذ سے پہلا اختلاف

یہ ایک عجیب سا عنوان ہے اور کم از کم ہمارے زمانے میں عقیدت مندانہ حلقوں میں گستاخی سمجھا جائے گا لیکن اہلِ حق جو پیروانِ حق ہوتے ہیں ان کے نزدیک یہ حق پسندی اور سعادت ہے چنانچہ ایک دفعہ امام

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اُستاذ حمادؒ بن ابی سلیمان مشہور تابعی ہیں۔ حضرت انسؓ سے روایت ک
ۂ اپنے زمانے میں کوفہ کے رؤسائے عظام اور فقہائے بے مثل میں شمار ہوئے ہیں۔ آپ کو ابراہیمؒ
ے شرفِ تلمذ حاصل ہے ۱۲۰ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔

تاریخ اصبہان میں ابو شیخ نے ان کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے ایک دن ابراہیم نخعیؒ نے اُ
بل درہم کا گوشت لانے کے لئے بازار بھیجا زنبیل ان کے ہاتھ میں تھی ادھر کہیں سے ان کے والدہ
ھوڑے پر سوار تشریف لا رہے تھے بیٹے کی یہ فقیرانہ حالت دیکھ کر ان کو ڈانٹا اور زنبیل ہاتھ سے
پھینکدی۔ جب ابراہیم نخعیؒ کا انتقال ہو گیا تو طالبانِ علمِ حدیث اُن کے والد مسلم بن یزید کے درو
پر آئے اور دستک دی یہ چراغ لے کر باہر آئے۔ طلباء نے کہا ہمیں آپ کی ضرورت نہیں بلک
آپ کے بیٹے حماد کے متلاشی ہیں۔ یہ شرمندہ ہو کر اندر گئے اور بیٹے سے کہا، جاؤ بھائی تمہیں یہ مق
براہیم کی زنبیل کی وجہ سے حاصل ہوا ہے۔ (ترجمان السنہ)

امام حماد کا حلقۂ درس ان دنوں میں بھی عروج پر تھا جب حجاج کی سفاکیاں اور ولید کی بد
عام تھیں اور لوگ بے دریغ قتل کئے جا رہے تھے وجہ اس کی غالباً یہ تھی کہ یہ فارغ البال اور د
تھے اس وجہ سے انہیں دل جمعی سے کام کرنے اور اشاعتِ علم کا خوب موقع ملا لہٰذا ان کی درسگا
امام ابو حنیفہؒ اور شعبہؒ جیسے ائمہ فن پیدا ہوئے۔

امام حماد اپنے زمانے میں نہایت معتمد سمجھے جاتے تھے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت
اپنے زمانے میں امام بھی تھے اسی وجہ سے ان کی طرف رجوع عام تھا غالباً اسی وجہ سے امام صاح
بھی ان کا حلقۂ درس منتخب کیا تھا۔

امام حماد پر کچھ حضرات نے اعتراضات بھی کئے ہیں مثلاً امام نسائی نے ان کو ارجاء کی طرف
کیا ہے اسی طرح ابو اسحاق اور اعمش نے ان کو غیر ثقہ قرار دیا ہے لیکن ان کے مقابلہ میں ایک جما
نے ان کی احادیث کو قبول کیا ہے۔ ائمۂ فن کے بکثرت اقوال ان کی توثیق میں موجود ہیں جس کا جی

آپؐ کی یاد میں صلے اللہ علیہ وسلم

آستانہ پہ تصوّر میں بھی سر رکھتے ہیں
"آپؐ کی یاد میں ہم آنکھ کو تر رکھتے ہیں

فیضِ صحبت سے نبیؐ کی جو ہوئے ہیں دلشاد
حُسنِ کردار کے وہ لعل وگہر رکھتے ہیں

جن کے دل یادِ نبیؐ سے نہیں ہوتے غافل
ایسے افراد زبانوں میں اثر رکھتے ہیں

حُبِ سرورؐ کی ضیاء پھیل گئی چہروں پر
جو مدینہ کے لئے عزمِ سفر رکھتے ہیں

کعبہ ہوتے ہوئے جائیں گے مدینہ زائر
اپنے دامن میں وہ بخشش کا ثمر رکھتے ہیں

اُن کو آساں ہے تصوّر میں مدینہ جانا
وہ جو تقویٰ و تقدّس کے بھی پر رکھتے ہیں

طاعتِ سرورِ عالمؐ کا نتیجہ ہے سعید
یہ کرم اُنؐ کا ہے جو ہم پہ نظر رکھتے ہیں

صلے اللہ علیہ وسلم

قاضی سعید فیضانی

اسی طرح جب حجاج بن یوسف کے ظالمانہ دورِ ولایت میں عبدالرحمٰن بن اشعث نے بنی اُمیہ کے خلاف خروج کیا تو اس وقت بڑے بڑے فقہاء، سعید بن جُبَیر، الشعبی، ابن ابی لیلیٰ اور ابوالبختری اس کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ ابن کثیر کا بیان ہے کہ قُرّاء (یعنی علماء و فقہاء) کی ایک پوری رجمنٹ اس کے ساتھ تھی۔ پھر جو علماء اس کے ساتھ کھڑے نہ ہوئے ان میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ یہ خروج ناجائز ہے۔ اس موقع پر ابن اشعث کی فوج کے سامنے ان فقہاء نے جو تقریریں کی تھیں وہ اُن کے نظریے کی پوری ترجمانی کرتی ہیں۔ ابن ابی لیلیٰ نے "اے اہلِ ایمان، جو شخص دیکھے کہ ظلم و ستم ہو رہا ہے اور بُرائیوں کی طرف دعوت دی جا رہی ہے، وہ اگر دل سے اس کو بُرا سمجھے تو بَری ہوا اور اگر زبان سے اس پر اظہار ناپسندی کرے تو اس نے اجر پایا اور پہلے شخص سے افضل رہا، مگر ٹھیک ٹھیک راہِ حق پانے والا اور یقین کے نور سے دل کو روشن کرنے والا وہی ہے جو اللہ کا بول بالا اور ظالموں کا بول نیچا کرنے کی خاطر ایسے لوگوں کی مخالفت تلوار سے کرے۔ پس جنگ کرو ان لوگوں کے خلاف جنہوں نے حرام کو حلال کر دیا ہے اور اُمت میں بُرے راستے نکالے ہیں، جو حق سے بیگانہ ہیں اور اسے نہیں پہچانتے، جو ظلم پر عمل کرتے ہیں اور اسے بُرا نہیں جانتے۔"

الشعبی نے کہا: "ان سے لڑو اور یہ خیال نہ کرو کہ ان کے خلاف جنگ کرنا کوئی بُرا فعل ہے۔ خدا کی قسم، آج روئے زمین پر میرے علم میں ان سے بڑھ کر ظلم کرنے والا اور اپنے فیصلوں میں ناانصافی کرنے والا کوئی گروہ نہیں ہے۔ پس ان کے خلاف لڑنے میں ہرگز سستی نہ ہونے پائے۔"

سعید بن جُبَیر نے کہا: "ان سے لڑو، اس بنا پر کہ وہ حکومت میں ظالم ہیں، دین میں سرکش ہیں، کمزوروں کو ذلیل کرتے ہیں، اور نمازوں کو ضائع کرتے ہیں۔"

ان فقہاء کے برعکس جن بزرگوں نے حجّاج کے خلاف خروج میں ابن اشعث کا ساتھ نہیں دیا انہوں نے بھی یہ نہیں کہا کہ یہ خروج بجائے خود حرام ہے، بلکہ یہ کہا کہ ایسا کرنا مصلحت کے خلاف ہے۔ چنانچہ حضرت حسن بصریؒ سے جب اس معاملہ میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا:

"خدا کی قسم! اللہ نے حجاج کو تم پر یونہی مسلط نہیں کر دیا ہے، بلکہ یہ تمہارے لئے ایک سزا ہے۔ لہٰذا اللہ کی اس سزا کا مقابلہ تلوار سے نہ کرو بلکہ صبر و سکون کے ساتھ اسے سہو اور اللہ کے حضور گڑگڑا کر معافی چاہو۔"

یہ تھی پہلی صدی ہجری کے اہلِ دین کی عام رائے۔ امام ابوحنیفہؒ نے اسی دور میں آنکھیں کھولی تھیں اس لئے ان کی رائے بھی وہی تھی جو ان لوگوں کی تھی۔ اس کے بعد دوسری ہجری کے آخری دور میں وہ دوسری رائے ظاہر ہونی شروع ہوئی جو اب جمہور اہلِ سنت کی رائے کہی جاتی ہے۔ اس رائے کے ظہور کی وجہ یہ نہ تھی کہ کچھ نصوصِ قطعیہ اس کے حق میں مل گئی تھیں جو پہلی صدی کے اکابر سے پوشیدہ تھیں یا معاذ اللہ پہلی صدی والوں نے نصوص کے خلاف مسلک اختیار کر رکھا تھا۔ بلکہ دراصل اس کے دو وجوہ تھے۔ ایک یہ کہ جبّاروں نے پُرامن جمہوری طریقوں سے تبدیلی کا کوئی راستہ کھلا نہ چھوڑا تھا۔ دوسرے یہ کہ تلوار کے ذریعہ سے تبدیلی کی جو کوششیں ہوئی تھیں اُن کے ایسے نتائج پے در پے ظاہر ہوتے چلے گئے جن کو دیکھ کر اس راستے سے بھی خیر کی توقع باقی نہ رہی۔ (ماخوذ از امام ابوحنیفہؒ اور ان کے کارنامے)

ابو حنیفہؒ سے کچھ مختلف نہ تھا۔ نفس زکیہ کے خروج کے موقع پر جب ان سے پوچھا گیا کہ ہماری گردنوں میں تو خلیفہ منصور کی بیعت ہے، اب ہم دوسرے مدعیٔ خلافت کا ساتھ کیسے دے سکتے ہیں، تو انہوں نے فتویٰ دیا کہ عباسیوں کی بیعت جبری تھی اور جبری بیعت، قسم، یا طلاق جو بھی ہو، وہ باطل ہے۔ اسی فتوے کی وجہ سے بکثرت لوگ نفس زکیہ کے ساتھ ہو گئے اور بعد میں اس کا خمیازہ امام مالکؒ کو یہ بھگتنا پڑا کہ مدینے کے عباسی گورنر جعفر بن سلیمان نے انہیں کوڑے لگوائے اور ان کا ہاتھ شانے سے اکھڑ گیا۔

امام ابو حنیفہؒ اس مسلک میں منفرد نہیں ہیں

یہ خیال کرنا صحیح نہ ہوگا کہ خروج کے مسئلے میں اہل السنت کے درمیان امام ابو حنیفہؒ اپنی رائے میں منفرد ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ پہلی صدی ہجری میں اکابر اہل دین کی رائے وہی تھی جو امام اعظمؒ نے اپنے قول اور عمل سے ظاہر فرمائی ہے۔ بیعتِ خلافت کے بعد حضرت ابو بکرؓ نے سب سے پہلا خطبہ جو دیا اُس میں وہ فرماتے ہیں:
اَطِیْعُوْنِیْ مَا اَطَعْتُ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ، فَاِذَا عَصَیْتُ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ فَلَا طَاعَةَ لِیْ عَلَیْکُمْ۔

"میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کروں۔ لیکن اگر میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کروں تو میری کوئی اطاعت تم پر نہیں ہے۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:۔ مَنْ بَایَعَ رَجُلاً مِنْ غَیْرِ مَشْوَرَةٍ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ فَلَا یُبَایِعُ هُوَ وَلَا الَّذِیْ بَایَعَهٗ تَغِرَّةً اَنْ یُقْتَلَا۔

"جس نے مسلمانوں کے مشورے کے بغیر کسی شخص کی بیعت کی وہ بیعت کرنے والا اور جس سے اس نے بیعت کی، اپنے آپ کو بھی اور اس کو بھی دھوکا دیتا ہے اور اپنے آپ کو قتل کے لئے پیش کرتا ہے۔"

یزید کی قائم شدہ امارت کے مقابلے میں جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ اٹھے تو بکثرت صحابہ زندہ تھے، اور فقہائے تابعین کا تو قریب قریب سارا گروہ ہی موجود تھا۔ مگر ہماری نگاہ سے کسی صحابی یا تابعی کا یہ قول نہیں گزرا کہ "حضرت حسینؓ ایک فعلِ حرام کا ارتکاب کرنے جا رہے تھے"۔ جن جن لوگوں نے بھی حضرت ممدوح کو روکا تھا کہ اہلِ عراق قابلِ اعتماد نہیں ہیں، آپ کامیاب نہ ہو سکیں گے، اور اس اقدام سے اپنے آپ کو خطرے میں ڈال دیں گے۔ بالفاظ دیگران سب کی رائے اس مسئلے میں وہی تھی جو بعد میں امام ابو حنیفہؒ نے ظاہر فرمائی کہ فاسد امارت کے خلاف خروج بجائے خود ناجائز نہیں ہے، مگر اس اقدام سے پہلے یہ دیکھ لینا ضروری ہے کہ آیا بگڑے ہوئے نظام کو بدل کر صالح نظام قائم ہو جانے کا امکان ہے یا نہیں۔ امام حسینؓ اہل کوفہ کے پے در پے خطوط کی بنا پر یہ سمجھ رہے تھے کہ انہیں اتنے حامی مل گئے ہیں جنہیں ساتھ لے کر وہ ایک کامیاب انقلاب برپا کر سکتے ہیں۔ اسی لئے وہ مدینہ سے نکل کھڑے ہوئے۔ بخلاف اس کے جو صحابہؓ ان کو روک رہے تھے ان کا یہ خیال تھا کہ اہل کوفہ نے ان کے والد حضرت علیؓ اور ان کے بھائی حضرت حسنؓ کے ساتھ جو بے وفائیاں کی تھیں ان کی بنا پر وہ اعتماد کے لائق نہیں ہیں۔ اس طرح امام حسینؓ اور ان صحابہؓ کے درمیان اختلاف تدبیر کے لحاظ سے تھا نہ کہ جواز و عدم جواز کے لحاظ سے۔

وہ لوگوں کو ابراہیم کا ساتھ دینے اور اُن سے بیعت کرنے کی تلقین کرتے تھے۔ وہ اُن کے ساتھ خروج کو نفلی حج سے پچاس ۵۰ یا ستّر گنا زیادہ ثواب کا کام قرار دیتے تھے۔ ایک شخص ابو اسحاق الفزاری سے انہوں نے یہاں تک کہا کہ تیرا بھائی جو ابراہیم کا ساتھ دے رہا ہے، اس کا یہ فعل تیرے اس فعل سے کہ تو کفار کے خلاف جہاد کرتا ہے زیادہ افضل ہے۔ امام کے یہ اقوال ابو بکر جصّاص، الموفق المکی اور ابنِ البزّاز الکردری صاحب فتاویٰ بزّازیہ جیسے لوگوں نے نقل کئے ہیں جو خود بڑے درجے کے فقیہ ہیں۔ ان اقوال کے صاف معنیٰ یہ ہیں کہ امام کے نزدیک مسلم معاشرے کے اندرونی نظام کو بگڑی ہوئی قیادت کے تسلّط سے نکالنے کی کوشش باہر کے کفّار سے لڑنے کی بہ نسبت بدرجہا زیادہ فضیلت رکھتی تھی۔

سب سے زیادہ اہم اور خطرناک اقدام ان کا یہ تھا کہ انھوں نے المنصور کے نہایت معتمد جنرل اور اس کے سپہ سالارِ اعظم حسن بن قحطبہ کو نفسِ زکیّہ اور ابراہیم کے خلاف جنگ پر جانے سے روک دیا۔ اس کا باپ قحطبہ وہ شخص تھا جس کی تلوار نے ابو مسلم کی تدبیر و سیاست کے ساتھ مل کر سلطنتِ عباسیہ کی بنا رکھی تھی۔ اس کے مرنے کے بعد یہ اس کی جگہ سپہ سالارِ اعظم بنایا گیا اور منصور کو اپنے جنرلوں میں سب سے زیادہ اسی پر اعتماد تھا۔ لیکن وہ کوفے میں رہ کر امام ابو حنیفہؒ کا گرویدہ ہو چکا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ امام سے کہا کہ میں آج تک جتنے گناہ کر چکا ہوں (یعنی منصور کی نوکری میں جیسے کچھ ظلم و ستم میرے ہاتھوں ہوتے ہیں) وہ آپ کے علم میں ہیں۔ اب کیا میرے لئے ان گناہوں کی معافی کی بھی کوئی صورت ہے؟ امام نے کہا "اگر اللہ کو معلوم ہو کہ تم اپنے افعال پر نادم ہو، اور اگر آئندہ کسی مسلمان کے بے گناہ قتل کے لئے تم سے کہا جائے اور تم اسے قتل کرنے کے بجائے خود قتل ہو جانا گوارا کر لو، اور اگر تم خدا سے عہد کرو کہ آئندہ اپنے پچھلے افعال کا اعادہ نہ کرو گے تو یہ تمہارے لئے توبہ ہوگی"۔ حسن نے امام کی یہ بات سُن کر ان کے سامنے عہد کر لیا۔ اس پر کچھ مدّت ہی گزری تھی کہ نفسِ زکیّہ اور ابراہیم کے خروج کا معاملہ پیش آگیا۔ منصور نے حسن کو اُن کے خلاف جنگ پر جانے کا حکم دیا۔ اس نے آکر امام سے اس کا ذکر کیا۔ امام نے فرمایا "اب تمہاری توبہ کے امتحان کا وقت آگیا ہے۔ اپنے عہد پر قائم رہو گے تو تمہاری توبہ بھی رہے گی، ورنہ پہلے جو کچھ کر چکے ہو اس پر بھی خدا کے ہاں پکڑے جاؤ گے اور اب جو کچھ کرو گے اس کی سزا بھی پاؤ گے"۔ حسن نے دوبارہ اپنی توبہ کی تجدید کی اور امام سے کہا اگر مجھے مار بھی ڈالا جائے تو میں اس جنگ پر نہ جاؤں گا۔ چنانچہ اس نے منصور کے پاس جا کر صاف کہہ دیا کہ "امیر المؤمنین! میں اس مہم پر نہ جاؤں گا۔ آج تک جو کچھ میں نے آپ کی اطاعت میں کیا ہے اگر وہ اللہ کی اطاعت میں تھا تو میرے لئے بس اتنا ہی کافی ہے، اور اگر وہ اللہ کی معصیت میں تھا تو اس سے آگے اب میں مزید گناہ نہیں کرنا چاہتا"۔ منصور نے اس پر سخت ناراض ہو کر حسن کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ حسن کے بھائی حمید نے آگے بڑھ کر کہا "سال بھر سے اس کا رنگ بدلا ہوا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے، میں اس مہم پر جاؤں گا"۔ بعد میں منصور نے اپنے معتمد لوگوں کو بلا کر پوچھا کہ حسن ان فقہاء میں سے کس کے پاس جانا آنا ہے۔ بتایا گیا کہ ابو حنیفہؒ کے پاس اکثر اس کا جانا آنا رہتا ہے۔

یہ طرزِ عمل بھی ٹھیک ٹھیک امام کے اس نظریے کے مطابق تھا کہ ایک کامیاب اور صالح انقلاب کے امکانات ہوں تو ظالم حکومت کے خلاف خروج جائز ہی نہیں واجب ہے۔ اس معاملہ میں امام مالکؒ کا طرزِ عمل بھی امام

رونما ہو سکے گا۔ علاوہ بریں غالباً امام کے نہ اٹھنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ خود اس وقت تک اتنے با اثر نہ ہوئے تھے کہ ان کی شرکت سے اس تحریک کی کمزوری کا مداوا ہو سکے۔ ۱۲۰ھ تک عرق کے مدرسہ اہل الرائے کی امامت حماد کو حاصل تھی اور ابو حنیفہؒ اس وقت تک محض ان کے ایک شاگرد کی حیثیت رکھتے تھے۔ زید کے خروج کے وقت انہیں اس مدرسے کی امامت کے منصب پر سرفراز ہوئے صرف ڈیڑھ سال یا اس سے کچھ کم و بیش مدت ہوئی تھی۔ ابھی انہیں "فقیہ اہلِ مشرق" ہونے کا مرتبہ اور اثر و رسوخ حاصل نہ ہوا تھا۔

نفسِ زکیہؒ کا خروج

دوسرا خروج محمد بن عبداللہ (نفسِ زکیہ) اور اُن کے بھائی ابراہیم بن عبداللہ کا تھا جو امام حسنؓ بن علیؓ کی اولاد سے تھے۔ یہ ۱۴۵ھ بر ۶۲-۷۶۳ء کا واقعہ ہے جب امام ابو حنیفہؒ بھی اپنے پورے اثر و رسوخ کو پہونچ چکے تھے۔ ان دونوں بھائیوں کی خفیہ تحریک بنی اُمیّہ کے زمانے سے چل رہی تھی، حتیٰ کہ ایک وقت تھا جب خود المنصور نے دوسرے بہت سے لوگوں کے ہمراہ، جو اُموی سلطنت کے خلاف بغاوت کرنا چاہتے تھے، نفس زکیہ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ عباسی سلطنت قائم ہو جانے کے بعد یہ لوگ روپوش ہو گئے اور اندر ہی اندر اپنی دعوت پھیلاتے رہے۔ خراسان، الجزیرہ، رَے، طبرستان، یمن اور شمالی افریقہ میں ان کے داعی پھیلے ہوئے تھے۔ نفسِ زکیہ نے خود اپنا مرکز حجاز میں رکھا تھا اُن کے بھائی ابراہیم نے عراق میں بصرے کو اپنا مرکز بنایا تھا۔ کوفہ میں بھی بقول ابنِ اثیر ایک لاکھ تلواریں اُن کی حمایت میں نکلنے کے لئے تیار تھیں المنصور اُن کی خفیہ تحریک سے پہلے ہی واقف تھا اور اُن سے نہایت خوفزدہ تھا، کیونکہ اُن کی دعوت اسی عباسی دعوت کے متوازی چل رہی تھی جس کے نتیجے میں دولتِ عباسیہ قائم ہوئی تھی، اور اس کی تنظیم عباسی دعوت کی تنظیم سے کم نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کئی سال سے اس کو توڑنے کے درپے تھا اور اسے کچلنے کے لئے انتہائی سختیاں کر رہا تھا۔

جب رجب ۱۴۵ھ میں نفسِ زکیہ نے مدینے سے عملاً خروج کیا تو منصور سخت گھبراہٹ کی حالت میں بغداد کی تعمیر چھوڑ کر کوفہ پہونچا اور اس تحریک کے خاتمے تک اسے یقین نہ تھا کہ اس کی سلطنت باقی رہے گی یا نہیں۔ بسا اوقات بدحواس ہو کر کہتا "بخدا میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں" بصرہ، فارس، اہواز، واسط، مدائن، سواد، جگہ جگہ سے سقوط کی خبریں آتی تھیں اور ہر طرف سے اس کو بغاوت پھوٹ پڑنے کا خطرہ تھا۔ دو مہینے تک وہ ایک ہی لباس پہنے رہا۔ بستر پر نہ سویا، رات رات بھر مصلے پر گزار دیتا تھا اس نے کوفہ سے فرار ہونے کے لئے ہر وقت تیز رفتار سواریاں تیار رکھ چھوڑی تھیں۔ اگر خوش قسمتی اس کا ساتھ نہ دیتی تو یہ تحریک اس کا اور خانوادۂ عباسی کی سلطنت کا تختہ اُلٹ دیتی۔

اس خروج کے موقع پر امام ابو حنیفہؒ کا طرزِ عمل پہلے خروج سے بالکل مختلف تھا۔ انہوں نے اس زمانہ میں جبکہ منصور کوفے ہی میں موجود تھا اور شہر میں ہر رات کرفیو لگا رہتا تھا، بڑے زور شور سے کھلم کھلا اس تحریک کی حمایت کی، یہاں تک کہ ان کے شاگردوں کو خطرہ پیدا ہو گیا کہ ہم سب باندھ لئے جائیں گے

پیش آئے ان میں کیا طرزِ عمل انہوں نے اختیار کیا۔

پہلا واقعہ زید بن علی کا ہے جن کی طرف شیعوں کا فرقہ زیدیہ اپنے آپ کو منسوب کرتا ہے۔ یہ امام حسینؓ کے پوتے امام محمد الباقر کے بھائی تھے۔ اپنے وقت کے بڑے جلیل القدر عالم، فقیہ اور متقی و صالح بزرگ تھے۔ اور خود امام ابو حنیفہؒ نے بھی اُن سے علمی استفادہ کیا تھا۔ ۱۲۰ھ ۷۳۸ء میں جب ہشام بن عبدالملک نے خالد بن عبداللہ القسری کو عراق کی گورنری سے معزول کر کے اس کے خلاف تحقیقات کرائی تو اس سلسلے میں گواہی کے لئے حضرت زید کو بھی مدینے سے کوفے بُلایا گیا۔ ایک مُدّت کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ خاندان علیؓ کا ایک ممتاز فرد کوفہ آیا تھا۔ یہ شہر شیعانِ علیؓ کا گڑھ تھا۔ اس لئے ان کے آنے سے یک لخت علوی تحریک میں جان پڑ گئی اور لوگ کثرت سے اُن کے گرد جمع ہونے لگے۔ ویسے بھی عراق کے باشندے سالہا سال سے بنی اُمیّہ کے ظلم و ستم سہتے سہتے تنگ آچکے تھے اور اُٹھنے کے لئے سہارا چاہتے تھے۔ علوی خاندان کی ایک صالح، عالم، فقیہ شخصیت کا میسّر آجانا انہیں غنیمت محسوس ہوا۔ ان لوگوں نے زید کو یقین دلایا کہ کوفہ میں ایک لاکھ آدمی آپ کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہیں اور ۱۵ ہزار آدمیوں نے بیعت کر کے باقاعدہ اپنے نام بھی ان کے رجسٹر میں درج کرا دیئے اس اثنا میں کہ خروج کی یہ تیاریاں اندر ہی اندر ہو رہی تھیں، اُموی گورنر کو ان کی اطلاع پہونچ گئی۔ زید نے یہ دیکھ کر کہ حکومت خبردار ہو گئی ہے، صفر ۱۲۲ھ ۷۴۰ء میں قبل از وقت خروج کر دیا۔ جب تصادم کا موقع آیا تو کوفہ کے شیعانِ علیؓ ان کا ساتھ چھوڑ گئے۔ جنگ کے وقت صرف ۲۱۸ آدمی اُن کے ساتھ تھے۔ دورانِ جنگ میں اچانک ایک تیر سے وہ گھائل ہوئے اور ان کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔

اس خروج میں امام ابو حنیفہؒ کی پوری ہمدردی اُن کے ساتھ تھی۔ انہوں نے زید کو مالی مدد بھی دی اور لوگوں کو ان کا ساتھ دینے کی تلقین بھی کی۔ انہوں نے اُن کے خروج کو جنگِ بدر میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خروج سے تشبیہ دی، جس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے نزدیک جس طرح اس وقت آنحضرتؐ کا حق پر ہونا غیر مشتبہ تھا اسی طرح اس خروج میں زید بن علی کا بھی حق پر ہونا غیر مشتبہ تھا۔ لیکن جب زید کا پیغام ان کے نام آیا کہ آپ میرا ساتھ دیں تو انہوں نے قاصد سے کہا کہ "اگر میں یہ جانتا کہ لوگ ان کا ساتھ نہ چھوڑیں گے اور سچّے دل سے ان کی حمایت میں کھڑے ہوں گے تو میں ضرور اُن کے ساتھ ہوتا اور جہاد کرتا کیونکہ وہ امام حق ہیں، لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ یہ لوگ اسی طرح ان سے بے وفائی کریں گے جس طرح ان کے دادا (سیّدنا حسینؓ) سے کر چکے ہیں۔ البتہ میں روپے سے اُن کی مدد ضرور کروں گا۔" یہ بات ٹھیک اس مسلک کے مطابق تھی جو ائمہ جور کے خلاف خروج کے معاملے میں امام نے اصولاً بیان کیا تھا۔ وہ کوفہ کے شیعانِ علیؓ کی تاریخ اور اُن کے نفسیات سے واقف تھے۔ حضرت علیؓ کے زمانے سے یہ لوگ جس سیرت و کردار کا مسلسل اظہار کرتے رہے تھے۔ اس کی پوری تاریخ سب کے سامنے تھی۔ داؤد بن علی (ابن عباسؓ کے پوتے) نے بھی عین وقت پر حضرت زید کو ان کوفیوں کی اسی بیوفائی پر متنبہ کر کے خروج سے منع کیا تھا۔ امام ابو حنیفہؒ کو یہ بھی معلوم تھا کہ یہ تحریک صرف کوفہ میں ہے۔ پوری سلطنتِ بنی اُمیّہ اس سے خالی ہے۔ کسی دوسری جگہ اس کی کوئی تنظیم نہیں جہاں سے مدد مل سکے۔ اور خود کوفہ میں بھی چھ مہینے کے اندر یہ کچّی پکّی کھچڑی تیار ہوئی ہے اس لئے انہیں تمام ظاہری آثار کو دیکھتے ہوئے یہ توقع نہ تھی کہ زید کے خروج سے کوئی کامیاب انقلاب

کرے، لوگوں کے حقوق پر بے جا دست درازیاں کرے اور کھلم کھلا فسق کا مرتکب ہو۔ لیکن امام ابو حنیفہؒ کا مسلک یہ تھا کہ ظالم کی امامت نہ صرف یہ کہ باطل ہے، بلکہ اس کے خلاف خروج بھی کیا جا سکتا ہے اور کیا جانا چاہیئے، بشرطیکہ ایک کامیاب اور مفید انقلاب ممکن ہو، ظالم و فاسق کی جگہ عادل و صالح کو لایا جا سکتا ہو، اور خروج کا نتیجہ محض جانوں اور قوتوں کا ضیاع نہ ہو۔ ابوبکر الجصاص ان کے اس مسلک کی تشریح اس طرح کرتے ہیں :۔

"ظالموں اور ائمۂ جور کے خلاف قتال کے معاملہ میں ان کا مذہب مشہور ہے۔ اسی بنا پر اوزاعی نے کہا تھا کہ ہم نے ابو حنیفہؒ کی ہر بات برداشت کی یہاں تک کہ وہ تلوار کے ساتھ آ گئے (یعنی ظالموں کے خلاف قتال کے قائل ہو گئے) اور یہ ہمارے لئے ناقابل برداشت تھا۔ ابو حنیفہؒ کہتے تھے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ابتداءً زبان سے فرض ہے، لیکن اگر سیدھی راہ اختیار نہ کی جائے تو پھر تلوار سے واجب ہے"

دوسری جگہ وہ عبد اللہ بن المبارک کے حوالہ سے خود امام ابو حنیفہؒ کا ایک بیان نقل کرتے ہیں۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب پہلے عباسی خلیفہ کے زمانے میں ابو مسلم خراسانی نے ظلم و ستم کی حد کر رکھی تھی۔ اس زمانے میں خراسان کے فقیہ ابراہیم الصائغ امام کے پاس آئے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے مسئلے پر اُن سے گفتگو کی۔ اس گفتگو کا ذکر بعد میں خود امام نے عبد اللہ بن المبارک سے اس طرح کیا :

"ہمارے درمیان جب اس امر پر اتفاق ہو گیا کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر فرض ہے تو ابراہیم نے یکایک کہا ہاتھ بڑھائیے تا کہ میں آپ سے بیعت کروں۔ یہ سن کر دنیا میری نگاہوں میں تاریک ہو گئی (ابنِ مبارک کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یہ کیوں؟ بولے، اس نے مجھے اللہ کے ایک حق کی طرف دعوت دی اور میں نے اس کو قبول کرنے سے انکار کیا۔ آخر میں نے اس سے کہا اگر ایک اکیلا آدمی اس کے لئے اٹھ کھڑا ہو تو مارا جائے گا اور لوگوں کا کوئی کام بھی نہ بنے گا۔ البتہ اگر اُسے صالح مددگار مل جائیں اور ایک آدمی سرداری کے لئے ایسا بہم پہونچ جائے جو اللہ کے دین کے معاملے میں بھروسے کے لائق ہو تو پھر کوئی چیز مانع نہیں ہے۔ اس کے بعد ابراہیم جب بھی میرے پاس آتے مجھ پر اس کام کے لئے ایسا تقاضا کرتے جیسے کوئی سخت قرض خواہ کرتا ہے۔ میں ان سے کہتا کہ یہ کام ایک آدمی کے بنانے سے نہیں بن سکتا۔ انبیاء بھی اس کی طاقت نہ رکھتے تھے جب تک کہ آسمان سے اس کے لئے مامور نہ کئے گئے۔ یہ فریضہ عام فرائض کی طرح نہیں ہے۔ عام فرائض کو ایک آدمی تنہا بھی انجام دے سکتا ہے۔ مگر یہ ایسا کام ہے کہ اکیلا آدمی اس کے لئے کھڑا ہو جائے تو اپنی جان دے دے گا اور مجھے اندیشہ ہے کہ وہ اپنے قتل میں اعانت کا قصوروار ہو گا۔ پھر جب وہ مارا جائے گا، تو دوسروں کی ہمتیں بھی اس خطرے کو انگیز کرنے میں پست ہو جائیں گی۔"

خروج کے معاملہ میں امام کا اپنا طرزِ عمل

اس سے امام کی اصولی رائے تو اس مسئلے میں صاف معلوم ہو جاتی ہے۔ لیکن ان کا پورا نقطۂ نظر اس وقت تک سمجھ میں نہیں آ سکتا جب تک ہم یہ نہ دیکھیں کہ ان کے زمانے میں خروج کے جو اہم واقعات

قرض ادا کر دیا

ایک بار سفر حج میں عبداللہ سہمی کا ساتھ ہوا۔ کسی منزل میں ایک بدوی نے ان کو پکڑا اور امام صاحبؒ کے سامنے لایا کہ اس پر میرے روپے آتے ہیں اور یہ ادا نہیں کرتا۔ امام صاحبؒ نے عبداللہ سے اس کی حقیقت پوچھی، انہوں نے سرے سے انکار کیا۔ امام صاحبؒ نے بدوی سے پوچھا، آخر کتنے درہموں پر جھگڑا ہے۔ اس نے کہا چالیس درہم! متعجب ہو کر فرمایا کہ زمانے سے حمیت اٹھ گئی۔ اتنے سے معاملہ پر یہ فضیحتے، پھر کل درہم اپنے پاس سے ادا کر دیئے۔

اس کو قید کرنا اور سزا دینا ان کے نزدیک جائز نہیں، تاوقتیکہ وہ مسلح بغاوت یا بدامنی برپا کرنے کا عزم نہ کرے۔ اس کے لئے وہ حضرت علیؓ کے اس واقعہ سے استدلال کرتے ہیں کہ ان کے زمانہ خلافت میں پانچ آدمی اس الزام میں گرفتار کر کے لائے گئے کہ وہ امیر المومنین کو کوفہ میں علانیہ گالیاں دے رہے تھے اور ان میں سے ایک شخص کہہ رہا تھا کہ میں انہیں قتل کر دوں گا۔ حضرت علیؓ نے انہیں رہا کر دینے کا حکم دیا۔ کہا گیا کہ یہ تو آپ کو قتل کرنے کا ارادہ ظاہر کر رہا تھا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا "تو کیا بس یہ ارادہ ظاہر کرنے پر میں اسے قتل کر دوں؟" کہا گیا اور یہ لوگ آپ کو گالیاں دے رہے تھے۔ فرمایا "تم چاہو تو تم بھی انہیں گالیاں دے سکتے ہو۔" اسی طرح وہ مخالفین حکومت کے معاملے میں حضرت علیؓ کے اس اعلان سے بھی استدلال کرتے ہیں جو انہوں نے خوارج کے بارے میں کیا تھا کہ "ہم تم کو مسجدوں میں آنے سے نہیں روکیں گے۔ ہم تمہیں مفتوحہ اموال کے حصے سے محروم نہ کریں گے جب تک تم ہمارے خلاف کوئی مسلح کارروائی نہ کرو۔"

ظالم حکومت کے خلاف خروج کا مسئلہ

اس زمانہ میں ایک اہم مسئلہ یہ تھا کہ اگر مسلمانوں کا امام (امام سے مراد ہے رہنما، حاکم) ظالم و فاسق ہو تو آیا اس کے خلاف خروج کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ اس مسئلے میں خود اہل السنت کے درمیان اختلاف ہے۔ اہل الحدیث کا بڑا گروہ اس بات کا قائل رہا ہے کہ صرف زبان سے اس کے ظلم کے خلاف آواز اٹھائی جائے اور اس کے سامنے کلمہ حق کہا جائے، لیکن خروج نہ کیا جائے اگرچہ وہ ناحق خوں ریزی

فرض ہے، اور ان کو عکرمہ عن ابن عباسؓ کی سند سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سُنایا کہ "افضل الشہداء ایک تو حمزہ بن عبد المطلب ہیں، دوسرے وہ شخص جو ظالم امام کے سامنے اٹھ کر اسے نیک بات کہے اور بدی سے روکے اور اس قصور میں مارا جائے۔" ابراہیم پر امام کی اس تلقین کا اتنا زبردست اثر پڑا کہ وہ جب خراسان واپس گئے تو انہوں نے عباسی سلطنت کے بانی ابو مسلم خراسانی (م ۱۳۶ھ ۷۵۴ء) کو اس کے ظلم و ستم اور ناحق کی خونریزی پر برملا ٹوکا اور بار بار ٹوکا، یہاں تک کہ آخر کار اس نے انہیں قتل کر دیا۔

ابراہیم بن عبد اللہ، نفس زکیہ، کے بھائی کے خروج (۱۴۵ھ ۷۶۳ء) کے زمانے میں امام ابو حنیفہ کا اپنا طرز عمل یہ تھا کہ وہ علانیہ ان کی حمایت اور المنصور کی مخالفت کرتے تھے حالانکہ المنصور اس وقت کوفہ ہی میں موجود تھا، ابراہیم کی فوج بصرے سے کوفے کی طرف بڑھ رہی تھی اور شہر میں رات بھر کرفیو رہتا تھا۔ ان کے مشہور شاگرد زُفر بن الہُذیل کی روایت ہے کہ اس نازک زمانے میں ابو حنیفہؒ بڑے زور شور سے کھلم کھلا اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے یہاں تک کہ ایک روز میں نے ان سے کہا "آپ باز نہ آئیں گے جب تک، ہم سب کی گردنوں میں رسّی نہ بندھ جائے۔"

۱۴۸ھ ۷۶۵ء میں اہل موصل نے بغاوت کی۔ منصور اس سے پہلے ایک بغاوت کے بعد ان سے یہ عہد لے چکا تھا کہ آئندہ اگر وہ بغاوت کریں گے تو ان کے خون اور مال اس پر حلال ہوں گے۔ اب جو انہوں نے خروج کیا تو منصور نے بڑے بڑے فقہاء کو جن میں ابو حنیفہؒ بھی شامل تھے، بلا کر پوچھا کہ معاہدے کی رُو سے اُن کے خون اور مال مجھ پر حلال ہو گئے ہیں یا نہیں؟ دوسرے فقہاء نے معاہدے کا سہارا لیا اور کہا کہ آپ انہیں معاف کر دیں تو یہ آپ کی شان کے مطابق ہے ورنہ جو سزا بھی آپ انہیں دینا چاہیں دے سکتے ہیں۔ ابو حنیفہ خاموش تھے۔ منصور نے کہا "یا شیخ، آپ کیا کہتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا۔" اہل موصل نے آپ کے لئے وہ چیز مباح کی جو اُن کی اپنی نہ تھی (یعنی ان کے خون) اور آپ نے ان سے وہ شرط منوائی جسے آپ منوانے کا حق نہ رکھتے تھے۔ بتائیے، اگر کوئی عورت اپنے آپ کو نکاح کے بغیر کسی کے لئے حلال کر دے تو کیا وہ حلال ہو جائے گی؟ اگر کوئی شخص کسی سے کہے کہ مجھے قتل کر دے تو کیا اس کا قتل اس شخص کے لئے مباح ہو گا؟ منصور نے کہا "نہیں" امام نے کہا "تو آپ اہل موصل سے ہاتھ روک لیجئے۔ ان کا خون بہانا آپ کے لئے حلال نہیں ہے۔" یہ بات سُن کر منصور نے ناراضی کے ساتھ فقہاء کی مجلس برخاست کر دی۔ پھر ابو حنیفہؒ کو الگ بلا کر کہا "بات تو وہی صحیح ہے جو تم نے کہی، مگر تم ایسے فتوے نہ دیا کرو جن سے تمہارے امام پر حرف آئے اور باغیوں کی ہمت افزائی ہو۔"

اسی آزادیٔ اظہار رائے کا استعمال وہ عدالتوں کے مقابلے میں بھی کرتے تھے۔ کسی عدالت سے اگر کوئی غلط فیصلہ ہوتا تو قانون یا ضابطے کی جو غلطی بھی اس میں ہوتی، امام ابو حنیفہؒ اس کا صاف صاف اظہار کر دیتے تھے۔ ان کے نزدیک احترام عدالت کے معنی یہ نہ تھے کہ عدالتوں کو غلط فیصلے کرنے دیئے جائیں۔ اس قصور میں ایک دفعہ مدت تک انہیں فتویٰ دینے سے بھی روک دیا گیا تھا۔

آزادیٔ رائے کے معاملے میں وہ اس حد تک جاتے ہیں کہ جائز امامت اور اس کی عادل حکومت کے خلاف بھی اگر کوئی شخص زبان کھولے اور امام وقت کو گالیاں دے، یا اسے قتل تک کرنے کا خیال ظاہر کرے تو

پیشکش کی۔ مگر وہ ایک مدت تک طرح طرح کے حیلوں سے اس کو ٹالتے رہے۔ آخر کار جب وہ بہت زیادہ مُصر ہوا تو امام نے صاف صاف اپنے انکار کے وجوہ بتائے۔ ایک مرتبہ کی گفتگو میں انہوں نے بڑے نرم انداز میں معذرت کرتے ہوئے کہا "قضاء کے لئے نہیں موزوں ہوسکتا مگر وہ شخص جو اتنی جان رکھتا ہو کہ آپ پر اور آپ کے شاہزادوں اور سپہ سالاروں پر قانون نافذ کرسکے۔ مجھ میں یہ جان نہیں ہے۔ مجھے تو جب آپ بلاتے ہیں تو واپس نکل کر ہی میری جان میں جان آتی ہے۔" ایک اور موقع پر زیادہ سخت گفتگو ہوئی جس میں انہوں نے خلیفہ کو مخاطب کرکے کہا "خدا کی قسم میں تو اگر رضامندی سے بھی یہ عہدہ قبول کروں تو آپ کے بھروسے کے لائق نہیں ہوں، کجا کہ ناراضی کے ساتھ مجبوراً قبول کروں۔ اگر کسی معاملہ میں میرا فیصلہ آپ کے خلاف ہوا اور پھر آپ نے مجھے دھمکی دی کہ یا تو میں تجھے فرات میں غرق کردوں گا ورنہ اپنا فیصلہ بدل دے، تو میں غرق ہوجانا قبول کرلوں گا مگر فیصلہ نہ بدلوں گا۔ پھر آپ کے بہت سے اہلِ دربار بھی ہیں، انہیں تو کوئی ایسا قاضی چاہیے جو آپ کی خاطر ان کا بھی لحاظ کرے۔" ان باتوں سے جب منصور کو یقین ہوگیا کہ یہ شخص اس سنہری پنجرے میں بند ہونے کے لئے تیار نہیں ہے تو وہ عُریاں انتقام پر اتر آیا۔ انہیں کوڑوں سے پٹوایا، جیل میں ڈال کر کھانے پینے کی سخت تکلیفیں دیں، پھر ایک مکان میں نظر بند کردیا جہاں بقول بعض طبعی موت سے اور بقول بعض زہر سے ان کی زندگی کا خاتمہ ہوگیا۔

آزادیٔ اظہارِ رائے کا حق

امام کے نزدیک مسلم معاشرے اور اسلامی ریاست میں قضاء کی آزادی کے ساتھ آزادیٔ اظہارِ رائے کی بھی بہت بڑی اہمیت تھی، جس کے لئے قرآن و سنت میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ محض "اظہارِ رائے" تو نہایت ناروا بھی ہوسکتا ہے، فتنہ انگیز بھی ہوسکتا ہے، اخلاق اور دیانت اور انسانیت کے خلاف بھی ہوسکتا ہے، جسے کوئی قانون برداشت نہیں کرسکتا۔ لیکن برائیوں سے روکنا اور بھلائی کے لئے کہنا ایک صحیح اظہارِ رائے ہے اور اسلام یہ اصطلاح اختیار کرکے اظہارِ آراء کی تمام صورتوں میں سے اسی کو مخصوص طور پر عوام کا نہ صرف حق قرار دیتا ہے بلکہ اسے ان کا فرض بھی ٹھہراتا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کو اس حق اور اس فرض کی اہمیت کا سخت احساس تھا کیونکہ ان کے زمانے کے سیاسی نظام میں مسلمانوں کا یہ حق سلب کرلیا گیا تھا اور اس کی فرضیت کے معاملے میں بھی لوگ مذبذب ہوگئے تھے اس زمانے میں ایک طرف مُرجئہ اپنے عقائد کی تبلیغ سے لوگوں کو گناہ پر جرأت دلا رہے تھے، دوسری طرف حشویہ اس بات کے قائل تھے کہ حکومت کے مقابلے میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر ایک فتنہ ہے، اور تیسری طرف بنی امیہ و بنی عباس کی حکومتیں طاقت سے مسلمانوں کی اس روح کو کچل رہی تھیں کہ وہ امراء کے فسق و فجور اور ظلم و جور کے خلاف آواز اٹھائیں۔ اس لئے امام ابوحنیفہؒ نے اپنے قول اور عمل دونوں سے اس روح کو زندہ کرنے کی اور اس کے حدود واضح کرنے کی کوشش کی۔ الجصاص کا بیان ہے کہ ابراہیم الصائغ (خراسان کے ایک مشہور و بااثر فقیہ) کے سوال پر امام نے فرمایا کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر

رکھنے والے دوسرے لوگ بھی مداخلت کریں گے۔

سب سے پہلے بنی اُمیہ کے عہد میں عراق کے گورنر یزید بن عمر بن ہُبَیرہ نے ان کو منصب قبول کرنے پر مجبور کیا۔ یہ ۱۳۰ھ کا زمانہ تھا جب کہ عراق میں اُموی سلطنت کے خلاف فتنوں کے وہ طوفان اُٹھ رہے تھے جنھوں نے دو سال کے اندر امویوں کا تختہ اُلٹ دیا۔ اس موقع پر ابنِ ہُبَیرہ چاہتا تھا کہ بڑے بڑے فقہاء کو ساتھ ملا کر اُن کے اثر سے فائدہ اٹھائے۔ چنانچہ اس نے ابن ابی لیلیٰ، داؤد بن ابی الہند، ابن شُبرُمَہ وغیرہ کو بلا کر اہم مناصب دیئے۔ پھر ابو حنیفہؒ کو بلا کر کہا کہ میں آپ کے ہاتھ میں اپنی مُہر دیتا ہوں، کوئی حکم نافذ نہ ہوگا جب تک کہ آپ اُس پر مُہر نہ لگائیں اور کوئی مال خزانے سے نہ نکلے گا جب تک آپ اس کی توثیق نہ کریں۔ امام نے یہ ذمّہ داری قبول کرنے سے انکار کیا تو اس نے انہیں قید کر دیا اور کوڑے لگوانے کی دھمکی دی۔ دوسرے فقہاء نے امام کو سمجھایا کہ اپنے اُوپر رحم کرو، ہم سب اس خدمت سے ناخوش ہیں مگر مجبوراً اسے قبول کیا ہے، تم بھی مان لو۔ امام نے جواب دیا "اگر وہ مجھ سے چاہے کہ اس کے لئے واسط کی مسجد کے دروازے گنوں تب بھی میں قبول نہ کروں گا کجا کہ وہ چاہتا ہے کہ وہ کسی آدمی کے قتل کا حکم لکھے اور میں اس فرمان پر مُہر لگاؤں۔ خدا کی قسم، میں اس ذمّہ داری میں شریک نہ ہوں گا۔" اس سلسلے میں ابنِ ہُبَیرہ نے ان کے سامنے اور خدمات پیش کیں اور وہ انکار کرتے رہے۔ پھر اس نے ان کو قاضیٔ کوفہ بنانے کا فیصلہ کیا اور اس پر قسم کھالی کہ ابو حنیفہ انکار کریں گے تو میں انہیں کوڑے لگواؤں گا۔ ابو حنیفہؒ نے بھی جواب میں قسم کھالی اور کہا "دنیا میں اس کے کوڑے کھالینا میرے لئے آخرت کی سزا بھگتنے سے زیادہ سَہل ہے۔ خدا کی قسم میں ہرگز قبول نہ کروں گا، خواہ وہ مجھے قتل ہی کر دے۔" آخر کار اس نے اُن کے سر پر ۲۰ یا ۳۰ کوڑے لگوائے۔ بعض روایات یہ ہیں کہ دس گیارہ روز تک وہ روزانہ دس کوڑے لگواتا رہا، مگر ابو حنیفہؒ اپنے انکار پر قائم رہے۔ آخر کار اسے اطلاع دی گئی کہ یہ شخص مر جائے گا۔ اس نے کہا کیا کوئی ناصح نہیں ہے جو اس شخص کو سمجھائے کہ مجھ سے مُہلت ہی مانگ لے۔ امام ابو حنیفہؒ کو ابنِ ہُبَیرہ کی بات پہنچائی گئی تو انہوں نے کہا مجھے چھوڑ دو کہ میں اپنے دوستوں سے اس معاملے میں مشورہ کر لوں۔ ابن ہبیرہ نے یہ پیغام ملتے ہی انہیں چھوڑ دیا اور وہ کوفہ چھوڑ کر مکّہ چلے گئے جہاں سے بنی اُمیہ کی سلطنت ختم ہونے تک وہ پھر نہ پلٹے۔

اس کے بعد عباسی عہد میں المنصور نے اُن پر عہدۂ قضاء کے لئے اصرار شروع کیا۔ جیسا کہ آگے اس کا تذکرہ ہوگا، منصور کے خلاف نفس زکیہ اور ان کے بھائی ابراہیم کے خروج میں امام نے کھلم کھلا ان کا ساتھ دیا تھا، جس کی وجہ سے منصور کے دل میں ان کے خلاف گرہ بیٹھی ہوئی تھی۔ الذہبی کے الفاظ میں وہ ان کے خلاف غصّے میں آگ کے بغیر جلا جا رہا تھا، مگر ان جیسے با اثر آدمی پر ہاتھ ڈالنا اس کے لئے آسان نہ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ایک امام حسینؓ کے قتل نے بنی اُمیہ کے خلاف مسلمانوں میں کتنی نفرت پیدا کر دی تھی اور اس کی بدولت ان کا اقتدار کس آسانی سے اکھاڑ پھینکا گیا۔ اس لئے وہ انہیں مارنے کے بجائے سونے کی زنجیروں سے باندھ کر اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنا زیادہ بہتر سمجھتا تھا۔ اس نے اُن کے سامنے بار بار قضا کا منصب اسی نیت سے پیش کیا، یہاں تک کہ انہیں سلطنتِ عباسیہ کا قاضی القضاۃ مقرر کرنے کی

خلیفہ کے بے جا مصارف اور عطیات پر بھی معترض تھے، اور یہ اُن وجوہ میں سے ایک بڑی وجہ تھی جن کی بنا وہ خود خلفاء کے عطیے قبول نہ کرتے تھے۔

جس زمانہ میں اُن کے اور خلیفہ منصور کے درمیان سخت کشمکش چل رہی تھی، منصور نے اُن سے کہا تم میرے ہدیے کیوں نہیں قبول کرتے؟ انہوں نے جواب دیا "امیر المومنین نے اپنے مال میں سے مجھے کب دیا تھا کہ میں نے اُسے رد کیا ہو۔ اگر آپ اس میں سے دیتے تو میں ضرور قبول کر لیتا۔ آپ نے تو مسلمانوں کے بیت المال سے مجھے دیا، حالانکہ ان کے مال میں میرا کوئی حق نہیں ہے۔ میں نہ ان کے دفاع کے لئے لڑنے والا ہوں کہ ایک سپاہی کا حصہ پاؤں، نہ اُن کے بچوں میں سے ہوں کہ بچوں کا حصہ مجھے ملے، اور نہ فقراء میں سے ہوں کہ جو کچھ فقیر کو ملنا چاہیئے وہ مجھے ملے۔"

پھر جب المنصور نے عہدۂ قضا قبول نہ کرنے پر انہیں ۳۰ کوڑے مارے اور ان کا سارا بدن لہولہان ہو گیا تو خلیفہ کے چچا عبدالصمد بن علی نے اس کو سخت ملامت کی کہ "یہ تم نے کیا کیا، اپنے اوپر ایک لاکھ تلواریں کھنچوا لیں، یہ عراق کا فقیہ ہے، بلکہ یہ تمام اہل مشرق کا فقیہ ہے۔" منصور نے اس پر نادم ہو کر فی تازیانہ ایک ہزار درہم کے حساب سے ۳۰ ہزار درہم امام کو بھجوائے، لیکن انہوں نے لینے سے انکار کر دیا۔ کہا گیا کہ لے کر خیرات کر دیجئے۔ جواب میں فرمایا: "کیا ان کے پاس کوئی مال حلال بھی ہے؟"

اسی کے قریب زمانے میں جب پے در پے تکلیفیں سہتے سہتے ان کا آخر وقت آگیا تو انہوں نے وصیت کی کہ بغداد کے اس حصے میں انہیں دفن نہ کیا جائے جسے شہر بسانے کے لئے منصور نے لوگوں کی املاک میں سے غصب کر لیا تھا۔ منصور نے اس وصیت کا حال سُنا تو چیخ اٹھا کہ "ابو حنیفہ، زندگی اور موت میں تیری پکڑ سے کون مجھے بچائے۔"

عدلیہ کی انتظامیہ سے آزادی

عدلیہ کے متعلق ان کی قطعی رائے یہ تھی کہ اسے انصاف کرنے کے لئے انتظامیہ کے دباؤ اور مداخلت سے نہ صرف آزاد ہونا چاہیئے بلکہ قاضی کو اس قابل ہونا چاہیئے کہ خود خلیفہ بھی اگر لوگوں کے حقوق پر دست درازی کرے تو وہ اس پر اپنا حکم نافذ کر سکے۔ چنانچہ اپنی زندگی کے آخری زمانے میں جب کہ امام کو یقین ہو گیا تھا کہ حکومت ان کو زندہ نہ رہنے دے گی، انہوں نے اپنے شاگردوں کو جمع کر کے ایک تقریر کی اور اس میں منجملہ دوسری اہم باتوں کے ایک بات یہ بھی فرمائی کہ: "اگر خلیفہ کوئی ایسا جرم کرے جو انسانی حقوق سے متعلق ہو تو مرتبے میں اس سے قریب ترین قاضی (یعنی قاضی القضاۃ) کو اس پر حکم نافذ کرنا چاہیئے۔"

بنی اُمیّہ اور بنی عباس کے زمانہ میں حکومت کے مناصب، اور خصوصاً قضا کا عہدہ قبول کرنے سے ان کے انکار کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی کہ وہ ان دونوں حکومتوں میں قضاء کی یہ حیثیت نہ پاتے تھے۔ صرف یہی نہیں کہ خلیفہ پر قانون کا حکم نافذ کرنے کی وہاں کوئی گنجائش نہ تھی، بلکہ انہیں اندیشہ تھا کہ انہیں آلۂ ظلم بنایا جائے گا، ان سے غلط فیصلے کرائے جائیں گے اور ان کے فیصلوں میں نہ صرف خلیفہ بلکہ اس کے قصر سے تعلق

ایسے لوگوں کی امامت قطعاً باطل ہے۔

خلافت کے لئے قرشیت کی شرط

دوسرے مسئلے کے بارے میں امام ابوحنیفہؒ کی رائے یہ تھی کہ خلیفہ قریش ہی میں سے ہونا چاہئے۔ اور یہ صرف انہی کی نہیں، تمام اہل سنّت کی متفق علیہ رائے تھی۔ اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ اسلامی خلافت ازروئے شریعت صرف ایک قبیلے کا دستوری حق تھی، بلکہ اس کی اصل وجہ اس وقت کے حالات تھے جن میں مسلمانوں کو مجتمع رکھنے کے لئے خلیفہ کا قریشی ہونا ضروری تھا۔ ابن خلدون نے یہ بات بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کی ہے کہ اس وقت اسلامی ریاست کی اصل پشت پناہ عرب تھے، اور عربوں کا زیادہ سے زیادہ اتفاق اگر ممکن تھا تو قریش ہی کی خلافت پر۔ دوسرے کسی گروہ کا آدمی لینے کی صورت میں تنازع اور افتراق کے امکانات اتنے زیادہ تھے کہ خلافت کے نظام کو اس خطرے میں ڈالنا مناسب نہ تھا۔ اسی وجہ سے نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے ہدایت کی تھی کہ ”امام قریش میں سے ہوں“ ورنہ اگر یہ منصب غیر قریشی کے لئے شرعاً ممنوع ہوتا تو حضرت عمرؓ اپنی وفات کے وقت یہ نہ کہتے کہ اگر حذیفہؓ کے آزاد کردہ غلام سالم زندہ ہوتے تو میں ان کو اپنا جانشین تجویز کرتا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی قریش میں خلافت رکھنے کی ہدایت دیتے ہوئے یہ بات واضح کر دی تھی کہ یہ منصب ان کے اندر اس وقت تک رہے گا جب تک ان میں مخصوص صفات باقی رہیں گی۔ اس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان صفات کے فقدان کی صورت میں خلافت غیر قریش کے لئے بھی ہو سکتی ہے۔ یہی اصل فرق ہے امام ابوحنیفہؒ اور جمیع اہل السنّت کے مسلک اور ان خوارج و معتزلہ کے مسلک میں جو مطلقاً غیر قریشی کے لئے خلافت کا جواز ثابت کرتے تھے بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر غیر قریشی کو خلافت کا زیادہ حقدار قرار دیتے تھے ان کی نگاہ میں اصل اہمیت جمہوریت کی تھی خواہ اس کا نتیجہ انتشار ہی کیوں نہ ہو۔ مگر اہل السنّت والجماعت کو جمہوریت کے ساتھ ریاست کے استحکام کی بھی فکر تھی۔

بیت المال

اپنے وقت کے خلفاء کی جن باتوں پر امام سب سے زیادہ معترض تھے ان میں سے ایک سرکاری خزانے پر ان کے بے جا تصرفات اور لوگوں کی املاک پر اُن کی دست درازیاں تھیں۔ ان کے نزدیک حکم میں جور اور بیت المال میں غلول (خیانت) ایک امام کی امامت کو باطل کر دینے والے افعال تھے جیسا کہ ہم اوپر الذہبی کے حوالے سے نقل کر چکے ہیں۔ وہ اس کو بھی جائز نہ رکھتے تھے کہ بیرونی ممالک سے جو ہدیے اور تحفے خلیفہ کے پاس آئیں اُن کو وہ اپنی ذاتی ملک بنا لے۔ ان کے نزدیک یہ چیزیں پبلک کے خزانے کا حق تھیں نہ کہ خلیفہ اور اس کے خاندان کا کیونکہ وہ اگر مسلمانوں کا خلیفہ نہ ہوتا اور بین الاقوامی دنیا میں اُن کی اجتماعی قوت و سعی کی بدولت اس کی دھاک قائم نہ ہوئی ہوتی تو کوئی اس شخص کو گھر بیٹھے ہدیے نہ بھیجتا۔ وہ بیت المال سے

اس منصب پر قائم کرلے، دراں حالیکہ وہ فاسق ہو، تو لوگوں پر اس کا اتباع اور اس کی اطاعت لازم نہیں یہی بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہے کہ خالق کی معصیت میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں ہے۔ اور یہ آیت اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ کوئی فاسق حاکم (جج اور مجسٹریٹ) نہیں ہو سکتا، اور اگر وہ حاکم ہو جائے تو اس کے احکام نافذ نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح اس کی نہ شہادت مقبول ہے نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی روایت قبول کی جاسکتی ہے، اور نہ اس کا فتویٰ مانا جاسکتا ہے اگر وہ مفتی ہو۔"

آگے چل کر الجصاص اس امر کی تصریح کرتے ہیں کہ یہی امام ابوحنیفہؒ کا مذہب ہے اور پھر تفصیل کے ساتھ بتاتے ہیں کہ ابوحنیفہؒ پر یہ کتنا بڑا ظلم ہے کہ انہیں فاسق کی امامت جائز قرار دینے کا الزام دیا جاتا ہے۔

"بعض لوگوں نے یہ گمان کیا ہے کہ ابوحنیفہؒ کے نزدیک فاسق کی امامت و خلافت جائز ہے۔ یہ بات اگر قصداً جھوٹ نہیں کہی گئی ہے تو ایک غلط فہمی ہے، اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ ابوحنیفہؒ کہتے ہیں، اور صرف ابوحنیفہ ہی نہیں، فقہائے عراق میں سے جن جن لوگوں کے اقوال معروف ہیں وہ سب یہی کہتے ہیں کہ قاضی اگر خود عادل ہو تو خواہ وہ کسی ظالم امام ہی کا مقرر کیا ہوا ہو، اس کے فیصلے صحیح طور پر نافذ ہو جائیں گے اور نماز ان فاسق اماموں کے پیچھے بھی، ان کے فسق کے باوجود جائز ہوگی۔ یہ مسلک اپنی جگہ بالکل صحیح ہے مگر اس سے یہ استدلال نہیں کیا جاسکتا کہ ابوحنیفہؒ فاسق کی امامت کو جائز ٹھہراتے ہیں۔"

امام ذہبی اور الموفق المکی، دونوں امام ابوحنیفہؒ کا یہ قول نقل کرتے ہیں: "جو امام فَے (یعنی پبلک کے خزانے) کا ناجائز استعمال کرے، یا حکم میں ظلم سے کام لے اس کی امامت باطل ہے اور اس کا حکم جائز نہیں ہے۔"

ان بیانات پر غور کرنے سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ امام ابوحنیفہؒ خوارج اور معتزلہ کے برعکس بالحق اور بالفعل میں فرق کرتے ہیں۔ خوارج و معتزلہ کے مسلک سے لازم آتا تھا کہ اگر امام عادل و صالح یعنی امام بالحق موجود نہ ہو تو مسلم معاشرے اور ریاست کا پورا نظام معطل ہو جائے۔ نہ حج ہو سکے، نہ جمعہ و جماعت ہو، نہ عدالتیں قائم ہوں، نہ مسلمانوں کا کوئی مذہبی کام یا سیاسی و معاشرتی کام جائز طور پر انجام پائے۔ امام ابوحنیفہؒ اس غلطی کی اصلاح یوں کرتے ہیں کہ بالحق امام اگر میسر نہ ہو تو بالفعل جو بھی مسلمانوں کا امام ہو اس کے ماتحت مسلمانوں کی پوری اجتماعی زندگی کا نظام جائز طور پر چلتا رہے گا، خواہ بجائے خود اس امام کی امامت جائز نہ ہو۔

معتزلہ و خوارج کی اس انتہا پسندی کے مقابلہ میں جو دوسری انتہا مرجئہ، اور خود اہل سنّت کے بعض ائمہ نے اختیار کی تھی، امام ابوحنیفہؒ نے مسلمانوں کو اس سے اور اس کے نتائج سے بھی بچا لیا ہے۔ وہ لوگ بھی بالفعل اور بالحق کے درمیان خلط ملط کر گئے تھے، اور انہوں نے فاسق کی بالفعل امامت کو اس انداز سے جائز ٹھہرایا تھا کہ گویا وہی بالحق بھی ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا تھا کہ مسلمان ظالم و جابر اور بدکردار فرمانرواؤں کی حکومت پر مطمئن ہو کر بیٹھ جائیں، اور اسے بدلنے کی کوشش تو درکنار، اس کی فکر تک چھوڑ دیں۔ امام ابوحنیفہؒ نے اس غلط خیال کی اصلاح کے لئے پورے زور سے اس حقیقت کا اعلان و اظہار کیا کہ

جس طرح بعد کے محققین، ماوردی اور ابن خلدون وغیرہ نے انہیں بیان کیا ہے۔ کیونکہ ان میں سے اکثر اس وقت گویا بلا بحث مسلم تھیں۔ مثلاً آدمی کا مسلمان ہونا، مرد ہونا، آزاد ہونا، ذی علم ہونا، سلیم الحواس اور سلیم الاعضا ہونا۔ البتہ دو چیزیں ایسی تھیں جو اس زمانے میں زیر بحث آچکی تھیں اور جن کے متعلق صراحت مطلوب تھی۔ ایک یہ کہ ظالم و فاسق جائز خلیفہ ہو سکتا ہے یا نہیں۔ دوسرے یہ کہ خلافت کے لئے قریشی ہونا ضروری ہے یا نہیں۔

فاسق و ظالم کی امامت

پہلی چیز کے متعلق امام کی رائے کے دو پہلو ہیں جن کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ جس زمانے میں انہوں نے اس مسئلے پر اظہار خیال فرمایا ہے، وہ عراق میں خصوصاً، اور دنیائے اسلام میں عموماً، دو انتہا پسندانہ نظریات کی سخت کشمکش کا زمانہ تھا۔ ایک طرف نہایت زور شور سے کہا جا رہا تھا کہ ظالم و فاسق کی امامت قطعی ناجائز ہے اور اس کے ماتحت مسلمانوں کا کوئی اجتماعی کام بھی صحیح نہیں ہو سکتا۔ دوسری طرف کہا جا رہا تھا کہ ظالم و فاسق خواہ کسی طرح بھی ملک پر قابض ہو جائے، اس کا تسلط قائم ہو جانے کے بعد اس کی امامت و خلافت پوری طرح جائز ہو جاتی ہے۔ ان دونوں کے درمیان امام اعظمؒ نے ایک نہایت متوازن نظریہ پیش کیا جس کی تفصیل یہ ہے:۔ الفقہ الاکبر میں وہ فرماتے ہیں: "مومنوں میں سے ہر نیک و بد کے پیچھے نماز جائز ہے۔" اور عقیدۂ طحاویہ میں امام طحاوی اس حنفی مسلک کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اور حج و جہاد مسلمانوں کے اولی الامر کے ماتحت قیامت تک جاری رہیں گے خواہ وہ نیک ہوں یا بد ان کاموں کو کوئی چیز باطل نہیں کرتی اور نہ ان کا سلسلہ منقطع کر سکتی ہے۔"

یہ اس مسئلے کا ایک پہلو ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ امام کے نزدیک خلافت کے لئے عدالت شرط لازم ہے۔ کوئی ظالم و فاسق آدمی جائز خلیفہ یا قاضی یا حاکم یا مفتی نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ بن بیٹھا ہو تو اس کی امامت باطل ہے اور لوگوں پر اس کی اطاعت واجب نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کے عملاً قابض و متصرف ہو جانے کے بعد مسلمان اس کے تحت اپنی اجتماعی زندگی کے جو کام صحیح شرعی طریقے سے انجام دیں گے وہ جائز ہوں گے اور اس کے مقرر کئے ہوئے قاضی عدل کے ساتھ جو فیصلے کریں گے وہ نافذ ہو جائیں گے اس مسئلے کو مذہب حنفی کے مشہور امام ابوبکر الجصاص نے احکام القرآن میں بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"پس جائز نہیں کہ کوئی ظالم شخص نبی ہو یا نبی کا خلیفہ، یا قاضی، یا کوئی ایسا منصب دار جس کی بنا پر امور دین میں اس کی بات قبول کرنا لوگوں پر لازم آتا ہو، مثلاً مفتی یا شاہد یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث روایت کرنے والا۔ آیت (لَا یَنَالُ عَہْدِی الظّٰلِمِیْنَ، سورہ بقرہ: ۱۲۴) اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ دین کے معاملات میں جن لوگوں کو بھی پیشوائی کا مقام حاصل ہو ان کا عادل اور صالح ہونا شرط ہے۔ اس آیت سے یہ ثابت ہے کہ فاسق کی امامت باطل ہے۔ وہ خلیفہ نہیں ہو سکتا، اور اگر کوئی شخص اپنے آپ کو جو

شاگردوں کے ساتھ سلوک

شاگردوں میں جس کو تنگ حال دیکھتے اس کی ضروریات خانگی کی کفالت کرتے کہ اطمینان سے علم کی تکمیل کر سکے، بہت سے لوگ جن کو مفلسی کی وجہ سے تحصیل علم کا موقع نہیں ملتا تھا۔ امام صاحبؒ ہی کی دستگیری کی بدولت بڑے بڑے رتبوں پر پہونچے انہی میں قاضی ابو یوسف صاحبؒ بھی ہیں۔

تقویٰ کے اجتماع سے قائم ہوتی ہے۔ اور جو شخص خود اس پر قبضہ کرلے اس کے لئے کوئی تقویٰ نہیں ہے آپ اور آپ کے مددگار توفیق سے خارج اور حق سے منحرف ہیں۔ اب اگر آپ اللہ سے سلامتی مانگیں اور پاکیزہ اعمال سے اس کا تقرب حاصل کریں تو یہ چیز آپ کو نصیب ہوگی ورنہ آپ خود ہی اپنے مطلوب ہیں۔"

امام ابو حنیفہؒ کہتے ہیں کہ جس وقت ابن ابی ذئب یہ باتیں کہہ رہے تھے، میں نے اور مالک نے اپنے کپڑے سمیٹ لئے کہ شاید ابھی ان کی گردن اڑادی جائے گی اور ان کا خون ہمارے کپڑوں پر پڑے گا۔ اس کے بعد منصور امام ابو حنیفہؒ کی طرف متوجہ ہوا اور بولا آپ کیا کہتے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا "اپنے دین کی خاطر راہ راست تلاش کرنے والا غصے سے دور رہتا ہے۔ اگر آپ اپنے ضمیر کو ٹٹولیں تو آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ آپ نے ہم لوگوں کو اللہ کی خاطر نہیں بلایا ہے بلکہ آپ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کے ڈر سے آپ کے منشا کے مطابق بات کہیں اور وہ عوام کے علم میں آجائے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ آپ اس طرح خلیفہ بنے ہیں کہ آپ کی خلافت پر اہل فتویٰ لوگوں میں سے دو آدمیوں کا اجتماع بھی نہیں ہوا، حالانکہ خلافت مسلمانوں کے اجتماع اور مشورے سے ہوتی ہے۔ دیکھئے، ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ چھ مہینے تک فیصلے کرنے سے رکے رہے جب تک کہ اہل یمن کی بیعت نہ آگئی۔"

یہ باتیں کر کے تینوں صاحب اٹھ گئے۔ پیچھے منصور نے ربیع کو تین توڑے درہموں کے دے کر ان تینوں اصحاب کے پاس بھیجا اور اس کو ہدایت کی کہ اگر مالک لے لیں تو ان کو دے دینا، لیکن اگر ابو حنیفہؒ اور ابن ابی ذئب انہیں قبول کرلیں تو ان کا سر اتار لانا۔ امام مالکؒ نے یہ عطیہ لے لیا۔ ابن ابی ذئب کے پاس جب ربیع پہونچا تو انہوں نے کہا میں اس مال کو خود منصور کے لئے بھی حلال نہیں سمجھتا، اپنے لئے کیسے حلال سمجھوں۔ ابو حنیفہؒ نے کہا خواہ میری گردن ہی کیوں نہ ماردی جائے میں اس مال کو ہاتھ نہ لگاؤں گا۔ منصور نے یہ روداد سن کر کہا: "اس بے نیازی نے ان دونوں کا خون بچا دیا۔"

اہلیتِ خلافت کی شرائط

امام ابو حنیفہؒ کے زمانے تک اہلیتِ خلافت کی شرطیں اس تفصیلی طریقے سے بیان نہیں کی جاتی تھیں

یہ تھا کہ قانونی حاکمیت خدا اور اس کے رسولؐ کی ہے۔ ان کے نزدیک قیاس و رائے سے قانون سازی کا دائرہ صرف ان حدود تک محدود تھا جس میں خدا اور رسولؐ کا کوئی حکم موجود نہ ہو۔ صحابۂ رسولؐ کے انفرادی اقوال کو دوسروں کے اقوال پر جو ترجیح وہ دیتے تھے اس کی وجہ بھی دراصل یہ تھی کہ صحابی کے معاملہ میں یہ امکان موجود ہے کہ اس کے علم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی حکم ہو اور وہی اس کے قول کا ماخذ ہو۔ اسی لئے امام ابو حنیفہؒ اس بات کا التزام کرتے تھے کہ جن مسائل میں صحابہؓ کے درمیان اختلاف ہوا ہے اُن میں کسی صحابیؓ کے قول ہی کو اختیار کریں اور اپنی رائے سے کوئی ایسا فیصلہ نہ کریں جو تمام صحابیوں کے اقوال

سے مختلف ہو۔ کیونکہ اس میں نادانستہ سنت کی خلاف ورزی ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ البتہ وہ قیاس سے یہ رائے قائم کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ ان میں سے کس کا قول .... سنت سے قریب تر ہو سکتا ہے۔ اگرچہ امام پر ان کے زمانۂ حیات ہی میں یہ الزام لگایا گیا تھا کہ وہ قیاس کو نص پر ترجیح دیتے ہیں مگر انھوں نے اس کی تردید کرتے ہوئے کہا: "بخدا اس شخص نے جھوٹ کہا اور ہم پر افترا کیا جس نے کہا کہ ہم قیاس کو نص پر مقدم رکھتے ہیں۔ بھلا نص کے بعد بھی قیاس کی کوئی حاجت رہتی ہے۔"

خلیفہ المنصور نے ایک مرتبہ ان کو لکھا کہ میں نے سُنا ہے آپ قیاس کو حدیث پر مقدم رکھتے ہیں۔ انھوں نے جواب میں لکھا:-

"امیر المؤمنین، جو بات آپ کو پہونچی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ میں سب سے پہلے کتاب اللہ پر عمل کرتا ہوں پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سنت پر، پھر ابو بکر و عمر اور عثمان و علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے فیصلوں پر، پھر باقی صحابہؓ کے فیصلوں پر، البتہ جب ان میں اختلاف ہو تو قیاس کرتا ہوں۔"

خلافت کے انعقاد کا صحیح طریقہ

خلافت کے متعلق امام ابو حنیفہؒ کی رائے یہ تھی کہ پہلے بزور اقتدار پر قبضہ کرنا اور بعد میں دباؤ کے تحت بیعت لینا اس کے انعقاد کی کوئی جائز صورت نہیں ہے۔ صحیح خلافت وہ ہے جو اہل الرائے لوگوں کے اجتماع اور مشورے سے قائم ہو۔ اس رائے کو انھوں نے ایک ایسے نازک موقع پر بیان کیا جبکہ اُسے زبان پر لانے والے کا سر اس کی گردن پر باقی رہنے کا احتمال نہ تھا۔ المنصور کے حاجب رَبیع بن یُونس کا بیان ہے کہ منصور نے امام مالکؒ، ابن ابی ذِئبؒ اور امام ابو حنیفہؒ کو بلایا اور اُن سے کہا: "یہ حکومت جو اللہ تعالیٰ نے اس اُمّت میں مجھے عطا کی ہے، اس کے متعلق آپ لوگوں کا کیا خیال ہے؟ کیا میں اس کا اہل ہوں۔"

امام مالکؒ نے کہا: "اگر آپ اس کے اہل نہ ہوتے تو اللہ اُسے آپ کے سپرد نہ کرتا۔"

ابن ابی ذِئب نے کہا: "دنیا کی بادشاہی اللہ جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے، مگر آخرت کی بادشاہی اسی کو دیتا ہے جو اس کا طالب ہو اور جسے اللہ اس کی توفیق دے۔ اللہ کی توفیق آپ سے قریب ہوگی، اگر آپ اس کی اطاعت کریں۔ ورنہ اس کی نافرمانی کی صورت میں وہ آپ سے دُور رہے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ خلافت اہل

اس طرح تاریخ کا یہ اہم واقعہ رونما ہوا کہ ایک شخص واحد کی قائم کی ہوئی نجی مجلس وضع قوانین کا مرتب کیا ہوا قانون محض اپنے اوصاف اور اپنے مرتب کرنے والوں کی اخلاقی ساکھ کے بل پر ملکوں اور سلطنتوں کا قانون بن کر رہا۔ اس کے ساتھ دوسرا اہم نتیجہ اس کا یہ بھی ہوا کہ اس نے مسلم مفکرین قانون کے لئے اسلامی قوانین کی تدوین کا ایک نیا راستہ کھول دیا۔ بعد میں جتنے دوسرے بڑے بڑے فقہی نظام بنے وہ اپنے طرز اجتہاد اور نتائج اجتہاد میں چاہے اس سے مختلف ہوں، مگر ان کے لئے نمونہ یہی تھا جسے سامنے رکھ کر ان کی تعمیر کی گئی۔

امام ابو حنیفہ کا مسلک

سیاست کے باب میں امام ابو حنیفہؒ اپنی ایک نہایت مفصل رائے رکھتے تھے جو ریاست و امارت کے قریب قریب ہر پہلو پر حاوی تھی، اور بعض بنیادی امور میں دوسرے ائمہ سے مختلف بھی تھی۔ یہاں اس کے ایک ایک شعبے کو لے کر اس کے بارے میں امام کی آراء پیش ہیں۔

حاکمیت کا مسئلہ

ریاست کا خواہ کوئی نظریہ بھی زیر بحث ہو، اس میں اوّلین سوال یہ ہوتا ہے کہ وہ نظریہ "حاکمیت" کس کے لئے ثابت کرتا ہے۔ اس حاکمیت کے باب میں امام ابو حنیفہؒ کا نظریہ وہی تھا جو اسلام کا مسلّم بنیادی نظریہ یعنی اصل حاکم خدا ہے۔ رسول اس کے نمائندے کی حیثیت سے مطاع ہیں، اور خدا اور رسول کی شریعت وہ قانون برتر ہے جس کے مقابلے میں اطاعت و اتباع کے سوا اور کوئی طرز عمل اختیار نہیں کیا جا سکتا چونکہ امام اصلاً ایک قانونی آدمی تھے اس لئے انھوں نے اس مضمون کو علم سیاست کے بجائے قانون کی زبان میں بیان کیا ہے:

"مجھے جب کوئی حکم خدا کی کتاب میں مل جاتا ہے تو میں اسی کو تھام لیتا ہوں۔ اور جب اس میں نہیں ملتا تو رسول اللہ کی سنت اور آپؐ کے ان صحیح آثار کو لیتا ہوں جو ثقہ لوگوں کے ہاں ثقہ لوگوں کے واسطے معروف ہیں۔ پھر جب نہ کتاب اللہ میں حکم ملتا ہے نہ سنّت رسول اللہ میں تو میں اصحاب رسولؐ کے قول (یا) ان کے اجماع، کی پیروی کرتا ہوں، اور (ان کے اختلاف کی صورت میں) جس صحابی کا قول چاہتا ہوں قبول کرتا ہوں اور جس کا چاہتا ہوں چھوڑ دیتا ہوں، مگر ان سب کے اقوال سے باہر جا کر کسی کا قول نہیں لیتا، رہے دوسرے لوگ تو جس طرح اجتہاد کا انہیں حق ہے مجھے بھی حق ہے۔"

ابن حزم کا بیان ہے:۔ "تمام اصحاب ابو حنیفہؒ اس پر متفق ہیں کہ ابو حنیفہؒ کا مذہب یہ تھا کہ ضعیف حدیث بھی اگر مل جائے تو اس کے مقابلے میں قیاس اور رائے کو چھوڑ دیا جائے۔"

اس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ وہ قرآن اور سنّت کو آخری سند قرار دیتے تھے۔ ان کا ...

امام نے پوچھا یہ دوسرا قول کس کا ہے؟"

اس کے ساتھ المکیؒ کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس مجلس کے جو فیصلے لکھے جاتے تھے ان کو الگ الگ عنوانات کے تحت کتابوں اور ابواب میں مرتب بھی امام ابوحنیفہؒ ہی کی زندگی میں کر دیا گیا تھا:

"ابوحنیفہؒ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس شریعت کے علم کو مدوّن کیا۔ ان سے پہلے کسی نے یہ کام نہیں کیا تھا... ابوحنیفہؒ نے اس کو کتابوں اور جدا جدا عنوانات کے تحت ابواب کی شکل میں مرتب کر دیا تھا۔"

اس مجلس میں، جیسا کہ ہم پہلے المکیؒ ہی کے حوالے سے بتا چکے ہیں، ۸۳ ہزار قانونی مسائل طے کئے گئے تھے اس میں صرف وہی مسائل زیر بحث نہیں آتے تھے جو اس وقت تک عملاً لوگوں کو یا ریاست کو پیش آ چکے تھے۔ بلکہ معاملات کی امکانی صورتیں فرض کر کر کے اُن پر بھی بحث کی جاتی اور ان کا حل تلاش کیا جاتا تھا تاکہ آئندہ اگر کبھی کوئی نئی صورت پیش آجائے جو اب تک نہ پیش آئی ہو تو قانون میں پہلے سے اس کا حل موجود ہو۔ یہ مسائل قریب قریب ہر شعبۂ قانون سے متعلق تھے۔ بین الاقوامی قانون (جس کے لئے السِّیَر کی اصطلاح مستعمل تھی) دستوری قانون، دیوانی و فوجداری قانون، قانونِ شہادت، ضابطۂ عدالت، معاشی زندگی کے ہر شعبے کے الگ قوانین، نکاح و طلاق اور وراثت وغیرہ شخصی احوال کے قوانین، اور عبادات کے احکام، یہ سب عنوانات ہم کو ان کتابوں کی فہرستوں میں ملتے ہیں جو اس مجلس کے فراہم کردہ مواد سے امام ابویوسفؒ نے اور پھر امام محمد بن حسن الشیبانی نے بعد میں مرتب کیں۔

اس باقاعدہ تدوینِ قانون (CODIFICATION) کا اثر یہ ہوا کہ انفرادی طور پر کام کرنے والے مجتہدوں مفتیوں اور قاضیوں کا کام ساقط الاعتبار ہوتا چلا گیا۔ قرآن و حدیث کے احکام اور سابقہ فیصلوں اور فتاویٰ کے نظائر کی چھان بین کر کے اہل علم کی ایک مجلس نے ابوحنیفہؒ جیسے نکتہ رس آدمی کی صدارت و رہنمائی میں شریعت کے جو احکام منقح صورت میں نکال کر رکھ دیئے تھے، اور پھر اصولِ شریعت کے تحت وسیع پیمانے پر اجتہاد کر کے زندگی کے ہر پہلو میں پیش آنے والی امکانی ضرورتوں کے لئے جو قابلِ عمل قوانین مرتب کر دیئے تھے، ان کے بعد متفرق افراد کے مدوّن کئے ہوئے احکام مشکل ہی سے وقیع ہو سکتے تھے۔ اس لئے جونہی یہ کام منظرِ عام پر آیا عوام اور حکام اور قضاۃ، سب اس کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہو گئے، کیونکہ یہ وقت کی مانگ تھی اور لوگ مدت سے اسی چیز کے حاجت مند تھے، چنانچہ مشہور فقیہ یحییٰ بن آدم (م ۲۰۳ھ - ۸۱۸ء) کہتے ہیں کہ ابوحنیفہؒ کے اقوال کے آگے دوسرے فقہاء کے اقوال کا بازار سرد پڑ گیا، انہی کا علم مختلف علاقوں میں پھیل گیا، اسی پر خلفاء اور ائمہ اور حکام فیصلے کرنے لگے اور معاملات کا چلن اسی پر ہو گیا۔ خلیفہ مامون (۱۹۸، ۲۱۸ھ - ۸۱۳، ۸۳۳ء) کے زمانے تک پہونچتے پہونچتے یہ حالت ہو گئی کہ ایک دفعہ وزیر اعظم فضل بن سہل کو ابوحنیفہؒ کے ایک مخالف فقیہ نے مشورہ دیا کہ حنفی فقہ کا استعمال بند کرنے کے احکام جاری کر دیئے جائیں۔ وزیر اعظم نے باخبر اور معاملہ فہم لوگوں کو بُلا کر اس معاملے میں رائے لی۔ انہوں نے بالاتفاق کہا کہ یہ بات نہیں چلے گی اور سارا ملک آپ لوگوں پر ٹوٹ پڑے گا جس شخص نے آپ کو یہ مشورہ دیا ہے وہ ناقص العقل ہے۔ وزیر نے کہا "میں خود بھی اس خیال سے متفق نہیں ہوں اور امیر المومنین بھی اس پر راضی نہ ہوں گے۔"

قانونی مسائل پر سوچنے، علمی طرز پر تحقیقات کرنے اور دلائل سے نتائج مستنبط کرنے کی تربیت دی تھی۔
اُن میں سے قریب قریب ہر شخص امام کے علاوہ وقت کے دوسرے بڑے بڑے اساتذہ سے بھی قرآن، حدیث، فقہ، اور دوسرے مددگار علوم، مثلاً لغت، نحو، ادب اور تاریخ و سِیَر کی تعلیم حاصل کر چکا تھا۔ مختلف شاگرد مختلف علوم کے اختصاصی ماہر سمجھے جاتے۔ مثلاً کسی کو قیاسی و رائے میں نمایاں مقام حاصل تھا، کسی کے پاس احادیث اور صحابہؓ کے فتاویٰ اور پچھلے خلفاء و قضاۃ کے نظائر کی وسیع معلومات تھیں، اور کوئی علمِ تفسیر یا قانون کے کسی خاص شعبے، یا لغت اور نحو یا مغازی کے علم میں اختصاص رکھتا تھا۔ ایک دفعہ امام نے خود اپنی ایک گفتگو میں بتایا کہ یہ کس مرتبے کے لوگ تھے:

"یہ ۳۶ آدمی ہیں جن میں سے ۲۸ قاضی ہونے کے لائق ہیں، ۶ فتویٰ دینے کی اہلیت رکھتے ہیں، اور ۲ اس درجے کے آدمی ہیں کہ قاضی اور مفتی تیار کر سکتے ہیں۔"

اس مجلس کا طریقِ کار جو امام کے معتبر سوانح نگاروں نے لکھا ہے وہ ہم خود انہی کے الفاظ میں یہاں نقل کرتے ہیں۔ المؤفق بن احمد المکی (م ۵۶۸ھ - ۱۱۷۲ء) لکھتا ہے:

"ابو حنیفہؒ نے اپنا مذہب اُن کے (یعنی اپنے فاضل شاگردوں کے) مشورے سے مرتب کیا ہے۔ وہ اپنی حدِ وسع تک دین کی خاطر زیادہ سے زیادہ جانفشانی کرنے کا جذبہ رکھتے تھے اور خدا اور رسولؐ خدا اور اہلِ ایمان کے لئے جو کمال درجہ کا اخلاص ان کے دل میں تھا اس کی وجہ سے انہوں نے شاگردوں کو چھوڑ کر یہ کام محض اپنی انفرادی رائے سے کر ڈالنا پسند نہ کیا۔ وہ ایک ایک مسئلہ اُن کے سامنے پیش کرتے تھے، اس کے مختلف پہلو اُن کے سامنے لاتے تھے، جو کچھ ان کے پاس علم اور خیال ہوتا اُسے سنتے اور اپنی رائے بھی بیان کرتے حتیٰ کہ بعض اوقات ایک ایک مسئلے پر بحث کرتے ہوئے مہینہ مہینہ بھر اور اس سے بھی زیادہ لگ جاتا تھا۔ آخر جب ایک رائے قرار پا جاتی تو اسے قاضی ابو یوسف کتبِ اصول میں ثبت کرتے۔"

ابن البزاز الکردری (صاحب فتاویٰ بزازیہ م ۸۲۷ھ - ۱۴۲۴ء) کا بیان ہے: "اُن کے شاگرد ایک مسئلے پر خوب دل کھول کر بحث کرتے اور ہر فن کے نقطۂ نظر سے گفتگو کرتے۔ اس دوران میں امام خاموشی کے ساتھ ان کی تقریریں سنتے رہتے تھے۔ پھر جب امام زیرِ بحث مسئلے پر اپنی تقریر شروع کرتے تو مجلس میں ایسا سکوت ہوتا جیسے یہاں اُن کے سوا کوئی اور نہیں بیٹھا ہے۔"

عبداللہ بن المبارک کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ اس مجلس میں تین دن تک مسلسل ایک مسئلے پر بحث ہوتی رہی۔ تیسرے دن شام کے وقت میں نے جب اللہ اکبر کی آوازیں سنیں تو پتہ چلا کہ اس بحث کا فیصلہ ہو گیا۔

امام کے ایک اور شاگرد ابو عبداللہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مجلس میں امام ابو حنیفہؒ اپنی جو رائیں ظاہر کرتے تھے انہیں بعد میں وہ پڑھوا کر سن لیا کرتے تھے۔ چنانچہ ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

"میں امام کے اقوال اُن کو پڑھ کر سناتا تھا۔ ابو یوسف (مجلس کے فیصلے ثبت کرتے ہوئے) ساتھ ساتھ اپنے اقوال بھی درج کر دیا کرتے تھے۔ اس لئے پڑھتے وقت میں کوشش کرتا تھا کہ ان کے اقوال چھوڑتا جاؤں اور صرف امام کے اپنے اقوال انہیں سناؤں۔ ایک روز میں چُوک گیا اور دوسرا قول بھی میں نے پڑھ دیا۔

زبردست چیلنج تھا جس سے اسلام کو سابقہ در پیش تھا۔ اور دوسری طرف حالت یہ تھی کہ ملوکیت کے دَور میں کوئی ایسا مسلّم آئینی ادارہ باقی نہ رہا تھا جس میں مسلمانوں کے معتمد علیہ اہلِ علم اور فقیہ اور مدبّرین بیٹھ کر ان مسائل کو سوچتے اور شریعت کے اصولوں کے مطابق ان کا ایک مستند حل پیش کرتے جو سلطنت کی عدالتوں اور اس کے سرکاری محکموں کے لئے قانون قرار پاتا اور پوری مملکت میں یکسانی کے ساتھ اس پر عمل کیا جاتا۔

اس نقصان کو خلفاء، گورنر، حکام اور قاضی سب محسوس کر رہے تھے، کیونکہ انفرادی اجتہاد اور معلومات کے بل پر روزمرہ پیش آنے والے اتنے مختلف مسائل کو بروقت حل کر لینا ہر مفتی، حاکم، جج اور ناظم محکمہ کے بس کا کام نہ تھا، اور اگر فرداً فرداً انہیں حل کیا بھی جاتا تھا تو اس سے بے شمار متضاد فیصلوں کا ایک جنگل پیدا ہو رہا تھا۔ مگر دشواری یہ تھی کہ ایسا ایک ادارہ حکومت ہی قائم کر سکتی تھی، اور حکومت ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں تھی جو خود جانتے تھے کہ مسلمانوں میں اُن کا کوئی اخلاقی وقار و اعتماد نہیں ہے۔ اُن کے لئے فقہاء کا سامنا کرنا تو درکنار ان کو برداشت کرنا بھی مشکل تھا۔ اُن کے تحت بننے والے قوانین کسی حالت میں بھی مسلمانوں کے نزدیک اسلامی نظامِ قانون کا جُز نہ بن سکتے تھے۔ ابن المقفّع نے اپنے رسالۃ الصحابہ میں اس خلا کو بھرنے کے لئے المنصور کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ خلیفہ اہلِ علم کی ایک کونسل بنائے جس میں ہر نقطۂ نظر کے علماء پیش آمدہ مسائل پر اپنا اپنا علم اور خیال پیش کریں، پھر خلیفہ خود ہر مسئلے پر اپنا فیصلہ دے اور وہی قانون ہو لیکن منصور اپنی حقیقت سے اتنا بے خبر نہ تھا کہ یہ حماقت کرتا۔ اس کے فیصلے ابوبکرؓ اور عمرؓ کے فیصلے نہ بن سکتے تھے۔ اس کے فیصلوں کی عمر خود اس کی اپنی عمر سے زیادہ نہ ہو سکتی تھی۔ بلکہ اس کی زندگی میں بھی یہ توقع نہ تھی کہ پوری مملکت میں کوئی ایک مسلمان ہی ایسا مل جائے گا جو اس کے منظور کئے ہوئے قانون کی مخلصانہ پابندی کرے۔ وہ ایک لادینی (SECULAR) قانون تو ہو سکتا تھا مگر اسلامی قانون کا ایک حصہ ہرگز نہ ہو سکتا تھا۔

اس صورت حال میں امام ابوحنیفہؒ کو ایک بالکل نرالا راستہ سوجھا اور وہ یہ تھا کہ وہ حکومت سے بے نیاز رہ کر خود ایک غیر سرکاری مجلس وضع قانون (PRIVAE LEGISLATURE) قائم کریں۔ یہ تجویز ایک انتہائی بدیع الفکر آدمی ہی سوچ سکتا تھا، اور مزید برآں اس کی ہمت صرف وہی شخص کر سکتا تھا جو اپنی قابلیت پر، اپنے کردار پر، اور اپنے اخلاقی وقار پر اتنا اعتماد رکھتا ہو کہ اگر وہ ایسا کوئی ادارہ قائم کر کے قوانین مدوّن کرے گا تو کسی سیاسی قوتِ نافذہ (POLITICAL SANCTION) کے بغیر اس کے مدوّن کردہ قوانین اپنی خوبی اپنی صحت، اپنی مطابقت احوال، اور اپنے مدوّن کرنے والوں کے اخلاقی اثر کے بل پر خود نافذ ہوں گے، قوم خود ان کو قبول کرے گی اور سلطنتیں آپ سے آپ ان کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوں گی۔ امام کوئی غیب داں نہ تھے کہ پیشگی ان نتائج کو دیکھ لیتے جو فی الواقع اُن کے بعد نصف صدی کے اندر ہی برآمد ہو گئے۔ مگر وہ اپنے آپ کو اور اپنے ساتھیوں کو جانتے تھے، مسلمانوں کے اجتماعی مزاج سے واقف تھے۔ اور وقت کے حالات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ انہوں نے ایک کمال درجہ کے دانا و دُور اندیش انسان کی حیثیت سے بالکل صحیح اندازہ کر لیا کہ وہ اس خلا کو اپنی نجی حیثیت سے بھر سکتے ہیں اور ان کے بھرنے سے یہ خلا واقعی بھر جائے گا۔

اس مجلس کے شرکاء امام کے شاگرد تھے جن کو سالہا سال تک انہوں نے اپنے مدرسہ قانون میں باقاعدہ

اس عقیدے کے نتائج

اس طرح امامؒ نے شیعہ و خوارج اور معتزلہ و مرجئہ کی انتہائی آراء کے درمیان ایک ایسا متوازن عقیدہ پیش کیا جو مسلم معاشرے کو انتشار اور باہمی تصادم و منافرت سے بھی بچاتا ہے اور اس کے افراد کو اخلاقی بے قیدی اور گناہوں پر جسارت سے بھی روکتا ہے۔ جس فتنے کے زمانے میں امام نے عقیدۂ اہلِ سنّت کی یہ وضاحت پیش کی تھی، اس کی تاریخ کو نگاہ میں رکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ان کا بڑا کارنامہ تھا جس سے انھوں نے اُمّت کو راہِ اعتدال پر قائم رکھنے کی سعیٔ بلیغ فرمائی تھی۔ اس عقیدے کے معنی یہ تھے کہ اُمّت اس ابتدائی اسلامی معاشرے پر پورا اعتماد رکھتی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کیا تھا۔ اس معاشرے کے لوگوں نے جو فیصلے بالاتفاق یا اکثریت کے ساتھ کئے تھے، اُمّت ان کو تسلیم کرتی ہے۔ جن اصحاب کو انھوں نے یکے بعد دیگرے خلیفہ منتخب کیا تھا، ان کی خلافت کو بھی اور اُن کے زمانے کے فیصلوں کو بھی آئینی حیثیت سے درست مانتی ہے اور شریعت کے اس پورے علم کو بھی وہ قبول کرتی ہے جو اس معاشرے کے افراد (یعنی صحابہ کرام) کے ذریعے سے بعد کی نسلوں کو ملا ہے۔ یہ عقیدہ اگرچہ امام ابو حنیفہؒ کا اپنا ایجاد کردہ نہ تھا بلکہ اُمّت کا سوادِ اعظم اس وقت یہی عقیدہ رکھتا تھا، مگر امام نے اسے تحریری شکل میں مرتب کر کے ایک بڑی خدمت انجام دی کیونکہ اس سے عام مسلمانوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ متفرق گروہوں کے مقابلہ میں ان کا امتیازی مسلک کیا ہے۔

قانونِ اسلامی کی تدوین

امام ابو حنیفہؒ کا سب سے بڑا کارنامہ جس نے انہیں اسلامی تاریخ میں لازوال عظمت عطا کی، یہ تھا کہ انہوں نے اس عظیم خلا کو اپنے بل بوتے پر بھر دیا جو خلافتِ راشدہ کے بعد شوریٰ کا سدِّباب ہو جانے سے اسلام کے قانونی نظام میں واقع ہو چکا تھا۔ ہم اس کے اثرات و نتائج کی طرف پہلے اشارہ کر چکے ہیں۔ ایک صدی کے قریب اس حالت پر گزر جانے سے جو نقصان رونما ہو رہا تھا اسے ہر صاحبِ فکر آدمی محسوس کر رہا تھا۔ ایک طرف مسلم ریاست کے حُدود دسندھ سے اسپین تک پھیل چکے تھے۔ بیسیوں قومیں اپنے الگ الگ تمدّن، رسم و رواج اور حالات کے ساتھ اس میں شامل ہو چکی تھیں۔ اندرونِ ملک مالیات کے مسائل، تجارت اور زراعت اور صنعت و حرفت کے مسائل، شادی بیاہ کے مسائل، دستوری اور دیوانی اور فوجداری قوانین و ضوابط کے مسائل روز بروز سامنے آ رہے تھے۔ بیرونِ ملک دنیا بھر کی قوموں سے اس عظیم ترین سلطنت کے تعلقات تھے اور ان میں جنگ، صلح، سفارتی روابط، تجارتی لین دین، بحری و برّی مسافرت، کسٹم وغیرہ کے مسائل پیدا ہو رہے تھے۔ اور مسلمان چونکہ اپنا ایک مستقل نظریہ، اصولِ حیات اور بنیادی قانون رکھتے تھے، اس لئے ناگزیر تھا کہ وہ اپنے ہی نظامِ قانون کے تحت ان بے شمار نت نئے مسائل کو حل کریں۔ غرض ایک طرف وقت کا یہ

نزدیک ایسا ہوسکتا ہے کہ ایک مومن شخص فاسق ہو اور کافر نہ ہو۔"
الوصیۃ میں امام اس مضمون کو یوں ادا کرتے ہیں: "امتِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے گناہ گار سب مومن ہیں کافر نہیں ہیں۔" عقیدۂ طحاویہ میں اس کی مزید تشریح یہ ہے: "بندہ خارج از ایمان نہیں ہوتا مگر صرف اس چیز کے انکار سے جس کے اقرار نے اُسے داخلِ ایمان کیا تھا۔"

اس عقیدے اور اس کے اجتماعی نتائج (SOCIAL CONSEQUENCES) پر پوری روشنی اس مناظرے سے پڑتی ہے جو ایک مرتبہ خوارج اور امام ابو حنیفہؒ کے درمیان اسی مسئلے پر ہوا تھا۔ خارجیوں کی ایک بڑی جماعت ان کے پاس آئی اور کہا کہ مسجد کے دروازہ پر دو جنازے ہیں۔ ایک ایسے شرابی کا ہے جو شراب پیتے پیتے مر گیا۔ دوسرا ایک عورت کا ہے جو زنا سے حاملہ ہوئی اور شرم کے مارے خودکشی کر کے مرگئی۔ امام نے پوچھا یہ دونوں کس ملت سے تھے؟ کیا یہودی تھے؟ انھوں نے کہا نہیں۔ پوچھا عیسائی تھے؟ کہا نہیں۔ پوچھا مجوسی تھے؟ وہ بولے نہیں۔ امام نے کہا پھر آخر وہ کس ملت سے تھے؟ انہوں نے جواب دیا اس ملت سے جو کلمۂ اسلام کی شہادت دیتی ہے۔ امام نے کہا بتاؤ یہ ایمان کا ⅓ ہے یا ¼ یا ⅕؟ وہ بولے کہ ایمان کا تہائی چوتھائی نہیں ہوتا۔ امامؒ نے کہا اس کلمے کی شہادت کو آخر تم ایمان کا کتنا حصہ مانتے ہو؟ وہ بولے پورا ایمان۔ اس پر امام نے فوراً کہا جب تم خود انہیں مومن کہہ رہے ہو تو مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟ وہ کہنے لگے، ہم یہ پوچھتے ہیں کہ وہ دوزخی ہیں یا جنتی؟ امام نے جواب دیا اچھا اگر تم پوچھنا ہی چاہتے ہو تو میں ان کے بارے میں وہی کہتا ہوں جو اللہ کے نبی ابراہیمؑ نے ان سے بدتر گناہ گاروں کے متعلق کہا تھا کہ "خدایا جو میری پیروی کرے وہ میرا ہے اور جو میری نافرمانی کرے تو آپ غفور رحیم ہیں۔" (ابراہیم، آیت ۳۶) اور جو اللہ کے ایک اور نبی عیسٰیؑ نے ان سے بھی زیادہ بڑے گناہ گاروں کے متعلق کہا تھا کہ "اگر آپ انہیں عذاب دیں تو آپ کے بندے ہیں، معاف فرمادیں تو آپ زبردست اور دانا ہیں۔" (المائدہ، ۱۱۸) اور جو اللہ کے ایک تیسرے نبی نوحؑ نے کہا تھا کہ "ان لوگوں کا حساب لینا تو میرے رب کا کام ہے، کاش تم سمجھو، اور میں مومنوں کو دھتکارنے والا نہیں ہوں۔" (الشعراء ۱۳-۱۱۴) اس جواب کو سن کر خارجیوں کو اپنے خیال کی غلطی کا اعتراف کرنا پڑا۔"

گناہ گار مومن کا انجام

"ہم یہ نہیں کہتے کہ مومن کے لئے گناہ نقصان دِہ نہیں ہے۔ اور ہم نہ یہ کہتے ہیں کہ مومن دوزخ میں نہیں جائے گا اور نہ یہی کہتے ہیں کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں رہے گا اگر وہ فاسق ہو۔" اور ہم مرجئہ کی طرح یہ نہیں کہتے کہ ہماری نیکیاں ضرور مقبول اور ہماری برائیاں ضرور معاف ہو جائیں گی۔" عقیدۂ طحاویہ اس پر اتنا اضافہ اور کرتا ہے:

"ہم اہلِ قبلہ میں سے کسی کے نہ جنتی ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں نہ دوزخی ہونے کا اور نہ ہم اُن پر کفر یا شرک یا منافقت کا حکم لگاتے ہیں جب تک کہ ان سے ایسی کسی بات کا عملاً ظہور نہ ہوا اور ان کی نیتوں کا معاملہ ہم خدا پر چھوڑتے ہیں۔"

امام صاحبؒ کی دیانت

ایک دن گھر میں بیٹھے تھے، اُن کی لڑکی نے مسئلہ پوچھا کہ میں آج روزے سے ہوں، دانتوں سے خون نکلا اور تھوک کے ساتھ گلے سے اُتر گیا۔ روزہ جاتا رہا یا باقی ہے؟ امام صاحبؒ نے فرمایا کہ جان پدر اپنے بھائی حماد سے پوچھو۔ میں تو فتویٰ دینے سے منع کر دیا گیا ہوں۔" مورخ ابن خلکان نے اس روایت کو نقل کر کے لکھا ہے کہ اطاعتِ حکم اور امانت کی اس سے بڑھ کر کیا مثال ہو سکتی ہے چند روز کے بعد گورنر کو اتفاق سے فقہی مسائل میں مشکلات پیش آئیں اور امام ابو حنیفہؒ کی طرف رجوع کرنا پڑا جس کی وجہ سے امام صاحبؒ کو پھر فتوے دینے کی عام اجازت حاصل ہو گئی۔

وہ صاف طور پر یہ کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ کی جن لوگوں سے بھی جنگ ہوئی (اور ظاہر ہے کہ اس میں جنگِ جمل و صفین کے شرکا شامل ہیں) ان کے مقابلہ میں علیؓ زیادہ برسرِ حق تھے" لیکن وہ دوسرے فریق کو مطعون کرنے سے قطعی پرہیز کرتے ہیں۔

تعریفِ ایمان

"ایمان نام ہے اقرار اور تصدیق کا" "الوصیہ" میں اس کی تشریح امام نے اس طرح کی ہے: "ایمان زبان سے اقرار اور دل سے تصدیق کا نام ہے" پھر کہتے ہیں: "نہ اقرار اکیلا ایمان ہے اور نہ محض معرفت ہی کو ایمان کہا جا سکتا ہے۔" آگے چل کر اس کی مزید تشریح وہ اس طرح کرتے ہیں: "عمل ایمان سے الگ ایک چیز ہے اور ایمان عمل سے الگ۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ بسا اوقات مومن سے عمل مرتفع ہو جاتا ہے مگر ایمان اس سے مرتفع نہیں ہوتا۔ مثلاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ فقیر پر زکوٰۃ واجب نہیں، مگر یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ اس پر ایمان واجب نہیں۔" اس طرح انھوں نے خوارج کے اِس خیال کی تردید کر دی کہ عمل ایمان کی حقیقت میں شامل ہے اور گناہ لازماً عدمِ ایمان کا ہم معنیٰ ہے۔

گناہ اور کفر کا فرق

"ہم کسی مسلمان کو کسی گناہ کی بنا پر خواہ وہ کیسا ہی بڑا گناہ ہو، کافر نہیں قرار دیتے جب تک کہ وہ اس کے حلال ہونے کا قائل نہ ہو۔ ہم اس سے ایمان کا نام سلب نہیں کرتے بلکہ اُسے حقیقتاً مومن قرار دیتے ہیں۔ ہمارے

رکھتا تھا، بلکہ اس سے خود بخود یہ مسئلہ پیدا ہو جاتا تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو احکام ان لوگوں کے واسطے سے منقول ہوئے ہیں وہ آیا اسلامی قانون کے ماخذ قرار پائیں گے یا نہیں۔

تیسرا اہم اور بُنیادی سوال ایمان کی تعریف، ایمان و کفر کے اُصولی فرق، اور گناہ کے اثرات و نتائج کا تھا جس پر خوارج، معتزلہ اور مُرجِئہ کے درمیان سخت بحثیں اٹھی ہوئی تھیں۔ یہ سوال بھی محض دینیاتی نہ تھا بلکہ مسلم سوسائٹی کی ترکیب سے اس کا گہرا تعلق تھا، کیونکہ اس کے متعلق جو فیصلہ بھی کیا جائے اس کا اثر مسلمانوں کے اجتماعی حقوق اور ان کے قانونی تعلقات پر لازماً پڑتا ہے۔ نیز ایک اسلامی ریاست میں اس سے یہ مسئلہ بھی پیدا ہو جاتا ہے کہ گناہ گار حاکموں کی حکومت میں جمعہ و جماعت جیسے مذہبی کام اور عدالتوں کے قیام اور جنگ و جہاد جیسے سیاسی کام صحیح طور پر کئے جا سکیں گے یا نہیں۔

امام ابوحنیفہؒ نے ان مسائل کے متعلق اہل السنت کا جو مسلک ثبت کیا ہے وہ حسبِ ذیل ہے:-

خلفائے راشدینؓ کے بارے میں

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد افضل النّاس ابو بکر صدیقؓ ہیں، پھر عمرؓ بن الخطاب، پھر عثمانؓ بن عفان پھر علیؓ بن ابی طالب۔ یہ سب حق پر تھے اور حق کے ساتھ رہے۔"

عقیدۂ طحاویہ میں اس کی مزید تشریح اس طرح کی گئی ہے:- "ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ابوبکر صدّیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تمام اُمّت پر افضل قرار دیتے ہوئے سب سے پہلے خلافت ان کے لئے ثابت کرتے ہیں، پھر عمرؓ بن الخطاب کے لئے، پھر عثمانؓ کے لئے، پھر علی بن ابی طالب کے لئے، اور یہ خلفا راشدین و ائمہ مہدیین ہیں۔"

اس سلسلہ میں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ امام ابوحنیفہؒ ذاتی طور پر حضرت علیؓ کو حضرت عثمانؓ کی بہ نسبت زیادہ محبوب رکھتے تھے، اور ان کی شخصی رائے بھی یہ تھی کہ ان دونوں بزرگوں میں سے کسی کو کسی پر فضیلت نہیں دی جا سکتی، مگر حضرت عثمانؓ کے انتخاب کے موقع پر اکثریت سے جو فیصلہ ہو چکا تھا اس کو تسلیم کرتے ہوئے انہوں نے اجتماعی عقیدہ یہی قرار دیا کہ فضیلت کی ترتیب بھی وہی ہے جو خلافت کی ترتیب ہے۔

صحابۂ کرام کے بارے میں

"ہم صحابہؓ کا ذکر بھلائی کے سوا اور کسی طرح نہیں کرتے۔" عقیدۂ طحاویہ میں اس کی مزید تفصیل یہ ہے:

"ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اصحابؓ کو محبوب رکھتے ہیں، ان میں سے کسی کی محبت میں حد سے نہیں گزرتے اور نہ کسی سے تبرّی کرتے ہیں۔ ان سے بغض رکھنے والے اور بُرائی کے ساتھ اُن کا ذکر کرنے والے کو ہم ناپسند کرتے ہیں، اور اُن کا ذکر بھلائی کے سوا کسی اور طرح نہیں کرتے۔"

اگرچہ صحابہؓ کی خانہ جنگی کے بارے میں امام ابوحنیفہؒ نے اپنی رائے ظاہر کرنے سے دریغ نہیں کیا ہے چنانچہ

آزادی اور بے نیازی

ابن ہبیرہ نے کہ کوفہ کا گورنر اور نہایت نامور شخص تھا۔ ان سے بہ لجاجت کہا کہ آپ کبھی کبھی قدم رنجہ فرماتے تو مجھ پر احسان ہوتا۔ فرمایا "میں تم سے مل کر کیا کروں گا۔ مہربانی سے پیش آؤ گے تو خوف ہے کہ تمہارے دام میں آجاؤں عتاب کرو گے تو میری ذلت ہے۔ تمہارے پاس جو زر و مال ہے مجھے اس کی حاجت نہیں، میرے پاس جو دولت ہے اس کو کوئی شخص چھین نہیں سکتا" عیسیٰ بن موسیٰ کے ساتھ بھی ایسا ہی واقعہ گذرا۔

اس کو دو ٹوک طریقے سے ایک واضح تحریر کی صورت میں مرتب نہیں کیا تھا۔

عقیدۂ اہل سنّت کی توضیح

امام ابو حنیفہؒ پہلے شخص ہیں جنھوں نے "الفقہ الاکبر" لکھ کر ان مذہبی فرقوں کے مقابلہ میں عقیدۂ اہل السنت والجماعت کو ثبت کیا۔

اس میں جن سوالات سے امام نے بحث کی ہے ان میں پہلا سوال خلفاء راشدین کی پوزیشن کا ہے۔ مذہبی فرقوں نے یہ بحث اٹھا دی تھی کہ آیا ان میں سے بعض کی خلافت صحیح تھی یا نہیں، اور ان میں کون کس پر افضل تھا۔ بلکہ ان میں سے کوئی مسلمان بھی رہا یا نہیں۔ ان سوالات کی حیثیت محض چند سابق شخصیتوں کے متعلق ایک تاریخی رائے کی نہیں تھی، بلکہ دراصل ان سے یہ بنیادی سوال پیدا ہوتا تھا کہ جس طرح یہ خلفاء مسلمانوں کے امام بنائے گئے آیا اس کو اسلامی ریاست کے سربراہ کی تقرری کا آئینی طریقہ مانا جائے گا نہیں۔ نیز اگر ان میں سے کسی کی خلافت کو بھی مشکوک سمجھ لیا جائے تو اس سے یہ سوال پیدا ہو جاتا تھا کہ اس کے زمانے کے اجماعی فیصلے قانون اسلام کا جزء مانے جائیں گے یا نہیں، اور اس خلیفہ کے اپنے فیصلے قانو[illegible] نظائر کی حیثیت رکھیں گے یا نہیں۔ اس کے علاوہ ان کی خلافت کی صحت و عدم صحت اور ان کے ایما[illegible] عدم ایمان، حتیٰ کہ ان میں سے بعض پر بعض کی فضیلت کا سوال بھی آپ سے آپ اس سوال پر منتہی ہوتا تھا [illegible] بعد کے مسلمان آیا اس ابتدائی اسلامی معاشرے پر اعتماد رکھتے ہیں اور اس کے اجتماعی فیصلوں کو تسلی[illegible] کرتے ہیں یا نہیں جو پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم کی براہِ راست تربیت و رہنمائی میں بنا تھا اور جس کے توسّ[illegible] ہی سے بعد کی نسلوں کو قرآن اور سنتِ پیغمبر اور اسلامی احکام کی ساری معلومات پہونچی ہیں۔

دوسرا سوال جماعتِ صحابہؓ کی پوزیشن کا ہے جس کے سوادِ اعظم کو ایک گروہ اس بنا پر ظالم و گمرا[illegible] بلکہ کافر تک کہتا تھا کہ انہوں نے پہلے تین خلفاء کو امام بنایا، اور جس کے افراد کی ایک بڑی تعداد کو خوا[illegible] اور معتزلہ کافر و فاسق ٹھہراتے تھے۔ یہ سوال بھی بعد کے زمانے میں محض ایک تاریخی سوال کی حیثیت [illegible]

"بخدا وہ اللہ کی حرام کردہ چیزوں سے سخت پرہیز کرنے والے، اہلِ دُنیا سے مجتنب اور اکثر خاموش رہنے والے آدمی تھے۔ ہمیشہ غور و فکر میں لگے رہتے اور فضول باتیں کبھی نہ کرتے۔ اگر کوئی مسئلہ اُن سے پوچھا جاتا اور ان کے پاس اس کے متعلق کوئی علم ہوتا تو جواب دے دیتے۔ امیر المؤمنین! میں تو بس یہ جانتا ہوں کہ وہ اپنے نفس اور دین کو برائیوں سے بچانے تھے اور لوگوں سے بے نیاز ہو کر اپنے آپ سے مشغول رہتے تھے۔ وہ کبھی کسی کا ذکر بُرائی کے ساتھ نہ کرتے تھے۔"

وہ ایک نہایت فیاض آدمی تھے خصوصاً اہلِ علم پر اور طلبہ پر اپنا مال بڑی دریا دلی سے خرچ کرتے تھے انہوں نے اپنے تجارتی منافع کا ایک خاص حصّہ اس مقصد کے لئے الگ کر رکھا تھا جس سے سال بھر تک علماء اور طلبہ کو باقاعدہ مالی اعانتیں دیتے رہتے اور آخر میں جو کچھ بچتا وہ انہی میں تقسیم کر دیتے۔ وہ ان کو مال دیتے وقت کہا کرتے "آپ لوگ اسے اپنی ضروریات پر خرچ کریں اور اللہ کے سوا کسی کے شکر گزار نہ ہوں میں نے آپ کو اپنے پاس سے کچھ نہیں دیا ہے، یہ اللہ کا فضل ہے جو آپ ہی لوگوں کے لئے اس نے بخشا ہے" ان کے

شاگردوں میں ایک کثیر تعداد ایسی تھی جن کے مصارف کی کفالت وہ خود کرتے تھے، امام ابو یوسفؒ کے تو گھر کا پورا خرچ ہی انہوں نے اپنے ذمّے لے رکھا تھا، کیونکہ اُن کے والدین غریب تھے اور وہ اپنے لڑکے کی تعلیم چھڑا کر اسے کسی معاشی کام میں لگانا چاہتے تھے۔

اِس سیرت اور شخصیت کا تھا وہ شخص جس نے دوسری صدی ہجری کے نصف اوّل میں قریب قریب ان تمام اہم مسائل سے تعرّض کیا جو خلافتِ راشدہ کے بعد پیش آنے والے حالات میں پیدا ہوئے تھے۔

امام رحمۃ اللہ علیہ کی آراء

امامؒ کے خیالات ان کے اپنے قلم سے ثبت کئے ہوئے موجود ہیں۔ وہ کوئی صاحبِ تصنیف آدمی نہ تھے اس لئے اُن کے کام کے متعلق زیادہ تر دوسرے معتبر ذرائع ہی کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ لیکن شیعہ، خوارج، مُرجئہ اور مُعتزلہ کے اٹھائے ہوئے چند مسائل ایسے ہیں جن پر انہوں نے اپنی عادت کے خلاف خود قلم اٹھایا ہے اور اہل السنّت والجماعت (یعنی مسلم معاشرے کے سوادِ اعظم) کا عقیدہ و مسلک نہایت مختصر مگر واضح الفاظ میں مرتب کر دیا ہے۔

حضرت علیؓ کے زمانۂ خلافت اور بنو امیّہ کے آغازِ سلطنت میں مسلمانوں کے درمیان جو اختلافات رونما ہوئے تھے ان سے چار بڑے فرقے وجود میں آگئے تھے جنہوں نے بعض ایسے مسائل پر انتہائی آراء کا نہ صرف اظہار کیا بلکہ ان کو مذہبی عقیدہ قرار دے دیا جو مسلم سوسائٹی کی ترکیب، اسلامی ریاست کی ہیئتِ ملکی قانون کے ماخذ، اور اُمّت کے سابقہ اجتماعی فیصلوں کی مستند حیثیت پر اثر انداز ہوتے تھے۔ ان کے مسائل کے متعلق سوادِ اعظم کا مسلک اگرچہ متعین تھا کیونکہ تمام مسلمان اس پر چل رہے تھے اور بڑے بڑے فقہاء وقتاً فوقتاً اپنے اقوال و افعال سے بھی اس کا اظہار کرتے تھے۔ لیکن امام ابو حنیفہؒ کے وقت تک کسی نے

امامؒ کی دریادلی

ایک دفعہ کسی بیمار کی عیادت کو جارہے تھے۔ راہ میں ایک شخص ملا، جوان کا مقروض تھا۔ اس نے دُور سے اُن کو دیکھ لیا اور کترا کر دوسری طرف چلا، انہوں نے پکارا کہ کہاں جاتے ہو۔ وہ کھڑا ہو گیا قریب پہونچے تو پوچھا کہ مجھ کو دیکھ کر تم نے راستہ کیوں کاٹا۔ اس نے کہا آپ کے دس ہزار درہم مجھ پر آتے ہیں جو مجھ سے اب تک ادا نہ ہو سکے، اس شرم سے آنکھ برابر نہیں ہوتی۔ امام صاحبؒ اس کی غیرت سے متعجب ہوئے اور فرمایا، جاؤ میں نے سب معاف کر دیا۔"

دُور دراز علاقوں میں بھی جاتا تھا۔ پھر ان کی دیانت پر عام اعتماد جب بڑھا تو یہ کوٹھی عملاً ایک بینک بھی بن گئی جس میں لوگ کروڑوں روپیہ امانت رکھواتے تھے۔ اُن کی وفات کے وقت ۵ کروڑ درہم کی امانتیں اس کوٹھی میں جمع تھیں مالی و تجارتی معاملات کے متعلق اس وسیع تجربے نے اُن کے اندر قانون کے بہت سے شعبوں میں وہ بصیرت پیدا کر دی تھی جو صرف علمی حیثیت سے قانون جاننے والوں کو نصیب نہیں ہوتی۔ فقہ اسلامی کی تدوین میں اس تجربے نے اُن کو بڑی مدد دی۔ اس کے علاوہ دنیوی معاملات میں ان کی فراست و مہارت کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ جب ۱۴۵ھ (۷۶۲ء) میں المنصور نے بغداد کی تعمیر کا آغاز کیا تو ابو حنیفہ ہی کو اس کی نگرانی پر مقرر کیا اور چار سال تک وہ اس کام کے نگرانِ اعلیٰ رہے۔

وہ اپنی شخصی زندگی میں انتہائی پرہیزگار اور دیانت دار آدمی تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے اپنے شریک کو مال بیچنے کے لئے باہر بھیجا۔ اس مال میں ایک حصہ عیب دار تھا۔ امام نے شریک کو ہدایت کی کہ جس کے ہاتھ فروخت کرے اسے آگاہ کر دے۔ مگر وہ اس بات کو بھول گیا اور سارا مال عیب ظاہر کئے بغیر فروخت کر آیا۔ امام نے اس پورے مال کی وصول شدہ قیمت (جو ۳۵ ہزار درہم تھی) خیرات کر دی۔ مورخین نے متعدد واقعات ایسے بھی نقل کئے ہیں کہ ناتجربہ کار لوگ اگر اپنا مال فروخت کرنے کے لئے ان کی دوکان پر آتے اور مال کی قیمت کم بتاتے تو امام خود ان سے کہتے تھے کہ تمہارا مال زیادہ قیمتی ہے اور ان کو صحیح قیمت ادا کرتے تھے۔ ان کے ہمعصر ان کی پرہیزگاری کی تعریف میں غیر معمولی طور پر رطب اللسان ہیں۔ مشہور امام حدیث عبداللہ بن المبارکؒ کا قول ہے "میں نے ابو حنیفہؒ سے زیادہ پرہیزگار آدمی نہیں دیکھا۔ اس شخص کے متعلق کیا کہا جائے گا جس کے سامنے دنیا اور اس کی دولت پیش کی گئی اور اس نے ٹھکرا دیا، کوڑوں سے اس کو پیٹا گیا اور وہ ثابت قدم رہا، اور وہ مناصب جن کے پیچھے لوگ دوڑتے پھرتے ہیں کبھی قبول نہ کئے۔" قاضی ابن شبرمہ کہتے ہیں "دنیا ان کے پیچھے لگی مگر وہ اس سے بھاگے اور ہم سے وہ بھاگی مگر ہم اس کے پیچھے لگے۔" حسن بن زیاد کہتے ہیں "خدا کی قسم ابو حنیفہؒ نے کبھی کسی امیر کا عطیہ یا ہدیہ قبول نہیں کیا۔" ہارون الرشید نے ایک دفعہ امام ابو یوسفؒ سے ابو حنیفہ کی صفت پوچھی۔ انہوں نے کہا:۔

"میں ایک ایسا شخص تھا جسے علمِ کلام کی بحثوں میں مہارت حاصل تھی۔ ایک زمانہ ایسا گزرا کہ میں اِنہی بحثوں اور مناظروں میں مشغول رہتا تھا۔ اور چونکہ اختلافات کا اکھاڑہ زیادہ تر بصرے میں تھا اس لئے میں تقریباً ۲۰ مرتبہ وہاں گیا اور کبھی کبھی سال چھ مہینے بھی وہاں رہ کر خوارج کے مختلف گروہوں، اباضیہ صُفریہ وغیرہ سے اور حشویہ کے مختلف طبقوں سے مناظرے کرتا رہا۔"

اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ امام نے اس وقت کے فلسفہ و منطق اور اختلافاتِ مذاہب کے متعلق بھی ضرور کافی واقفیت بہم پہونچائی ہوگی، کیونکہ اس کے بغیر علم کلام میں آدمی دخل نہیں دے سکتا۔ بعد میں انہوں نے قانون میں منطقی اِستدلال اور عقل کے استعمال کا جو کمال دکھایا اور بڑے بڑے پیچیدہ مسائل کو حل کرنے میں جو شہرت حاصل کی وہ اسی ابتدائی ذہنی تربیت کا نتیجہ تھی۔

کافی مدّت تک اس میں مشغول رہنے کے بعد کلامی جھگڑوں اور مجادلوں سے ان کا دل بیزار ہو گیا اور انہوں نے فقہ (اسلامی قانون) کی طرف توجّہ کی۔ یہاں طبعًا اُن کی دلچسپی اہل الحدیث کے مدرسۂ فکر سے نہ ہو سکتی تھی۔ عراق کے اصحاب الرّائے کا مرکز اس وقت کوفہ تھا۔ اسی سے وہ وابستہ ہو گئے۔ اس مدرسۂ فکر کی ابتدا حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ (متوفّی ۳۲ھ-۶۵۲ء) سے ہوئی تھی۔ اُن کے بعد ان کے شاگرد شُریح (م ۷۸ھ-۶۹۷ء) علقمہ (م ۶۲ھ-۶۸۱ء) اور مَسروق (م ۶۳ھ-۶۸۲ء) اس مدرسے کے نامور ائمہ ہوئے جن کا شہرہ اس وقت تمام دنیائے اسلام میں تھا۔ پھر ابراہیم نخعی (م ۹۵ھ ۷۱۴ء) اور اُن کے بعد حمّاد تک اس کی امامت پہونچی۔ اِنہی حمّاد کی شاگردی ابو حنیفہؒ نے اختیار کی اور اُن کی وفات تک پورے ۱۸ سال اُن کی صحبت میں رہے۔ مگر انہوں نے صرف اسی علم پر اکتفا نہ کیا جو کوفہ میں اُن کے اساتذہ کے پاس تھا، بلکہ بار بار حج کے موقع پر حجاز جا کر وہ فقہ اور حدیث کے دوسرے اکابر اہلِ علم سے بھی استفادہ کرتے رہے۔

۱۲۰ھ میں جب اُن کے اُستاذ حمّاد کا انتقال ہوا تو اس مدرسۂ فکر کے لوگوں نے بالاتفاق امام ابو حنیفہؒ کو ان کا جانشین بنایا اور اس مسند پر ۳۰ سال تک درس و تدریس اور افتاء کا وہ لافانی کام انہوں نے انجام دیا جو آج مذہبِ حنفی کی بنیاد ہے۔ اس ۳۰ سال کی مدت میں انہوں نے بقول بعض ۶۰ ہزار اور بقول بعض ۸۳ ہزار قانونی مسائل کے جوابات دیئے جو ان کی زندگی ہی میں الگ الگ عنوانات کے تحت مرتب کر دیئے گئے۔ سات آٹھ سو کی تعداد میں ایسے شاگرد تیار کئے جو دنیائے اسلام کے مختلف علاقوں میں پہونچ کر درس و افتاء کے مسند نشین اور عوام کی عقیدتوں کے مرکز بن گئے۔ ان کے شاگردوں میں سے ۵۰ کے قریب ایسے آدمی نکلے جو اُن کے بعد سلطنتِ عباسیہ کے قاضی ہوئے۔ اُن کا مذہب اسلامی دُنیا کے بہت بڑے حصے کا قانون بن گیا۔ وہی عباسی، سلجوقی، عثمانی اور مغل سلطنتوں کا قانون تھا۔ اور آج چین سے لے کر ترکی تک کے کروڑوں مسلمان اسی کی پیروی کرتے ہیں۔

معاش کے لئے امام نے اپنا آبائی پیشہ تجارت اختیار کیا۔ کوفہ میں وہ خزّ (ایک خاص قسم کے کپڑے) کی تجارت کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ انہوں نے اس پیشے میں بھی غیر معمولی ترقی کی۔ ان کا اپنا ایک بڑا کارخانہ تھا جس میں خزّ تیار کیا جاتا تھا۔ ان کی تجارتی کوٹھی صرف کوفے ہی میں کپڑا فروخت نہیں کرتی تھی بلکہ اس کا مال

امام صاحبؒ کا اسمِ گرامی نعمان بن ثابت تھا۔ عراق کے دارالحکومت کوفہ میں اُن کی پیدائش معتبر روایات کے مطابق ۸۰ھ (۶۹۹ء) میں ہوئی۔ عبدالملک بن مروان اُس وقت اُموی خلیفہ تھا اور حجاج بن یوسف عراق کا گورنر۔ انھوں نے اپنی زندگی کے ۵۲ سال بنی اُمیّہ کے عہد میں اور ۱۸ سال بنی عباس کے عہد میں گزارے۔ حجاج بن یوسف کی موت کے وقت وہ پندرہ سال کے تھے۔ عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانے میں وہ جوان تھے۔ یزید بن المہلب، اور خالد بن عبداللہ القسری اور نصر بن سیّار کی ولایتِ عراق کے طوفانی عہد اُن کی آنکھوں کے سامنے گزرے۔ ابنِ ہُبیرہ آخری اُموی گورنر کے ظلم وستم کا وہ خود نشانہ بنے۔ پھر اُن کے سامنے ہی عبّاسی دعوت اٹھی۔ اس کا مرکز اُن کا اپنا شہر کوفہ تھا، اور بغداد کی تعمیر سے پہلے تک کوفے ہی کو عملاً نوخیز دولتِ عباسیّہ کے مرکز کی حیثیت حاصل رہی۔ خلیفہ المنصور کے عہد میں ۱۵۰ھ (۷۶۷ء) میں انہوں نے وفات پائی۔

ان کا خاندان ابتداءً کابُل میں آباد تھا۔ اُن کے دادا، جن کا نام بعض نے زُوطی اور بعض نے زُوطیٰ لکھا ہے، جنگ میں گرفتار ہو کر کوفہ آئے اور مسلمان ہو کر یہیں بنی تیم اللہ کی "وِلاء" (PATRONAGE) میں رہ پڑے۔ ان کا پیشہ تجارت تھا۔ حضرت علیؓ سے اُن کی ملاقات تھی اور اس حد تک تعلقات تھے کہ وہ کبھی کبھی ان کی خدمت میں ہدیے بھیجتے رہتے تھے۔ ان کے بیٹے ثابت (امام ابو حنیفہؒ کے والد) بھی کوفے میں تجارت کرتے تھے۔ امام کی اپنی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ کوفے میں اُن کی روٹیوں کی دوکان (BAKERY) تھی۔

امام کی تعلیم کے متعلق اُن کا اپنا بیان یہ ہے کہ ابتداءً انہوں نے قرأت، حدیث، نحو، ادب، شعر، کلام وغیرہ تمام اُن علوم کا مطالعہ کیا تھا جو اس زمانے میں متداول تھے۔ اس کے بعد انہوں نے علم کلام میں اختصاص پیدا کیا اور ایک مدّت اس ہی میں مشغول رہ کر اس مرتبے تک ترقی کر گئے کہ اس فن میں اُن کی طرف نگاہیں اُٹھنے لگیں۔ ان کے مشہور شاگرد زُفر بن الہذیل کی روایت ہے کہ امام نے اُن سے کہا "پہلے میں علمِ کلام سے دل چسپی رکھتا تھا، اور اس حد کو پہونچ گیا تھا کہ میری طرف اشارے کئے جاتے تھے۔" ایک اور روایت میں امام خود فرماتے ہیں :

2

مدیر اعلیٰ کا مکتوب قارئین کے نام

بسم اللہ الرحمن الرحیم ہ

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم ہ

قارئین ھدیٰ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

میرے لئے یہ بات باعث فخر ہے کہ آپ "ھدیٰ" کی سرپرستی فرماتے ہیں۔ اور یقیناً محسوس کرتے ہونگے کہ ھدیٰ بزرگان سلف کی یاد تازہ رکھنے، قارئین میں دینی اور ملی شعور پیدا کر کے اللہ کے دین اور رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات اور اولیاء اللہ کے مشن کو ایک گھر سے دوسرے گھر تک، ایک بندے سے دوسرے بندے تک پہونچانے نیز آنے والی نسلوں کے لئے ان دینی ذخیروں کو محفوظ رکھنے کی نہایت عظیم خدمت انجام دے رہا ہے۔

"ھدیٰ" آج سے کم وبیش ۲۲ سال قبل انہی مقاصد کو سامنے رکھ کر جاری کیا گیا تھا، اور اس بات کے لئے میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوں کہ سخت آزمائش کے مراحل میں بھی یہ مقاصد نظروں سے اوجھل نہیں ہوئے اور ہر ماہ پابندی وقت کے ساتھ ظاہری اور معنوی خوبیوں سے مزین یہ ماہنامہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا تارہا ہے۔ لیکن موجودہ ہوشربا گرانی کے دور میں جبکہ طباعت اور کاغذ کے نرخ کئی گنا بڑھ چکے ہیں اس زبردست اور ناقابل برداشت بوجھ کو تنہا اٹھائے رکھنا دشوار نظر آرہا ہے اور اسی بات نے مجھے مجبور کیا ہے کہ ھدیٰ کے انتہائی مخلص قارئین کی خدمت میں مزید تعاون کی درخواست کروں۔

آپ کی خدمت میں گزارش ہے کہ آپ دینی بھائیوں کو ھدیٰ کی طرف متوجہ فرماکر کم از کم ایک سالانہ خریدار ضرور بنائیں اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو ایک گھرانے کو اس طرف راغب کریں کہ وہ ہر ماہ مقامی ایجنسی سے "ھدیٰ" ضرور خرید لیا کرے۔ اگر آپ اپنے شہر کے اساتذہ، طلباء اور دیگر باثر افراد سے رابطہ پیدا کریں تو یہ کوئی مشکل کام نہیں مجھے یقین ہے کہ میری گزارش پر خصوصی توجہ فرمائیں گے۔ آپ کے اس کار خیر میں شمولیت اور تعاون کے لئے ذاتی طور پر بھی شکر گزار ہوں گا۔

والسلام

آپ کا مخلص اور طالب خیر

احمد مصطفےٰ صدیقی راہی

مدیر اعلیٰ ہدیٰ اسلامی ڈائجسٹ

غصہ، نفرت، تفرقہ، بغض و عناد اس مشن کا تشخص ہے جو بارگاہ ایزدی سے معتوب اور گم کردہ راہ ہے۔ یہ مشن کبر و نخوت، ضد اور ذاتی طور پر غرور کا پرچار کرتا ہے۔ اس کردار میں وہ تمام عوامل کار فرما ہیں جن سے بندہ اللہ سے دور ہو جاتا ہے۔ اس کے اوپر تاریکی گھٹائیں کر چھاجاتی ہے، ادبار اور آلام و مصائب اس طرح مسلط ہو جاتے ہیں کہ یہ خود اپنی نظروں میں ذلیل و خوار ہو جاتا ہے۔ بظاہر دنیا کو ہر آسودگی میسر ہوتی ہے لیکن دل میں ایک ایسا ناسور پیدا ہو جاتا ہے کہ اس کے تعفن سے روح کے اندر لطیف انوار، اپنا رشتہ منقطع کر لیتے ہیں اور جب قطع وبرید کی یہ حالت مزمن ہو جاتی ہے تو انوار کا ذخیرہ پس پردہ چلا جاتا ہے اور اللہ کے ارشاد کے مطابق دلوں پر، کانوں پر مہر لگادی جاتی ہے اور آنکھوں پر دبیز گہرے پردے ڈال دیئے جاتے ہیں۔ یہ محرومی اس کو، نہ صرف یہ کہ دنیا میں امن و سکون سے دور کر دیتی ہے بلکہ ایسا بندہ ازلی سعادت اور عرفان حق سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

"قیامت کے روز کچھ لوگ اپنی قبروں سے اٹھیں گے اور ان کے چہرے نور سے جگمگار ہے ہوں گے۔ وہ موتیوں کے منبروں پر بٹھائے جائیں گے۔ لوگ ان کی شان پر رشک کریں گے۔ یہ لوگ نہ نبی ہوں گے۔ نہ شہید ہوں گے"۔

ایک بدو نے سوال کیا "یارسول اللہ ﷺ یہ کون لوگ ہیں ہمیں ان کی پہچان بتا دیجئے"۔

فرمایا! "یہ وہ لوگ ہیں جو آپس میں خدا کی خاطر محبت کرتے ہیں"۔

نبی اکرم ﷺ کو خدا کا دیدار ہوا، خدا نے اپنے پیارے نبی ﷺ سے کہا، مانگیئے! حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ دعا مانگی۔

اے خدا! میں تجھ سے نیک کاموں کی توفیق چاہتا ہوں، اور برے کاموں سے بچنے کی قوت چاہتا ہوں، اور مسکینوں کی محبت چاہتا ہوں اور یہ کہ تو میری مغفرت فرمادے اور مجھ پر رحم فرما۔ اور جب تو کسی قوم کو عذاب میں مبتلا کرنا چاہے تو مجھے اس حال میں اٹھالے کہ میں اس سے محفوظ رہوں اور میں تجھ سے تیری محبت کا سوال کرتا ہوں اور اس شخص کی محبت کا سوال کرتا ہوں جو تجھ سے محبت کرتا ہے اور اس عمل کی توفیق چاہتا ہوں جو تیرے قرب کا ذریعہ ہے"۔

"اس نے تمہیں منتخب فرما لیا ہے، اور دین کے معاملہ میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی ہے، پیروی کرو، اس دین کی جو تمہارے باپ ابراہیم کا دین ہے۔ اس نے پہلے ہی تمہیں مسلم کے نام سے نوازا تھا تاکہ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام ہمارے لئے دین حق کی شہادت دیں اور تم دنیا کے سارے انسانوں کے سامنے حق کی شہادت دو"۔ (القرآن)

ہم بحیثیت مسلم اللہ اور اس کے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے جانشین ہیں اور ہمیں وہی کام انجام دینا ہے جو اللہ کے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام نے انجام دیا ہے۔ جس طرح آخری نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے قول و عمل اور شب و روز کی زندگی سے خدا کے دین کو پھیلانے اور واضح کرنے کا حق ادا کیا ہے۔ اسی طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پیروکار کی حیثیت سے ہمیں بھی دنیا کے سارے انسانوں کے سامنے، خدا کے دین کو واضح کرنا ہے تاکہ پوری نوع انسانی، اللہ کے حقیقی منشاء کو پورا کرنے کے قابل ہو جائے۔ اللہ نے جنات اور انسانوں کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ خود اللہ چاہتا ہے کہ بندے اپنی روح سے آشنا ہو کر اللہ کو پہچان لیں۔

جو لوگ خود شناسی سے آگے اللہ کے راستے پر قدم اٹھا چکے ہیں۔ ان کے اوپر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ انسانوں کو اس راستہ پر چلنے کی دعوت دیں جو راستہ صراط مستقیم ہے اور جس راستہ پر چلنے والے لوگوں پر انعام کیا جاتا ہے اور ان کے اوپر عرفان کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

اس دعوت کو عام کرنے کے لئے کچھ ضابطے ہیں، اصول اور قاعدے ہیں، ان کو ذہن نشین رکھئے۔ اپنی اصلی حیثیت کو ہمیشہ نگاہ میں رکھئے۔ خود نمائی اور کبر سے بچئے، کوشش پیہم جاری رکھئے۔ اللہ کی مخلوق کی بے لوث خدمت کیجئے۔ مقصد کے لئے زندہ رہئے، اور اس ہی کے لئے جان دیجئے۔ اسی کام کو انجام دینے کے لئے خدا نے آپ کو "خیر امت" کے عظیم لقب سے سرفراز کیا ہے۔

پاکیزہ نفس اور روحانیت سے سرشار لوگوں سے محبت بندہ کو خود شناسی سے قریب کرتی ہے۔ یہ کون لوگ ہیں۔ یہ لوگ وہ ہیں جو آپس میں خدا کی خاطر محبت کرتے ہیں۔ بلاشبہ محبت آخرت کی نجات ہے

نعت سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت مولانا احمد رضا خانؒ

پوچھتے کیا ہو عرش پر یوں گئے مصطفیٰ کہ یوں
کیف کے پر جہاں جلیں کوئی بتائے کیا کہ یوں

قصرِ دنیٰ کے راز میں عقلیں تو گم ہیں جیسی ہیں
روح قدس سے پوچھیے تم نے بھی کچھ سنا کہ یوں

میں نے کہا کہ جلوۂ اصل کس طرح گمیں
صبح نے نورِ مہر میں مٹ کے دکھا دیا کہ یوں

ہائے رے ذوقِ بے خودی دل جو سنبھلنے سا لگا
جھک کے مہک میں پھول کی گرنے لگا کہ یوں

دل کو فکر ہے کس طرح مردے جلاتے ہیں حضورؐ
اے میں خدا لگا کر ایک ٹھوکر اسے بتا دیا کہ یوں

باغ میں شکرِ وصل تھا ہجر میں ہائے ہائے گل
کام ہے ان کے ذکر سے خیر وہ یوں ہوا کہ یوں

جو کہے شعر و پاسِ شرع دونوں کا حسن کیونکر آئے
اسے پیش جلوۂ زمزمۂ رضا کہ یوں

(صلی اللہ علیہ وسلم)

پروفیسر محمد اکرم رضاؔ

دہر میں تاریکیوں کو جگمگاتا ہے تو
عظمتِ ایمان کی شمعیں جلا دیتا ہے تو

تو ہی بھرتا ہے ہر اک سائل کا دامانِ طلب
اور ہر سائل کو حسن التجا دیتا ہے تو

اپنی رحمت سے ہمیں کر کے تو وحدت آشنا
نقش غیر اللہ کو دل سے مٹا دیتا ہے تو

ایک امی کو بنا کر صاحبِ اسرار کل
طالبانِ شوق کو اپنا پتہ دیتا ہے تو

نام لیواؤں کو تو ہر حال میں رکھتا ہے شاد
چاہنے والوں کو خواہش سے سوا دیتا ہے تو

مانگنے والے ندامت سے اگر جھکیں تو پھر
ان کو خود سے مانگنے کا صلہ دیتا ہے تو

سرور کونین کا ہم کو بنا کر امتی
منزل حسن صداقت کا پتہ دیتا ہے تو

تیرا دریائے کرم دیکھا ہمیشہ جوش پر
مانگنے والوں کو حسبِ مدعا دیتا ہے تو

ہے رضاؔ ہر دم شانِ کریمی کے نثار
جب یہ گرتا ہے تو اس کو آسرا دیتا ہے تو

جلّ جلالہٗ

ارشاداتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

☆ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "اس کی ناک خاک آلود ہو" یہ بات آپؐ نے تین دفعہ فرمائی۔ لوگوں نے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! کون ذلیل ہو؟ آپؐ نے فرمایا کہ وہ شخص جس نے اپنے والدین کو بڑھاپے کی حالت میں پایا ان میں سے ایک کو یا دونوں کو پھر (ان کی خدمت کر کے) جنت میں داخل نہ ہوا۔ (مسلم۔ ابو ہریرہؓ)

☆ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد "اللہ تعالیٰ نے تم پر حرام کی ہے ماں باپ کے ساتھ بد سلوکی۔ اور لڑکیوں کو زندہ دفن کرنا۔ اور حرص و بخل اور تمہارے لیے اس نے ناپسند کیا ہے بے کار قسم کی گفتگو اور زیادہ سوال کرنا اور مال کو برباد کرنا۔

☆ ابو اسیدؓ فرماتے ہیں کہ اس اثناء میں ہم حضور کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، بنو سلمہ کا ایک آدمی آپؐ کے پاس آیا اس نے کہا کہ "اے اللہ کے رسولؐ! ماں باپ کے وفات پا جانے کے بعد ان کا کوئی حق باقی رہتا ہے جسے میں ادا کروں؟" آپ ﷺ نے فرمایا "ہاں! ان کے لیے دعا و استغفار کرو اور جو جائز وصیت وہ کر گئے ہیں اسے پورا کرو اور والدین سے جن لوگوں کا رشتہ داری کا تعلق ہے ان کے ساتھ صلہ رحمی کرو اور ماں باپ کے دوست اور سہیلیوں کی عزت اور خاطر داری کرو۔

(ابو داؤد)

☆ حضرت ابو طفیل فرماتے ہیں کہ "میں نے حضور ﷺ کو مقام جعرانہ میں دیکھا کہ آپ گوشت تقسیم فرما رہے تھے کہ اتنے میں ایک عورت آئی اور حضور ﷺ کے قریب گئی تو آپؐ نے اپنی چادر بچھا دی جس پر وہ بیٹھ گئی۔ میں نے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ لوگوں نے مجھے بتایا کہ یہ حضور ﷺ کی ماں ہیں، جنہوں نے آپ کو دودھ پلایا ہے۔ (ابو داؤد)

☆ حضرت ابو بکرؓ کی بیٹی حضرت اسماءؓ فرماتی ہیں کہ "اس زمانے میں جب کہ قریش اور مسلمانوں کے درمیان صلح ہوئی تھی (صلح حدیبیہ) میری ماں (رضاعی) میرے پاس آئی اور وہ ابھی اسلام نہیں لائی تھی بلکہ شرک کی حالت پر تھی۔ تو میں نے حضور سے پوچھا کہ میری ماں میرے پاس آئی ہے اور وہ چاہتی ہے کہ میں اسے کچھ دوں تو کیا میں اسے دے سکتی ہوں؟"

آپ ﷺ نے فرمایا "ہاں تم اس کے ساتھ مہربانی کا سلوک کرو۔ (متفق علیہ)

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

گزشتہ سے پیوستہ

میرے اللہ کی طرف سے سلامتی ہی سلامتی ہے جس دن سے میں پیدا ہوا اور جس دن تک دنیا میں رہوں گا اور جس دن قیامت کے روز زندہ کر کے اٹھایا جاؤں گا (۳۳) تو لوگو! یہ ہیں عیسیٰ بن مریم جن کے متعلق غلط سلط باتیں مشہور ہو رہی ہیں اور لوگ شک وشبہے میں پڑے اختلاف رائے میں مبتلا ہیں (۳۴) اللہ کی ذات پاک اس سے بہت بلند ہے کہ اس کے لیے کوئی بیٹا بیٹی ہو اس کی شان اور اس کی قدرت کا تو یہ حال ہے کہ وہ جس بات کو چاہتا ہے کہ ہو جائے وہ کہتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے (۳۵) اے محمد! (صلعم) جس بات کی تم دعوت دیتے ہو وہی مسیح کی بھی صدا تھی کہ لوگو! جو ہمارا پروردگار ہے وہی تم سب کا بھی پروردگار ہے اور عبادت کے لائق صرف اسی کی ذات ہے پس اسی کی عبادت کرو، سیدھا راستہ یہی ہے اس کے سوا سب راستے ٹیڑھے اور غلط ہیں۔ اس کے باوجود مسیح کے کچھ ہی دن بعد جماعت بندیاں ہو گئیں اور لوگ آپس میں اختلاف رائے میں مبتلا ہو گئے افسوس ہے ان کافروں پر اور ان کے اس بڑے دن کے انجام پر جس کا بھیانک منظر ان کے سامنے آنے والا ہے (۳۷) اے محمد (صلعم) آج یہ کچھ نہیں سنتے اور حق بات کو نہیں دیکھتے لیکن قیامت کے دن ان کے کان بڑے سننے والے اور آنکھیں سب کچھ دیکھنے والی ہو جائیں گی اور یہ دن کچھ بہت دور نہیں، لیکن آج تو یہ ظالم بڑی سخت گمراہی کا شکار ہو رہے ہیں (۳۸) اور اے محمد (صلعم) تم اپنا فرض ادا کرو ان کافروں کو اس دن کی اہمیت اور ہولناکی سے ڈراؤ جس دن نافرمانی کی شکل میں ان کے حصے میں حسرت وندامت کے سوا کچھ نہ ہوگا اور ان کے خلاف فیصلہ ہو جائیگا یہ وہی دن ہوگا یہ جس سے غفلت میں ہیں اور ایمان نہیں لا رہے ہیں (۳۹) اور دیکھو زمین کے بھی اصلی وارث ہم ہیں اور ان لوگوں کے بھی جو اس پر بستے ہیں کیوں کہ ان لوگوں کو ایک دن ہمارے ہی حضور ہونا ہے (۴۰) اور اے محمد (صلعم) تو الکتاب (قرآن) سے ابراہیم کی واردات بھی لوگوں کو سناؤ کہ وہ اللہ کا نبی کیسا سچا تھا (۴۱) اس نے اپنے باپ تک کو سچی باتیں سنائیں اور نصیحت کرنے سے باز نہ آیا اس نے کہا اے میرے باپ تجھ کو بتوں کی پوجا نہیں کرنی چاہیے، یہ تو نہ کچھ سنتے ہیں نہ دیکھتے ہیں اور نہ کچھ تیرے کام آسکتے ہیں (۴۲)

(جاری ہے اگلے ماہ)

پھر دیکھو یہ ہوا کہ جب بچے کی پیدائش کا ر
ت آیا اور اسے درد زہ شروع ہوا تو بے قراری
ں وہ ایک کھجور کے درخت کے نیچے چلی گئی اور
نے کا سہارا لے کر بیٹھ گئی پھر اپنی حالت پر غور کر
لے بولی، اے کاش! اس سے پہلے کہ میری یہ
لت ہو، میں نیست و نابود ہو گئی ہوتی اور بھولی
ی بن جاتی (۲۳) بچہ پیدا ہوا، اس پر نخلستان
نچلے حصے سے ایک فرشتے نے مبارکباد دی اور
خوش خبری سنائی کہ مریم رنج و فکر کی بجائے
ں ہو کہ تیرے پروردگار کے فضل سے تیرا یہ
ود دنیا کی بڑی ہستی ہو گا (۲۴) تیرے لیے
نے پینے کا سرو سامان بھی یہیں ہوا جاتا ہے ایسا
ہ تو کھجور کے درخت کی شاخ کو اپنی طرف ہلا
ے لیے تر و تازہ کھجوریں گریں گی (۲۵) پاس
نی کا چشمہ موجود ہے، کھا پی اور بیٹے کو دیکھ دیکھ
نی آنکھوں کی ٹھنڈک بنا اور جب کوئی آدمی
آئے اور تجھ سے اس بارے میں پوچھے کچھ
ے تو اشارے سے یہ کہہ دے کہ میں نے
شی کا روزہ رکھا ہے جو رحمٰن و رحیم خدا کی نذر
دہ ہے اس لیے اس کا احترام لازمی ہے اور میں
سے بات کرنے سے معذور ہوں (۲۶) اس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورہ مریم۔ آیت ۲۳۔۳۲

لڑکے سے جو پوچھنا ہے پوچھو، قوم کے لوگوں
نے کہا یہ ایک اور عجیب بات ہے ہم بچے سے کیا
پوچھیں، یہ تو ابھی بچہ ہے اور اپنے گہوارہ میں پڑا
ہے (۲۹) لیکن گہوارے سے آواز آئی "میں اللہ کا
بندہ ہوں مجھے پیغمبری ملنے والی ہے مجھے آسمانی
کتاب سے نوازا جانے گا (۳۰) مجھے میرے
پروردگار نے بابرکت بنایا ہے میں جہاں کہیں بھی

اپنی باتیں

بسم الله الرحمن الرحيم

نحمده و نصلي علىٰ رسوله الكريم

قارئین کرام! اگست ۱۹۹۰ء میں جب ھدیٰ کا "صحاح ستہ نمبر" شائع کیا گیا تھا تو ہم نے عرض کیا تھا کہ "اسلاف کے حالات وواقعات، مناقب واوصاف، اقوال وافادات کے مطالعے اور واقفیت حاصل کرنے سے دل ودماغ میں ایک ایسی پر جوش حرکت پیدا ہوتی ہے جو قاری یا سننے والے کے حوصلے کو دبنگ، ہمت کو بلند کر کے نیکیوں کی ترغیب اور برائیوں سے روک کر، صبر واستقلال کی صفت میں اضافہ کرتی ہے۔ بہر حال بزرگوں کے حالات وسوانح اور ان کے کارنامے بعد والوں کے لیے عبرت وموعظت آموزی اور سیرت سازی کا بہترین ذریعہ ہیں۔"

"صحاح ستہ نمبر" کی اشاعت کے بعد بزرگوں واحباب کا اصرار تھا کہ ھدیٰ کا امام ابو حنیفہؒ رحمۃ اللہ علیہ پر ایک ایسا نمبر شائع کیا جائے جس میں امام اعظم کا تعارف اور ان کے محاسن واوصاف اور جس قدر فضائل ہو سکتے ہیں، تفصیلات کے ساتھ یکجا جمع ہوں۔ بہر حال "امام اعظم نمبر" حاضر ہے، ہم اپنے محدود وسائل کے باوجود اس ضرورت کو پورا کرنے میں کس حد تک کامیاب رہے اس کا فیصلہ اہلِ علم وبصیرت ہی کر سکتے ہیں۔

امام اعظمؒ کی زندگی، فکری، علمی اور عملی حیثیت سے پوری امت کی زندگی ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو امام صاحبؒ کی عطا سے مستفید نہ ہو رہا ہو۔ یقیناً آپؒ کی زندگی ان نوعیتوں کا گلدستہ ہے جن سے انفرادی یا اجتماعی زندگی متنوع ہوتی ہے۔ اپنے زمانے کی سیاسیات سے بھی گہرا تعلق تھا اور اجتماعیات سے بھی۔ بقول مولانا محمد میاںؒ "وہ بہت بڑے سوداگر بھی تھے اور بہت بڑے امین بھی جن کے یہاں بہت سے لوگوں کی امانتیں بھی رہا کرتی تھیں۔ اور لوگ ان سے قرض بھی لیا کرتے تھے، وہ عیال دار بھی تھے اور جائداد کے مالک بھی، وہ بہترین مناظر اور بلند پایہ متکلم بھی تھے، وہ آزاد بھی رہے اور پابند سلاسل بھی۔ زندگی شاہانہ تھی اور طبیعت فقیرانہ۔ گوشہ نشین اور عزلت نشین بھی تھے، منڈیوں اور بازاروں سے بھی ان کا تعلق تھا، بحث ونظر کی مجلسوں اور درس وتدریس کی محفلوں سے بھی۔"

اللہ کرے امام ابو حنیفہؒ کے حالاتِ زندگی، کاوشوں اور کارناموں کا مطالعہ ہمارے اور قارئین ھدیٰ کے لیے نشانِ راہ بن جائے اور ان کے نقشِ قدم پر چل کر ہم بھی رضائے الٰہی کے جویا اور اطاعت رسول ﷺ کے کوشاں رہیں۔ آمین ثم آمین!

طالب دعا

احمد مصطفیٰ صدیقی راہی

۱۸ فروری ۲۰۰۰ء مطابق ۱۱ ذیقعدہ ۱۴۲۰ھ

(بروز جمعۃ المبارک)

امام اعظم ابو حنیفہؒ

قرآن پاک کی روشنی میں

السابقون الاولون من المهاجرين والانصار والذين اتبعوهم باحسان رضى الله عنهم و رضوا عنه

مہاجرین اور انصار میں سابقین الاولون اور جن حضرات نے ان کی نیکیوں میں اتباع کی اللہ نے ان سب کو پسند کیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔

بلاشبہ امام ابو حنیفہؒ امام اعظم، اور تابعین میں افضل ہیں

امام اعظم ابو حنیفہؒ

حدیث شریف کی روشنی میں

رجل من ابناء فارس

حضور ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ اگر ایمان ثریا کے پاس بھی ہو گا تو
ۓ فارس میں سے ایک شخص اس کو وہاں سے اتار لائے گا۔ (مسلم)

بالاتفاق اس حدیث کا مصداق نعمان بن ثابت ہیں۔ (سیوطی)

مارچ ۲۰۰۰ء ذیقعدہ رذی الحجہ ۱۴۲۰ھ

جلد ۳۲ — شمارہ ۳۸۲

اس شمارہ کا ہدیہ پچاس روپے

سالانہ ہدیہ [illegible] روپے [illegible]
ڈاک خرچ کے [illegible]
[illegible]
[illegible]

ہندوستان سے باہر سالانہ هدیه

ایسے حضرات جو ہندوستان سے باہر ممالک میں سالانہ خریدار بنا چاہتے ہیں وہ اپنے مطلوبہ مقام کے لیے بذریعہ ہوائی جہاز یا سمندری جہاز جس طرح چاہیں بذریعہ خط و کتابت معلوم کریں

نوٹ

ہدیٰ میں شائع ہونے والے ہر مضمون کی نقل یا ترجمہ کے لیے ہدیٰ کی اجازت حاصل کرنا ضروری ہے۔ ہدیٰ اسلامی ڈائجسٹ میں قرآن کریم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ اس لیے ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

ھُدیٰ

مستقل عنوانات

اس کے علاوہ نعت و حمد اور دیگر بیشمار عنوانات اور امام اعظمؒ کے متعلق اہم واقعات و معلومات

ھدیٰ

ترتیب و تدوین
احمد مصطفیٰ صدیقی راہی

منتظم
احمد ندیم صدیقی

تزئین کار
محمد ذکیر الدین ذکی
بہزاد راہی

کتابت
محمد نصیر الدین بلیاوی، محمد نظر عالم قاسمی، وغیرہم

مطبوعہ:
ایرانین آرٹ پرنٹرس ۱۵۳۴، قاسم جان اسٹریٹ
دہلی ۱۱۰۰۰۶

مقام اشاعت:
3/45 جنگ پورہ (بی) متھرا روڈ
نئی دہلی ۱۱۰۰۱۴

طابع و ناشر:
احمد مصطفیٰ صدیقی راہی

تاریخ اشاعت:
3 فروری 2000ء

اس شمارہ کے خصوصی عنوانات

بانی: حضرت مولانا عبد الوحید صدیقی رحمۃ اللّٰہ علیہ

امام اعظمؒ نمبر

مسلسل اشاعت کا بتیسواں سال

مقامی حضرات کے لیے رابطہ آفس:
2/18 بلاک 2 بھوگل نئی دہلی 14
خط و کتابت کا پتہ:
ناظم ھدیٰ اسلامی ڈائجسٹ: 3/45 جنگ پورہ (بی) متھرا روڈ، نئی دہلی۔ 110014

مدیر اعلیٰ
احمد مصطفیٰ
صدیقی راہی

فون نمبر: 4324980

ہدایت:
ترسیلِ زر کے وقت جملہ بینک ڈرافت ''ھدیٰ میگزین'' کے نام سے ہی قابلِ قبول ہوں گے

کچھ ھدیٰ و طٰہٰ کے ہدیوں کے بارے میں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

قارئین کرام! آج سے پانچ سال قبل دسمبر ۱۹۹۴ میں "ھدیٰ" و "طہٰ" کے ہر پرچہ کا ھدیہ بارہ روپے تھا، جب اس بدل اشتراک میں ان پرچوں کو زندہ رکھنا ناممکن ہو گیا تو مجبوراً "ھدیٰ" و "طہٰ" کے ھدیہ میں اضافہ کر کے ہر پرچے پر آنے والی لاگت اور اس کے اخراجات کے مطابق فی کاپی پندرہ روپے کر دیا گیا تھا۔ حالانکہ اس اضافے کے بعد بھی ہر دو پرچے نقصان ہی میں چل رہے تھے اور نتیجہ میں اس مدت کے دوران "ھدیٰ" تین سے چار لاکھ اور کم و بیش "طہٰ" دو ڈھائی لاکھ کا قرض دار ہو گیا۔

آج تو حالت یہ ہے کہ مہنگائی آسمان کو چھو رہی ہے۔ گزشتہ پانچ سالوں میں ریلوے محصول، رجسٹری خرچ، وی پی خرچ تو تین گنا اور کاغذ کی قیمت جو دو سو چالیس روپے فی رم سے بڑھ کر تین سو بیس روپے تک پہنچ چکی ہے۔ اور ابھی مسلسل اضافہ بدستور ہے، کچھ نہیں کہہ سکتے آئندہ مارچ کا بجٹ کیا گل کھلائے، دیگر بنیادی دفتری ضروریات کا کہنا ہی کیا وہ ہر شخص جانتا ہے۔

چنانچہ موجودہ بدل اشتراک میں ان پرچوں کو زندہ رکھنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ اسلئے ماہ مئی ۲۰۰۰ء کے شماروں سے بادل ناخواستہ مجبوراً، افسوس کے ساتھ "ھدیٰ" و "طہٰ" کے ہدیوں میں اضافہ کر کے ہر پرچے پر آنے والی موجودہ لاگت و اس کے اخراجات کے مطابق فی کاپی ہدیہ بیس روپیہ کیا جا رہا ہے اور اس کے مطابق اب سالانہ ھدیہ پانچ سو روپے ہوگا جس میں ڈاک خرچ دو سو روپے اور سال میں کم از کم دو یا تین نمبر بھی شامل ہیں، ہر شمارہ رجسٹری ڈاک سے بھیجا جاتا ہے۔ حالانکہ اس اضافے کے بعد دینی مواد، دینی رسائل سے بے رغبتی، آسمان سے باتیں کرتی ہوئی مہنگائی، کو دیکھتے ہوئے موجودہ حالت میں اخراجات کو پورا کرنا آسان بات نہیں، بہر حال اللہ تعالیٰ کی مدد اور آپ کے تعاون سے، فرقوں، طبقوں اور گروہ بندیوں سے بالاتر ہو کر یہ پرچے انشاء اللہ مقررہ تاریخوں میں اپنی سابقہ آب و تاب کے ساتھ ناظرین کی خدمت میں پہونچتے رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس بے دینی کے دور میں ھدیٰ و طہٰ کے ذریعے دینی ذخیرہ کو قارئین تک پہونچانے اور اہل خیر حضرات کو ان دینی ذخیروں کو آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ رکھنے کی توفیق اور قوت عطا فرمائے آمین۔ ثم آمین۔۔

خادم

احمد مصطفیٰ صدیقی راہی

بسم اللہ الرحمن الرحیم ۰

نحمد و نصلی علی رسولہ الکریم ۰

قارئین ھدیٰ اور ایجنٹ حضرات کے نام

پانچ سال قبل ”ھدیٰ“ کا ہدیہ بارہ روپے سے پندرہ روپے کر دیا گیا تھا حالانکہ اس اضافے کے بعد بھی پرچہ نقصان میں چل رہا تھا۔ لیکن گزشتہ پانچ سالوں میں اسے برداشت کیا جاتا ہے۔ آج تو حالت یہ ہے کہ مہنگائی آسمان کو چھو رہی ہے۔

چنانچہ موجودہ ہدیہ میں ”ھدیٰ“ کو زندہ رکھنا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے ماہ مئی ۲۰۰۰ء کے شمارے سے نہایت معذرت اور افسوس کے ساتھ بادل ناخواستہ مجبوراً ہدیہ میں اضافہ کر کے پرچے پر آنے والی لاگت اور اس کے اخراجات کے مطابق فی کاپی ھدیہ ۲۰ روپے کیا جارہا ہے حالانکہ اس اضافہ کے بعد بھی موجودہ ہوش ربا اور دن بدن بڑھتی ہوئی گرانی کی حالت میں اخراجات کو پورا کرنا آسان نہیں ہے بہر حال اللہ تعالیٰ کی مدد اور آپ لوگوں کے تعاون سے ھدیٰ ہر ماہ انشاء اللہ مقررہ تاریخوں میں ناظرین کی خدمت میں اپنی آب و تاب کے ساتھ پہونچتا رہے گا۔

نوٹ فرمالیں

مئی کے شمارہ سے ھدیٰ کا ھدیہ فی کاپی ۲۰ روپے ہے

جو اگلا شمارہ ہے۔

ناظم ھدیٰ اسلامی ڈائجسٹ